تاریخ افکار اسلامی
مرتبہ
ملک سیف الرحمٰن صاحب

شائع کردہ.........نظارت اشاعت صدر انجمن احمدیہ پاکستان۔ربوہ
سیٹنگ.........   کلیم احمد طاہر مربی سلسلہ
طابع............طاہر مہدی امتیاز احمد وڑائچ۔ضیاءالاسلام پریس ربوہ۔چناب نگر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ   نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ ۔ھوالناصر

عرض ناشر

سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت پر آئندہ زمانہ میں آنے والے ادوار اور حالات پر روشنی ڈالی ہے ۔مسلمانوں کے تنزل اور انحطاط کے موجبات ومحرکات اور علامات و کیفیات کی تفصیل بیان فرمائی کہ زمانہ نبوت سے دوری اور بُعد کے ساتھ بتدریج مسلمانوں کی حالت بگڑتی جائے گی ۔قرآن مجید فرقان حمید کی تعلیم اور میری اور میرے خلفائے راشدین المہدیّین کی سنت کی پیروی اور اطاعت سے اجتناب اور انحراف کے نتیجہ میں امت مسلمہ افتراق و انشقاق کا شکار ہو کر مختلف فرقوں اور گروہوں میں بٹتی جائے گی اور وحدت اور یگانگت کو سخت صدمہ پہنچے گا ۔ نتیجۃً دنیا میں بھی مسلمانوں کو رسوائی وخذلان اور ذلت وحرمان کا سامنا ہوگا اور اخلاق بگڑ کر دین بھی ہاتھ سے نکل جائے گا اور صرف نام کے مسلمان رہ جائیں گے ۔اپنی شامت اعمال اور دین سے بے اعتنائی اور اخلاقی برائیوں کی وجہ سے جہنمی قرار پائیں گے اور صرف ایک فرقہ ناجی ہوگا ۔صحابہ نے عرض کی وہ کونسا فرقہ ہوگا تو فرمایا کہ وہ فرقہ جو میرے اور میرے صحابہ کے طرزِ عمل کو اپنائے گا ۔وہ متحد اور جماعت کی صورت ہوگا یعنی اس کا ایک واجب الاطاعت امام ہوگا ۔جس کی پیروی اور اطاعت ان کا شعار ہوگا ۔

اس زمانہ میں یہ پیشگوئیاں حرف بحرف پوری ہو چکی ہیں اور تمام علامات اور نشانیاں ظاہر ہو چکی ہیں ۔ وحدت ٹوٹی اور تسبیح دانہ دانہ ہوئی اور امام غائب ہوگیا ۔ایک خدا، ایک رسول اور ایک کتاب کو ماننے والے فرقہ درفرقہ تقسیم ہوگئے اور ایسا غلو اور شدت اپنائی کہ ہر گروہ نے باقی تمام کو کافر جانا ۔فَاعۡتَبِرُوۡا یَا اُولِی الۡاَبۡصَارِ

فرقہ بندی کے رجحان کو فروغ کیونکر ہوا۔ اکابرین و مفکرین نے اس کے اسباب اور وجوہات کی تلاش کی اور ان کو معین کیا۔ فکری وحدت اور عملی اتحاد کے پارہ پارہ ہونے اور تکفیر بازی تک نوبت پہنچنے کی بنیادی وجہ وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا کے ارشاد کی نافرمانی ہے۔ جس کا نتیجہ اور جس کے مظاہر تمام عالم اسلام پر منصۂ ظہور رہیں۔

مختلف اسلامی مکاتب فکر کی تشکیل اور مختلف فرقوں کا ظہور، پرورش اور پروان چڑھنے اور انجام پذیر ہونے کی المیہ داستان کا مطالعہ دردانگیز بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ قرآن کریم فرقان حمید اپنے پیروکاروں کو بار بار تدبر اور فکری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تدبر و تفقہ فی الدین کا درس دیا ہے اور فکری صلاحیتوں کو صیقل کرنے کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ آپ نے مثبت انداز فکر میں اختلاف رائے کو رحمت قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء و فقہاء ربانی نے خیر القرون میں فقہی و علمی ترقی میں غیر معمولی کردار ادا کیا لیکن بعد ازاں اختلاف میں شدت پسندی اور انانیت نے اختلاف عقائد کو جنم دیا اور گروہ در گروہ تقسیم کا موجب ہوا جس نے ملت کی وحدت کو نقصان پہنچایا۔

تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کے فکری ارتقاء اور اختلافات کے سلسلہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب

Revelation, Rationality, Knowledge & Truth

میں تحریر فرماتے ہیں۔

''تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں دو قسم کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

اوّل۔ سب سے زیادہ غالب اور طاقتور اثر قرآن اور سنت کا تھا جس کی وجہ سے تصور علم میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا ہوئی اور مطالعہ اور تحقیق مختلف جہتوں میں بے پایاں وسعت سے ہمکنار ہوئے۔

دوم۔ یونانی فلسفہ اور سائنس میں روز افزوں دلچسپی نیز ہندوستان، ایران اور چین کے کلاسیکی فلسفہ کے مطالعہ نے بھی مسلمانوں کے فکری ارتقا میں ایک اہم کردار

ادا کیا۔اس کے نتیجہ میں بہت سے بیرونی فلسفے آزادانہ طور پر یا اسلامی تعلیمات کے اختلاط سے مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

ان مختلف فلسفوں میں دلچسپی اور ان کی قرآنی آیات سے مطابقت کی خواہش نے نئے مکاتب فکر کو جنم دیا جو اس لئے اسلامی کہلائے کہ ابتدائی طور پر یہ مکتبہ ہائے فکر اسلامی سوچ، تعلیم اور عقائد کی گود میں پروان چڑھے تھے۔نتیجتاً بدیشی فلسفہ کا کلیۃً قرآنی مطالعہ پر مبنی خیالات سے اختلاط شروع ہوا۔اس حقیقت کے باوجود کہ چند تنگ نظر علماء نے ان کے وسیع النظر اور لچکدار رویہ کے باعث ان پر غیر اسلامی ہونے کی مہر لگا دی تھی اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ عظیم علماء بنیادی طور پر مسلمان ہی تھے۔مختلف دنیوی علوم سے ان کا تعلق شاذ ہی ان کے ایمان کی راہ میں حائل ہوا ہوگا۔اس لحاظ سے ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قرآن وسنت کے مطالعہ کے بعد خود فیصلہ کرے کہ ایسے مفکرین کا پیش کردہ فلسفیانہ نقطہ نظر اسلامی ہے یا نہیں۔ تاہم ان کے اخذ کردہ نتائج ہمیشہ بحث طلب رہے ہیں۔بعض کے نزدیک یہ نتائج اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہیں اور بعض کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔تاہم کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان کی نیتوں پر شک کرے۔سچائی کے ہر متلاشی کا یہ حق ہے کہ قرآن اور سنت کو گہرائی میں جا کر سمجھنے کی مخلصانہ کوشش کے بعد اپنے نتائج اخذ کرے۔اسی طرح دوسروں کو بھی اس سے اختلاف کا حق حاصل ہے لیکن کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ دوسرے کو اس بنیادی حق سے محروم کر دے کہ وہ جس چیز پر چاہے ایمان لائے اور خود کو حق پر سمجھے۔...... یاد رہے کہ قرآن وسنت پر مبنی ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہر مکتبہ فکر کو براہ راست ان شواہد کی کسوٹی پر پرکھا جانا چاہیے جو وہ اپنی تائید میں پیش کرتا ہے۔ اسلامی حکومت کے دور میں پنپنے والے تمام نظریات اور نقطہ ہائے نظر کو فی ذاتہٖ اسلامی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ان میں سے کچھ جزوی طور پر متضاد بلکہ ایک دوسرے کے بالکل برعکس تھے۔تاہم یہ بات ان کو اس حق سے محروم نہیں کرتی کہ ان کے ماننے

والے ان کا حوالہ دیتے وقت ان کو اسلامی قرار دیں۔"

(اردو ترجمہ الہام، عقل، علم اور سچائی صفحہ ۱۷، ۱۸)

فکری صحت مند ارتقاء اور ذہن کی مثبت تبدیلی کے لئے اعلیٰ اخلاق، عمدہ نمونہ اور مذہبی اصول سے گہرا رشتہ اور تعلق ضروری ہوتا ہے۔ غلو، شدت، طاقت اور قرآن و سنت سے کمزور رشتہ کے باعث جب عملی اور نظری معاملات درپیش ہوئے اور اختلاف سامنے آئے تو ضد اور تعصب کی راہ سے اپنے اپنے موقف پر قائم رہے۔ بعض اوقات عدل اور انصاف کا دامن چھوٹ گیا اور یہ بالعموم تفرقہ بازی اور فرقہ پرستی کے فروغ کا سبب بنا اور امت مسلمہ کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔

سلسلہ احمدیہ کے ممتاز اور متبحر عالم مفتی سلسلہ محترم ملک سیف الرحمٰن صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اس کا حق ادا کیا ہے۔ آپ نے اپنی اس تصنیف منیف میں مختلف فرقوں کا نظریاتی جائزہ پیش کرتے ہوئے جس اصول کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"مختلف فرقوں کے نظریات کا تاریخی جائزہ پیش کرنے سے پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ آئندہ صفحات میں جو کچھ کسی فرقہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہو اور کسی جگہ بھی تعصب یا شنید یا تساہل سے کام نہ لیا جائے۔ ہر فرقہ کے بارہ میں وہی کچھ لکھا جائے جسے وہ فرقہ مانتا ہے لیکن تاریخی حقیقت کے لحاظ سے یہ حتمی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کوشش پوری طرح کامیاب بھی رہی ہے کیونکہ تاریخ مختلف ادوار میں سے گزرنے اور گردوپیش سے متاثر ہونے کی وجہ سے بڑی حد تک حجاب اکبر بھی ثابت ہوتی ہے اس لئے کسی حقیقت کے کئی پہلوؤں کا تشنۂ وضاحت رہ جانا عین ممکن ہے اور کئی واقعات کی اصلیت سیاق وسباق سے کٹ جانے کی وجہ سے مشتبہ ہو سکتی ہے۔

بہر حال یہ نظریاتی جائزہ اس حسن ظن کی بنیاد پر پیش کیا جا رہا ہے کہ جن سابقہ بزرگوں نے اس موضوع پر لکھا وہ اپنی جلالت شان اور عظمت علم کے لحاظ سے ہر قسم کے

تعصب اور جانبداری سے پاک اور اظہار حقیقت کے لئے بڑے، جری اور صادق القول مانے جاتے ہیں اور ان کی ثقاہت کا انکار مشکل ہے۔''

(کتاب ھٰذا صفحہ ۱۹۵)

مختلف فرقوں کے نظریات کا تاریخی جائزہ جو تاریخ افکار اسلامی کی صورت میں آپ کے ہاتھ میں ہے مصنف نے حزم، احتیاط اور تقویٰ کے ساتھ اس دشوار گزار رستہ کو طے کیا ہے اور تعصب اور جانبداری کا شائبہ بھی پیدا نہیں ہونے دیا۔ اس لئے یہ مطالعہ حقیقت واصلیت سے ہمکنار کرنے والا ہے اور اس میں قاری کی تسلی اور اعتماد کا سامانِ وافر موجود ہے اور اس میں گہرائی میں جا کر سمجھنے اور اپنے نتائج اخذ کرنے کے موقع بہم ہوگا۔ انشاء اللہ

مکرم ومحترم ملک سیف الرحمٰن صاحب ایک عالم باعمل اور تقویٰ شعار بزرگ تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر خیر کرتے ہوئے فرمایا۔

''ملک صاحب مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی علم عطا فرمایا۔ غیر معمولی فراست عطا فرمائی۔ غیر معمولی اطاعت کی روح عطا کی اور ایسا حسین ذہن اور قلب کے درمیان توازن عطا کیا کہ جو شاذ شاذ بندوں میں پایا جاتا ہے۔ ایک بہت ہی دلربا وجود تھے...... ملک صاحب کی زبان سے کبھی کسی نے ساری زندگی ایسا کلمہ نہیں سنا جس کے متعلق آپ کہہ سکیں کہ اس نے دل پر بوجھ ڈالا ہے۔...... ایسے متبحر علماء دنیا میں کم کم پیدا ہوتے ہیں۔''

(خطبہ جمعہ ۳ رنومبر ۱۹۸۹ء، خطبات طاہر جلد ۸ صفحہ ۷۲۰ تا ۷۲۳)

سلسلہ کے لٹریچر میں اس موضوع پر غالباً یہ پہلی تصنیف ہے۔ اس کا انداز تحریر نہایت سلیس اور سہل الفہم ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی خدمت میں جب اس کی اشاعت کی اجازت ومنظوری کے لئے خاکسار نے عرض کیا تو فرمایا کہ ضرور شائع کریں نیز ہدایت فرمائی کہ محترم ملک صاحب کا حوالہ درج کرنے کا اپنا ایک انداز ہے مثلاً بعض اوقات ایک حدیث نقل فرماتے ہیں اور اس حدیث کی دیگر روایات بھی ان کے پیش نظر ہوتی ہیں ان میں سے

بعض حصے یا الفاظ بھی شامل کر لیتے ہیں مگر حوالہ صرف ایک ہی دیتے ہیں۔ یہ طرز گو کہ علماءِ سلف میں بھی مروج ہے تاہم ایک دفعہ تمام حوالے دیکھ کر پوری تسلی کر لی جائے چنانچہ تعمیل ارشاد کی گئی۔ محترم محمد یوسف صاحب شاہد اور محترم ظفر علی صاحب طاہر مربیان سلسلہ نے پروف ریڈنگ میں خوب محنت کی۔

محترم کلیم احمد صاحب طاہر مربی سلسلہ نے سیٹنگ کرنے اور اغلاط کی درستی کا کام بہت محنت سے سرانجام دیا ہے نیز دوسرے مراحل پر بھی کئی احباب شریک کار رہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر دے۔ آمین

خالد مسعود

ناظر اشاعت

صدر انجمن احمدیہ پاکستان

تشکّر

اس مضمون کی تیاری میں خاکسار کی اہلیہ محترمہ امۃ الرشید شوکت صاحبہ نے قابل قدر مدد کی۔اسی طرح محترم چوہدری محمد الیاس صاحب آف کیلگری کینیڈا اور عزیزم محترم چوہدری عبدالباری صاحب اور عزیزم ہشام ملک صاحب نے بھی ہر قسم کی ضروری مدد بہم پہنچائی۔

فَجَزَاھُمُ اللّٰہُ تَعَالٰی اَحْسَنَ الْجَزَاء

فہرست مضامین

نمبرشمار	مضامین	صفحہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِهِ الۡکَرِیۡمِ

تشتّت اورافتراق کے بارہ میں انذاری پیشگوئی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آئندہ زمانے کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے متعدد بار فرمایا ہے کہ میری امت نے اگر قرآن کریم کی ہدایات پر عمل نہ کیا اور میری اور میرے خلفاء راشدین کی سنت کی پیروی ترک کردی تو وہ یہود کی طرح متعدد فرقوں میں بٹ جائیں گے بلکہ یہود سے بھی بدتر ان کا حال ہوگا۔ ان میں سے صرف ایک فرقہ ناجی اور قائم علی الحق ہوگا اور باقی سب فرقے جہنم کا ایندھن بن جائیں گے۔ دنیا میں بھی خوار ہوں گے اور آخرت میں بھی رسوائی کا منہ دیکھیں گے۔ صحابہؓ نے عرض کی حضورؐ ناجی فرقہ کون ہوگا؟ آپ نے فرمایا وہ فرقہ جو وہی طرز عمل اختیار کرے گا جو میرا اور میرے صحابہؓ کا ہے اور وہی فرقہ صحیح معنوں میں جماعت کہلانے کا مستحق ہوگا کیونکہ اس کا ایک زندہ امام اور ایک خلیفہ ہوگا جس کی پیروی اور اطاعت ان کا شعار زندگی ہوگا۔

یہ روایات مختلف الفاظ میں کم وبیش مندرجہ ذیل صحابہ سے مروی ہیں:۔

حضرت ابوبکر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت انس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابو درداء، حضرت جابر، حضرت ابو سعید الخدری، حضرت ابی بن کعب، حضرت عبداللہ بن عمرو اور حضرت امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین[1]۔

---

[1] اَلۡفَرۡقُ بَیۡنَ الۡفِرَق للبغدادی صفحہ ۶،۷

ان روایات میں سے دو کے معین الفاظ یہ ہیں:۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو (رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا) قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰى اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِيْ اُمَّتِيْ مَنْ يَّصْنَعُ ذٰلِكَ وَ اِنَّ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً وَ تَفْتَرِقُ اُمَّتِيْ عَلٰى ثَلَاثٍ وَّ سَبْعِيْنَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ اِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً قَالُوْا: وَ مَنْ هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ [1]۔

یعنی حضرت عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری امت پر بھی وہی حالات آئیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے تھے۔ اوران دونوں فرقوں میں ایسی مطابقت ہوگی جیسی ایک پاؤں کے جوتے کی دوسرے پاؤں کے جوتے سے ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی اپنی ماں سے علانیہ بدکاری کا مرتکب ہوا تو میری امت میں سے بھی کوئی ایسا بدبخت نکل آئے گا جو اس قبیح حرکت کا مرتکب ہوگا۔ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی لیکن ایک فرقہ کے سوا باقی سب جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ نے پوچھا حضور یہ ناجی فرقہ کون سا ہوگا۔ تو آپ نے فرمایا وہ فرقہ جو میری اور میرے صحابہؓ کی سنت اور روش پر چلے گا۔

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْشِكُ اَنْ يَّأْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُهٗ مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَّهِيَ خَرَابٌ مِّنَ الْهُدٰى عُلَمَاءُ هُمْ شَرُّ مَنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَآءِ مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ [2]۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ نام کے سوا اسلام کا کچھ باقی نہیں رہے گا یعنی لوگ اسلام پر عمل کرنا چھوڑ دیں گے۔ الفاظ اور عبارت کے سوا قرآن کریم کا بھی کچھ باقی نہیں رہے گا یعنی قرآن کریم

---

[1] ترمذی کتاب الایمان، باب ما جآء فی افتراق ھذہ الامۃ۔

[2] مشکوۃ کتاب العلم الفصل الثالث و کنز العمال جلد ٦ صفحہ ۴۳

کے مطالب کو اس زمانہ کے لوگ بھلا دیں گے اور عمل چھوڑ دیں گے۔ اس زمانہ کے لوگوں کی مسجدیں دیکھنے میں بڑی شاندار اور آباد نظر آئیں گی لیکن ہدایت اور رُشد سے خالی ہوں گی۔ اس زمانہ کے لوگوں کے علماء آسمان کے نیچے بسنے والی ساری مخلوق میں سے بدتر اور شریر تر ہوں گے ان میں سے فتنے اٹھیں گے اور ان میں ہی لوٹ جائیں گے یعنی سارے فتنوں کی جڑ اور ساری خرابیوں کا سر چشمہ وہی علماء ہوں گے"۔

اس قسم کی پیشگوئیوں کا مقصد دراصل تنبیہ تھا کیونکہ انذاری پیشگوئیوں میں یہ حکمت مخفی ہوتی ہے کہ اگر کوشش کی جائے اور وقت پر سمجھ سے کام لیا جائے اور نفسانی خواہشات کی پیروی سے اجتناب کیا جائے تو مصیبت ٹل سکتی ہے لیکن افسوس کہ اس حکمت کو نہ سمجھا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اتحاد کے بارہ میں جو ہدایات دی تھیں انہیں نظر انداز کر دیا گیا اس طرح مسلمان فرقہ بندی میں یہود سے بھی بڑھ گئے اور تفریق کا شکار بن کر اپنی عظمت اور اپنی شوکت کو کھو بیٹھے۔

مسلمان کون ہے؟

فرقہ بندی پر بحث کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ مسلمان کون ہے۔اس سوال کے مندرجہ ذیل جواب دیئے گئے ہیں۔

الف:۔وہ شخص مسلمان ہے جو اللہ تعالیٰ کو ایک جانتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کرتا ہے اور یہ مانتا ہے کہ **كُلُّ مَا جَآءَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَهُوَ حَقٌّ**۔

معتزلہ کے مشہور امام **ابو القاسم عبداللہ احمد بن محمود الکعبی شیخ المعتزلہ المتوفی 319ھ** نے مسلمان کی یہی تعریف کی ہے۔(تفصیلی حوالہ حاشیہ میں ملاحظہ ہو)[1]۔

ب:۔ خراسان کے **المجسمہ** (الکرامیہ) کہتے ہیں کہ وہ شخص مسلمان ہے جو کلمۂ شہادت پڑھتا ہے ان کا قول ہے۔ **كُلُّ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ مُسْلِمٌ سَوَآءٌ كَانَ مُخْلِصًا فِيْهِ اَوْ مُنَافِقًا**[2]۔

ان دونوں نظریوں پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ غیر مسلموں کے کئی فرقے یہ دونوں باتیں مانتے ہیں مثلاً اصفہان کے یہودی جنہیں عیسویہ بھی کہا جاتا ہے وہ یہ مانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سچے نبی تھے اور ان کی لائی ہوئی شریعت بھی برحق ہے لیکن وہ صرف عرب کے نبی ہیں۔

اسی طرح یہود کا ایک اور فرقہ **مُوشَیْکانِیَہ** کا نظریہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سچے نبی ہیں ان کی شریعت برحق ہے لیکن وہ یہود کے علاوہ باقی ساری دنیا کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔یہود کے لئے ان کا اتباع ضروری نہیں۔پس کیا مذکورہ بالا تعریف کے مطابق ایسے فرقے مسلمان شمار ہوں گے؟

ج:۔وہ شخص مسلمان ہے جو کلمۂ شہادت کا اقرار کرتا ہے کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہے اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔

---

[1] العبر و دیوان المبتدأ والخبر فی ایام العرب والعجم والبربر و من عاصرھم من ذوی السلطان الاکبر جلد۲ صفحہ ۱۷۲ (وھو تاریخ ابن خلدون) علامہ عبدالرحمٰن بن محمد بن خلدون المغربی. ناشر دارالکتب اللبنانی . بیروت لبنان. طبع ۱۹۸۱ء۔

[2] اَلْفَرْقُ بَيْنَ الْفِرَق صفحہ ۱۰

و:۔اہل السنّت والجماعت کے علماء کے نزدیک مسلمان وہ ہے جو کلمۂ شہادت کا اقرار کرتا ہے۔عالَم یعنی کائنات کو حادث اور صرف اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ مانتا ہے۔خدا تعالیٰ کو قدیم مانتا ہے اور اس کی صفات کا قائل ہے۔اس کو عادل اور حکیم مانتا ہے اس کو بے مثال مانتا ہے یعنی لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ کی صداقت کا قائل ہے۔نیز وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا قائل ہے کہ آپ سارے عالم کی طرف مبعوث کئے گئے ہیں۔ان کی لائی ہوئی شریعت دائمی ہے اور یہ کہ وہ برحق اور واجب العمل ہے اور قرآن کریم احکامِ شریعت کا منبع ہے اور کعبہ نماز کا قبلہ ہے۔علّامہ بغدادی مسلمان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

اِنَّ اُمَّۃَ الْاِسْلَامِ تَجْمَعُ الْمُقِرِّیْنَ بِکَلِمَتِہِ الشَّھَادَۃِ وَ بِحُدُوْثِ الْعَالَمِ وَ تَوْحِیدِ صَانِعِہٖ و قِدَمِہٖ وَ صِفَاتِہٖ وَ عَدْلِہٖ وَ حِکْمَتِہٖ وَ نَفْیَ التَّشْبِیْہِ وَ مَعَ ذٰلِکَ یُقِرُّوْنَ بِنُبُوَّۃِ مُحَمَّدٍ ﷺ وَ رِسَالَتِہٖ اِلٰی کَافَّۃِ النَّاسِ وَ بِتَابِیْدِ شَرِیْعَتِہٖ وَ بِاَنَّ کُلَّ مَا جَاءَ بِہٖ حَقٌّ وَ بِاَنَّ الْقُرْاٰنَ مَنْبَعُ اَحْکَامِ الشَّرِیْعَۃِ وَاَنَّ الْکَعْبَۃَ ھِیَ الْقِبْلَۃُ الَّتِیْ تَجِبُ الصَّلٰوۃُ اِلَیْھَا فَکُلُّ مَنْ اَقَرَّ بِذٰلِکَ کُلِّہٖ فَھُوَ الْمُسْلِمُ السُّنِّیُّ الْمُوَحِّدُ[1]۔

اس تعریف کی رو سے وہ باطنی فرقے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے دائمی ہونے کے قائل نہیں یا بیانی ہیں یا مغیری ہیں یا خطابی ہیں یہ سب ائمہ اہل بیت کی الوہیت کے قائل

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۱

۱) اِنَّ مُعَاوِیَۃَ اَرْسَلَ عَدَدًا کَبِیْرًا مِنْ عَائِلَاتِ الْکُوْفَۃِ وَالْبَصْرَۃِ اِلٰی خُرَاسَانَ وَاَسْکَنَھُمْ فِیْھَا ......)

۲) وَقَدْ اَرْسَلَ اِلَیْھَا (اَیْ خُرَاسَانَ. بَلْخ .نِیْسَابُوْر. وَ مَرْو (اَلْمَنْطِقَۃُ فِیْ مُلْتَقٰی افغانستان وایران) زُھَاءَ خَمْسِیْنَ اَلْفًا مِّنَ الْبَصْرِیِّیْنَ وَالْکُوْفِیِّیْنَ بِعِیَالَاتِھِمْ وَ ھِشَامُ بْنُ عَبْدِالْمَلِکِ اَرْسَلَ اِلَیْھَا عِشْرِیْنَ اَلْفًا مِّنْ اَھْلِ الْبَصْرَۃِ وَ الْکُوْفَۃِ

۳) وَ اَنَّ الْحَجَّاجَ قَدْ شَتَّتَ الْکُوْفِیِّیْنَ فِی الْبُعُوْثِ وَالْمَغَازِیْ وَکَانَ یَرٰی اَنَّ ذٰلِکَ اَدْوٰی دَوَآءٍ لِدَائِھِمْ وَ اِنَّ الْاَشْعَرِیِّیْنَ ھَاجَرُوْا مِنَ الْکُوْفَۃِ وَ تَوَطَّنُوْا قُمَّ بَعْدَ اَنْ قَتَلَ الْحَجَّاجُ رَئِیْسَھُمْ مُحَمَّدَ بْنَ السَّائِبِ الْاَشْعَرِیَّ ....

۴) وَ اَنَّ قَبَائِلَ ھٰذِہِ الْعَرَبِ فِیْ خُرَاسَانَ قَدْ ذَابُوْا فِی الْمُجْتَمَعِ الْخُرَاسَانِیِّ فَلَمْ یَعُوْدُوْا وَاضِحِیْنَ مِنْ بَیْنِ الْخُرَاسَانِیِّیْنَ . (اَلصِّلَۃ بین التَّصَوُّفِ و التَّشَیُّع صفحہ ۲۸۲،۲۸۳،۳۱۸)

ہیں اور مجوسیت سے متاثر ہیں۔اسی طرح وہ فرقے جو حلول اور تناسخ کے قائل ہیں۔یا خارجی اباضی فرقہ کا وہ گروہ جس کا عقیدہ ہے کہ آخری زمانہ میں ایک عجمی نبی مبعوث ہو گا جو نئی شریعت لائے گا اور شریعت محمدیہ کو منسوخ کر دے گا اور ایسا ہی خارجی فرقہ کا وہ گروہ جو نواسیوں اور پوتیوں سے نکاح جائز سمجھتا ہے اور ایسا ہی وہ فرقے جو اباحت کے قائل ہیں یہ سب دعوئ اسلام کے باوجود امت مسلمہ میں شمار نہیں کیے جاسکتے۔

اُمّت مسلمہ میں اختلاف کے اسباب

علماءِ تاریخ نے یہ بحث کی ہے کہ مسلمانوں میں فرقہ بندی کے رجحان نے کیونکر فروغ پایا اور اس کے اسباب کیا تھے۔اس بحث کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

تَحَزُّب اور فرقہ پرستی کی سب سے اہم وجہ خلافتِ راشدہ کے بعد حکومت اسلامیہ کے حکّام کا غیر شرعی کردار تھا۔وہ اپنے فرائض کو بڑی حد تک بھول گئے تھے۔جو نمونہ مسلمانوں نے خلافت راشدہ میں دیکھا تھا بنو اُمیّہ کے زمانہ کے حکام اس کے برعکس تھے۔وہ ظلم وزیادتی کے مرتکب ہوتے تھے۔ عدل وانصاف سے بڑی حد تک عاری ہو چکے تھے۔اس طرح جب اُس وقت کے خود غرض لیکن ذہین عناصر نے دیکھا کہ یہ حکّام قومی اموال کو بڑی بے دردی سے اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے بے جا خرچ کرتے ہیں اور وفاداریاں خریدنے میں لگے ہوئے ہیں۔عیش وعشرت ان کی عادت بن گئی ہے تو یہ لوگ بھی جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اپنا اثر ورسوخ بڑھانے لگے اور اقتدار سے حصہ پانے کے لئے طرح طرح کے نظریات کو بنیاد بنا کر شورش بپا کرنے لگے تا کہ ان کی بھی بَن آئے۔یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے شورش پسندوں میں قیادت بالعموم بنو ربیعہ یا نومسلم عجمی عناصر کے ہاتھ میں دکھائی دیتی ہے۔

بعض عناصر جو دینی رجحان رکھتے تھے جب انہوں نے دیکھا کہ ایسے لوگ امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین بن گئے ہیں جن کا دین سے وہ تعلق نہیں جس کا انہوں نے خلفاءِ راشدین کے کردار میں مشاہدہ کیا تھا یا ان کے مثالی نمونہ کے بارہ میں سنا تھا تو ان کے دلوں میں مایوسی اور بے دلی پیدا ہوئی اور وہ سوچنے لگے کہ کیا سلف صالحین نے اس لئے عظیم الشان قربانیاں دی تھیں کہ یزید اور اس کے بُروز مسلمانوں کے امام اور خلیفہ بن جائیں۔اس طرح یہ خیالِ خام ان کو غلط راہ کی طرف لے گیا کیونکہ ابھی دین ان کے دلوں میں مستحکم نہیں ہوا تھا۔

اسلام اتنی تیزی کے ساتھ پھیلا کہ اس زمانہ کی دو زبردست اور بڑی پرانی تہذیبیں آن کی

آن میں تہس نہس ہو گئیں ان تہذیبوں کے پروردہ بعض عناصر مغلوب ہو کر بظاہر مسلمان ہو گئے لیکن اندر سے وہ عمداً یا لاشعوری طور پر اپنی تہذیب وثقافت کے دلدادہ تھے۔اس طرح اس خلفشار کے دور میں یہ عناصر وہاں کے یہود۔مجوس اور نصاریٰ سے مل کر اسلامی اتحاد میں دراڑیں ڈالنے میں سرگرمِ عمل ہو گئے۔

آغاز میں اسلام کی مساوات کی تعلیم سے متاثر ہو کر عرب قبائل کی عصبیّت دب گئی تھی لیکن بنو اُمیّہ کے زمانہ میں اس عصبیّت کے عفریت نے دوبارہ ابھرنے کی کوشش کی۔بنو ربیعہ کے قبائل، مضری قبائل کے پرانے دشمن رہے ہیں بنو ربیعہ کی یہ رقابت مختلف رنگوں میں ظاہر ہوتی رہی ہے۔مسیلمہ کذاب کی بغاوت اسی رقابت کا ایک ابتدائی پَرتَو تھا کیونکہ بنو حنیفہ ربیعہ کی ہی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔بعد ازاں یہی رقابت تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنا رنگ دکھاتی رہی ہے۔خود بنو اُمیّہ بھی عصبیّت کے دلدادہ تھے جس کی وجہ سے بنو امیہ اور بنو ہاشم کی پرانی رقابت اُبھر آئی۔[1]

مسلمانوں کے اقتدار نے بلحاظ معیشت اور اصول حکمرانی ابھی استحکام حاصل نہیں کیا تھا۔ اخلاقی اقدار کو بھی پوری وسعت میسر نہیں آئی تھی۔با اخلاق عناصر غالب نہیں رہے تھے۔اِسی طرح اسلامی تعلیم کے مراکز ابھی تک وسیع اور مستحکم نہیں ہوئے تھے اس لئے جو عجمی عناصر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے آخری دور میں یا اس کے بعد اسلام لائے ان میں اسلامی تعلیمات رچی بسی نہ تھیں اور ان پر ابھی پرانے عقائد اور نظریات کی چھاپ خاصی گہری تھی۔ اس صورت حال کا بھی تفریق بین المسلمین پر بڑا بُرا اثر پڑا اور طرح طرح کے نظریات اسلام کے نام سے پروان چڑھنے لگے۔یہ عناصر کھلی مخالفت تو کر نہیں سکتے تھے اس لئے اسلام کا نام لے کر وہ اپنے باطل نظریات مثلاً تناسخ اور حلول وغیرہ کو فروغ دینے لگے اور اس کے لئے قرآنی آیات سے حوالے تلاش کئے گئے۔

فرقہ بندی کے فروغ کا مرکز عراق، ایران اور خراسان تھا۔یہ علاقے بنو اُمیّہ کے مرکز یعنی شام سے دور تھے۔ان میں موالی یعنی عجمی نومسلموں کی کثرت تھی جن کی ایک بڑی تعداد بوجوہ غیر مطمئن

---

[1] الفتنة الکبریٰ، حصہ دوم المعروف عَلِیٌّ وَ بَنُوْہُ صفحہ ۷۹، ۱۵۵ و ۱۸۱

اور نا آسودہ تھی۔ اس لئے اس قسم کے موالی کی وجہ سے یہ علاقے شورشوں اور بغاوتوں کے گڑھ بن گئے اور طرح طرح کے نظریات ان میں پھلنے پھولنے لگے چنانچہ علامہ بغدادی اس صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ظَهَرَ اَكْثَرُ الْبِدَعِ مِنْ اَبْنَاءِ السَّبَايَا وَالْمَوَالِي۔[1]

ایرانی اور خراسانی عناصر تمدن اور تہذیب کے لحاظ سے اپنے آپ کو برتر سمجھتے تھے جب کہ عربوں نے ان علاقوں کو فتح کر کے ان کی ان تہذیبی اقدار کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا تھا جس کا ان عناصر کو شدید احساس تھا اور وہ اپنی تہذیب کے فروغ اور دوبارہ سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے کوشاں رہنے لگے تھے۔ دوسری طرف بنو اُمیّہ نے بطور پالیسی یہ رویہ اختیار کر رکھا تھا کہ کوفہ اور عراق کے غیر مطمئن شورش پسند عربی قبائل کو مرکز یعنی شام سے دور رکھنے کے لئے ان کو ایرانی اور خراسانی سرحدوں کی طرف دھکیل دیا جاتا اور ان کو وہاں جا بسنے پر مجبور کر دیا جاتا تھا چنانچہ بنو ربیعہ کے کئی قبائل جن میں یمن کے اشعری بھی شامل تھے ایران کے وسطی علاقوں مثلاً قم اور مشہد اور خراسان وغیرہ میں جلاوطن کئے گئے۔[2]

بہر حال یہ غیر مطمئن عربی عناصر جو موالات اہل بیت کا دم بھرتے تھے مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر طرح طرح کی مذہبی اور سیاسی شورشیں بپا کرتے رہتے تھے چنانچہ ابو مسلم خراسانی کو بنو امیہ کے خلاف اور بنو عباس کے حق میں کامیاب بغاوت کا جو موقع ملا اس کے پیچھے عرب و عجم کے انہی غیر مطمئن عناصر کا ہاتھ تھا جو ایک طرح سے عربوں کی شکست اور عجم کی فتح کے مترادف صورتِ حال تھی چنانچہ اسی وجہ سے عباسی حکومت میں عربوں کی بجائے عجمیوں کو مسلسل غلبہ حاصل رہا۔[3]

مسلمانوں کے ہاتھوں فارسی شہنشاہی بالکل تباہ و برباد ہو گئی تھی۔ اس لئے ایران و خراسان کے مفاد پرست عناصر جن کے اقتدار کو دھچکا لگا تھا وہ اس کوشش میں لگ گئے کہ کسی طرح سیاسی مفاد اور حکومتی اقتدار دوبارہ حاصل کریں اس کے برخلاف شام میں پہلے بھی اجنبی حکومت تھی مسلمانوں کی فتح سے صرف اتنی تبدیلی ہوئی کہ بُرے حکّام کی بجائے نسبتاً اچھے حکّام سے ان لوگوں کو واسطہ پڑا اس لئے اس علاقہ کے لوگ اس تبدیلی کو ایک نشان رحمت سمجھتے تھے اور اس صورتِ حال نے ان کے

---

[1] الفرق بین الفرق للبغدادی صفحہ ۸۴ [2] اَلصِّلَةُ بَيْنَ التَّصَوُّفِ وَالتَّشَيُّعِ صفحہ ۲۸۲، ۲۸۳، و ۳۱۸

[3] محاضرات فی تاریخ المذاهب الفقهية صفحہ ۵۹

جذبۂ اطاعت کو اور زیادہ مستحکم کردیا تھا جس کی وجہ سے وہاں شورش کے امکان کم سے کم ہو گئے۔

حضرت امیر معاویہؓ کا دینی کردار خواہ کیسا ہی زیر تنقید رہا ہو ان کا سیاسی کردار خاصہ مضبوط اور تقاضۂ حالات کے مطابق تھا۔ سیاسی جوڑ توڑ، وفاداریاں خریدنے اور جاسوسی نظام سے پورا پورا اور بروقت کام لینے میں وہ بڑے ماہر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے زیر اقتدار مرکزی حصہ یعنی شام میں ہمیں ان کے خلاف کوئی قابل ذکر سرگرمی نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جس علاقہ کو اپنا مرکز بنایا تھا وہ شورشوں اور بغاوتوں کا گڑھ بنا رہا۔ آپ کے ہاں جو سیاسی یا فوجی عناصر تھے ان میں ایک خاصی تعداد ان لوگوں کی تھی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت اور شورش پھیلانے میں پیش پیش رہے تھے۔ تنقید، شورش پسندی اور فتنہ انگیزی ان لوگوں کے منہ کو لگ گئی تھی اور وہ بات بات پر بپھر جاتے تھے۔ خلافت کا رُعب اور ادب واحترام ان کے ذہنوں سے نکل چکا تھا اس پر مستزاد یہ کہ حضرت علیؓ کے بعض حامی عناصر امیر معاویہؓ کے ہاتھوں بک گئے تھے چنانچہ **تَحکِیم** کی تجویز کو قبول کرنے پر حضرت علیؓ جو مجبور ہوئے تو اس کی وجہ انہی خریدے ہوئے عناصر کا اصرار تھا ورنہ حضرت علیؓ اس کے حق میں نہ تھے۔

حضرت علیؓ کے حامی عناصر میں موالی یعنی عراقی اور خراسانی نومسلموں کی بھی بڑی بھاری تعداد تھی جو اسلام اور حق کی حمایت میں نہ اتنے پُرجوش تھے اور نہ اتنے باہمت۔ بعض اوقات وہ عین وقت پر دل چھوڑ بیٹھتے تھے اور اپنے امام کو میدانِ جنگ میں یک وتنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ حضرت علیؓ کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ جو قومی اموال میں خیانت کرتا ہے اسے معاف نہ کیا جائے۔ معاش میں وہی طریقِ مساوات اختیار کیا جائے جو آنحضرت ﷺ اور پہلے خلفاء نے اختیار کیا تھا۔ آپ استحصال اور وفاداریاں خریدنے کے سخت خلاف تھے ایسے حالات میں مفاد پرست اور ترجیح کے خواہشمند عناصر آپ کے مخلص نہ رہے۔ ان کی وفاداری کمزور پڑ گئی تھی۔ یہ لوگ من مانی کرنے کے لئے طرح طرح کی حیلہ سازیاں کرتے۔ اسلام اور محبت اہل بیت کی آڑ لے کر ناواقف لوگوں میں اپنے فاسد خیالات پھیلانے کی کوشش کرتے رہتے۔

بنو اُمیّہ نے یہ پالیسی اختیار کی تھی کہ اہل بیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر ومنزلت کو لوگوں کے دلوں سے نکالنے کے لئے خطبات جمعہ وغیرہ میں حضرت علیؓ اور دوسرے ائمہ اہل بیت کے خلاف ہرزہ سرائی کی جائے اس کا ردعمل یہ ہوا کہ بنو اُمیّہ جن کو بزرگ مانتے تھے اور جن کا احترام کرتے تھے ان کو مدعیان محبت اہل بیت برا بھلا کہنے لگے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہؓ کے خلاف جو نفرت پھیلائی گئی اس کی ایک وجہ مخالف عناصر کا یہی ردعمل تھا بہر حال اس قسم کی غلط سیاسی پالیسیوں کی وجہ سے دینی معاشرہ کمزور ہوتا چلا گیا اور شر کو شہ ملی، دھڑے بندیوں اور تفرقہ بازیوں کے دور کا آغاز ہوا۔

فرقہ پرستی اور دھڑے بندی کی ایک اور مؤثر وجہ یہ تھی کہ اقتدار کی منتقلی کے اصول وضوابط معیّن، مرتّب اور متفق علیہ نہ تھے اور نہ ہی کوئی ایسا مسلّمہ نظام جاری ہوا تھا جس کے تحت انتقال اقتدار کے اصول وضوابط میں ترمیم واصلاح کا عمل جاری وساری رہتا اس لئے جب کسی کو کوئی خرابی نظر آئی تو خیر واپس لانے کے لئے شر کو ذریعہ بنایا گیا اور وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ شر سے تو شر ہی پیدا ہوتی ہے۔ بدی بدی کے فروغ کا باعث بنتی ہے۔ خیر کے لئے تو خیر کے راستوں کی ضرورت ہے۔

خلافت اسلامیہ یا دوسرے لفظوں میں **خلافت علٰی منھاج النبوۃ** جو اتحاد اسلامی کا حقیقی مرکز تھی۔ اس کی اہمیت اور اس کی برکات کا احساس مدھم پڑ گیا۔ اس کے احترام اور اس سے لگاؤ میں کمی آگئی اور یہ سمجھ لیا گیا کہ غلبہ اور اقتدار قیادت اور سیادت تو ان کا موروثی حق ہے اس غلط سوچ کا نتیجہ یہ نکلا کہ باغی ذہن میں خلافت کی ہتک کی جرأت ابھرنے لگی اور شریر عناصر گستاخیوں میں شیر ہونے لگے جس کی وجہ سے خلفاء کی شہادت تک نوبت پہنچ گئی اور وہ تلوار جو نظام خلافت کی حفاظت کے لئے اٹھنی چاہئے تھی مسلمانوں کی گردنیں کاٹنے کے لئے نیام سے باہر آئی اور پھر وہ آپس میں ہی الجھ کر رہ گئے۔

فرقہ پرستی کے فروغ کی ایک اور وجہ اختلافات کو برداشت کرنے کے حوصلہ کا فقدان تھا۔ دلیل کی بجائے تشدد اور تلوار سے اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی اور یہ نہ سمجھا گیا کہ تلوار

زبان تو بند کر سکتی ہے دل کے اندر کے خیالات اور نظریات پر بند نہیں باندھ سکتی۔ [۱]
ذہن کی تبدیلی کے لئے مضبوط دلائل اعلیٰ اخلاق اور عمدہ نمونہ کی ضرورت ہوتی ہے تلوار کی نہیں۔ یہ تھے وجوہات اور کوائف جو بالعموم تفرقہ بازی اور فرقہ پرستی کے فروغ کا سبب بنے اور جن کی وجہ سے اُمّت مسلمہ کا مثالی اتحاد پارہ پارہ ہوگیا اور کام کی باتوں کی بجائے طرح طرح کے لغو نظریات اور **مافوق الطَّبعیات مَباحِث** کی دلدل میں مسلم معاشرہ پھنس کر رہ گیا، قدم رک گئے۔ فتوحات میں وہ تیزی نہ رہی جو خلافت راشدہ کے دور میں دیکھی گئی تھی۔ تاہم اس سب کچھ کے باوجود اہل حق باطل کے مقابلہ میں ڈٹے رہے۔ اسلام کی اشاعت کا عمل جاری رہا۔ گو رفتار کچھ سست پڑ گئی لیکن جیسا کہ آئندہ صفحات سے ظاہر ہوگا کہ غلبہ حق کو ہی حاصل رہا اور بڑی بھاری اکثریت جادۂ حق پر قائم و دائم رہی اور حسب وعدہ اللہ تعالیٰ اسلام کی حفاظت اور اس کی اشاعت کے لئے مصلحین اور مجددین کو بھیجتا رہا اور اب ہم اس دور میں داخل ہو رہے ہیں جو تکمیل اشاعت اسلام اور **لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ** کا دور ہے۔

فَاللّٰهُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاجْعَلْنَا مِنْهُمْ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا تَجْعَلْنَا مِنْهُمْ ۔

[۱] اِنَّ الْعِرَاقِيِّيْنَ لَمْ يُغَالُوْا فِيْ حُبِّ مُحَمَّدٍ كَمَا غَالُوْا فِيْ حُبِّ عَلِيٍّ لِاَنَّ حُبَّ مُحَمَّدٍ لَمْ يَكُنْ مُحَرَّمًا عَلَيْهِمْ فَقَدْ كَانَ حُكَّامُهُمْ يَشْتَرِكُوْنَ مَعَهُمْ فِيْهِ بِخِلَافِ حُبِّ عَلِيٍّ فَاِنَّهٗ كَانَ مُحَرَّمًا عَلَى الشِّيْعَةِ مِنْ قِبَلِ الْعَلُوِّ.
(مَهْزَلَة العقل البشری صفحه ۲ (ملخصًا) ڈاکٹر علی الوردی. مطبع الرابطه بغداد عراق ، طبع ۱۹۵۵ء)

مسلمانوں میں اختلافات کا آغاز

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے معاً بعد اُمّت مسلمہ میں بعض معمولی اختلافات اٹھے لیکن جلد مٹ گئے اور اُمّت کو ان کی وجہ سے کسی مشکل یا پریشانی سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ اس قسم کے اختلافات کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہ اختلاف سامنے آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے ہیں یا نہیں۔ بعض کہتے تھے کہ آپ فوت نہیں ہوئے بلکہ حضرت عیسیٰؑ کی طرح آسمان پر چڑھ گئے ہیں آپ دوبارہ آئیں گے اور منافقین کو ختم کریں گے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب اس قسم کی چہ میگوئیوں کا علم ہوا تو آپ گھر سے آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک پر بوسہ دیا اور پھر کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ پر دو موتیں کبھی وارد نہیں کرے گا یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اس دنیا سے جائیں اور ساتھ ہی آپ کا لایا ہوا دین بھی مٹ جائے اور آپ کی اُمّت اختلافات کا شکار ہو جائے۔ پھر آپ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے جو اس بحث میں اُلجھے ہوئے تھے کہ آپ فوت ہوئے ہیں یا نہیں۔ اس موقع پر آپ نے ان لوگوں کے سامنے یہ آیات پڑھیں۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (الآیۃ)[1]

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (الآیۃ)[2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب یہ آیات پڑھیں اور اعلان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واقعی فوت ہو گئے ہیں اور کوئی نبی بھی اس جسم کے ساتھ آسمان پر نہیں گیا تو سب کی آنکھیں کھلیں اور اختلاف کرنے والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا غرض حضرت ابوبکرؓ کی بروقت مداخلت سے یہ

۱؎ ال عمران:۱۴۵　　۲؎ الزمر:۳۱

اختلاف جلد رفع ہوگیا۔[1]

ایک اور اختلاف یہ سامنے آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں دفن کیا جائے ۔بعض نے کہا مکہ لے جا کر دفن کیا جائے کیونکہ آپ وہاں پیدا ہوئے وہاں مبعوث ہوئے وہاں ہی آپ کا خاندان بستا ہے اور قبلہ بھی وہیں ہے اور آپ کے دادا حضرت اسماعیلؑ کی قبر بھی وہاں ہے۔ انصار نے کہا کہ چونکہ مدینہ آپ کا دارالہجرت ہے اسے آپ نے اپنا مسکن بنایا ہے اور یہیں آپ کے انصار رہے ہیں اس لئے آپ یہیں دفن ہوں۔بعض نے کہا کہ بیت المقدس لے جا کر آپ کو وہاں دفن کیا جائے کیونکہ وہاں آپ کے جد امجد حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے متعدد انبیاء کی قبریں ہیں ۔یہ اختلاف بھی حضرت ابوبکرؓ کی مداخلت سے جلد ختم ہوگیا۔آپ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جہاں میری وفات ہو وہیں تدفین ہو۔اِنَّ الْاَنْبِیَآءَ یُدْفَنُوْنَ حَیْثُ یُقْبَضُوْنَ۔[2]

اس موقع پر صحابہ **رضوان اللہ تعالیٰ علیھم اجمعین** کے سامنے یہ اختلاف بھی آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین کون ہو؟ انصار کا خیال تھا ہم سے جانشین مقرر کیا جائے یا دو جانشین ہوں اس کے لئے انہوں نے سیّد الخزرج سعد بن عبادہ کا نام پیش کیا۔بنو ہاشم میں سے بعض نے کہا کہ قرابت کے لحاظ سے جانشینی ہمارا حق ہے اور اس کے لئے حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے نام لئے گئے آخر کار حضرت ابوبکرؓ کی تقریر اور ان کی طرف سے یہ روایت پیش کرنے پر کہ "اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَیْشٍ" انصار نے اپنا مطالبہ واپس لے لیا[3] اور ہاشمیوں نے بھی اپنے مطالبہ پر اصرار نہ کیا اس طرح سب صحابہ نے باہمی اتفاق سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور ﷺ کا جانشین منتخب کرلیا اور آپ کی بیعت کرنے میں اپنی سعادت سمجھی اس طرح ایک لمبے عرصہ تک کے لئے یہ اختلاف بھی دب گیا۔[4]

---

[1] بخاری کتاب المناقب ، فضل ابی بکرؓ ، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم "لَوْ کُنْتُ مُتَخِذًا خَلِیْلًا"

[2] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۲

[3] اس روایت پر شیعہ کی طرف سے جو تنقید کی گئی ہے اس کے لئے دیکھیں "تاریخ الفرق الاسلامیہ صفحہ ۱۱تا۳۰ و ۱۴۷

[4] بخاری کتاب المناقب باب فضل ابی بکرؓ ۔الفرق بین الفرق صفحہ ۱۲،۱۳

مانعین زکوٰۃ سے جنگ کے جواز کے بارہ میں بھی معمولی اختلاف کا اظہار کیا گیا لیکن اسے کوئی خاص اہمیت نہ ملی بہر حال اس قسم کے اختلافات سامنے تو آئے اور تاریخ نے ان کو ریکارڈ بھی کیا لیکن مسلمانوں کے اتحاد میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑا اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مسلمانوں میں مثالی اتحاد قائم رہا۔ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت کے پہلے نصف میں بھی یہی صورت حال رہی تمام مسلمان اتحاد کا کامل نمونہ بن کر بُنْیَانِ مرصُوص کا انداز اختیار کئے رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے نصف آخر میں بعض عُمّال حکومت کے طرز عمل پر تنقید کا آغاز ہوا جس نے آہستہ آہستہ بڑی شدت اور وسیع شورش کی صورت اختیار کر لی اور آخر الامر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت پر منتج ہوئی۔ اس حادثہ فاجعہ کے بعد یہ اختلاف اٹھ کھڑا ہوا کہ خلیفۂ وقت کے قاتلوں سے کیسے اور کب قصاص لیا جائے۔ نیز آپ کے جانشین یعنی خلیفہ رابع کو کیسے منتخب کیا جائے۔ یہ اختلاف بڑھا اور خون ریزیوں کا باعث بنتا رہا اور آج تک اس کے اثرات باقی ہیں۔ شیعہ اسی اختلاف کی پیداوار ہیں اور اس لحاظ سے تفرقہ کا پہلا بیج ہیں۔[1]

اسی دوران تَحْکِیم یعنی حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے تنازع کو دور کرنے کے لئے حَکَمْ مقرر کرنے کے فیصلہ نے ایک نیا جھگڑا کھڑا کر دیا جو بالآخر حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت کا رنگ اختیار کر گیا۔ خوارج اسی تنازع کی پیداوار ہیں[2]۔ اس کے بعد اعتقادی اور نظریاتی اختلاف اٹھے جن کی وجہ سے مسلمان یا بالفاظ صحیح اسلام کے مدّعی ایسے بٹے، ایسے بکھرے کہ اقوام عالم کے لئے آج تک نشان عبرت بنے ہوئے ہیں اور ان کے فرقوں کی تعداد بہتر سے بھی تجاوز کر گئی ہے اور ہزار کوشش کے باوجود ان کے اتحاد و اتفاق کا خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔

۱؎ الفرق بین الفِرَق. صفحہ ۱۴

۲؎ الفرق بین الفِرَق. صفحہ ۱۵

مسلمانوں کا سب سے بڑا فرقہ

اہل السنّت والجماعت

اہل السنّت والجماعت سے مراد مسلمانوں کا وہ فرقہ ہے جو کتاب وسنت اور احادیث کو حجت اور شریعت اسلامیہ کا ماخذ مانتا ہے اور اس کا اکثر حصہ اجماع اور قیاس کو بھی بطور ماٰ خذ شریعت تسلیم کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اہل السنّت والجماعت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ادب واحترام کو دل سے تسلیم کرتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ دین اسلام کی تبلیغ، قرآن کریم کی حفاظت کی کوشش اور اگلی نسل تک آنحضرت ﷺ کے ارشادات کو پہنچانے میں وہ سب کے سب صادق القول، صادق العمل، انتہائی عادل اور بڑے دیانتدار تھے۔ وہ سب سے پہلے مبلغ ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر دنیا تک اسلام کا پیغام پہنچایا اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اس وقت تک مسلمانوں کی اکثریت اسی فرقہ سے وابستہ ہے اور انہی نظریات کی حامل ہے۔

اہل السنّت والجماعت کے بعض امتیازی نظریات

اہل السنّت والجماعت خدا کو ایک وَحْدَہٗ لَا شَرِیکَ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول برحق مانتے ہیں۔ نیز فرشتوں، نبیوں اور ان پر نازل شدہ کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی طرح تقدیر خیر وشر اور قیامت کو برحق سمجھتے ہیں۔ اہل السنّت والجماعت حقائق اشیاء اور ان کے علم کو تسلیم کرتے ہیں جبکہ سوفسطائیہ اس کے منکر ہیں۔ وہ اشیاء کی حقیقت کو اعتقاد کے تابع مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنے اعتقاد اور تصور کے مطابق کسی چیز کا وجود تسلیم کرتا ہے ورنہ حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ صرف تصور ہی تصور اور وہم ہی وہم کی کارستانی کے ہم سب شکار ہیں۔

اہل السنّت کے نزدیک حواس خمسہ ایک حقیقت ہیں اور الگ وجود رکھتے ہیں جبکہ ابو ہاشم جبائی معتزلی کہتا ہے کہ حواس کا کوئی الگ وجود نہیں۔ اَیْ اِنَّ الْاِدْرَاکَ لَیْسَ بِمَعْنًی وَلَا

عَرَضٍ وَّلَا شَیْءٍ سِوَی الْمُدرِکِ.

اہل السنّت کے نزدیک اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات قدیم اورازلی ابدی ہیں اور باقی تمام کائنات حادث ہے اور وہ جواہر اور اعراض پر مشتمل ہے اور بمطابق آیت کریمہ وَ اَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا[1] ۔ایسے اجزاء سے مرکب ہے جن کا مزید تجزیہ ممکن نہیں اور جنہیں فلسفہ کی اصطلاح میں جُزْءٌ لَا یَتَجَزّٰی کہا گیا ہے جبکہ فلاسفہ اور نظام معتزلی کے نزدیک کائنات ایسے اجزاء سے مرکب ہے جن کی تَجَزِّی اور تقسیم لامحدود ہے ۔گویا یونانی فلاسفہ جو بالعموم ایسی کسی چیز کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے جس کی مزید تقسیم نہ ہو سکے کی طرح وہ جُزْءٌ لَا یَتَجَزّٰی کے موجود ہونے کے قائل نہیں ۔فلاسفہ یہ بھی مانتے ہیں کہ افلاک کی طبیعت کون وفساد، فنا اور تفرق کو قبول نہیں کرتی یعنی وہ ابدی ہیں جبکہ اہل السنّت اس نظریہ کو درست تسلیم نہیں کرتے ۔ان کے نزدیک ماسِوَی اللّٰہ کوئی چیز بھی ابدی نہیں ۔ سب اشیاء بمطابق آیت کریمہ کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ[2] فانی اور نابود ہو جائیں گی ۔

اہل السنّت کے نزدیک اللہ تعالیٰ صانع عالم ہے ۔تمام جواہر اور اعراض کو اسی نے پیدا کیا ہے جب کہ بعض قدریہ معتزلہ کہتے ہیں کہ اعراض یعنی حرکات وافعال وغیرہ اللہ تعالیٰ کے مخلوق نہیں اَیْ قَالُوْا اِنَّ الْاَفْعَالَ الْمُتَوَلِّدَةَ اَیْ الطَّبْعِیَّةَ لَافَاعِلَ لَهَا یعنی یہ اعراض جسم کی طبیعت اورفطرت کا ذاتی تقاضہ ہیں ۔ فَاللّٰهُ تَعَالٰی لَمْ یَخْلُقْ شَیْئًا مِّنَ الْاَعْرَاضِ وَاِنَّمَا خَلَقَ الْجَوَاهِرَ وَالْاَجْسَامَ ۔مثلاً جب کوئی جسم وجود میں آئے گا تو لازماً اس میں کوئی نہ کوئی رنگ خود بخود ظاہر ہوگا کیونکہ کوئی جسم رنگ کے بغیر وجود نہیں پا سکتا ۔

اہل السنّت کے نزدیک صانع عالم ذات واحد ہے جبکہ ثنویہ اور مجوس کے خیال میں صانع عالم دو ہیں یعنی نور وظلمت اور دونوں قدیم ہیں ۔مجوسیوں کے نزدیک صانع خیر یعنی نور قدیم ہے اور اس کا نام یَزداں ہے اور صانع شر یعنی ظلمت حادث ہے اور اس کا نام اَهرمن ہے ۔ عیسائیوں کے نزدیک خدا صانع اول ہے اور صانع ثانی مسیح ہے ۔معتزلہ قدریہ میں سے احمد بن خابط کا بھی یہی نظریہ ہے اس کا کہنا ہے کہ مسیح مدبر عالم اور خالق ثانی ہے ۔بعض شیعوں کے نزدیک

[1] الجنّ : ۲۹ [2] القصص : ۸۹

کائنات کی تدبیر حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کے سپرد ہے اور یہ سب دوسرے درجہ کے خالق ہیں۔ یعنی صانع ثانی ہیں۔

اہل السنّت کے نزدیک صانع عالم محدود نہیں، اس کی کوئی حد بندی نہیں کی جاسکتی جبکہ ہشام بن الحکم رافضی کا کہنا ہے کہ وہ محدود ہے۔ اس کا قد اس کی اپنی بالشت کے لحاظ سے سات بالشت ہے اور کرامیہ فرقہ کہتا ہے کہ خدا کا جو حصہ عرش سے متصل اور ملاقی ہے وہ محدود ہے اور اس کی نشست کے برابر عرش کی چوڑائی ہے اور باقی اطراف سے وہ لامحدود ہے۔ اَیْ هُوَ مَحْدُوْدٌ مِّنَ الْجِهَةِ الَّذِیْ یُلَاقِیْ مِنْهَا الْعَرْشَ وَلَا نِهَا یَةَ مِنْ خَمْسِ جِهَاتٍ سِوَاهَا۔

اہل السنّت کے نزدیک صورت اور اعضاء کے لحاظ سے صانع عالم کی کوئی تعریف اور تشریح ممکن نہیں جبکہ بعض رافضی کہتے ہیں کہ وہ نور ہے اور انسانی صورت رکھتا ہے۔ اَیْ اَنَّهٗ عَلٰی صُوْرَةِ اِنْسَانٍ مِنْ نُوْرٍ عَلٰی رَأْسِهٖ وَفْرَةٌ سَوْدَآءُ مِنْ نُوْرٍ اَسْوَدَ وَنِصْفُهُ الْاَعْلٰی مُجَوَّفٌ وَ نِصْفُهُ الْاَسْفَلُ مُصْمَتٌ وَقَالَ الْمُغِيْرِيَّةُ مِنَ الرَّوَافِضِ اِنَّ اَعْضَاءَ اللّٰهِ عَلٰی صُوْرَةِ حُرُوْفِ الْهِجَاءِ عَيْنُ اللّٰهِ عَلٰی صُوْرَةِ "ع" وَ فَرْجُ اللّٰهِ عَلٰی صُوْرَةِ "ہ" مَثَلًا فَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ۔

اہل السنّت کے نزدیک اللہ تعالیٰ حرکت وسکون، رنج والم وغیرہ کیفیات سے پاک ہے جبکہ بعض رافضیوں کے نزدیک وہ چلتا پھرتا ہے، تھک بھی جاتا ہے، آرام بھی کرتا ہے، غم بھی کھاتا ہے اور خوش بھی ہوتا ہے۔

اہل السنّت کے نزدیک خدا کی بعض صفات مثلاً حیات، قدرت، علم، ارادہ اور اس کی صفت سمع وبصر اور صفت کلام یہ سب ازلی اور ابدی اور قائم بالذات ہیں۔ جبکہ بعض معتزلہ اور بعض شیعہ کہتے ہیں کہ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی لَيْسَ لَهٗ حَيَاةٌ وَ لَا عِلْمٌ وَ لَا قُدْرَةٌ وَ لَا سَمْعٌ وَ لَا اِرَادَةٌ وَ لَا كَلَامٌ بَلْ يَخْلُقُ هٰذِهِ الصِّفَاتِ فِی الْمَخْلُوْقِ كَتَخْلِيْقِ الْكَلَامِ فِی الشَّجَرِ اَوْ فِیْ قَلْبِ الْاِنْسَانِ وَ زَعَمَ زُرَارَةُ بْنُ اَعْيَنٍ وَ اَتْبَاعُهٗ مِنَ الرَّوَافِضِ اِنَّ حَيَاةَ اللّٰهِ تَعَالٰی وَ قُدْرَتَهٗ وَ عِلْمَهٗ وَسَائِرَ صِفَاتِهٖ حَادِثَةٌ وَاَنَّهٗ لَمْ يَكُنْ حَيًّا وَلَا قَادِرًا وَلَا عَالِمًا حَتّٰی خَلَقَ لِنَفْسِهٖ

حَیَاۃٌ وَ قُدْرَۃٌ وَ عِلْمًا وَ اِرَادَۃٌ وَ سَمْعًا وَ بَصَرًا۔

اہل السنّت کے نزدیک کلام اللہ تعالیٰ کی ازلی صفت ہے وہ حادث اور مخلوق نہیں جبکہ قدریہ معتزلہ کے نزدیک یہ حادث ہے اور اس کے کلام کرنے کے یہ معنے ہیں کہ وہ اجسام میں کلام کا وصف پیدا کرتا ہے اور وہ بولنے لگ جاتے ہیں یہ نہیں کہ خدا بولتا ہے۔ انہی معنوں میں وہ قرآن کو مخلوق مانتے ہیں۔

اہل السنّت کہتے ہیں کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے تابع ہیں۔ اَیْ اِنَّـهٗ لَا یَحْدُثُ فِی الْعَالَمِ شَیْءٌ اِلَّا بِاِرَادَتِہٖ مَا شَآءَ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَآءْ لَمْ یَکُنْ جبکہ بصرہ کے معتزلہ کہتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ اللہ نہ چاہے اور چیز ہو جائے جیسے وہ بندے کا کفر نہیں چاہتا لیکن بندہ کفر کا مرتکب ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ چاہتا ہے لیکن ایسا ہوتا نہیں جیسے وہ چاہتا ہے کہ سب لوگ مومن ہو جائیں لیکن سب ایمان نہیں لاتے کچھ ایمان لاتے ہیں اور کچھ کفر اختیار کرتے ہیں۔

اہل السنّت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی صفات غیر ذات لیکن قائم بالذات ہیں جبکہ معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات کا عین ہیں ان کا کوئی الگ اور ممتاز وجود نہیں ورنہ تَعَدُّد قُدَمَاء لازم آئے گا۔ اسی طرح اہل السنّت یہ بھی مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ روح سے بالا ہستی ہے اَیْ اِنَّ حَیَاتَہٗ بِلَا رُوْحٍ وَ بِلَا اِغْتِذَاءٍ وَ اِنَّ الْاَرْوَاحَ کُلَّهَا مَخْلُوْقَۃٌ جب کہ عیسائی کہتے ہیں کہ باپ کے علاوہ بیٹا اور روح القدس بھی قدیم یعنی ازلی ابدی ہیں۔

اہل السنّت کے نزدیک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے کیونکہ وہ قادر مطلق ہے۔ اَیْ هُوَ قَادِرٌ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ جبکہ معتزلہ قدریہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مقدورات العباد پر قادر نہیں اَیْ اِنَّہٗ تَعَالٰی لَا یَقْدِرُ عَلٰی مَقْدُوْرَاتِ الْعِبَادِ وَلَا عَلٰی مَقْدُوْرَاتِ الْحَیَوَانِ۔ ان کے نزدیک انسان خود اپنی قدرت سے کام کرتا ہے خدا اسے اس کام کے کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ یہی حال حیوانات کا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے چلتے پھرتے اور سارے کام کرتے ہیں۔

اہل السنّت کے نزدیک افعال العباد کا خالق خدا ہے اور کسب کا تعلق انسان کے ارادہ اور اختیار سے ہے جبکہ جبریہ کہتے ہیں کہ بندہ مجبور محض ہے سب کچھ خدا کرتا ہے۔ قدریہ معتزلہ کہتے

ہیں کہ بندہ مختار اور آزاد ہے جو چاہے کرے گویا اہل السنّت کے نزدیک معاملہ بین بین ہے کچھ خدا کرتا ہے اور کچھ بندہ۔ خدا خالق ہے اور بندہ کاسِبْ ہے۔

اہل السنّت کے نزدیک ان مادی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی رویت ممکن ہے۔ اس دنیا میں بھی وہ نظر آسکتا ہے اور اگلے جہاں میں بھی وہ مومنوں کو نظر آئے گا۔ فرمایا وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ ۔[1] اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ تم اپنے رب کو ایسا دیکھو گے جس طرح چودھویں کے چاند کو دیکھتے ہو۔[2] جبکہ ابن سالم بصری کہتا ہے کہ وہ کافروں کو بھی نظر آئے گا۔ ضرار بن عمرو کہتا ہے کہ وہ اس مادی آنکھ سے نظر نہیں آسکتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز انسان کو ایک چھٹی حس عطا کرے گا۔ اس حس کے ذریعہ وہ ان کو نظر آئے گا۔ معتزلہ قدریہ اور جہمیہ کہتے ہیں کہ خدا کا نظر آنا محال ہے کیونکہ وہ لامحدود ہے اور نظر میں آنے کے لئے محدود ہونا ضروری ہے۔

اہل السنّت کے نزدیک اسماءِ الٰہی توقیفی ہیں یعنی قرآن کریم اور احادیث میں اس کے جو نام گنوائے گئے ہیں وہی استعمال میں آنے چاہئیں اپنی طرف سے اس کے نئے نئے نام نہیں گھڑنے چاہئیں جبکہ معتزلہ قدریہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو کام کرتا ہے اس کے مطابق اس فعل سے اس کا نام مشتق ہوسکتا ہے مثلاً وہ بندوں کی بات مانتا ہے ان کی مرادیں بر لاتا ہے ان کی دعائیں قبول کرتا ہے اس لئے اس کا نام ''مطیع'' یعنی بات ماننے والا رکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ حمل ٹھہراتا ہے اس لئے اس کا نام مُحْبِل بھی ہے لیکن یہ نظریہ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی[3] کے خلاف ہے۔

اہل السنّت کے نزدیک اسماءِ الٰہی کی تین قسمیں ہیں:۔

الف: وہ اسماء جو اس کی ذات پر دلالت کرتے ہیں جیسے اَلْمَوْجُوْدُ ۔ اَلْوَاحِدُ ۔ اَلْاَوَّلُ ۔ اَلْاٰخِرُ ۔ اَلْغَنِیُّ ۔ اَلْجَلِیْلُ ۔ اَلْجَمِیْلُ وغیرہ۔

ب:۔ وہ اسماء جو اس کی ان صفات ازلیہ کو ظاہر کرتے ہیں جو قائم بالذات یعنی اس کی ذات

---

[1] القیامۃ :۲۴

[2] بخاری کتاب الرد علی الجھمیۃ ، باب قول اللّٰہ وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاظِرَۃ ....

[3] بنی اسرائیل:۱۱۱ و الحشر :۲۵

کے ساتھ قائم ہیں جیسے اَلْحَیُّ، اَلْقَادِرُ، اَلْعَالِمُ، اَلْمُرِیْدُ، اَلسَّمِیْعُ، اَلْبَصِیْرُ وغیرہ جبکہ معتزلہ کہتے ہیں کہ اس کی صفات کا کوئی الگ وجود نہیں یعنی اس کی صفات عین ذات ہیں۔

ج:۔وہ اسماء جو اس کے افعال سے مشتق ہوتے ہیں۔جیسے الخالق. الرّازق، العادل، الحکیم. ان اسماء سے وہ بوقت صدور فعل موسوم اور متصف ہوتا ہے۔

اہل السنّت کے نزدیک نبوت آدمؑ سے شروع ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگئی جبکہ خرمیہ کہتے ہیں کہ نبوت کبھی ختم نہیں ہوگی۔اَیْ اِنَّ الرُّسُلَ تَتْرٰی لَا آخِرَ لَھَا۔بعض اہل السنّت کے نزدیک شریعت والی نبوت ختم ہے اور غیر تشریعی نبوت جسے نبوت مبشرات بھی کہتے ہیں جاری ہے۔ وَلَا آخِرَ لَھَا.[1]

اہل السنّت کے نزدیک انبیاء معصوم ہوتے ہیں جبکہ روافض میں سے ھشامیّہ فرقہ کے نزدیک نبی معصوم نہیں ہوتا وہ گناہ اور غلطی کا مرتکب ہوسکتا ہے لیکن بذریعہ وحی اس کی غلطی کا تدارک ہوجاتا ہے اس کے برعکس اس کے نزدیک امام معصوم ہوتا ہے۔

اہل السنّت کے نزدیک انبیاء، ملائکہ اور اولیاء اور ائمہ سے افضل ہوتے ہیں جبکہ اکثر قدریہ ملائکہ کو انبیاء سے افضل تسلیم کرتے ہیں۔اور بعض روافض کرامیہ اور بعض صوفیاء ائمہ اور اولیاء کو انبیاء سے افضل قرار دیتے ہیں۔

اہل السنّت کے نزدیک امامت اور خلافت کی بنیاد انتخاب اور شوریٰ پر ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو نام لے کر اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا تھا اور نہ کسی کو نامزد کیا تھا اور نہ کسی کے حق میں وصیت کی تھی۔اہل السنّت کہتے ہیں کہ ارباب حل وعقد جنہیں جمہور مسلمان صاحب اثر ورسوخ تسلیم کرتے ہیں اور ان کے کئے کو اپنا کیا کرایا مانتے ہوں وہ انتخاب کے لئے کسی کو نامزد کرسکتے ہیں یعنی یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص کو منتخب کیا جائے اور اس کی بیعت کی جائے۔اسی طرح انتخاب کے لئے کوئی سا طریق اختیار کرنا یا پہلے سے تجویز رکھنا جمہور کے اختیار

---

[1] مرقات شرح مشکوٰۃ مصنفہ ملّا علی قاری حنفی مکّیؒ جلد ۲ صفحہ ۵۶۴
تفہیمات الٰھیّۃ صفحہ ۵۳ مصنفہ شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ
فتوحات مکّیہ جلد ۲ صفحہ ۱۰۰ مصنّفہ شیخ ابن عربیؒ.

میں ہے۔اہل السنّت یہ بھی مانتے ہیں کہ بمطابق حدیث اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَیْشٍ [1] خلیفہ قریش میں سے چنا ضروری ہے۔

اہل السنّت یہ بھی مانتے ہیں کہ پہلے چار خلفاء امام برحق اور خلیفہ راشد تھے جبکہ شیعہ پہلے تین خلفاء کو خلیفہ راشد نہیں مانتے۔شیعوں کے نزدیک خلافت اور امامت کے لئے اہل بیت میں سے ہونا ضروری ہے نیز اس کا تعلق وراثت اور نسل سے ہے، امت کو انتخاب کا اختیار نہیں نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے پہلے حضرت علیؓ کے حق میں وصیت کی تھی کہ میرے بعد یہ میرے جانشین اور خلیفہ ہوں گے پھر ہر امام کا فرض ہے کہ وہ وفات سے پہلے اپنا جانشین مقرر کرے اور اس کے حق میں وصیت کرے گویا شیعہ کے نزدیک امامت اور خلافت موروثی اور منصوص ہے امت کو اپنا امام منتخب کرنے کا حق نہیں۔

روندیہ فرقہ جو ابوہریرہ الروندی کا پیرو تھا اور جس کا ایک داعی ابومسلم خراسانی بھی تھا وہ حضرت عباسؓ کو خلافت کا مستحق مانتا تھا کیونکہ وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی وارث تھے۔حضرت علیؓ کا نمبر بعد میں آتا ہے اس لئے کہ وہ چچا زاد بھائی تھے اور عباس چچا اور چچا زیادہ قریبی وارث ہے۔[2]

خوارج کے نزدیک ہر وہ مسلمان جو اہلیت رکھتا ہو خواہ وہ عربی ہو یا عجمی اسے بطور خلیفہ و امام منتخب کیا جاسکتا ہے۔اب قریباً اہل السنّت بھی اسی نظریہ کو درست تسلیم کرتے ہیں اور اسی بناء پر عثمانی ترکوں کی خلافت کو برحق مانتے ہیں۔

اہل السنّت کے نزدیک اَلصَّحَابَةُ کُلُّهُمْ عَدُوْلٌ ایک سچائی ہے یعنی صحابہؓ نے پوری سچائی اور دیانتداری کے ساتھ بعد میں آنے والوں تک دین اسلام کو پہنچایا اور اس ذمہ داری کے بارہ میں وہ سب کے سب عادل اور واجب الاعتماد تھے جبکہ بعض شیعہ اور خوارج متعدد صحابہ کی تکفیر کرتے ہیں اور انہیں قابل اعتماد نہیں سمجھتے اور روافض کا کاملیہ فرقہ ان تمام صحابہ کو کافر قرار

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۲۵

[2] اعتقادات فرق المسلیمن والمشرکین صفحہ ۶۳ مصنفہ امام فخر الدین رازیؒ مطبوعہ مطبع دارالکتب العلمیۃ بیروت لبنان ۱۹۸۲ء

دیتا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندہ رہے۔ عام صحابہ کو اس لئے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو نہیں مانا اور علیؓ کی بجائے ابو بکرؓ کو اپنا امام مان لیا اور علیؓ اس لئے کافر ہیں کہ انہیں اپنا منصوص حق لینے کے لئے لڑنا چاہیے تھا لیکن وہ نہ لڑے اور چپ کر کے بیٹھ گئے اس لئے وہ بھی کافر ہیں۔

اہل السنّت کے نزدیک خبر متواتر سے علم یقینی حاصل ہوتا ہے اور خبر واحد ذریعہ علم ظن ہے۔[۱] اس لئے ایسی احادیث اور روایات سے احکام شرعیہ ثابت ہو سکتے ہیں یعنی یہ ذریعہ علم بھی مدار شریعت ہے جبکہ شیعہ کے نزدیک صرف ائمہ اہل بیت خاص طور پر حضرت امام جعفرؒ کی مرویات حجت اور ماخذ شریعت ہیں۔

بعض رافضیوں کا یہ نظریہ ہے کہ صحابہؓ نے چونکہ قرآن کریم میں تحریف وتبدیلی کر دی ہے اس لئے وہ بھی حجت شرعی اور ماخذ شریعت نہیں رہا۔ خوارج کے نزدیک حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے دور خلافت میں اکثر صحابہؓ کفر کے مرتکب ہوئے اس لئے ان کی مرویات حجت شرعیہ نہیں۔ نظام معتزلی اجماع کے حجت اور ماٰخذ شریعت ہونے کا منکر تھا وہ کہتا تھا کہ لوگ غلط بات پر متفق ہو سکتے ہیں اور یہ ممکن ہے کہ سب نے جھوٹ کو سچ مان لیا ہو اس لئے خبر متواتر قطعی اور یقینی علم کا ذریعہ نہیں۔ سَمْنِیّہ فرقہ کا بھی یہی نظریہ ہے۔[۲]

اہل السنّت کے نزدیک قرآن کریم کی عبارت بلحاظ نظم وترتیب بھی ایک معجزہ ہے کوئی دوسرا

---

[۱] احادیث احاد کی چھان بین ضروری ہے۔ وہ حدیث ہی قابل قبول ہوگی جو سند کے لحاظ سے قوی ہو۔ درایت بھی اس کی تائید کرتی ہو اور قرآن کریم کی کسی نص کے خلاف نہ ہو۔ یہ چھان بین اس لئے ضروری ہے کہ دور فتنہ میں کئی مفتری ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے حدیثیں وضع کرنے میں حد کر دی۔ چنانچہ اس بارہ میں علامہ بغدادی لکھتے ہیں۔

”ان عبدالکریم بن ابی العوجاء کان یضع احادیث کثیرۃ باسانید یغتر بھا من لا معرفۃ لہ بالجرح والتعدیل و رفع جزء ھذا الضال الی ابی جعفر محمد بن سلیمان عامل المنصور علی الکوفۃ فامر بقتلہ فقال لن یقتلونی لقد وضعت اربعۃ آلاف حدیث احللت بھا الحرام و حرمت بھا الحلال“

یہ تو ایک مفتری ہے جس نے اپنی شرارت کا اعتراف کیا نا معلوم کتنے دوسرے شریر ہوں گے جو گرفت میں نہ آ سکے یا اعتراف گناہ کی جرأت نہ کر سکے۔ (الفرق بین الفرق صفحہ ۲۰۶)

[۲] الفرق بین الفرق صفحہ ۲۵۳

اس جیسی فصیح و بلیغ عبارت مرتب نہیں کرسکتا جبکہ نظام معتزلی کا کہنا ہے کہ

"لَااِعْجَازَ فِیْ نَظْمِ الْقُرْآنِ"

اہل السنّت کے نزدیک انسان اور حیوان دونوں کا حشر ہوگا جبکہ بعض دوسرے فرقوں کی رائے ہے کہ صرف انسانوں کا حشر ہوگا۔حیوانات دوبارہ زندہ نہیں کئے جائیں گے۔

اہل السنّت کے نزدیک جنت اور دوزخ دونوں مخلوق لیکن ابدی ہیں کبھی فنا نہ ہوں گی جبکہ بعض کہتے ہیں کہ دوزخ فنا ہوجائے گی اور وہ سب لوگ جو دوزخ میں داخل ہوں گے۔وہ سزا بھگت کر اور اصلاح پاکر دوزخ سے نکل آئیں گے۔

جہمیہ کے نزدیک جنت اور دوزخ دونوں فانی ہیں ایک وقت آئے گا کہ ان میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔خوارج کے نزدیک گنہگار مسلمان بھی کفار کے ساتھ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔[1]

اہل السنّت والجماعت کی بعض ضمنی شاخیں

بعض نظریاتی اور باطنی مسالک یا فقہی احکام میں معمولی اختلاف کے لحاظ اہل السنّت والجماعت مختلف شاخوں اور حزبوں میں تقسیم ہیں لیکن چونکہ یہ سب مذکورہ بالا بنیادی نظریات میں متفق اور متحد الخیال ہیں۔قرآن سنت اور احادیث کو شریعت اسلامیہ کا ماخذ مانتے ہیں اور تھوڑے بہت اختلاف کے باوجود بالعموم ایک دوسرے کو کافر نہیں کہتے اور اپنے آپ کو اہل السنّت والجماعت کہلانا پسند کرتے ہیں۔اس لئے اصولاً یہ سب ایک ہی فرقہ شمار ہوتے ہیں۔اگرچہ تعارف یا تحزّب پسندی کی وجہ سے اپنے الگ الگ نام بھی اختیار کر رکھے ہیں مثلاً نظریاتی اور کلامی مسائل کے لحاظ سے کوئی اشعری ہے تو کوئی مَاتُرِیْدِیْ یا سَلَفِیْ تصوف اور باطنی مسالک کے لحاظ سے کوئی چشتی ہے تو کوئی سہروردی، کوئی قادری ہے تو کوئی نقشبندی۔

اسی طرح فقہی مسلک کے لحاظ سے کوئی حنفی ہے تو کوئی مالکی کوئی شافعی ہے تو کوئی حنبلی۔ اسی طرح کئی اور نام اور ضمنی شاخیں ہیں جن کی تفصیل میں جانا اختصار کے منافی ہے۔تاہم اہل السنّت والجماعت کی ہر بڑی شاخ کے بارہ میں ضروری وضاحت آئندہ صفحات میں پیش کی جارہی ہے۔

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۲۰،۱۹، ۲۴۰ تا ۲۸۶

نظریاتی اور کلامی لحاظ سے اہل السنّت والجماعت کی ذیلی شاخیں

عقاید اور نظریات میں بعض معمولی اختلافات کے لحاظ سے اہل السنّت والجماعت کی مندرجہ ذیل شاخیں ہیں۔اَشاعرة . مَاتُرِیْدِیَه. سَلَفِیَّه.

ا۔ اَشَاعِرَہ

اشاعرہ اہل السنّت والجماعت کا وہ گروہ ہے جو کلامی مسائل میں امام ابوالحسن بن اسمٰعیل اَلْاَشْعَرِیْ کا پیرو ہے۔امام اشعری بصرہ کے رہنے والے تھے۔۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۳۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔امام اشعری پہلے معتزلی المسلک تھے اور مشہور معتزلی عالم ابوعلی الجبائی کے شاگرد تھے لیکن بعد میں اہل السنّت کے مسلک کو اپنا لیا [1] اور اپنے استاد علامہ جبائی سے متعدد مناظرے کئے اور علم کلام میں آپ نے بڑے پائے کی کتابیں لکھیں جن میں سے "مقالات الاسلامیّین" زیادہ مشہور رہے۔آپ جمہور مسلمانوں کے مانے ہوئے امام، کامیاب مناظر اور اعلیٰ پایہ کے خطیب تھے۔علامہ بغدادی نے آپ کا ایک مناظرہ نقل کیا ہے جو آپ نے اپنے استاد الجبائی سے کیا تھا جس میں آپ کی ذہانت اور مناظرہ میں مہارت کا پتہ چلتا ہے۔یہ مناظرہ کچھ اس طرح ریکارڈ ہوا ہے۔

اشعری: مومن۔کافر اور بچہ کی نجات کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جبائی: مومن جنت میں جائے گا اور کافر دوزخ میں اور بچہ کو نہ عذاب ہوگا اور نہ وہ جنت میں جائے گا کیونکہ جنت میں جانے کے لئے اعمال کا ہونا ضروری ہے اور بچہ کا ظاہر ہے کہ کوئی عمل نہیں۔

اشعری: بچہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے اور مہلت دیتا تو میں نیک اعمال بجالاتا۔بچپن میں فوت ہو جانا تو میرا کوئی قصور نہ تھا۔اس لئے مجھے جنت سے کیوں محروم کیا گیا ہے۔

جبائی: خدا اس کا یہ جواب دے سکتا ہے کہ میرے علم میں تھا کہ اگر اس بچہ کو عمر اور مہلت ملی تو یہ بدکار ہو جائے گا اور دوزخ کا ایندھن بنے گا اس لئے بچہ کی مصلحت اسی میں تھی کہ وہ نابالغی کی عمر میں ہی فوت ہو جائے تاکہ کم از کم دوزخ کے عذاب سے تو وہ بچا رہے۔

---

[1] اس تبدیلی کے بارہ میں مختلف آراء کے لئے دیکھیں تاریخ الفرق الاسلامیة۔صفحہ ۱۵۲

اشعری: اس طرح تو کافر بھی کہہ سکتا ہے خدایا تجھے علم تھا کہ میں نے بڑے ہو برے کام کرنے ہیں اس لئے مجھے بچپن ہی میں کیوں نہ ماردیا کہ کم از کم دوزخ کے عذاب سے تو بچ جاتا۔

جبائی سے کچھ جواب نہ بن پڑا اور وہ خاموش ہو گیا۔

اشاعرہ کی امتیازی خصوصیات

خدا نے جس طرح اپنے آپ کو قرآن کریم اور احادیث میں ظاہر کیا ہے وہ اسی طرح ہے۔ اس میں نہ کسی قسم کی تاویل مناسب ہے اور نہ مجاز اور استعارہ کا سہارا لینا درست ہے۔ مثلاً۔

خدا کا چہرہ ہے۔ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ [1]۔

خدا کے دو ہاتھ ہیں۔ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ [2]۔ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ [3]۔ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ [4]۔

خدا کی آنکھیں ہیں۔ تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا [5]۔ لِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي [6]۔

خدا آسمان اولیٰ پر نزول اجلال فرماتا ہے جیسا کہ حدیثوں میں وضاحت آئی ہے۔

اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے۔ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ [7]۔ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ [8]۔

خدا قادر مطلق ہے۔ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ [9]۔ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً [10]۔

اللہ تعالیٰ بولتا ہے۔ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا [11]۔

قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور وہ غیر مخلوق ہے۔

افعال عباد اللہ تعالیٰ کے مخلوق ہیں۔ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ [12]۔ أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ [13]۔

البتہ کسب بندہ کا ہے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ [14]۔

خلق اور کسب میں کیا فرق ہے؟ یہ ایک راز ہے جس کی وضاحت بہت مشکل ہے۔

اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ مَنْ يَهْدِ اللَّهُ

---

[1] الرّحمٰن : ۲۸ [2] المائدة : ۶۵ [3] ص : ۷۶ [4] فتح : ۱۱ [5] قمر : ۱۵
[6] طٰهٰ : ۴۰ [7] النساء : ۱۶۷ [8] التحریم : ۳ [9] الانعام : ۶۶ [10] حٰمٓ السجدة : ۱۶
[11] النساء : ۱۶۵ [12] الصّٰفّٰت : ۹۷ [13] الطور : ۳۶ [14] البقرة : ۱۳۲

فَهُوَ الْمُهْتَدِیْ ۔[1] وَمَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ[2]۔ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ[3]۔

اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور مشیت ہے۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ[4]۔
فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ[5]۔

گناہ کبیرہ کا مرتکب دائمی جہنمی نہیں وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر دوزخ سے نکل آئے گا۔ خدا چاہے تو گنہگار کو معاف کر دے اور چاہے تو نیک کو دوزخ میں ڈال دے وہ مختار و خالق ہے تاہم اس کا رحم اور اس کا فضل اتنا وسیع ہے کہ اختیار رکھنے کے باوجود وہ نیک کو دوزخ میں نہیں ڈالے گا اور اسے جنت سے نہیں نکالے گا۔

ان سب مذکورہ بالا مسلمات میں معتزلہ کو اختلاف ہے اور وہ ان نصوص کی تاویل کرتے ہیں[6]۔

۲۔ مَاتُرِیْدِیَه

مَاتُرِیْدِیَه اہل السنّت والجماعت کا وہ گروہ ہے جو کلامی مسائل میں امام ابوالمنصور محمد بن محمود سمرقندی ماتریدی کی پیروی کرتا ہے۔ امام موصوف سمرقند کے محلہ ماترید کے رہنے والے تھے اس لئے ماتریدی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ ۳۳۳ھ میں فوت ہوئے جبکہ امام اشعری کی وفات ۳۳۰ھ میں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے دونوں امام ہمعصر تھے۔ آپ نصر بن یحیٰ بلخی کے شاگرد تھے جو اس زمانہ میں حنفیوں کے مشہور پیشوا تھے اس لئے امام ماتریدی بھی حنفی المسلک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ امام ابومنصور ماتریدی حضرت امام ابوحنیفہ کے کلامی افکار کے شارح اور مفسر تھے آپ متعدد مرتبہ سمرقند سے بصرہ گئے تاکہ وہاں معتزلہ اور اشاعرہ سے مناظرہ کریں۔ امام ابومنصور ماتریدی اپنی کتابوں میں بار بار امام ابوحنیفہؒ کے نظریات کا حوالہ دیتے ہیں اور ان کے لئے منطقی اور عقلی دلائل ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ مثلاً کتاب تَأوِیْل القرآن، مَأخذ الشرائع ۔ اَلْمَقالات فی الکلام۔ اَلرَّدُّ عَلَی الْقَرَامِطَةِ وغیرہ۔

---

[1] الاعراف : ۱۷۹ [2] الزمر : ۳۸ [3] الاعراف : ۱۸۷ [4] الدهر : ۳۱
[5] بروج : ۱۷ [6] الفرق بین الفرق صفحہ ۲۲۰ تا ۲۸۰۔ تاریخ المذاهب الاسلامیة صفحہ ۲۲۰۔ مصنفہ محمد ابوزہرہ پروفیسر شریعت اسلامیہ لاء کالج قاہرہ یونیورسٹی ۔ ناشر دارالفکر العربی القاہرہ مصر۔

مَاتُرِیْدِیَه کی امتیازی خصوصیات

ما تریدیه کے نزدیک معرفت الٰہی اور صانع عالم کے وجود کو تسلیم کرنا ایک عقلی وجوب ہے اس لئے قبل نزول شریعت بھی اس پر علی الاجمال ایمان لانا ضروری ہے اور کوتاہی کرنے والے سے باز پرس ہوگی جبکہ اشاعرہ کہتے ہیں کہ یہ معرفت وجوب شرعی ہے اس لئے قبل نزول شریعت اس کوتاہی کی نہ کوئی گرفت ہے اور نہ کوئی سزا۔

ما تریدیه کے نزدیک افعال الٰہی میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے اسی لئے اس نے ہر چیز کو خاص مصلحت اور حکمت کے تحت پیدا کیا ہے۔ اسی طرح اس نے شریعت کے جو احکام نازل کئے ہیں وہ بھی اپنے اندر حکمت اور مصلحت رکھتے ہیں کیونکہ وہ حکیم ہے اور **فِعْلُ الْحَکِیْمِ لَا یَخْلُوْ عَنِ الْحِکْمَۃِ**۔ جبکہ **اشاعرہ** کہتے ہیں کہ خدا پر ایسی کوئی پابندی نہیں اس نے جو چاہا اور جس طرح چاہا پیدا کر دیا اور جو حکم چاہا نازل فرمادیا۔ وہ **فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ** ہے اس لئے اس کے کاموں اور حکموں میں حکمت اور مصلحت تلاش کرنا بے معنے اور بے کار بات ہے۔

ما تریدیه کے نزدیک افعال عباد میں ذاتی حسن اور ذاتی قبح ہے یعنی کچھ افعال عقلاً اچھے ہوتے ہیں اور کچھ برے جو اچھے کام ہیں اللہ تعالیٰ ان کے کرنے کا حکم دیتا ہے اور جو برے ہیں ان سے روکتا ہے نیز افعال کے اس حسن یا قبح کا عقل ادراک کرسکتی ہے لیکن یہ ادراک اور علم مدار ثواب وعقاب نہیں۔ ثواب وعقاب کا سوال نزول شریعت کے بعد پیدا ہوتا ہے جبکہ معتزلہ کہتے ہیں کہ یہ ادراک اور علم مدار ثواب وعقاب بھی ہے اچھا کام کرنے والے کو ثواب ملے گا اور برا کام کرنے والوں کو سزا دی جائے گی خواہ شریعت نازل نہ بھی ہوئی ہو۔ اشاعرہ کا نظریہ یہ ہے کہ افعال عباد میں کوئی ذاتی حسن یا ذاتی قبح نہیں ہوتا۔ شریعت نے جس کام کے کرنے کا حکم دیا وہ حسن بن گیا اور جس کے کرنے سے روکا وہ بُرا اور قبیح ہوگیا گویا کسی فعل کے اچھا یا برا ہونے کا سوال نزول شریعت کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

ماتریدیہ کا ایک نظریہ یہ ہے کہ نیک کو ثواب دینے اور جنت میں داخل کرنے کا اس نے وعدہ کیا ہے اور اپنے اس وعدہ کو ضرور پورا کرے گا کیونکہ اَلْکَرِیْمُ اِذَا وَعَدَ وَفَا اور بد کو سزا دینے کی اس نے خبر دی ہے لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی فرمایا ہے کہ چاہے تو اسے معاف کر دے وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ[1] اور بمطابق مقولہ اَلْکَرِیْمُ اِذَا وَعَدَ وَفَا معاف کر دینا بجائے خود ایک خوبی ہے۔ اسی لئے فرمایا لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى[2]۔

جبکہ معتزلہ کہتے ہیں کہ نیک کو جنت میں لے جانا اور بد کو دوزخ میں ڈالنا خدا کے لئے ضروری ہے وہ اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ[3]۔ اشاعرہ کہتے کہ اس پر کچھ بھی پابندی نہیں اور نہ کچھ واجب ہے چاہے تو نیک کو جہنم میں ڈال دے اور چاہے تو بد کو معاف کر کے جنت میں لے جائے۔ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ[4]۔

ماتریدیہ کہتے ہیں کہ صفات باری کو نہ قائم بالذات کہا جا سکتا ہے اور نہ **مُنْفَک عَنِ الذَّات** جبکہ معتزلہ کہتے ہیں کہ صفات باری عین ذات ہے۔ ذات باری سے کوئی الگ چیز نہیں گویا **ماتریدیہ** اس نظریہ میں معتزلہ سے قریب تر ہیں جبکہ اشاعرہ کا نظریہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ کی ازلی صفات بھی غیر ذات ہیں لیکن قائم بالذات ہیں۔ اس سے منفک نہیں ہو سکتیں۔

ماتریدیہ قرآن کریم کو غیر مخلوق مانتے ہیں لیکن ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ حادث ہے گویا وہ خلق اور حدث کے مفہوم میں فرق کرتے ہیں جبکہ اشاعرہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نہ مخلوق ہے اور نہ حادث بلکہ وہ قدیم ہے۔ معتزلہ کے نزدیک قرآن کریم یا بالفاظ دیگر کلام الٰہی مخلوق اور حادث ہے اور اسے قدیم کہنا عیسائی ذہن کی پیداوار ہے۔ یوحنا دمشقی جو بنو امیہ کے زمانہ میں کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا وہ اپنے پیروؤں کو کہا کرتا تھا کہ جب تم سے مسلمان پوچھیں کہ تم مسیحؑ کو کیا مانتے ہو تو جواب میں کہا کرو کہ ہم مسیحؑ کو کلمۃ اللہ مانتے ہیں اور تمہارا بھی ایمان ہے کہ "کلمہ" قدیم ہے۔ تاہم اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ قرآن کریم کے مخلوق اور حادث ہونے کی بحث دراصل نزاع لفظی ہے لیکن اس نظریہ کے اظہار پر پہلے معتزلہ کو بے حد تنگ کیا گیا ان کے خلاف قتل

---

[1] النساء: ۱۱۷ [2] الحشر: ۲۵ [3] الرعد: ۳۲ [4] الانبیاء: ۲۴

کے فتوے دیئے گئے۔[1] پھر جب معتزلہ کی باری آئی اور انہیں بنو عباس کے دربار میں رسوخ حاصل ہوا تو انہوں نے بھی بدلہ اتارنے میں حد کر دی اس طرح امت مسلمہ ایک لفظی نزاع کے سلسلہ میں بڑے لمبے عرصہ تک دست و گریباں رہی۔ قتل و غارت اور تعذیب و تحقیر کا بازار گرم رہا۔ فَاِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

بعض محدثین کے نزدیک یہ بحث کہ قرآن کریم مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ ایجاد بندہ اور بدعت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ کے دور میں ایسی بحث کہیں سننے میں نہیں آئی تھی پس یہ ایک کھلی بدعت ہے۔ وَ کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ۔

ماتریدیہ عقل کو بھی خاصی اہمیت دیتے ہیں اور جہاں عقل و نقل میں بظاہر تعارض نظر آئے وہاں تطبیق کی کوشش کرتے ہیں اور بعض اوقات تاویل سے بھی کام لے لیتے ہیں۔ علامہ ماتریدی کا کہنا ہے کہ نظر و فکر اور عقل و تدبر سے انکار کیسے ممکن ہے جبکہ خود خدا بار بار نظر و فکر اور عبرت و موعظت کی تلقین کرتا ہے البتہ جو شخص قرآن و حدیث یعنی نقل سے آزاد ہو کر صرف عقل پر بھروسہ کرتا ہے اور اس کے بل بوتہ پر حکمت باری کا احاطہ کرنا چاہتا ہے وہ جادۂ حق سے ہٹنے کی جرأت کرتا ہے اور عقل سے ایسا کام لینا چاہتا ہے جس کی وہ متحمل نہیں ہو سکتی اس لئے وہ بھی عقل پر ظلم کرتا ہے۔

بہر حال ماتریدیہ کے ہاں نقل اور عقل روایت اور درایت کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے جو دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اشاعرہ روایت کو درایت پر ترجیح دیتے ہیں جہاں انہیں بظاہر عقل

---

[1] قَالَ لِمَالِکٍ رَجُلٌ مَا تَقُوْلُ فِیْمَنْ قَالَ الْقُرْاٰنُ مَخْلُوْقٌ ، فَرَدَّ زِنْدِیْقٌ کَافِرٌ اُقْتُلُوْهُ ...... وَکَانَ یَقُوْلُ مَنْ قَالَ الْقُرْاٰنُ مَخْلُوْقٌ یُوْجَعُ ضَرْبًا وَ یُحْبَسُ حَتّٰی یَتُوْبَ

(مالک بن انس صفحہ ۱۰۷ عبد الحلیم الجندی مطبوعہ دار المعارف القاہرہ ۱۹۸۳ء)

یہ صرف فتویٰ نہ تھا بلکہ اس پر عمل بھی کیا گیا۔ مثلاً امام سمعون جو امام مالک کے بڑے مقرب شاگرد تھے اور مصر میں مالکی مذہب کے امام تھے۔ انہوں نے ابن ابی الجواد کو اتنے کوڑے مروائے کہ وہ مر گئے۔ الزام صرف یہ تھا وہ قرآن کریم کو مخلوق مانتے تھے۔ اسی الزام میں امام مالک کے شاگرد بہلول بن راشد کو کوڑے لگوائے گئے اور ان کے دوسرے شاگرد بھلول بن عمر الحبیبی جب فوت ہوئے تو ان کے جنازہ پر پتھراؤ کیا گیا اور ان کی نعش کو ایک وادی میں پھینکوا دیا گیا۔ (الاسلام و الحضارة العربیة جلد ۲ صفحہ ۷۸، ۷۹ محمد کرد علی مطبوعہ لجنة التالیف و الترجمة و النشر القاہرہ مصر طبع ثالث ۱۹۶۸ء)

اور نقل میں تضاد نظر آئے وہاں وہ عقل کو نظر انداز کر دیں گے اور نقل یعنی روایت کو تسلیم کر لیں گے بشرطیکہ اس کی سند صحیح ہو اور راوی ثقہ ہوں۔

معتزلہ عقل کی حکمرانی کے قائل ہیں نقل کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے جہاں انہیں بظاہر عقل اور نقل میں تضاد نظر آئے تو وہ نقل کی تاویل کریں گے یا نقل کو نظر انداز کر دیں گے خواہ سند کے لحاظ سے وہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو۔[1]

۳۔ سلفیہ

سلفیہ سے مراد اہل السنّت والجماعت کا وہ گروہ ہے جو اسلام یعنی صحابہؓ اور تابعین کے مسلک پر گامزن ہونے کا دعویدار ہے۔ اس گروہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ دین کے معاملہ میں وہ نئے نئے نظریات اور ان کی تشریحات میں نہیں پڑتے بلکہ ان سب سوالوں کو حوالہ بخدا کرتے ہیں جو مسائل دینیہ کے بارہ میں ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ سلفیہ تقلید کے بھی خلاف ہیں وہ فقہی مسائل میں کسی امام فقہ کی پیروی نہیں کرتے تاہم حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی آراء کو وہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں امام ابن تیمیہؒ اس مسلک کے بڑے سرگرم داعی تھے۔ موجودہ اہلحدیث جنہیں عوام وہابی کہتے ہیں اپنے آپ کو سلفیہ میں ہی شمار کرتے ہیں۔

دلائل کے مختلف انداز

سلفیہ دلائل کے اس انداز کے بھی خلاف ہیں جو قرآن وحدیث سے ماخوذ نہ ہو بلکہ عقلی اور فلسفی علوم پر اس کی بنیاد ہو۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ علماء متکلمین نے نظریات اور دینی مسلمات کے اثبات کے لئے بالعموم پانچ انداز اختیار کئے ہیں۔ فلاسفہ اسلام کا انداز۔ معتزلہ کا انداز۔ ماتریدیہ کا انداز۔ اشاعرہ کا انداز۔ سلفیہ کا انداز۔

فلاسفہ کا انداز یہ ہے کہ عقائد اور مافوق الطبعیہ مسلمات کے اثبات کی بنیاد برہان عقلی پر رکھی جائے کیونکہ یقین اسی طرح حاصل ہوتا ہے کہ عقل ان کی صحت کو تسلیم کرے۔ ان کے نزدیک قرآن کریم کا انداز خطابی ہے جس سے عوام تو مطمئن ہو سکتے ہیں لیکن اہل بصیرت کی اس سے تسلی

---

[1] تاریخ المذاهب الاسلامیة۔ صفحه ۲۳۸

نہیں ہوتی اس لئے عقلی دلیل کا تتبع ضروری ہے۔

معتزلہ کا انداز فلاسفہ کے انداز سے ملتا جلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقائد کے ادراک اور اثبات کے لئے براہین عقلی کی ضرورت ہے۔ تاہم قرآن کریم اور احادیث سے ان دلائل کی تائید حاصل کی جانی چاہیے لیکن جہاں نقل اور عقل میں اختلاف ہو وہاں عقل کو ترجیح ہوگی اور نقل کی تاویل کی جائے گی۔

ماتریدیہ کا انداز یہ ہے کہ عقائد کے اثبات اور ادارک کی بنیاد نقل یعنی قرآن کریم اور احادیث پر ہے تاہم ان کی تائید میں عقلی دلائل کی جستجو بھی ضروری ہے کیونکہ عقلی اطمینان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اشاعرہ کا انداز یہ ہے کہ عقائد کے اثبات کے لئے نقل یعنی قرآن و سنت کو اصل بنیاد بنایا جائے۔ اگر عقل کی تائید بھی حاصل ہوجائے تو چشم ماروشن دلِ ماشاد اور اگر عقلی دلائل کی تائید میسر نہ آسکے تو پرواہ نہیں۔ ترجیح بہر حال نقل کو حاصل ہے اور عقلی پہلو کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

سلفیہ کا انداز ان چاروں سے مختلف ہے ان کا کہنا ہے کہ عقائد کے اثبات کے لئے نقل کافی ہے یعنی جو کچھ قرآن و سنت میں آیا ہے اسی پر اکتفا کرنا چاہیے۔ فلسفی یا منطقی انداز بدعت ہے کیونکہ سلف صالحین نے یہ انداز اختیار نہیں کیا تھا اس لئے ہم بھی اس انداز کو اختیار نہیں کر سکتے۔

سلفیہ کی امتیازی خصوصیات

سلفیہ ان تمام اسماء، صفات اور احوال کو بلا تاویل درست مانتے ہیں جن کا ذکر قرآن کریم یا احادیث میں آیا ہے یہی وجہ ہے کہ سلفی خدا کے چہرہ، ہاتھ اور آنکھ اور اس کے **اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ** یا **نُزُوْلُ اِلَی السَّمَآءِ الْاَوَّلِ** ۔ اس کی محبت اس کے غضب وغیرہ کوائف کو کسی قسم کی تاویل کے بغیر ظاہر کے مطابق درست تسلیم کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں امام بن تیمیہؒ لکھتے ہیں۔ سلف صالحین کا مسلک ان احوال الٰہی کے بارہ میں تجسیم اور تمثیل کے بین بین ہے۔ وہ خدا کے چہرے اس کے ہاتھ اس کی آنکھوں اس کے فوق اور اس کے نزول وغیرہ کو بلا کیف مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں خدا نے اپنی جو صفات قرآن کریم میں

بیان کی ہیں یا اس کے رسولؐ نے ان کی جو تشریح اور توضیح کی ہے ہمیں اسی حد تک محدود رہنا چاہئے ۔ یہ کوشش کرنا کہ ان کی تاویل کی جائے اور اس کے لئے مجاز و استعارہ کا سہارا لیا جائے بے راہ روی کے مترادف ہے کیونکہ سلف صالحین میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ خدا آسمان پر نہیں ۔عرش پر نہیں اور نہ یہ کہا ہے کہ خدا نہ عالم ارضی میں داخل ہے اور نہ اس سے خارج ہے نہ متصل ہے نہ منفصل ، نہ اس کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے اور نہ وہ نظر آسکتا ہے یہ سب توجیہات بعد کی پیداوار اور بدعت ہیں ۔

دوسرے علماء اہل السنّت نے کہا ہے کہ سلفیہ کا یہ انداز فکر خدا کی تجسیم کو مستلزم ہے کیونکہ جب اس کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے تو پھر وہ جسم ہوا ۔ اسی طرح یہ کہنا کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا اس لئے خدا کا منہ بھی ہے ، دانت بھی ہیں ، جبڑے بھی ہیں ، آنکھیں بھی ہیں ، ہاتھ اور انگلیاں بھی ہیں سینہ ، ران ، پنڈلی اور پاؤں بھی ہیں تو پھر تجسیم میں کون سی کمی رہ گئی ۔ بھلا ان باتوں کی کون سی نقلی دلیل موجود ہے کہ یَد ، ساق ، وَجہ اور عَین وغیرہ کے الفاظ کا ظاہری مفہوم لیا جائے ۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ کلمات کا ایک طرح ہی استعمال نہیں ہوتا ۔ مجاز اور استعارہ کے رنگ میں بھی ان کا استعمال متداول اور متبادر ہے ۔ اس سلسلہ میں امام غزالی لکھتے ہیں کہ ایک لفظ کے اصلی اور مجازی دونوں معنوں سے ایک عربی نژاد آشنا ہوتا ہے ۔ مثلاً یَد کا ایک معنٰی تو انسان کا عضو ہے جو گوشت پوست ، ہڈی ، رگ وریشہ وغیرہ اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے اس کا طول بھی ہوتا ہے اور عرض بھی ۔ عُمق بھی ہوتا ہے اور حجم بھی ۔ اس لحاظ سے یَد جسم ہے ۔ یَد کے دوسرے معنٰی جس سے ہر عربی نژاد بلا کسی دقت اور ابہام کے واقف ہوتا ہے ۔ تسلط ، غلبہ ، طاقت ، گرفت اور قبضہ کے ہیں مثلاً جب کہا جائے کہ اَلْبَلْدَۃُ فِی یَدِالْاَمِیْرِ تو اس جملہ کا مفہوم سمجھنے میں کسی عربی دان کو کوئی مشکل پیش نہیں آتی ۔ یہاں تک کہ اگر امیر کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے بھی ہوں تب بھی یہ جملہ صحیح ہوگا اور یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ امیر کے تو ہاتھ ہی نہیں پھر شہر اس کے ہاتھ میں کیسے ہوسکتا ہے ۔ پس جب وضع اور مجاز کا اس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے اور اسے ہر زبان دان جانتا ہے تو پھر یہی طرز فکر اسماء الٰہی کے بارہ میں کیونکر ممنوع اور بدعت ہوسکتی ہے مثلاً جب اللہ نے فرمایا

یَدُاللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ [1]۔ تو وہاں موجود کسی عربی کے ذہن میں یہ بات نہ آئی ہوگی کہ خدا کا اس طرح کا ہاتھ ہے جس طرح ایک انسان کا ہوتا ہے بلکہ سب نے یہی سمجھا اور درست سمجھا کہ "یَدُ اللّٰہِ" سے اس جگہ مراد اس کی نصرت اور تائید ہے۔ یہ مراد نہیں کہ خدا کا کوئی ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھا تھا یا محمد صلی اللہ علیہ سلم کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ سما گیا تھا۔ بہرحال ہر زبان میں جہاں حقیقت اور وضعی معنویت ہوتی ہے وہاں مجاز اور استعارہ کا مفہوم بھی مروج اور سہل الفہم ہوتا ہے اور اہل زبان دونوں انداز کو جانتے اور پہچانتے ہیں اور کسی دقت کا انہیں سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ پس سلفیہ کا یہ انداز فکر درست نہیں بلکہ زبان کے اصول نہ سمجھنے کے مترادف ہے۔ سلفیہ توحید پر بھی بڑا زور دیتے ہیں اسی تشدد کی بناء پر وہ فوت شدہ بزرگان سے توسّل کرنا۔ ان کی قبروں کی زیارت کے لئے جانا اور وہاں جا کر اپنے لئے دعا کرنا ان کے خیال میں سب بدعات اور شرک سے قریب تر ہیں اس لئے ان سب باتوں سے بچنا چاہیے۔ خلاصہ یہ کہ سلفیہ اکثر کلامی مسائل میں اشاعرہ سے قریب تر ہیں جبکہ ماتریدیہ معتزلہ کے زیادہ قریب ہیں۔ [2]

صوفیاء

باطنی عرفان پر زور دینے والے اور اس کے لئے مختلف ریاضتیں کرنے والے صوفی کہلاتے ہیں جو صوفیاء اتباع سنت کو ہر حال میں ضروری سمجھتے ہیں وہ اہل السنّت والجماعت میں ہی شمار ہوتے ہیں۔ البتہ ان کا کہنا ہے کہ خشک دلائل دل میں محبت الٰہی پیدا نہیں کر سکتے اس لئے ظاہر کے ساتھ باطن کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ شرعی اعمال بجالانے میں خلوص، بے ریائی، خشوع وخضوع، محبت، تقرب اور توجہ الی اللہ کی تڑپ سے متصف ہونا دین کی اصل غرض ہے اور اس مقام کے حصول کے لئے خاص انداز کا ذکر اور فکر، مجاہدہ اور ریاضت، تبتل اور انقطاع مختلف قسم کے اَوراد اور وظائف کی ضرورت ہے اور یہ مقام کسی مقرب الٰہی کی شاگردی اور اس کی صحبت

---

[1] الفتح: ۱۱

[2] حوالہ جات کے لئے دیکھیں۔ المذاھب الاسلامیہ صفحہ ۲۲۰ تا ۲۸۲ تلخیص۔ الفرق بین الفرق صفحہ ۱۹۷ تا ۲۸۷ تلخیص۔ اعتقادات فرق المسلمین و المشرکین صفحہ ۶۶ تا ۷۴ تلخیص

میں رہے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا لیکن دوسرے مسلک کے علماء خاص طور پر سلفیہ کے اس انداز پر یہ اعتراض ہے کہ معرفت الٰہی اور محبت واخلاص میں صحابہؓ سے بڑھ کر کون ہوسکتا ہے۔انہوں نے تو اس قسم کے مجاہدے اور مراقبے نہیں کئے تھے اور ایسے اَوراد و وظائف کو دستور زندگی نہیں بنایا تھا اس لئے یہ سب باتیں سلف صالحین کے طریق کے خلاف اور بدعت ہیں۔پس پیر پرستی کے ایسے تصورات سے بچنا چاہیے اور قرآن وسنت کو اپنا دستور زندگی بنانا چاہیے۔

تاہم موجودہ زمانہ کے صوفیاء اور تصوف کے سلسلے خاص طور پر برصغیر ہند و پاک کی خانقاہی زندگی کے لیل ونہار ایسی بدعات عجیبہ سے بھرپور ہیں جن کا اتا پتا نہ سنت نبویؐ میں ملتا ہے اور نہ صحابہؓ کی زندگی میں نظر آتا ہے۔مثلاً قُل، چہلم اور عرس منانا، گیارھویں اور نذر ونیاز کی رسمیں بطورِ خاص مزارات کی زیارت کے لئے جانا، ان کے عرس پر جانا، اولیاء اللہ کی قبروں سے حاجات طلب کرنا، میلاد پڑھنا، سلام پڑھتے ہوئے یہ سمجھ کر اچانک کھڑے ہوجانا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لے آئے ہیں، اسی طرح آنحضرت ﷺ کو حاضر وناظر اور عالم الغیب جاننا۔یہ سب بدعات اس زمانہ کے تصوف کا حصہ بن گئی ہیں اور ان رسموں کا نام عشق رسول ﷺ اور محبت الٰہی رکھ دیا گیا ہے۔معرفت الٰہی اور عرفان ازلی کی بھلا یہ کون سی راہ ہے جس کی طرف قرآن وسنت میں اشارہ کیا گیا ہو۔

برصغیر پاک وہند میں زیادہ تر تصوف کے مندرجہ ذیل سلسلے زیادہ مشہور اور معروف ہیں۔

چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور قلندریہ۔

چشتیہ کے مشہور صوفیاء جو برصغیر پاک وہند میں معروف ہیں یہ ہیں۔

خواجہ فریدالدینؒ شکر گنج پاک پتنی، خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیری، خواجہ علی الہجویری المعروف بہ داتا گنج بخشؒ لاہوری، خواجہ نظام الدین اولیاء دہلویؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، خواجہ عثمان تونسویؒ، خواجہ غلام فرید چاچڑانوالےؒ۔

سہروردیہ کے مشہور بزرگ۔خواجہ بہاءالدین زکریا ملتانی۔خواجہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت اُچ شریف ضلع ملتان۔

قادریہ کے مشہور بزرگ خواجہ محی الدین سید عبدالقادر جیلانیؒ الملقلب بہ غوث اعظم۔
نقشبندیہ کے مشہور بزرگ خواجہ باقی باللہ دہلویؒ اور خواجہ شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندیؒ۔
قلندریہ کے مشہور بزرگ بوعلی قلندرؒ پانی پتی۔

معاشرت اور ثقافت۔ تمدن اور تفقُّہ کا ارتقاء

(مجتہدین دین)

عہد صحابہؓ [1] میں عرب کے علاوہ فارس، شام، فلسطین اور شمالی افریقہ کے بعض اہم حصے فتح ہو چکے تھے اور مسلمانوں نے ان علاقوں پر مضبوط کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ اس طرح جہاں مجاہدین اسلام مملکت کی وسعت اس کے استحکام اور اس میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے کوشاں تھے وہاں دوسری طرف صاحب علم صحابہؓ مملکت کے اندر اسلامی علوم کی بنیادوں کو وسیع اور مضبوط کرنے میں لگے ہوئے تھے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے فروغ کے لئے کوشاں تھے۔ چنانچہ جن صحابہؓ کے علمی اور ثقافتی کارناموں کو تاریخ نے محفوظ کیا ہے ان میں خلفاء اربعہؓ کے علاوہ حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ [2]، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے علاوہ امہات المومنین میں سے حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت ام سلمہؓ تفقُّہ اور تمدنی مسائل میں مجتہد کا درجہ رکھتے تھے۔ دوسری طرف حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو سعید الخدریؓ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ وغیرہ صحابہ احادیث اور تاریخی روایات کو محفوظ کرنے میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔

صحابہؓ کی علمی اور فقہی بنیاد قرآن کریم اور سنت نبوی تھی اور جن مسائل کی تصریح ان کو قرآن و سنت میں نہ ملتی اُن کے حل کے لئے وہ مصلحت اُمّہ کو سامنے رکھ کر اجتہاد اور رائے سے کام لیتے اور

---

[1] اَلصَّحَابِیُّ کُلُّ مُسْلِمٍ رَأَی النَّبِیَّ ﷺ وَ طَالَتْ صُحْبَتُہُ النَّبِیِّ ﷺ ......وَانْتَقَلَ النَّبِیُّ ﷺ اِلَی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی وَبِالْمَدِیْنَۃِ مِنَ الصَّحَابَۃِ کَثِیْرُوْنَ نَحْوَ عَشَرَۃُ آلافٍ. وَالْاَلْفَانِ الْآخَرَانِ تَفَرَّقَا فِی الْاَمْصَارِ ......وَقِیْلَ الصَّحَابِیُّ کُلُّ مُسْلِمٍ رَأَی النَّبِیَّ وَلَوْ سَاعَۃً اَوْ رَآہُ النَّبِیُّ وَلَوْ صَبِیًّا وَ بِھٰذَا التَّعْرِیْفِ کَانَ عَدَدُھُمْ عِنْدَ وَفَاتِہٖ مِائَۃَ اَلْفٍ وَّ اَرْبَعَۃً وَّ عِشْرِیْنَ اَلْفًا. مالک بن انس صفحہ ۱۲۹، الاسلام والحضارۃ العربیۃ جلد اوّل صفحہ ۱۵۱، بحوالہ تاریخ ابی الفداء

[2] ابن عمرؓ استاذ مدرسہ مدینہ، ابن عباس استاذ مدرسہ مکہ اور ابن مسعود استاذ مدرسہ کوفہ مانے گئے ہیں۔ مالک بن انس صفحہ ۲۰۹

اس کے لئے زیادہ تر اجتماعی مشورہ کا طریق اختیار کرتے۔

صحابہؓ کے بعد جن تابعین نے علمی خدمات سرانجام دیں ان میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے علاوہ مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ اور دوسرے علاقوں کے بعض سربرآوردہ اصحابِ علم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ سے مراد مندرجہ ذیل کبار تابعین ہیں۔

۱۔ حضرت سعید بن المسیبؒ (متوفی ۹۳ھ) یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے شاگرد اور حضرت ابوہریرہؓ کے داماد تھے۔ بڑے مشہور محدث اور ابن شہاب زہری اور ربیعۃ الرائے کے استاد مانے جاتے تھے۔

۲۔ حضرت ابوبکر بن عبیداللہ بن الحارثؒ (متوفی ۹۴ھ) یہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے شاگرد تھے اور مانے ہوئے فقیہ تھے۔

۳۔ حضرت عروہ بن زبیرؒ (متوفی ۹۴ھ) حضرت عائشہؓ کے بھانجے شاگرد اور گودیالک تھے۔

۴۔ حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیقؒ (متوفی ۱۰۸ھ) یہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بھتیجے، گودیالک اور شاگرد تھے۔ بڑے محدث اور صائب الرائے فقیہ مانے جاتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے بنوامیہ کی مخالفت اور ان کی طرف سے فساد کا ڈر نہ ہوتا تو میں اپنے بعد قاسم کو اپنا جانشین نامزد کرتا کیونکہ وہ ہر لحاظ سے اس مقام کے اہل ہیں۔[1]

۵۔ حضرت عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعودؒ (متوفی ۹۹ھ) یہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے استاد تھے۔

۶۔ حضرت سلیمان بن یسارؒ (متوفی ۱۰۰ھ) حضرت میمونہؓ کے مولیٰ حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد تھے۔ امہات المومنین میں سے حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت ام سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ سے بھی شرف تلمذ حاصل تھا۔

۷۔ حضرت خارجہ بن زید بن ثابتؓ (متوفی ۱۰۰ھ) اپنے والد کی طرح بڑے پائے

---

[1] محاضرات فی تاریخ المذاہب الفقہیہ۔ صفحہ ۲۲۰

کے فقیہ اور مجتہد تھے اپنے باپ سے ہی علم حاصل کیا تھا۔ مسائل وراثت اور تقسیم اراضی کے کام کے ماہر اور مرجع الناس تھے اور اپنے والد کی طرح میدان علم کے شناور تھے۔

ان فقہائے سبعہ کے علم کو ابن شہاب زُہری، ربیعۃ الرائے اور بعض اور علماء مدینہ نے عام کیا۔ ابن شہاب زہری اور ربیعۃ الرائے تو حضرت امام مالکؒ کے خاص استاد تھے۔ ان کے علاوہ سالم بن عبداللہ بن عمرؓ، یحییٰ بن سعید انصاری بھی مدینہ منورہ کے سربرآوردہ فقہا میں شمار ہوتے تھے۔

حدیث اور فقہ کے لحاظ سے مکہ میں عطاء بن ابی رباح، عراق اور کوفہ میں ابراہیم نخعی، علقمہ مولیٰ ابن عباسؓ، حماد بن ابی سلیمان اور امام شعبی بڑے پائے کے محدث اور فقیہ سمجھے جاتے تھے۔ حماد تو امام ابوحنیفہ کے خاص استاد تھے انہی سے آپ نے علم فقہ کی تربیت پائی تھی۔ شام کے علاقہ میں امام اوزاعی۔ بصرہ میں حضرت حسن بصری اور یمن میں طاؤس بن کیسان کا شمار بھی خاص علماء اور کبار تابعین میں ہوتا تھا۔

تابعین کے زمانہ میں قرآن وسنت کے علاوہ اقوال صحابہؓ اور اجماع کو بھی بالعموم شرعی ماخذ کے طور پر تسلیم کرلیا گیا تھا۔ غرض ان بزرگوں کی کوششوں سے اسلامی تہذیب وتمدن اور علم وفقہ کی رفتار تیزی سے بڑھنے لگی۔

موالی اور خدمت علم

یہی وہ دور ہے جس میں تمدنی اور علمی لحاظ سے معاشرہ میں مسلم موالی کا اثر ورسوخ بھی بڑھا۔ موالی سے مراد وہ عجمی عناصر تھے جو مختلف جنگوں میں قید ہوئے۔ پھر آزاد اور مسلمان ہوکر عربوں میں رچ بس گئے یا کسی عرب کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے اور اس کی حمایت کے اندر آگئے یا کسی عرب قبیلہ سے عقد موالات باندھ کر باہمی مناصرت اور ایک دوسرے کی مدد کے معاہدہ میں آگئے اور اس طرح مسلم معاشرہ کا حصہ بن گئے۔ اس دور میں عربوں کی اکثریت وسیع اسلامی مملکت کی حفاظت اور ملک میں امن وامان قائم کرنے کی انتظامی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھی۔ اس لئے علمی اور تدریسی خدمات کی طرف وہ بہت کم توجہ دے سکے۔ اس کے بالمقابل ذہین موالی نے اس خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کیا اور ذہنی اور علمی جدوجہد کے خوب جوہر دکھائے۔ اس وقت

علمی میدان میں موالی کا اثر ورسوخ کس قدر وسیع تھا اُس کا اندازہ اس مکالمہ سے ہوتا ہے جو بنوامیہ کے چوتھے خلیفہ عبدالملک بن مروان اور مشہور محدث ابن شہاب زہری کے درمیان ہوا۔[1]

ایک دفعہ امام زہری عبدالملک کے دربار میں گئے۔ عبدالملک نے برسبیل تذکرہ باتوں میں امام زہری سے پوچھا:۔

عبدالملک ۔اس وقت مکہ مکرمہ میں استاد العلماء اور سب سے بڑا عالم کون سمجھا جاتا ہے؟

زہری ۔عطاء بن ابی رباح۔

ع۔یہ مولیٰ ہے یا عرب؟

ز۔مولیٰ ہے۔

ع۔اس نے یہ مقام کیسے حاصل کیا؟

ز۔قرآن وسنت کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینے کی وجہ سے۔

ع۔یمن میں اس وقت کے لحاظ سے کسے شہرت حاصل ہے اور کسے استاذ العلماء سمجھا جاتا ہے؟

ز۔طاؤس بن کیسان بڑے مقبول ہیں۔

ع۔عرب ہے یا مولیٰ؟

ز۔مولیٰ ہے۔

ع۔مصر میں اس وقت سب سے بڑا عالم اور استاذ العلماء کسے سمجھا جاتا ہے؟

ز۔یزید بن حبیب

ع۔عرب ہے یا مولیٰ؟

ز۔مولیٰ ہے۔

ع۔یہ بتاؤ کہ شام میں کون امام اور استاذ العلماء ہے؟

ز۔مکحول۔

ع۔عرب ہے یا مولیٰ؟

ز۔مولیٰ ہے۔

---

[1] بعض نے لکھا ہے کہ یہ مکالمہ زہری اور ہشام بن عبدالملک کے درمیان ہوا۔ ابوحنیفہ صفحہ ۲۵

ع۔جزیرے اور بحرین کا کون امام ہے؟

ز۔مامون بن مہران۔

ع۔عرب ہے یا مولیٰ؟

ز۔مولیٰ ہے۔

ع۔خراسان کا امام اور استاذ العلماء کسے سمجھا جاتا ہے؟

ز۔ضَحَّاک بن مزاحم۔

ع۔عرب ہے یا مولیٰ؟

ز۔مولیٰ۔

ع۔بصرہ کا امام الناس کسے سمجھا جاتا ہے؟

ز۔حسن بصری

ع۔عرب ہے یا مولیٰ؟

ز۔مولیٰ

عبدالملک جھنجھلا کر چیخ اٹھا بس مولیٰ مولیٰ ہی کی رٹ لگائی ہوئی ہے کیا کوئی عرب امامت علم کے مقام پر نہیں؟ اچھا یہ بتاؤ کہ مدینہ منورہ اور کوفہ کے امام الناس اور استاذ العلماء کون ہیں؟

زہری نے جواب دیا مدینہ کے سعید بن المسیب اور کوفہ کے ابراہیم نخعی اور دونوں عرب ہیں۔

عبدالملک بے اختیار چلایا الحمدللہ کہیں تو عربوں کی علمی امامت بھی ہے اگر اب بھی تو کسی مولیٰ کا نام لیتا تو شاید غم سے میرا کلیجہ پھٹ جاتا۔

پھر عبدالملک نے حاضرین دربار سے مخاطب ہو کر کہا وہ زمانہ قریب ہے کہ جبکہ موالی رشد وہدایت کی مسند پر سرفراز ہوں گے اور عرب ان کے قدموں میں فرش پر بیٹھے ان کا خطاب سن رہے ہوں گے۔

امام زُہری نے عبدالملک کی جھنجھلاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے بڑے ادب سے کہا۔امیر المومنین! یہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے جو بھی دین کی خدمت کے لئے کمر بستہ ہوگا خواہ وہ عربی ہو یا عجمی وہی دین

کا امام اور لوگوں کا مقبول استاد ہوگا اور دوسرے اس کے پیچھے چلنے والے ہوں گے۔[۱]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت علیؓ کی طرف سے بصرہ کے والی تھے جب بھی امام الجزیرہ میمون بن مہران کے بھائی محدث ابو العالیہ رفیع بن مہران اُن سے ملنے آتے تو وہ ان کو اپنے پاس مسند پر بٹھاتے جبکہ سرداران عرب فرش پر بیٹھے ہوئے ہوتے تھے۔ آپ فرماتے۔ **هٰكَذَا الْعِلْمُ يَزِيْدُ الشَّرِيْفَ شَرَفًا**۔[۲]

حضرت حسن بصریؒ اور حضرت محمد بن سیرینؒ بھی موالی میں سے تھے اور اپنے علم وزہد کی وجہ سے سید العلماء سمجھے جاتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک کے والد مولیٰ اور مَرو کے رہنے والے تھے۔[۳] ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مبارک رقہ آئے۔ ہارون الرشید بھی ان دنوں وہاں تھا۔ حضرت عبداللہ کے استقبال کے لئے ایک دنیا ٹوٹ پڑی۔ اتنی بھیڑ تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ ہارون کی بیوی نے یہ دیکھ کر کہا خدا کی قسم! استقبال اسے کہتے ہیں حکومت اس کا نام ہے نہ کہ ہارون الرشید کی حکومت جس کے استقبال کے لئے لوگوں کو پولیس اور افسران حکومت کی مدد سے اکٹھا کیا جاتا ہے۔[۴]

تبع تابعین کے دور میں علوم دینیہ کی تدوین کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ خاص طور پر حدیث اور فقہ کی تدوین کا آغاز اسی دور میں ہوا اور اسی زمانہ میں فقہ کے مشہور ائمہ اور ان کے قابل شاگردوں نے تہذیب وتمدن کے استحکام کے لئے قانونی نظام کو مرتب کرنے کی طرف توجہ مبذول کی اور سلسلہ تصانیف کی ابتدا ہوئی۔ معاشرتی اور عائلی مسائل کے لئے احکام شریعت کو واضح شکل دینے کی کوشش کی گئی۔[۵]

۱۔ مقدمة ابن الصلاح صفحه ۱۹۹، النوع الرابع والستون، معرفة الموالی من الرواة والعلماء، معرفة علوم الحديث للحاكم صفحه ۱۹۸

۲۔ تذكرة الحفاظ للذهبي صفحه ۱۲۰

۳۔ كَانَ أَبُوْ عَبْدِاللّٰهِ تُرْكِيًّا وَّ أُمُّهُ خَوَارِزْمِيَّةٌ (ابو حنيفة صفحه ۱۱۵)

۴۔ سير اعلام النبلاء جلد ۸ صفحه ۳۸۷۔ تاريخ بغداد للخطيب جلد ۱۰ صفحہ ۱۵۶

۵۔ بَدَأَ تَدْوِيْنُ الْفِقْهِ عَلٰى نِطَاقٍ وَاسِعٍ بِعَمَلِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ وَ عَلٰى نِطَاقٍ ضَيِّقٍ فِيْ مُؤَطَّا مَالِكٍ فِي النِّصْفِ الْأَوَّلِ مِنَ الْقَرْنِ الثَّانِيْ. (الامام الشافعي صفحه ۹۲)

مسلمان اور سیاسی مسائل

تاہم سیاسی مسائل کے حل کے لئے اس زمانہ کے مسلم علماء کوئی مؤثر نظام ترتیب نہ دے سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضورؐ کے تربیت یافتہ صحابہؓ نے انتخابی طرز حکومت کا آغاز کیا تھا اور اس کی بنیاد پر خلافت راشدہ کا دور شروع ہوا لیکن چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْھَہٗ کی شہادت کے بعد نہ یہ اصول انتخاب باقی رہا نہ صحیح انتخاب کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے عوام کی تربیت کا کوئی بہتر اور نتیجہ خیز نظام جاری ہوا اور نہ کوئی مؤثر ادارہ انتخاب تشکیل پا سکا۔ شیعہ ذہن رکھنے والے حضرات نے قدیم ایرانی اثرات کے تحت ولایت مسلمین کے لئے وراثت اور قدامت کا نظریہ پیش کیا اور کہا کہ خلافت کا حق وراثتاً اہل بیت رسولؐ کو پہنچتا ہے۔ کسی دوسرے کے لئے یہ حق نہ تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی کے انتخاب کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اسی رجحان کے فروغ سے بنو اُمیہ نے فائدہ اٹھایا اور پرانے شاہی وراثتی نظام حکومت کے رواج کو اختیار کیا جس کے لئے تَغَلُّب، استحصال اور ظلم و استبداد ضروری ہے۔ چنانچہ ظلم و ستم کے ہر اُس ذریعہ کو کام میں لایا گیا جس سے ان کے تسلط اور اقتدار کو استحکام مل سکتا تھا۔

بنو اُمیہ کے بعد بنو عباس بھی اِسی طرز حکومت پر عمل پیرا رہے۔ فقہاء اسلام اور علماء سیاست کے نزدیک اگرچہ علمی لحاظ سے خلافت راشدہ کا انتخابی طریق ہی صحیح اصل تھا لیکن چونکہ حالات کی ستم ظریفی کی وجہ سے تغلب اور استبداد کا عجمی طریق مستحکم ہو چکا تھا اور انتخاب کے تقاضوں کے مطابق عوام کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ اس لئے امت کی مجموعی مصلحت اور فتنہ و فساد اور خون ریزی سے بچنے کے لئے بحالت مجبوری علماء نے تغلب اور توارث کے اصول حکمرانی کے جواز کا فتویٰ دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک قائم شدہ حکومت کے خلاف علاقائی بغاوتوں میں حصہ لینا درست نہیں۔ اس سے امن و امان برباد ہوتا ہے۔ فتنہ و فساد کو فروغ ملتا ہے تباہی اور بربادی کا ایک تسلسل جاری ہو جاتا ہے۔[1] تمدنی اور علمی ترقی رک جاتی ہے ذہنی جمود اور مایوسی کی فضا پیدا

---

[1] چنانچہ علماء نے لکھا ہے "الفتن یحدث فیھا مظالم لا تحصیٰ اذ تعم الفوضٰی وَ فَوْضٰی ساعۃٍ تسکب فیھا من المظالم ما لا یُرْتَکَبُ فی استبداد سنین" (محاضرات فی تاریخ المذاھب الفقھیہ صفحہ ۲۲۰)

ہو جاتی ہے۔[1] اس لئے عام ملکی قانون میں حکام وقت کی اطاعت کرنی چاہیے۔

اسی طرح یہ بھی جائز سمجھا گیا کہ عام فقہاء اور علماء ایسی حکومت کے مناصب قبول کر سکتے ہیں تا کہ وہ عوام کی مناسب مدد کر سکیں اور ممکن حد تک انہیں انصاف میسر آ سکے ورنہ تو وہ مناصب لالچی، ظالم اور خدا ناترس امراء قبول کر لیں گے جس کی وجہ سے عوام کے حقوق اور زیادہ تلف ہوں گے اور ان کی تباہی اور بربادی میں مزید اضافہ ہوگا۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ اگر چہ بنو امیہ اور بنو عباس کی حکومت کو پسند نہیں کرتے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ علوی خاندان کے متقی اور بزرگ افراد کو یہ منصب ملے لیکن اس کے باوجود آپ نے کسی شورش میں عملی حصہ نہیں لیا۔ حکومت کے مناصب کو بوجوہ خود تو قبول نہیں کیا لیکن ان علماء اور فقہاء کی کبھی تنقیص بھی نہیں کی جو حکومت کے مختلف مناصب پر فائز تھے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے شاگردوں کو اس غرض کے لئے تیار کیا کہ وہ حکومت کی مختلف اہم ذمہ واریاں قبول کر سکیں۔ یہی حال حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کا تھا۔ ان بزرگوں نے کبھی کسی شورش میں عملی حصہ نہیں لیا۔ اگر چہ حکومت کی کسی ذمہ واری کو بھی قبول نہیں کیا لیکن حکومتی مناصب قبول کرنے کے خلاف کوئی فتویٰ بھی نہیں دیا۔

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سوال کیا گیا کہ فتنہ بپا کرنے والوں سے آپ لڑتے کیوں نہیں حالانکہ خدا کا حکم ہے کہ فتنہ کی روک تھام کے لئے تم جنگ کرو۔[2] آپ نے جواب دیا ہم نے فتنہ مٹانے اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے بہت سی جنگیں لڑیں لیکن تم فتنہ پیدا کرنے کے لئے اور اس کو ہوا دینے کے لئے شورش بپا کئے ہوئے ہو اور اس بات کے لئے کوشاں ہو کہ اللہ کے دین کی بجائے کسی اور دین کسی اور کی اطاعت کو فروغ ملے۔[3]

روایات میں آتا ہے کہ حضرت امام مالک خلفاء عباسیہ اور ان کے مقرر کردہ حکام کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے اعتراض کیا کہ آپ خلفاء اور امراء کے پاس آتے جاتے ہیں

---

[1] ان رأی اکثر العلماء و علٰی رأسھم مالک ان الحاکم الظالم لا یصحُّ الخروج علیه ولکن یسعیٰ فی تغییره ...... من غیر فتنةٍ و لا انتقاضٍ لِاَنَّهٗ فی ضَجَّةِ الفتن لا یسمع قول الحق (نفس المصدر)

[2] وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (البقرة: ۱۹۴ و الانفال: ۴۰)

[3] وَ اَنْتُمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّكُوْنَ الدِّيْنُ لِغَيْرِ اللّٰهِ (مالک بن انس صفحہ ۲۴۵)

اوران سے تعلقات رکھتے ہیں تو آپ نے جواب دیا رَحِمَکَ اللّٰہُ وَاَیْنَ التَّکَلُّمُ بِالْحَقِّ۔ خدا تجھ پر رحم کرے اگر میں ایسا نہ کروں تو کہاں جا کر ان کے سامنے کلمۂ حق کہوں اور فرمانِ رسول کے مطابق اَفْضَلُ الْجِهَادِ کَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ کا فریضہ سرانجام دوں[1]۔

تاریخ گواہ ہے کہ اس زمانہ کے امراء کے سامنے کلمۂ حق کہنے میں یہ بزرگ شمشیر برہنہ تھے۔ خلفاء عباسیہ بیعت لیتے وقت لوگوں کو طرح طرح کی قسمیں دے کر ان سے عہد لیا کرتے تھے کہ وہ بیعت نہیں توڑیں گے۔ ان قسموں میں ایک قسم یہ بھی تھی کہ اگر میں بیعت توڑوں تو میری ساری بیویوں کو تین طلاقیں اور آئندہ تمیں سال تک جس عورت سے بھی نکاح کروں اسے بھی تین طلاق ہوں۔ اس قسم کی لی گئی جبری قسموں کے بارہ میں امام مالک کا نظریہ یہ تھا کہ جبری طلاق واقعہ نہیں ہوتی اس وجہ سے مدینہ کے عباسی والی نے آپ کو گرفتار کرلیا۔ کوڑے لگوائے اور اتنی سختی کی کہ آپ کے کاندھے اتر گئے جس کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے آپ کے ہاتھ بیکار ہوگئے۔ آپ انہیں نہ اوپر اٹھا سکتے تھے اور نہ چادر اوڑھ سکتے تھے۔ اسی پر بس نہیں کی گئی بلکہ آپ کو رسوا کرنے کے لئے اونٹ پر سوار کرکے مدینہ کی گلیوں میں پھرایا گیا۔ اس حالت میں بھی اونٹ پر سوار آپ بلند آواز سے کہتے جاتے تھے۔ اَلَا مَنْ عَرَفَنِیْ فَقَدْ عَرَفَنِیْ وَمَنْ لَمْ یَعْرِفْنِیْ فَاَنَا مَالِکُ بْنُ اَنَسِ بْنِ اَبِیْ عَامِرٍ الْاَصْبَحِی وَاَنَا اَقُوْلُ طَلَاقُ الْمُکْرَہِ لَیْسَ بِشَیْءٍ[2] لوگو! پہچان لو میں مالک بن انس ہوں اور علی الاعلان کہتا ہوں کہ جبر سے لی گئی طلاق کچھ بھی نہیں ہے وہ بے اثر اور لغو ہے۔[3]

علماء نے وضاحت کی ہے کہ امام مالک کا یہ موقف اس بنا پر نہیں تھا کہ آپ قائم شدہ حکومت کے خلاف بغاوت کو جائز سمجھتے تھے بلکہ آپ کے نزدیک یہ ایک شرعی مسئلہ تھا جس کو آپ صحیح سمجھتے تھے اور اس کے اظہار کو اپنا حق جانتے تھے۔[4] آپ کا یہی صدق و ثبات تھا کہ خلفاء عباسیہ

---

[1] مالک بن انس صفحہ ۲۵۵ [2] مالک بن انس صفحہ ۲۳۸

[3] اس واقعہ کی کچھ مزید تفصیل حضرت امام مالک کے سوانح میں بھی آرہی ہے۔

[4] فَمَا لِکٌ لَا یَرَی الْخُرُوْجَ عَلَی الْاِمَامِ الْجَائِرِ کَمَا یَرَی الْخَوَارِجُ وَلَا یَرَی سَلَّ السَّیْفِ فِیْ سَبِیْلِ الْاَمْرِ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْکَرِ کَمَا یَرَی الْمُعْتَزِلَةُ وَمَالِکٌ یَسُدُّ الذَّرَائِعَ اِلَی الْفِتْنَةِ وَیَرَی اَنَّ الدُّنْیَا یَصْلُحُهَا السَّلَامُ (اَیْ اَلْاَ مَنُ) (مالک بن انس صفحہ ۲۴۵)

اس زمانہ کے سربرآوردہ علماء سے تعلقات استوار کرنے کو غنیمت جانتے تھے اور اس بات کے لئے کوشاں رہتے کہ ان کی خوشنودی حاصل رہے۔

چنانچہ امام مالک کی روایت ہے کہ ایک دفعہ عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے آپ کو بلا بھجوایا آپ نے سمجھا ضرور کوئی شکایت ہوئی ہے اور خیر نہیں۔ آپ جب منصور کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ منصور کے ہاتھ میں تلوار ہے اور وہ غضب سے بھرا بیٹھا ہے وہاں مدینہ کے دو اور سربرآوردہ عالم بھی بیٹھے ہیں۔ ایک ابن سمعان اور دوسرے ابن ابی ذؤیب۔ بہرحال سلام دعا کے بعد منصور نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے شکایت کی۔ ''**یَا مَعْشَرَ الْفُقَهَاءِ کُنْتُمْ اَحَقَّ النَّاسِ بِالْکَفِّ مِنْ اَلْسِنَتِکُمْ**'' اے فقہاء مدینہ مجھے امید تھی کہ تم سمجھ سے کام لو گے اور معاملات حکومت کے بارہ میں خاموشی اختیار کرو گے لیکن مجھے برابر شکایتیں پہنچ رہی ہیں کہ تم ہمارے خلاف نکتہ چینی کرتے ہو۔ امام مالک کہتے ہیں کہ میں نے جواباً عرض کیا امیر المومنین! اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ اے مومنو! جب کوئی فاسق تم تک کوئی بات پہنچائے تو اسے سچ ماننے سے پہلے تحقیق کر لیا کرو۔ ابوجعفر منصور نے کہا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ **اَیُّ الرِّجَالِ اَنَا اَمِنْ اَئِمَّةِ الْعَدْلِ اَمْ مِنْ اَئِمَّةِ الْجَوْرِ**۔ میں کیسا امام ہوں، عادل ہوں یا ظالم۔ امام مالک کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا امیر المومنین! میں آپ کو اللہ اور رسول کا واسطہ دیتا ہوں کہ مجھے اس سوال کے جواب سے معذور سمجھا جائے۔ منصور نے جواب دیا اچھا آپ کو معاف کرتا ہوں۔

پھر ابن سمعان سے یہی سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا آپ بہت اچھے ہیں۔ بیت اللہ کا حج کرتے ہیں۔ دشمنان اسلام سے جہاد کرتے ہیں۔ آپ ملک میں امن و امان قائم کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ آپ کی وجہ سے کمزور زیر دست کی زیادتیوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

پھر منصور نے ابن ابی ذؤیب سے یہی سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا خدا کی قسم تم بدترین انسان ہو۔ اللہ تعالیٰ کے مال پر قبضہ کر کے بیٹھے ہو، لوگوں کو اُن کے حقوق نہیں دیتے تم کمزوروں کو تباہ کر رہے ہو اور جو کچھ طاقت رکھتے ہیں ان پر بوجھ بنے ہوئے ہو۔ ان سے ان کے اموال چھین لیتے ہو۔ منصور یہ سن کر غصہ سے چیخ پڑا اور کہا تیرا ستیاناس ہو۔ جانتے ہو کس سے بات کر رہے ہو۔

ابن ابی ذوٴیب نے جواب دیا جانتا ہوں اور سامنے دیکھ رہا ہوں کہ تلوار میری گردن اڑانے کے لئے بے چین ہے اور موت نے تو آنا ہے جلد آئے تو بہتر ہے۔ عَاجِلُهٗ خَیْرٌ مِّنْ آجِلِهٖ ۔اس پر منصور کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور ہم سب بخیریت واپس آ گئے ۔ دوسری صبح منصور نے اپنے ایک افسر کو دیناروں سے بھری ہوئی تین تھیلیاں دیں اور کہا کل جو عالم یہاں آئے تھے ان کے پاس جاؤ اور ہر ایک کو ایک ایک تھیلی دو۔ اگر ابن ابی ذوٴیب دینار کی تھیلی قبول کر لے تو اس کا سر کاٹ کر میرے پاس لے آؤ اور اگر نہ لے تو پھر اسے کچھ نہ کہو۔ ابن سمعان اگر دینار کی تھیلی لے لے تو اسے کچھ نہ کہو اور اگر نہ لے تو اس کی گردن اڑا دو ۔ رہا مالک وہ لے یا نہ لے اس سے تعرض نہ کرو۔ چنانچہ ابن ابی ذوٴیب نے تھیلی قبول نہ کی ۔ ابن سمعان نے قبول کر لی اور کہا کہ مجھے بھی رقم کی ضرورت تھی چنانچہ میں نے رکھ لی ۔ بہر حال وہ دونوں علماء منصور کے امتحان میں کامیاب رہے اور جو کچھ ان کے دل میں تھا وہی ان سے ظاہر ہوا۔ اس طرح تینوں کی جانیں بچ گئیں ۔[1]

انہی ابن ابی ذوٴیب کا واقعہ ہے کہ یہ منصور کے دربار میں بیٹھے تھے ۔ کچھ لوگوں نے حاکم مدینہ حسن بن زید کی شکایت کی کہ بہت ظلم کرتا ہے ۔ حسن بھی وہاں موجود تھا۔ منصور نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے عرض کیا امیر المومنین آپ ابن ابی ذوٴیب سے پوچھ سکتے ہیں کہ یہ کیسے لوگ ہیں ۔ ابن ابی ذوٴیب نے پوچھنے پر بتایا کہ یہ لوگ بڑے شریر ہیں دوسروں کی بے عزتی کرنے سے ذرا بھی نہیں جھجکتے ۔ ان لوگوں نے جواباً کہا کہ آپ حسن کے بارہ میں انہی سے پوچھ لیں ۔ منصور کے پوچھنے پر ابن ابی ذوٴیب نے کہا حسن بھی کچھ کم ظالم نہیں ۔ عدل کے خلاف کرنے میں شیر ہے ۔ حسن نے یہ سن کر عرض کیا امیر المومنین اپنے بارہ میں بھی ان سے پوچھ لیں کہ یہ آپ کے بارہ میں کیا رائے رکھتے ہیں ۔ (مطلب یہ کہ تاریک پہلو پر ان کی نظر ٹکی رہتی ہے) منصور نے اصرار کیا کہ ضرور بتایئے اس پر انہوں نے کہا اللہ نے جو امانت آپ کے سپرد کی ہے اس کا حق ادا نہیں کرتے اور لوگوں کے اموال میں ناجائز تصرف کرتے ہیں ۔ پاس بیٹھے لوگوں نے سمجھا اب اس کی خیر نہیں ابھی اس کی گردن اڑی لیکن ایسا نہ ہوا ۔ منصور اٹھا ابن ابی ذوٴیب کی پیچھے سے گردن پکڑی اور کہا اگر میں اپنا رعب قائم نہ رکھوں تو عجمی لوگ آپ سب کو چیر پھاڑ دیں ۔ یہ تم عربوں کی ناک

[1] مالک بن انس صفحہ ۲۴۹

میں ہیں اس پر ابن ابی ذویب نے کہا کہ میرا مقصد بھی امیر المومنین کی خیر خواہی ہے آپ کی بھلائی ہی میرا مدعا ہے۔ میں کسی کینہ یا غصہ کی بنا پر یہ تلخ تنقید نہیں کر رہا۔[1]

امام مالک کا ہی بیان ہے کہ ایک دفعہ ابوجعفر منصور نے انہیں اور عبیداللہ بن طاؤس کو بلوایا۔ عبیداللہ ابھی جوان تھے بڑے وجیہ اور خوبصورت شخصیت کے مالک تھے اور ان کے والد طاؤس حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد رہ چکے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ ابوجعفر منصور کے پڑ دادا تھے۔ بہر حال منصور نے اس تعلق کی بنا پر عبیداللہ سے پوچھا کہ آپ کو اپنے والد کی کوئی حدیث یاد ہے جو انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے سنی ہو۔ عبیداللہ نے جواب دیا کہ آپ کے جدامجدؓ نے میرے والد کو یہ حدیث سنائی تھی کہ "قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب اس شخص کو ہوگا جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکومت میں شریک کیا لیکن اس نے بجائے عدل وانصاف کے ظلم و جور کو رواج دیا اور لوگوں کو اپنی زیادتیوں کا نشانہ بنایا۔"

امام مالک کہتے ہیں کہ میں نے سمجھا کہ عبیداللہ نے ایسی بات کہی ہے کہ منصور ابھی غصہ میں آکر اس کی گردن اڑا دے گا اور اس کے خون کے چھینٹے میرے کپڑوں پر پڑیں گے۔ اس لئے میں اپنے کپڑوں کو سراسیمگی کے مارے سمیٹنے لگا لیکن منصور عبیداللہ کی تلخ بات کو پی گیا اور یہ حادثہ نہ ہوا۔ بات بدلنے کے لئے منصور نے عبیداللہ سے کہا وہ دوات مجھے پکڑاؤ لیکن عبیداللہ نے دوات نہ پکڑائی۔ منصور نے وجہ پوچھی تو عبیداللہ نے کہا۔ مجھے خدشہ ہے کہ تم کوئی ایسا حکم لکھو گے جو گناہ یا ظلم کا موجب ہوگا اور میں نہیں چاہتا کہ گناہ میں ذرا بھی میری شرکت ہو۔[2]

ایک دفعہ سفیان ثوری ابوجعفر منصور سے ملنے گئے دوران گفتگو آپ نے کسی بات پر منصور سے کہا آپ اللہ سے ڈریں۔ ظلم و جور سے زمین بھر گئی ہے۔ منصور آپ کی اس تلخ بات کو پی گیا کچھ دیر کے لئے سر جھکا کر بیٹھا رہا پھر سر اٹھایا اور پوچھا آپ کی کوئی ضرورت ہو تو بتایئے۔ انہوں نے کہا آپ کو یہ مقام مہاجرین اور انصار کی قربانیوں کے طفیل ملا ہے اور اب ان کی اولاد مدینہ میں فاقوں مر رہی ہے کیونکہ آپ نے انہیں سبق سکھانے کے لئے مدینہ میں غلہ بھجوانے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ منصور نے تھوڑی دیر کے لئے پھر سر جھکایا پھر کہا آپ کی اگر کوئی ضرورت ہو تو بتایئے۔ آپ

---

[1] الامام شافعی ۱۸۸ [2] مالک بن انس صفحہ ۲۵۱

نے جواب میں کہا حضرت عمرؓ حج کے لئے گئے تو ان کا کل خرچ دس پندرہ درہم تھا اور آپ اس غرض کے لئے آئے تو اس قدر سامان آسائش ساتھ لائے ہیں کہ کئی اونٹ بھی اسے نہیں اٹھا سکتے۔ یہ کہہ کر آپ دربار سے اٹھ آئے۔[1]

ایک دفعہ ابوجعفر منصور نے حضرت امام جعفر صادق سے کہا۔ اہل مدینہ کی مخالفت سے میں تنگ آگیا ہوں۔ وہ بار بار دوسروں کے بہکاوے میں آکر بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اس لئے چاہتا ہوں کہ سارے شہر کو لوٹ لوں اور ان کے باغوں کو آگ لگا دوں اور سمندر کے راستہ ان تک غلہ نہ پہنچنے دوں۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا۔ امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے سلیمانؑ کو حکومت دی تو وہ شکر بجالائے۔ ایوبؑ مشکلات سے دوچار ہوئے تو انہوں نے صبر کا نمونہ دکھایا۔ یوسفؑ کو جب اقتدار ملا تو آپ نے زیادتی کرنے والے بھائیوں کو معاف کر دیا۔ آپ کا تعلق بھی انہی بزرگوں کی نسل سے ہے جو معاف کرنے والے اور درگذر کرنے والے تھے۔ انہی کا نمونہ اختیار کیجئے۔[2]

بنوامیہ پر جب بنوعباس غالب آئے تو خلیفہ عباسی کے چچا عبداللہ بن علی نے شام کے عالم حضرت امام اوزاعی سے پوچھا بنوامیہ کے قتل کے بارہ میں شریعت کیا کہتی ہے۔ انہوں نے جواب دیا۔ آپ نے انہیں امان دی ہے اور آپ کی زبان پر بھروسہ کر کے انہوں نے اپنے آپ کو تمہارے سپرد کیا ہے اس لئے اُن کا خون بہانا آپ کے لئے جائز نہیں۔[3] پھر اس نے پوچھا کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے حق میں وصیت نہیں کی تھی۔ آپ نے جواب دیا اگر وصیت کی ہوتی تو حضرت علیؓ جنگ صفین میں تحکیم کی تجویز ہرگز قبول نہ کرتے۔[4]

اسی طرح حضرت امام ابوحنیفہؒ کے بارہ میں روایت ہے کہ انہوں نے اپنے شاگرد رشید امام ابو یوسف کو نصیحت کرتے ہوئے کہا اگر تم سلطان وقت میں کوئی خلاف شرع بات دیکھو یا اس کے

---

1. مالک بن انس صفحہ ۲۴۳
2. قَدْ جَعَلَکَ اللّٰهُ مِنْ نَسْلِ الَّذِیْنَ یَعْفُوْنَ وَ یَصْفَحُوْنَ۔ (مالک بن انس صفحہ ۲۴۲)
3. دِمَائُھُمْ حَرَامٌ عَلَیْکَ.......... (مالک بن انس صفحہ ۲۲۵)
4. لَوْ اَوْصٰی اِلَیْهِ مَا حَکَّمَ الْحَکَمَیْنِ ۔ (مالک بن انس صفحہ ۲۲۵)

ظلم وستم کی تم کو خبر ملے تو بڑے حکیمانہ انداز میں موقع ومحل کو دیکھ کر اور اطاعت کے دائرہ میں رہ کر پوری جرأت اور بے خوفی کے ساتھ اسے نصیحت کرو اور اس کی غلطی پر اسے متنبہ کرو۔ خدا نے تجھے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں اس کی طاقت دی ہے اس لئے جو طاقت تم میں ہے اسی کا تم استعمال کرو اور اسی کی حد کے اندر رہو ورنہ اگر تم حد سے بڑھے تو تمہاری ساری کوششیں رائیگاں جائیں گی۔[1]

غرض سیاسی فتنوں کے اس پریشان کن دور میں علماء حق اور فقہاء امت نے اس نظریہ پر اتفاق کیا کہ پوری جرأت اور صبر وثبات کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کیا جائے اور اس راہ میں جو مشکلات اور مصائب آئیں حوصلہ اور حکمت عملی کے ساتھ ان کو برداشت کیا جائے۔ لیکن سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہتے ہوئے اطاعت کے دائرہ کے اندر رہا جائے۔ حکمت، موعظت اور پیغمبرانہ طریق اصلاح کا انداز اختیار کیا جائے اور ملکی استحکام اور امن وامان کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اصلاحی کام کو آگے بڑھایا جائے۔[2] فساد اور فتنہ بغاوت اور اَنارکی کی راہوں سے بچا جائے کیونکہ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ایک برحق ارشاد ہے اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اگر حق تلفیوں کے تدارک کی کوشش کی گئی تو یہ کوشش ہزاروں لاکھوں کے خون کا باعث بن جائے گی۔ سارا خون رائیگاں جائے گا اور حاصل کچھ نہ ہوگا بلکہ مزید حق تلفیوں کی بنیاد پڑے گی۔ تہذیب وتمدن اور علم وترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ پس اصلاح احوال کا یہ طریق نہ تو عقلمندی کی بات ہے اور نہ پیغمبرانہ انداز اصلاح سے اس کا کوئی تعلق ہے۔

۱۔ قَالَ لِاَنَّ یَدَ السُّلْطَانِ اَقْوٰی مِنْ یَدِکَ (مالک بن انس۔ صفحہ ۲۴۷)

۲۔ صَلَاحُ الْاَمْرِ مَأْمُوْلٌ مَعَ الْاَمْرِ بالمعروف والنّھی عن المنکر والتفحیۃ والشّورٰی والنّصیحۃ للّٰہ ولرسولہ ولسائر المؤمنین۔

وضع حدیث کا خطرناک فتنہ اور اس کے اسباب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے کچھ عرصہ بعد یہ خاص اہتمام فرمایا کہ قرآن کریم کی جو آیات نازل ہوتیں انہیں نہ صرف یاد کرا دیا جاتا بلکہ حفظ کے ساتھ ساتھ آپ انہیں اپنے ایسے اصحاب سے لکھوا لیتے جو لکھ پڑھ سکتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسی ہی لکھی ہوئی آیات جو ان کی بہن کے پاس تھیں پڑھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ لکھنے کا یہ اہتمام حضورؐ کی زندگی کے آخری لمحات تک رہا لیکن چونکہ کاغذ کی قلت تھی بلکہ شروع زمانہ میں وہ نایاب تھا اس لیے بعض اوقات قرآن کریم کی آیات لکڑی کی تختیوں، ٹھیکریوں اور اونٹ کے کندھوں کی چوڑی ہڈیوں پر بھی لکھوائی جاتی تھیں اور آخر میں یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ ایسے لکھے ہوئے مسودات لکڑی کے ایک بڑے صندوق میں محفوظ رکھے جاتے۔ جس نے اپنے لیے نازل شدہ حصہ قرآن لکھنا ہوتا یا اس کی نقل لینی ہوتی وہ حفظ کے علاوہ ان محررہ محفوظ شدہ مسودات کی مدد سے لکھتا یا لکھواتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند ماہ بعد ہی حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں صحابہؓ کے مشورہ سے حکومتی سطح پر بصورت کتاب ایک ''مستند مصحف'' تیار کرایا جو حضرت زید بن ثابتؓ کی سربراہی میں قرآن کریم کے حافظ صحابہؓ کی ایک کمیٹی نے تیار کیا۔ کمیٹی نے اس نسخہ کی تیاری میں صرف اپنے حفظ پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ اس ذخیرہ سے بھی پوری پوری مدد لی جو حضورؐ نے مختلف اوقات میں لکھوا کر محفوظ کیا تھا۔[1] اس تیار شدہ نسخہ کے استناد کو تمام صحابہؓ، ساری امت بلکہ ساری دنیا نے تسلیم کیا اور اس کا نام ''مصحف امام'' رکھا۔

اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت زید ہی کی سربراہی میں ایک اور کمیٹی قائم کر کے اس ''مصحف امام'' کی پانچ نقلیں کروائیں جو مملکت کے مختلف مراکز میں بھجوا دی گئیں تاکہ لوگ اس کے مطابق پڑھیں پڑھائیں اور جو لکھنا چاہیں لکھ

[1] مالک بن انس صفحہ ۲۰ و ۳۰

سکیں۔ان نسخوں میں قریش کی زبان اور اس زمانہ میں مروجہ مقبول اسلوب کتابت کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا۔[1]

قرآن کریم کی حفاظت اور کتابت کا جس طرح حکومتی سطح پر اہتمام کیا گیا اس قسم کا کوئی انتظام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی کتابت اور حفاظت کے بارہ میں نہ کیا جا سکا اور نہ ہی اس کی حوصلہ افزائی ہوئی[2] بلکہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ تو کتابت احادیث سے اس وقت منع فرمایا کرتے تھے۔روایت میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابو بکرؓ نے مدینہ کے اہل علم صحابہؓ کو جمع کیا اور کہا تم میں سے بعض اپنے اپنے سماع اور اپنی اپنی یادداشت کے مطابق بکثرت حدیثیں بیان کرتے ہو اور اس طرح اختلاف کا باعث بن رہے ہو۔تمہارے بعد لوگ تم سے سبق لے کر اور زیادہ شدت کے ساتھ اختلاف کریں گے اس لیے تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیثیں نہ بیان کیا کرو اور لوگوں کو قرآن کریم کی طرف متوجہ کرو۔اس کے حلال کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کو حرام۔اس سے آگے نہ بڑھو۔[3]

اسی طرح یہ روایت بھی آتی ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے احادیث لکھوانے کا ارادہ کیا اور اس سلسلہ میں صحابہؓ سے مشورہ بھی کیا۔انہوں نے کہا بہت اچھا خیال ہے ضرور ایسا کیجئے۔حضرت عمرؓ ایک ماہ تک دعا اور استخارہ کرتے رہے۔سوچ بچار کے بعد آپ نے صحابہؓ کو پھر بلایا اور کہا میں نے احادیث لکھنے کے بارہ میں آپ سب سے مشورہ کیا تھا خود میں نے بھی بہت سوچا ہے۔آپ جانتے ہیں کہ تم سے پہلے اہل کتاب یعنی یہود نے بھی کتاب اللہ کے ساتھ اپنے بزرگوں کی باتیں لکھیں پھر ان باتوں کی طرف زیادہ جھک گئے اور یہ امتیاز نہ رکھ سکے کہ کتاب اللہ کیا ہے اور بزرگوں کی احادیث کیا اور احادیث کے پڑھنے پڑھانے میں ہی لگ گئے اور کتاب اللہ کو بھلا دیا

---

[1] مالک بن انس صفحہ ۳۵

[2] لقد عاش النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد البعثۃ ثلاثا و عشرین سنۃً فکان تدوین سننہ (اقوالہ واعمالہ واقرارہ) أمر غیر یسیرٍ (الامام الشافعی صفحہ ۲۱۰)

[3] قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تکتبوا عنی شیئا و من کتب عنّی غیر القرآن فَلْیَمْحُہٗ (صحیح مسلم کتاب الزہد والرقاق . باب التثبت فی الحدیث فی حکم کتابۃ العلم)۔
مسند احمد جلد ۳ صفحہ ۳۹،۲۱،۱۲ ۔ تذکرۃ الحفاظ للذہبی جلد ۱ صفحہ ۲ ۔

میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔[1]

اس تربیت اور ہدایت کا اثر تھا کہ اکثر صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے بات کرنے سے بالعموم بچتے تھے۔[2]

عراق میں جو صحابہؓ آکر بس گئے تھے وہ عام طور پر قلت روایت کے عادی تھے۔ بعد میں حضرت امام ابوحنیفہؒ نے اسی عادت کو اپنایا۔ آپ سے نسبتاً بہت کم احادیث مروی ہیں۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ تاریخ کے انضباط سے مفر نہیں۔ انسان طبعاً اس کا عادی ہے اور اپنے ماضی سے کٹ نہیں سکتا نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی دینی حیثیت بھی مسلّم ہے اس لیے روایت حدیث کے جذبہ پر بند لگانا ناممکن تھا اس رجحان کو نہ روکا جا سکتا تھا اور نہ یہ رک سکا۔ اس لیے جب یہ دروازہ پوری طرح کھلا تو صحیح اور مستند احادیث کے ساتھ ساتھ ضعیف اور موضوع احادیث بھی عام ہونے لگیں۔ صالح ذہن کے ساتھ کج ذہن کے حامل عناصر بھی میدان میں اتر آئے اور جھوٹی احادیث کا ایک گونہ سیلاب آگیا۔ کہا جاتا ہے کہ خوارج[3] کے سوا ہر فرقہ کے کج ذہن افراد نے جی بھر کے کذب علی الرسول کے جرم کا ارتکاب کیا اور خوب خوب احادیث وضع کیں۔[4]

وضع احادیث کے کئی اسباب گنوائے گئے ہیں ان میں سے مندرجہ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۔ اسلام کے دشمن زنادقہ جو دل میں کفر چھپائے رکھتے اور اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے بظاہر مسلمان ہو گئے تھے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کو بدنام کرنے یا دین کے استخفاف کی غرض سے حدیثیں وضع کیں۔[5]

۱۔ انی لا اُلبس کتاب اللہ بشیء فمنع عمرؓ تدوین الحدیث مخافة ان یخلط القرآن بشیء و کان العرب بالقرآن حدیث عهدٍ. (مالک بن انس صفحہ ۱۸۱،۲۶)۔ ابو حنیفہ صفحہ ۱۶۱

۲۔ وکان الصحابة لا یذکرون احادیث رسول اللّٰہ الا مُقِلّین (ابو حنیفہ صفحہ ۱۶۱)

۳۔ لم یثبت علی الخوارج رذیلة الکذب علی الرسولؐ ۔(الا مام الشافعی صفحہ ۲۱۴)

۴۔ اِنَّ الکذب علی الرسول قد کثر فی عهد التّابعین بسبب تکوُّن الفرق . (محاضرات فی تاریخ المذاهب الفقهیة)

۵۔ اعترف ابن ابی العَوْجَاء و هو مُقْبِلٌ لِلْقَتْلِ للندقة اَنَّهٗ وَضَعَ اَرْبَعَةَ آلافِ حَدِیْثٍ یحرم فیها الحلال و یحل الحرام (الامام الشافعی صفحہ ۲۱۳)

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو مختلف بدعتی گروہ بن گئے تھے وہ اپنے اپنے مسلک کی تائید کے لئے بکثرت کذب علی الرسولؐ کے مرتکب ہوئے۔[۱]

شیعہ فرقہ نے فضائل اہل بیت یا مسالب صحابہؓ کے بارہ میں بکثرت احادیث وضع کیں۔ حضرت امام شافعی کہا کرتے تھے کہ شیعہ فرقہ سے زیادہ کذب علی الرسولؐ کی جرأت کسی اور فرقہ میں نہیں دیکھی گئی۔[۲]

شیعہ حضرات اپنی احادیث کی بنا پر بہت سے عمومات قرآن کو شخص واحد یا اہل بیت کے لیے محدود قرار دیتے ہیں۔ مثلاً آیت کریمہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ[۳] کی تفسیر میں یہ حدیث بیان کی جاتی ہے کہ اس سے مراد علی اور ان کے چند حامی صحابہؓ ہیں۔ اسی طرح آیت کریمہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ[۴] کا نزول اس وقت ہوا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے بارہ میں یہ اعلان فرمایا کہ میرے بعد وہ میرے خلیفہ ہوں گے۔ پہلے حضورؐ اس قسم کے اعلان سے جھجکتے تھے کہ لوگ مخالفت کریں گے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ[۵] اس وجہ سے آپ حضرت علیؓ کے بارہ میں مذکورہ بالا اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے۔ آیت کریمہ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ[۶] نازل ہوئی تو آپ نے اپنے رشتہ داروں کو بلایا، ان کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد ان سے کہا: اللہ تعالیٰ جب بھی کسی نبی کو مبعوث کرتا ہے تو ایک آدمی کو اس کا وصی، وزیر، وارث،

---

۱ کثرت اسباب الاختلاف ..... حتی اصبح الحدیث الصحیح فی الحدیث الکذب کما قال الدار قطنی کا لشعرة البیضاء فی جلد الثور الاسود ...... وکان مالک یسمّی الکوفة دار الضرب اذ تسبک الاحادیث کما تسبک النقود ...... ویقول الزھری یخرج الحدیث من عندنا شبرًا فیعود الینا من العراق ذراعا (ابو حنیفہ صفحہ ۱۳۶ و ۱۵۶)

۲ الف. قال الشافعی ما رأیت فی اھل الاھواء قومًا أشدّ بالزور من الرافضة وضعوا فی فضائل علیّ واَھلِه آلاف احادیث (الامام الشافعی صفحہ ۲۱۳)

(ب) اخذ الشیعة یصطنعون الاحادیث لنصرة علیّ و أخذ خصومھم یختلفونھا لنصرة مخالفیه. (ابو حنیفه صفحه ۱۳۵)

۳ البینة: ۷   ۴ المائدة: ۴   ۵ المائدة: ۶۸   ۶ الشعراء: ۲۱۵

بھائی اور ولی مقرر کرتا ہے تم میں سے کون میرا وصی، وارث، ولی، بھائی اور وزیر بننے کے لیے تیار ہے۔ سب رشتہ داروں نے آپ کی اس پیشکش کا انکار کیا صرف علیؓ نے اسے قبول کیا۔ اس وقت علیؓ کی عمر دس سال تھی۔ بہرحال جب علیؓ ایمان لائے تو آپ نے فرمایا: ہاں اے علیؓ! تم ہی میرے وصی اور وارث اور ولی اور وزیر اور بھائی ہو۔ آیت کریمہ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا [1] میں وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا سے مراد حضرت علیؓ ہیں خدا اور رسول کے ساتھ علی ہی سب مسلمانوں کے مولا ہیں۔

آیت کریمہ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ [2] میں اَلسّٰبِقُوْنَ سے مراد حضرت علیؓ ہیں۔ اسی بناپر وہ خلیفہ بلافصل ہیں کیونکہ یہ آیت انہی کے حق میں نازل ہوئی تھی۔ [3]

مشہور شیعہ محدث اَلْکُلِیْنِی حضرت امام جعفرؒ کی طرف منسوب کرکے یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ صحابہؓ نے قرآن کریم میں تحریف کی اور علی یا آلِ مُحَمَّد کے الفاظ نکال دیئے۔ مثلاً آیت کریمہ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ (فِیْ حَقِّ عَلِیٍّ) مِنْ رَّبِّكَ [4] میں سے فِیْ حَقِّ عَلِیٍّ کے الفاظ نکال دیئے۔ اسی طرح آیت کریمہ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا (آلَ مُحَمَّد) اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ [5] اور اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا (آلَ مُحَمَّدٍ) لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ [6] میں سے آلَ مُحَمَّدٍ کے الفاظ نکال دیئے۔ [7]

بہرحال شیعہ حضرات کی ایسی بہت سی روایات ہیں جن کی بنیاد عقیدت اور ذہنی رغبت پر ہے کوئی مستند بنیاد اس قسم کی روایات کی تائید نہیں کرتی۔

وضع احادیث کے اسباب میں سے ایک سبب لالچ اور حکومت وقت کے قرب کی خواہش تھی۔ مثلاً بنو اُمیہ کو خوش کرنے کے لیے یہ حدیث وضع کی گئی کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ [8] علیؓ کے حق میں نازل ہوئی اور اس میں ان کے رویہ کی مذمت کی گئی ہے۔

---

[1] المائدۃ: ۵۶ [2] الواقعۃ: ۱۱ [3] دعائم الاسلام جلد ۱ صفحہ ۲۰، ۲۷ [4] المائدۃ: ۶۸
[5] الشعراء: ۲۲۸ [6] النساء: ۱۶۹ [7] محاضرات فی تاریخ المذاہب الفقہیۃ صفحہ ۵۸۲
[8] البقرۃ: ۲۰۵

ایک دفعہ اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے سلیمان بن یسار سے پوچھا کہ آیت کریمہ وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ[1] کس کے بارہ میں نازل ہوئی؟ سلیمان نے جواب دیا اس آیت میں عبداللہ بن اُبی کی طرف اشارہ ہے۔ ہشام نے غصہ ہو کر کہا تم جھوٹ بولتے ہو اس میں تو علیؓ کی طرف اشارہ ہے۔ سلیمان نے اس پر کہا امیرالمومنین زیادہ بہتر جانتے ہیں۔[2] ایک دفعہ مشہور معتزلی ادیب جاحظ کو پیشکش کی گئی کہ اگر وہ مقتل علی کے بارہ میں احادیث وضع کریں تو ان کو دس ہزار دینار دیئے جائیں گے۔[3]

وضع احادیث کا ایک سبب یہ تھا کہ بعض تصوف پسند بدعتی گروہ ترغیب اور ثواب سمجھ کر احادیث گھڑتے تھے۔ گزشتہ حکماء اور داناؤں کی نصائح اور حکمت کی باتوں کو بطور حدیث بیان کرتے تھے اور اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ابوعصمہ نوح بن مریم سے پوچھا گیا کہ اس نے قرآن کریم کی سورتوں کے فضائل سے متعلق ایسی روایتیں بیان کی ہیں جو من گھڑت لگتی ہیں، اس نے ایسا کیوں کیا؟ نوح نے جواب دیا لوگ قرآن کریم کو چھوڑ کر دوسروں کی کتابیں پڑھنے کے شوقین ہو گئے ہیں اس لیے میں نے چاہا کہ ان کو اس طرف سے ہٹا کر قرآن کریم کی طرف متوجہ کروں۔[4]

ایک واعظ کرامات الصادقین کے بارہ میں حدیثیں گھڑ گھڑ کر لوگوں کو سنایا کرتا تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ کیا اس نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فرمان نہیں سنا مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ ؟ تو اس نے جواب دیا نَحْنُ نَكْذِبُ لِلنَّبِيِّ لَا عَلَيْهِ کہ ہم تو آپ کے کمالات اور فضائل بیان کرنے کے لیے جھوٹ بولتے ہیں۔ آپ کے خلاف تھوڑا ہی کہتے ہیں۔[5]

ایک اور واعظ کے بارہ میں روایت ہے کہ وہ عجوبہ پسند عوام کے ساتھ عجیب عجیب حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا[6] کی تفسیر

---

[1] النور: ۱۲ [2] الامام الشافعی: صفحہ ۲۱۲ [3] ابوحنیفہ صفحہ ۱۳۶

[4] رأيت الناس تحوّلوا عن القرآن و اشتغلوا بفقه أبي حنيفة و مغازى ابن اسحاق فوضعتها حِسْبَةً لوجه الله (ابو حنيفه صفحه ۱۳۶) [5] الامام الشافعی صفحه ۲۱۳ [6] بنی اسرائیل : ۸۰

کرتے ہوئے یہ حدیث بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے پاس عرش پر بیٹھیں گے۔ یہی مقام محمود ہے۔ امام ابن جریر طبریؒ نے اس واعظ کی یہ بات سنی تو فرمایا کیسی غلط تفسیر ہے کسی حدیث میں ایسا نہیں آیا۔ لوگ یہ بات سن کر امام ابن جریر طبریؒ کے خلاف ہو گئے اور کہا یہ گستاخ رسولؐ ہے اور پھر کر ان کے گھر پر پتھراؤ بھی کیا۔[1]

نظامِ شریعت

تہذیب و تمدن، اقتصاد اور معاشرت کے فروغ کے سلسلہ میں مسلم علماء کے سامنے جب یہ سوال آیا کہ شریعت اور قانون کی تدوین کیسے ہو تو اس تعلق میں بالعموم یہ نظریہ تسلیم کر لیا گیا کہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کے بارہ میں اسلامی ہدایات موجود ہیں۔[2] تفصیلات کا جاننا ہر مسلم عالم کا فرض ہے مگر یہ تفصیلات کیسے معلوم ہوں اور کیسے طے ہوں۔ یہاں سے فقہی اختلافات کا آغاز ہوا۔ مثلاً اس تعلق میں بعض نے اس نظریہ کا اظہار کیا کہ قرآن کریم شریعت کا بنیادی ماخذ ہے۔ اس میں جو کچھ تصریح ہے وہ ایک مسلمان کی زندگی کا لائحہ عمل ہے اور اگر قرآن کریم کی کوئی نص موجود نہیں تو پھر انفرادی معاملات میں ہر مسلمان خود اپنا مفتی ہے وہ اپنے لیے بہتر سمجھ سکتا ہے اور اجتماعی معاملات میں اہل حل وعقد باہمی مشورہ اور کثرت رائے سے جو فیصلہ کریں وہ اس وقت تک ساری جمعیت کے لیے واجب الاتباع ہوگا جب تک کہ اسی قسم کا اجماع اس فیصلہ کو تبدیل نہ کر دے۔ اس گروہ کا کہنا ہے کہ روایات سے بھی اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کیونکہ انفرادی اجتہاد کی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تصدیق فرمائی ہے۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ سفر میں تھے دونوں جنبی ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے نماز نہ پڑھی اور عمارؓ نے تیمم کی نیت سے زمین پر لوٹ پوٹ کر تیمم کیا اور نماز پڑھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے جب اس واقعہ کا ذکر ہوا تو آپ اس اجتہاد کی وجہ سے کسی پر ناراض نہ ہوئے۔ صرف عمار سے یہ کہا کہ زمین پر لوٹنے کی ضرورت نہ تھی صرف منہ اور ہاتھوں پر

---

[1] الامام الشافعی صفحہ ۲۱۳

[2] ما نزل نازلۃ بمسلم إلّا ولھا حکم من الشارع یعنی کُلُّ ما نزل بمسلم ففیہ حکم لازمٌ ولأنَّ للّٰہ فی کلّ واقعۃٍ حکما معیناً، علی المجتھد طلبہ والعمل بہ (الامام الشافعی صفحہ ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۸)

مسح کرلینا کافی تھا۔ایک دفعہ دو صحابی سفر میں تھے نماز کا وقت ہوگیا اور پانی میسر نہیں تھا چنانچہ دونوں نے تیمم کر کے نماز پڑھ لی اور آگے سفر پر روانہ ہوگئے کچھ دیر کے بعد پانی مل گیا نماز کا وقت ابھی باقی تھا۔ چنانچہ ایک نے وضو کر کے دوبارہ نماز پڑھی اور دوسرے نے کہا کہ جب ایک دفعہ نماز پڑھ لی ہے تو پھر کیا ضرورت ہے جب حضورؐ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ نے دونوں کے اجتہاد کی تصویب فرمائی [۱]۔

ایک اور روایت ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے عمرو بن العاصؓ کو ایک مہم کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ عمرو جنبی ہوگئے۔سردی سخت تھی۔ چنانچہ آپ نے تیمم کر کے اہل لشکر کو نماز پڑھائی۔حضورؐ کی خدمت میں رپورٹ کی گئی تو آپ نے عمرو کو بلا کر پوچھا تو عمرو نے عرض کیا سردی سخت تھی اور میرے سامنے قرآن کریم کی یہ آیت تھی لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ [۲] آپؐ ہنس پڑے لیکن عمرو کو کچھ نہ کہا۔

اجتماعی اجتہاد کی بھی کئی مثالیں ملتی ہیں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ صحابہ کو بلا کر مشورہ کرتے اور بلا جھجک فیصلے کرتے اسی اجتماعی مشورہ سے انہوں نے حضورؐ کی نیابت اور خلافت کا مسئلہ طے کیا اور "مصحف امام" تیار کروایا اور اس طرح ہر مشکل پر قابو پایا۔ [۳]

رہی یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں اُمت مسلمہ کی جو رہنمائی فرمائی ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضورؐ کی یہ رہنمائی عالم انسانیت کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے لیکن ہمیشہ کے لیے اس کی ہو بہو پابندی ضروری نہیں یہ گروہ ذخیرہ احادیث کو مسلمانوں کی تاریخ کا ایک عمدہ مجموعہ تو مانتا ہے اس کی دینی اور شرعی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا لیکن ......امت مسلمہ کی اکثریت نے اس نظریہ کو مسترد کر دیا اور اسے گمراہی، غلط سوچ اور کفر قرار دیا۔ [۴]

شریعت اور فقہ کے مآخذ

چنانچہ علماء حق نے قانون اسلام اور شریعت (تہذیب وتمدن، اقتصاد اور معاشرت) کی

---

[۱] قَالَ لِلَّذِی لَمْ یُعِدْ اَصَبْتَ السُّنَّةَ وَ اَجْزَأَتْکَ صَلٰوتُکَ وَ قَالَ لِلْاٰخَرِ لَکَ الْاَجْرُ مَرَّتَیْنِ (ابو حنیفہ صفحہ ۱۷۰)

[۲] النساء : ۳۰ [۳] ابوحنیفہ صفحہ ۱۴۸، ۱۵۶

[۴] وقریبا قد وجد مَنْ قالوا لا نقبل اِلَّا ما جاء بہ نصُّ القرآن و ھٰؤُلَآءِ کفّار بلا جدال لان السنة مبینة للدین کُلِّہٖ (مالک بن انس صفحہ ۱۶۸) محاضرات فی تاریخ المذاھب الفقهیّة صفحہ ۲۷۹

تدوین کے لئے جن اصول وقواعد کو سامنے رکھا وہ مندرجہ ذیل تھے۔ قرآن کریم، سنت وحدیث، اجماع اور ایسی رائے یا اجتہاد جو **قیاس، استحسان، مصلحت، رفع، حرج، سدّ ذرائع، عرف، استصحاب یا تَعْلِیْلُ النَّص** کے اصول پر مبنی ہو۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا قطعی اور یقینی کلام اور دنیا بھر کے لیے ایک معجزہ [1] ہے اور تمام مسلمان اس کتاب مقدس کو ماخذ شریعت اور منبع ہدایت تسلیم کرتے ہیں اگر کوئی جزوی اختلاف ہوسکتا ہے تو وہ قرآن کریم کے معنے ومفہوم کے سمجھنے میں ہوسکتا ہے۔ مثلاً کسی مصلحت کے تحت قرآن کریم میں ایک ایسا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے عربی زبان میں دو معنے ہیں اور کوئی قطعی قرینہ کسی ایک معنے کی تعیین کے لیے سامنے نہیں آیا اس وجہ سے ایک عالم نے اس لفظ کے ایک معنے لیے اور دوسرے نے دوسرے جیسے قرآن کریم کا ارشاد ہے وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ [2] یعنی جن عورتوں کو طلاق ملی وہ تین قروء اپنے آپ کو روکے رکھیں (اور کسی اور کے ساتھ نکاح نہ کریں) لفظ قُرُوْء قَرْءٌ کی جمع ہے اور عربی زبان میں قَرْءٌ کے معنے حیض کے بھی ہیں اور طُہر کے بھی اس لیے کسی نے کہا کہ مطلقہ عورت تین حیض گزرنے تک کسی اور کے ساتھ نکاح نہ کرے غرض اس طرح کے لغوی اختلاف کی وجہ سے یا حقیقت ومجاز [3] کے فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یا عام وخاص اور اسلوب کلام کے فرق کے لحاظ سے فروعی اختلاف کی کئی صورتیں سامنے آئیں۔

اسی طرح تفسیر القرآن بالحدیث کی بنا پر بھی بعض اختلافی مسلک نمایاں ہوئے۔ مثلاً امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ حدیث خواہ متواتر ہو یا مشہور، عزیز ہو یا غریب اگر معتبر راوی روایت کرتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں آیت کی یہ تفسیر کی ہے تو اسے تسلیم کرنا ہوگا اور ماننا پڑے گا کہ قرآن کریم کا صحیح مفہوم وہی ہے جو اس حدیث میں بیان ہوا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے علماء کہتے ہیں کہ حدیث ظنی الدلالۃ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ راوی جو کچھ کہہ رہا ہو وہ بالکل

---

[1] اعجاز القرآن فی انه اَصَحُّ لفظ فی احسن نظم فِی التالیف وفیه اَصَحُّ المعانی و اَرقَاها معجزٌ بلفظه ونظمه وترکیب عباراته والفاظه .... اعجز الشعراء ولیس بشعر واعجز الخطباء ولیس بخطبة و معجز باثره فی النفوس (الامام الشافعی صفحه ۹۵)

[2] البقرة : ۲۲۹

[3] مجاز کی مثال قرآن کریم کی یہ آیت وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ یہاں ثِیاب کے معنے نفس اور ذات کے لئے گئے ہیں۔ عرب کہتے ہیں۔ فدا لک ثوبی ای نفسی. فلی لک من اخی ثقة ازاری ای نفسی (الامام الشافعی صفحه ۱۰۵)

درست ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فرمایا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ راوی کو غلطی لگی ہو۔ درحقیقت حضورؐ نے ایسا نہ فرمایا ہو یا حضورؐ نے جو کچھ فرمایا ہو راوی اسے سمجھ نہ سکا ہو، اس بنا پر حدیث متواتر اور مشہور کی صورت میں تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کی کسی آیت کے وہی معنے ماننے چاہئیں جو ان احادیث میں بیان ہوئے ہیں، لیکن خبر واحد یعنی ایک دو راویوں کی روایت سے الفاظ قرآن کے ظاہری مفہوم کو ترک کرنا آئین عقلمندی کے خلاف ہے۔ **فَاَخْبَارُ الْاٰحَادِ لَا یُمْکِنُ اَنْ تَکُوْنَ فِیْ مَقَامِ الْقُرْآنِ الْکَرِیْمِ الَّذِیْ لَا یَأْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ فَهُوَ حَاکِمٌ عَلٰی اَخْبَارِ الْاٰحَادِ بِالصِّحَّةِ وَ الرَّدِّ۔**

قرآن کریم کے سلسلہ میں ایک اختلاف تفسیر بالرائے کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارہ میں ہے۔[1] تفسیر بالرائے سے مراد اگر یہ ہے کہ قرآن کریم کی دوسری آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت شدہ احادیث۔ لغت اور محاورۂ عرب کو نظر انداز کر کے یونہی اپنے خیالی اندازوں کی بنیاد پر کسی آیت کی تفسیر کی جائے تو امت مسلمہ کے تمام سنجیدہ علماء ایسی تفسیر کو غلط اور گمراہی سمجھتے ہیں۔[2] لیکن تفسیر بالرائے کے ممنوع ہونے کا اگر یہ مطلب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کسی روایت کے بغیر قرآن کریم کی کسی آیت کی تفسیر ناجائز اور غلط ہے تو یہ موقف بھی درست نہیں۔ اگر ہر آیت کی تفسیر کے لیے حضورؐ کا ارشاد ضروری ہوتا تو صحابہ حضورؐ کے تمام ارشادات کو محفوظ کرنے کا اسی طرح خاص اہتمام کرتے جس طرح قرآن کی حفاظت کا خاص اہتمام انہوں نے کیا تھا۔

بہر حال تفسیر بالرائے کا یہ مفہوم کہ قرآن کی کسی آیت کی اس طرح تفسیر کی جائے کہ وہ قرآن کریم کی دوسری آیات اور ثابت شدہ احادیث کے خلاف نہ ہو اور لغت و محاورۂ عرب اس کی تائید کرتے ہوں یا وہ تفسیر اس اصول پر مبنی ہو کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا قول ہے اور مظاہر قدرت یعنی سائنس اس کا فعل اور خدا کا قول اس کے فعل کے خلاف نہیں ہو سکتا تو ایسی پُر از معارف تفسیر نہ

---

[1] الشیعة یرون ان الائمة هم مفاتیح علم الکتاب الکامل و لا یمکن ان یدخل الناس ابوابه الا بهٰذه المفاتیح (محاضرات فی تاریخ المذاهب الفقهیة صفحه ۶۵)

[2] روی ابو عبید القاسم بن سلام ان ابابکر الصدیق سئل عن قوله تعالیٰ " وَ فَاکِهَةً وَّ اَبًّا" (عبس:۳۱) فقال ای ارض تقلنی و ای سماء تظلنی اذا قلت فی القرآن مالم اعلم (الدرالمنثور تفسیر سورة عبس: ۳۱)

صرف جائز ہے بلکہ تمام محقق علماء نے تفسیر کے اس انداز کو اختیار کیا ہے اور اس راہ پر چلتے ہوئے انہوں نے انتہائی گرانقدر خدمات سرانجام دی ہیں اور مبنی بر حقائق تفاسیر لکھی ہیں۔

سنت و حدیث

شریعت کا دوسرا ماخذ سنت ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں سنت سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب تواتر عملی نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ثابت شدہ وہ اقوال اور افعال ہیں جنہیں تواتر عملی کا درجہ تو حاصل نہ ہو لیکن صحیح سند کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا فرمایا تھا یا ایسا کیا تھا اسی طرح کسی صحابی کا ایسا قول یا عمل جو حضورؐ کے علم میں آیا ہو لیکن آپ نے اس کے متعلق کسی ناپسندیدگی کا اظہار نہ کیا ہو بلکہ پسند کا تأثر ملتا ہو یا آپ خاموش رہے ہوں۔ اس تیسری صورت کا اصطلاحی نام حدیث تقریری ہے۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تواتر عملی اور آپ کے ثابت شدہ ارشادات بھی اسی طرح حجت ثابتہ اور ماخذ شرعی ہیں جس طرح قرآن کریم ماخذ شریعت ہے اس میں کسی سچے مسلمان کا کوئی اختلاف نہیں۔[2] کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اگر ایک طرف مُبلّغ کتاب تھے تو دوسری طرف آپ مُبَیِّن اور مفسر کتاب بھی تھے۔ یہ دونوں فریضے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے سپرد ہوئے تھے۔[3]

اس سلسلہ میں اگر اختلاف ہے تو احادیث کی سند کے لحاظ سے ہے یا حدیث کے معنے کی تعیین کے اعتبار سے۔

سند کے لحاظ سے یہ اختلاف ہے کہ جن راویوں کے ذریعہ کوئی حدیث بعد کے لوگوں تک پہنچی ہے وہ کیسے تھے، کتنے تھے، ان کا مقام اعتبار کیا تھا، وہ ضعیف اور غیر معتبر تو نہیں تھے یا سند کے درمیان کوئی راوی رہ تو نہیں گیا یا کسی زیادہ ثقہ راوی نے اس سے اختلاف تو نہیں کیا۔

---

[1] السنۃ و الحدیث ما جاء عن رسول اللّٰہ من اقوال وافعال او اقرار لاقوال او افعال صدرت عمن سواہ (ابو حنیفہ صفحہ ۱۵۵۔ مالک بن انس صفحہ ۱۶۷)

[2] العلماء مجموعون علی ان رد التنازعات الی اللّٰہ والی الرسول حَسْبَمَا وردت الآیۃ " فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ (النسآء:۶۰) واجب ..... ومن قال لا نقبل الا ما جاء بہ القران فھو کافر بلا جدال (مالک بن انس۔ صفحہ ۱۶۷،۱۶۸)

[3] قال اللّٰہ تعالیٰ " اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ (نحل: ۴۵)

روایت احادیث اور صحابہؓ

ہر انسان مختلف طبیعت رکھتا ہے کوئی زیادہ باتیں یاد رکھنے اور پھر انہیں آگے دوسروں تک پہنچانے اور انہیں بار بار دہرانے کا طبعی ذوق اور شوق رکھتا ہے اور اس طبعی مناسبت کی وجہ سے تعلیم وتربیت کی طرف زیادہ رجحان کا مالک ہوتا ہے اور کوئی نسبتاً کم گو اور صرف ضرورت کے وقت کسی بات یا واقعہ کو بیان کرتا ہے ۔یہی حال صحابہؓ **رضوان اللّٰہ تعالٰی علیھم اجمعین** کا تھا۔پھر بعض صحابہ ملکی اور انتظامی ذمہ داریوں میں زیادہ مصروف تھے اور بعض کا تعلق کاروبار سے تھا۔نیز بعض صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بات منسوب کرکے بیان کرنے میں بڑے محتاط تھے کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے ۔[1] اس قسم کی وجوہات سے صحابہ کی مرویات کی قلت یا کثرت کا تعلق ہے ۔حضرت ابو بکر الصدیقؓ اور حضرت عمرؓ اور دوسرے کبار صحابہؓ جو **السابقون الاولون** میں سے تھے اور انہیں سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب حاصل تھا مگر ان کی روایات نسبتاً بہت کم ہیں جبکہ بعض دوسرے صحابہ جنہوں نے بہت کم عرصہ حضورؐ کی صحبت میں گزارا ان کی روایات بہت زیادہ ہیں۔

چنانچہ سب سے زیادہ روایات حضرت ابو ہریرہؓ کی ہیں جن کی تعداد قریباً ۵۳۷۴ ہے ۔ حالانکہ وہ چھ سات ہجری میں فتح خیبر کے قریب مسلمان ہوئے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مرویات ۲۶۳۰ ،حضرت انس بن مالکؓ کی ۲۲۷۶ ،حضرت عائشہؓ کی ۲۲۱۰ ،حضرت ابن عباسؓ کی ۱۶۷۰ ،

---

[1] ومن الصحابة من كان يتوقف في التحديث .... خشية من ان ينسب الى رسول الله صلى الله عليه وسلم ما لم يقله. وقال عمرو بن الشيباني كنت اجلس الى ابن مسعود حولًا يقول قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فاذا قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اِسْتَقَلَّتْهُ رعدةٌ وقال هكذا او نحوذا قال رسول الله صلى الله عليه وسلم........ وكان ابن عباس يقول كنا نحدث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم اذ لم يكن يكذب عليه فلما ركب النّاس الصعبة والذلل تركنا الحديث عنه ـ (محاضرات فى تاريخ المذاهب الفقهيه صفحه ۱۹ ـ الامام الشافعى صفحه ۲۱۱)

حضرت جابرؓ کی ۱۵۴۰، حضرت ابوسعید خدری کی ۱۱۷۰، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ۸۰۰، حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی ۷۰۰، حضرت علیؓ کی ۵۸۶، حضرت عمرؓ کی ۵۳۷، حضرت ابو ذرؓ کی ۲۸۱ اور حضرت ابو بکرؓ کی روایات کی کل تعداد ۱۳۲ ہے۔[1]

روایت حدیث کے رواج میں تدریج

عراق میں رہنے والے صحابہؓ اور تابعین سے نسبتاً کم احادیث مروی ہیں۔[2] یہی وجہ ہے کہ قریباً ۱۴۰ھ تک اہل عراق کے ہاں روایت حدیث کا چرچا بہت کم رہا اور کافی عرصہ بعد اس کے فروغ کا ذوق وشوق بڑھا[3] اور حنفی فقہاء نے بھی روایت حدیث کی طرف زیادہ توجہ مبذول کی چنانچہ عباسی خلیفہ المہدی (متوفی ۱۶۹ھ) کے کہنے پر حضرت امام محمد بن حسن الشیبانی امام مالک سے حدیث پڑھنے مدینہ منورہ گئے اور وہاں تین سال رہ کر ان سے مؤطا پڑھی اور مدینہ کے دوسرے اہل علم سے بھی حدیث کے بارہ میں معلومات حاصل کیں۔[4]

اس کے برخلاف مدینہ منورہ کے صاحب علم صحابہؓ اور ان کے شاگرد روایت احادیث میں بڑے نمایاں تھے کیونکہ مدینہ منورہ احادیث اور تاریخی روایات کا مرکز تھا اور اسی تعلق کی وجہ سے روایت حدیث میں حضرت امام مالک کا ذوق اور رجحان قابل فہم ہے اور اس علم کا وہ خاص شوق بھی رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود جب انہوں نے مؤطا کی تدوین کا ارادہ کیا تو ۱۷۹ھ یعنی اپنی وفات تک وہ اس میں کل ۱۷۲۰ روایات شامل کر سکے جن میں سے پانچ سو کے قریب مرفوع احادیث ہیں

---

[1] "علوم الحديث و مصطلحه لصبحي الصالح" صفحه ۳۵۹ و مالک بن انس صفحه ۱۷۱

[2] امرهم عمرؓ ان لا يحدثوا النّاس .... وكان الشعبي يقول كره الاوّلون الصّالحون الاكثار من الحديث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم. (تذكرة الحفاظ للذهبي صفحه ۷ ـ ابو حنيفه صفحه ۱۵۸)

[3] انّ تدوين السّنن حتّها البعض بسنة ثلاثة و اربعين و مائة ..... وكان ابوحنيفة لايطمئنّ الى احاديث الاحاد (ابو حنيفه صفحه ۱۳۷، ۱۵۸، ۱۶۴ ـ مالک بن انس صفحه ۱۰۹، ۱۷۴)

[4] كان محمد و ابو يوسف قد مالا بعد وفاة استاذهما بعض الميل الى التخفيف من التشدّد في تلقي السّنن و الاحاديث ... و امّا محمّد فاقام على باب مالک ثلاث سنين في حكم المهدى (ابو حنيفه صفحه ۱۵۸، ۱۶۹ ـ الامام الشافعي صفحه ۸۰)

اور باقی مرسل روایات آثار صحابہ یا فقہاء مدینہ کے فتاویٰ ہیں یا عمل اہل مدینہ کا بیان ہے۔[1]

یہ ۱۷۹ھ کے قریب کی بات ہے لیکن ۲۴۰ھ تک یعنی ایک سو سال سے بھی کم عرصہ میں روایات کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی کیونکہ امام احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ) نے اپنی مسند میں تیس اور چالیس ہزار کے درمیان احادیث شامل کی ہیں۔ جو سات لاکھ پچاس ہزار روایات میں سے منتخب کی گئیں تھیں۔[2]

ان کے بعد امام بخاری (متوفی ۲۵۶ھ) نے اپنے زمانہ میں مروج احادیث کے ذخیرہ میں سے صحیح احادیث منتخب کرنے کا اہتمام کیا اور اس کے لئے قواعد اور اصول تجویز کئے۔ چنانچہ اس کے لئے اپنی زندگی کے قریباً سولہ سال صرف کر کے جو مجموعہ تیار کیا اس کی کل احادیث سات ہزار تین سو ستانوے ہیں اور اگر مکررات کو نکال دیا جائے تو اصل مروی احادیث کی تعداد چار ہزار کے قریب ہے۔

صحیح مسلم کی احادیث ۵۷۷۵ ہیں۔ ابو داؤد کی ۴۸۰۰۔ اس میں مکررات شامل ہیں۔ یہی حال ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کا ہے ان سب کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے یعنی حدیث کی ایسی چھ کتابیں جن میں درج احادیث کو علماء اہل سنت نے بالعموم صحیح قرار دیا ہے۔[3]

صحت و حجیت حدیث

کبار تابعین کے زمانہ میں حدیث کی سند کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ جب کسی معتبر قابل بھروسہ انسان سے سنا جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا تھا یا یوں کہا تھا تو اس پر اعتبار کر لیا

---

[1] کہا جاتا ہے کہ یہ قلت اس لئے ہے کہ امام مالک اخذ حدیث میں بڑے محتاط تھے۔ ایک بار ان سے کہا گیا کہ ابن عُیَینَہ کے پاس کچھ احادیث ہیں جو آپ بیان نہیں کرتے تو آپ نے جواب دیا اگر ہر سنی سنائی بات میں بطور حدیث بیان کرنے لگوں تو پھر میرے جیسا احمق کوئی نہیں حالانکہ ابن عُیَینَہ مانے ہوئے محدث تھے۔ امام شافعی کہا کرتے تھے۔ العلم یدور علی ثلاثة مالک و لیث و سفیان بن عیینه مزید تفصیل کے لئے دیکھیں. مالک بن انس صفحہ ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۸۷، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳۔ الامام الشافعیؒ صفحہ ۱۷۳، ۲۱۳، ۲۳۸

[2] قال احمد ان هذا الکتاب قد جمعته وانتقیته من اکثر سبعمائة و خمسین الف حدیث (الامام احمد بن حنبل صفحہ ۲۴۳۔ الامام الشافعی صفحہ ۱۴۶)

[3] الامام الشافعی صفحہ ۱۷۱۔ ابو حنیفہ صفحہ ۱۵۹

جاتا لیکن بعد میں جب حزبی اختلاف بڑھے اور عجمی عناصر بکثرت اسلام میں شامل ہوئے اور تمدنی مسائل نے وسعت اختیار کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی احادیث منسوب کرنے کی جرأت کی جانے لگی۔اس سے سمجھدار اور علم کا حامل طبقہ خاصہ پریشان ہوا اور اس سراسر غلط اور نقصان دہ رجحان کی روک تھام اور صحیح احادیث کی پہچان کے لئے یہ پوچھا جانے لگا کہ اس حدیث کی روایت کرنے والا کون ہے اور اس کے معتبر ہونے کے کیا قرائن ہیں۔[1] یہاں سے سند اور راویوں کی چھان بین کے لئے اصول مرتب کرنے کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔اس طرح سند کی اقسام،حدیث بیان کرنے والے راویوں کی تعداد۔ان کے حالات زندگی اور سیرت کے مختلف پہلو جاننے کی جدوجہد کا آغاز ہوا اور اصطلاحات احادیث اور اسماء الرجال کا وہ عظیم الشان فن معرض وجود میں آیا جس کی مثال مسلم معاشرہ کے سوا دنیا کی کسی اور قوم میں نہیں ملتی۔[2]

صحت اور حجیت کے لحاظ سے احادیث کی اقسام

سند اور راویوں کی تعداد کے اعتبار سے احادیث کو چار اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔

متواتر اور مشہور۔عزیز اور غریب

متواتر وہ حدیث ہے جس کو مختلف علاقوں کے اتنے راویوں نے بیان کیا ہو جن کا جھوٹ پر متفق ہو جانا عقلاً اور عادتاً محال ہو نیز جو بات حدیث میں بیان ہوئی ہو وہ ایک مشاہدہ میں آجانے والی بات ہو کسی نظریہ یا عقیدہ کی بناء پر محض خوش فہمی سے اس کا تعلق نہ ہو۔

عملی تواتر کی تو بے شمار مثالیں ملتی ہیں مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پانچ نمازیں پڑھا کرتے تھے۔فلاں نماز کی اتنی رکعات ہیں۔آپ نے حج کے موقع پر میدان عرفات میں وقوف فرمایا۔آپ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں آبسے تھے۔مکہ کو آپ نے فتح کیا تھا۔غرض ایسی بے شمار

---

[1] لم یکن العلماء یسئلون عن الاسناد فلما وقعت الفتنة قالوا سموا لنا رجالکم (مالک بن انس صفحہ ۲۱۳)

[2] یقول المستشرق الالمانی لم یکن فیما مضیٰ من الامم السابقة کما لا الآن أمة من الامم المعاصرة اتت فی علم اسماء الرجال بمثل ما جاء به المسلمون فی هذا العلم العظیم الذی یتناول اسماء خمس مائة الف رجل وشئونهم ۔ (مالک بن انس صفحہ ۱۹۲)

باتیں اور واقعات ہیں جن کے بارہ میں ذرہ بھی شک نہیں اور کوئی عقلمند انسان جو اسلام کی دینی تاریخ سے واقف ہے اور مسلم معاشرہ کو جانتا ہے وہ ایسے عملی واقعات سے انکار نہیں کر سکتا۔[1]

البتہ **قولی تواتر** کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں مثلاً کہا گیا ہے کہ حدیث مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّءْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ متواتر ہے یعنی آنحضرتؐ کی طرف کوئی جھوٹ موٹ منسوب کرنا انسان کو جہنمی بنا دیتا ہے۔اس حدیث کو اتنے لوگوں نے اور اتنی کثرت کے ساتھ روایت کیا ہے کہ اس کا درست اور صحیح ہونا یقینی ہے۔حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات کو بھی بعض نے متواتر کہا ہے اور اس کا مفہوم یقینی ہے۔امام شافعی حدیث متواتر کو حدیث العامہ بھی کہتے ہیں۔

راویوں کی تعداد کے اعتبار سے حدیث کی دوسری قسم **مشہور** ہے۔یہ وہ حدیث ہے جس کی سند میں کسی جگہ بھی تین سے کم راوی نہ ہوں۔

حدیث کی تیسری قسم **عزیز** ہے۔یہ وہ حدیث ہے جس کی سند میں کسی جگہ بھی دو سے کم راوی نہ ہوں۔

حدیث کی چوتھی قسم **غریب** ہے۔یہ وہ حدیث ہے جس کی سند میں کسی جگہ ایک راوی رہ گیا ہو۔

مؤخر الذکر حدیث کی تینوں قسموں میں یعنی مشہور، عزیز اور غریب کا اصطلاحی نام خبر احاد یا اخبار احاد ہے۔امام شافعیؒ ان کو **حدیث الخاصہ** بھی کہتے ہیں۔خبر واحد (خواہ وہ مشہور ہو یا عزیز یا غریب) کو دینی اور شرعی مآخذ کے طور پر تسلیم کرنے کے لئے علم حدیث کے ماہرین نے جو شرائط مقرر کی ہیں وہ یہ ہیں:۔

۱۔سند متصل ہو، منقطع یا مرسل نہ ہو۔

۲۔سند کے راوی معروف ہوں لوگ انہیں جانتے ہوں وہ مستور الحال نہ ہوں۔

۳۔سند کے یہ راوی نیک ہوں۔سچے اور صادق القول ہوں۔ان صفات کا اصطلاحی نام

---

[1] تواتر عملی یعنی سنت کی سب سے عمدہ اور واضح تشریح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رسالہ ریویو بر مباحثہ بٹالوی و چکڑالوی کے صفحہ (۴) پر تحریر فرمائی ہے آپ فرماتے ہیں ”سنت سے مراد ہماری صرف آنحضرتؐ کی فعلی روش ہے جو اپنے اندر تواتر رکھتی ہے اور ابتدا سے قرآن شریف کے ساتھ ہی ظاہر ہوئی اور ہمیشہ ساتھ ہی رہے گی یا بہ تبدیل الفاظ یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن شریف خدا تعالیٰ کا قول ہے اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل اور قدیم سے عادۃ اللہ یہی ہے کہ جب انبیا علیہم السلام خدا کا قول لوگوں کی ہدایت کے لئے لاتے ہیں تو اپنے فعل سے یعنی عملی طور پر اس قول کی تفسیر کر دیتے ہیں......اور دوسروں سے بھی عمل کراتے ہیں۔“

عدالت ہے گویا تیسری شرط یہ ہے کہ راوی عادل ہوں۔

۴۔ سند کے راویوں کا حافظہ اچھا ہو اور وہ بات کو یاد رکھنے کی اہلیت رکھتے ہوں اس وصف کا اصطلاحی نام "ضبط" ہے گویا چوتھی شرط یہ ہے کہ راوی ضابط ہو۔

۵۔ سند کے راویوں میں سے کوئی راوی مُدلّس[1] نہ ہو اور نہ اس نے اپنے سے زیادہ ثقہ راوی کی مخالفت کی ہو۔

۶۔ امام شافعی حدیث کی صحت کے لئے یہ شرط بھی لگاتے[2] ہیں کہ راوی انہی الفاظ میں حدیث بیان کرے جو اس نے سنے ہوں۔ مفہوم بیان نہ کرے۔[3]

۷۔ امام مالک کے نزدیک خبر واحد کے مقبول ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ اہل مدینہ کے عمل کے خلاف نہ ہو۔ امام مالک عمل اہل مدینہ کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔[4] وہ اپنی مشہور کتاب مؤطا میں اس اہمیت کی طرف مختلف الفاظ میں بار بار اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً کبھی کہتے ہیں **هٰذَا الْاَمْرُ الَّذِیْ اَدْرَکْتُ عَلَیْهِ النَّاسَ وَ اَهْلَ الْعِلْمِ بِبَلَدِنَا** ۔ کبھی یوں فرماتے ہیں۔ **اَلسُّنَّةُ الَّتِیْ لَا اِخْتِلَافَ عِنْدَنَا یا اَلْاَمْرُ عِنْدَنَا**۔

---

[1] مُدَلِّسْ اسے کہتے ہیں جو اس انداز میں بات کرے جیسے اس نے یہ حدیث مروی عنہ سے خود سنی ہے حالانکہ امر واقعہ یہ ہو کہ اس نے خود یہ حدیث نہیں سنی تھی البتہ مروی عنہ سے ملا تھا یا اس سے ملنے کا امکان تھا۔ تدلیس میں ایک گونہ دھوکہ کا شائبہ ہوتا ہے۔

[2] يقول الشافعي لا تقوم الحجّة بخبر الخاصّة حتّى يجمع امورًا منها ان يكون من حدث به ثقةً في دينه معروفاً بالصدق في حديثه عاقلًا بما يحدث به و ان يكون ممّن يؤدي الحديث بحروفه كما سمع بريئًا ان يكون مُدَلِّسًا.... ما يحدث الثقات خلافه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم حتّى ينتهي بالحديث موصولًا الى النبيؐ (الامام الشافعي صفحه ۲۲۶ ،۲۳۸)

[3] اس شرط کی پابندی شائد ہی کسی نے کی ہو کَمَا لَا یَخْفٰی ۔ تفصیل کے لئے دیکھیں۔ ابو حنیفہ صفحہ ۱۵۶، مالک بن انس صفحہ ۱۹۱

[4] انّ المدينة سلطانها الديني والتاريخي مسلّم فيها اقام النبيؐ صلى الله عليه وسلم و هنالك عاشت الكثرة الغالبة من الصحابة وامهات المومنينؓ ....قال مالک انّ النّاس تبع لاهل المدينة و اجماعهم مقدم علٰى خبر الاحاد. امّا جمهور المحدّثين فلا يرون للراوي المدني فضلًا من حيث هو مدني وانما الفضل بالعدالة والضبط ۔(ابو حنيفه صفحه ۱۳۹، ۱۴۰ ۔ مالک بن انس صفحه ۱۷۴، ۱۷۹، ۱۹۱)

۸۔امام ابو حنیفہ خبر واحد کو قبول کرنے کے سلسلے میں ان شرائط کا بھی اضافہ کرتے ہیں کہ وہ عمومات قرآن اور اس کے ظواہر کے خلاف نہ ہو۔راوی خود اس حدیث کے خلاف عمل نہ کرے۔ نیز اس حدیث کا تعلق عموم بلوی[1] سے نہ ہو یعنی وہ ایسی بات نہ ہو جس کا جاننا بڑی حد تک عوام کے لئے ضروری تھا۔جیسے ایک صحابیہ بُسرہ کی طرف منسوب یہ حدیث ہے کہ مَسّ ذَکَر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔یہ حدیث اس لئے نا قابل قبول ہے اگر حضورؐ نے ایسا فرمایا ہوتا کہ شرم گاہ کے چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تو یہ بات عام طور پر لوگوں کے علم میں ہوتی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔[2]

۹۔ائمہ فقہ حجیت حدیث کے سلسلہ میں بعض اوقات گردوپیش اور ماحول سے بھی متاثر ہوتے تھے۔مثلاً امام مالک کو اس قسم کی روایات قبول کرنے میں تامل رہتا جن کی تائید اہل مدینہ کے عمل مستمر کے ذریعہ نہ ہو سکتی ہو مثلاً ایک دفعہ آپ کے سامنے یہ روایت بیان ہوئی کہ جب حضرت ابو بکرؓ کو جنگ یمامہ میں فتح کی خوشخبری ملی تو آپ نے سجدہ شکرادا کیا۔امام مالک نے کہا یہ روایت درست نہیں ہو سکتی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی بڑی فتوحات نصیب ہوئیں آپ کے زمانہ میں صحابہؓ نے بھی کامیابیاں حاصل کیں لیکن کبھی کسی نے سجدہ شکرادا نہیں کیا جب ان سابقون کا یہ طریق نہ تھا اور مدینہ میں اس پر عمل نہیں تو ہم کیوں ایک بدعت کو اختیار کریں۔اسی نظریہ کی بنا پر آپ نے مندرجہ ذیل صورتوں کی بھی مخالفت کی۔

(الف)۔سجدات تلاوت :اس سلسلہ میں مروی روایت کو آپ نے اس بنا پر رد کر دیا کہ اہل مدینہ کے ہاں یہ رواج[3] نہیں ہے۔

ب۔یہ روایت کہ رمضان کے معاً بعد شوال کے چھ روزے رکھنا باعث ثواب ہے۔امام مالک کے نزدیک یہ روایت اس لئے درست نہیں کہ یہ سد ذرائع کے خلاف ہے لوگ اس طرح ان چھ روزوں کو بھی رمضان جیسی اہمیت دینے لگیں گے۔

ج۔کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے (خواہ وہ فوت شدہ یا معذور ہو) نہ حج کر سکتا ہے اور

---

[1] الذی یکثر وقوعه وتعم به البلوٰی (الامام الشافعی صفحه ۱۳۷)

[2] مالک بن انس صفحه ۱۸۵،۱۹۴۔ ابو حنیفه صفحه ۱۵۸۔ الامام الشافعی صفحه ۲۳۷،۲۳۸

[3] احب الاحادیث الی ما اجتمع علیه الناس وهذا عالم یجتمع علیه الناس (مالک بن انس صفحه ۱۷۹)

نہ روزے رکھ سکتا ہے اس بارہ میں جو روایت ہے امام مالک کے نزدیک وہ اس لئے درست نہیں کہ یہ قرآنی ارشاد لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی [۱] کے خلاف ہے نیز سب کے نزدیک کوئی کسی دوسرے کی جگہ نماز نہیں پڑھ سکتا۔ غرض عبادات میں آپ نیابت کے قائل نہ تھے۔

د۔ یہ روایت کہ تقسیم سے پہلے غنیمت میں پکڑے گئے جانوروں کو ذبح کرنا منع ہے۔ امام مالک کے نزدیک درست نہیں کیونکہ جنگ کے حالات کا تقاضا ہے کہ ایسی حالت میں کھانے پینے کی چیزوں کے استعمال کی کھلی اجازت ہو۔ جنگ کے حالات میں ایسی ممانعت نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔

ہ۔ **اَلْبَیِّعَانِ بِالْخِیَارِ مَا لَمْ یَتَفَرَّقَا** ۔ یہ روایت امام مالک کے نزدیک درست نہیں کیونکہ اہل مدینہ کے ہاں ایسا رواج نہیں [۲] حالانکہ اکثر محدثین کے نزدیک یہ روایت صحیح ہے۔

و۔ ایک دفعہ امام ابو یوسف نے امام مالک کے سامنے یہ روایت بیان کی کہ علاقہ شام میں حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ کی موجودگی میں حضرت بلالؓ نے جس طرح اذان دی اسی طرح ہم بھی اذان دیتے ہیں لیکن امام مالک نے یہ کہہ کر امام ابو یوسف کے موقف کو رد کر دیا کہ اہل مدینہ کا معروف عمل اس کے خلاف ہے۔ [۳]

ز۔ امام مالک سے پوچھا گیا کہ مسجد میں خاص حلقہ بنا کر قرآن شریف پڑھا جاتا ہے یا خاص انداز میں جہراً ذکر الٰہی کیا جاتا ہے کیا اس قسم کے رواج جائز ہیں؟ تو امام مالک نے فرمایا یہ سب بدعت ہیں کیونکہ ایسا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا نہ آپ کے صحابہؓ نے اور نہ اہل مدینہ ایسا کرتے ہیں۔ [۴]

اس ساری بحث سے ظاہر ہے کہ قطع نظر اس بحث کے کہ کسی حدیث کے راوی قوی ہیں یا ضعیف دوسری وجوہات کی بنا پر حدیث کی صحت پر امام مالک کو اعتراض تھا۔ کہیں کہا گیا اہل مدینہ کے عمل کے خلاف ہے کسی جگہ ظاہر قرآن سے مخالفت کو بنیاد بنایا گیا ہے اور کہیں مصلحت قوم یا سد ذرائع کے اصول کو مدنظر رکھ کر روایت کو رد کیا گیا۔

---

۱ الانعام: ۱۶۵　　۲ مالک بن انس صفحہ ۲۲۹ حاشیہ

۳ ابو حنیفہ صفحہ ۱۵۷

۴ قال مالک لم یکن بالامر القدیم انما ھو شیٔ اُحْدِثَ ۔ (مالک بن انس صفحہ ۱۷۷)

۱۰۔ بعض اوقات علاقائی عقیدت یا اپنے اپنے اساتذہ سے خصوصی تعلق بھی روایت حدیث کی ترجیح کا باعث بن جاتا ہے حالانکہ خود حدیث کے راویوں کے ثقہ ہونے پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً ایک دفعہ امام ابوحنیفہ سے امام اوزاعی نے پوچھا کہ تم لوگ رکوع میں جاتے وقت اور اس سے اٹھتے وقت اور نماز کے دوسرے موقعوں پر رَفْعِ یَدَیْن کیوں نہیں کرتے؟ یعنی ہاتھ کیوں نہیں اٹھاتے۔ امام ابوحنیفہ نے جواب دیا کہ اس بارہ میں کوئی صحیح حدیث ہمیں نہیں ملی۔ امام اوزاعی نے جواب دیا حدیث تو ہے زہری سالم سے اور وہ اپنے باپ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے وقت، رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت ہاتھ اٹھایا کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہ نے جواب میں کہا ہمارے استاد حماد نے ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے اپنے استاد علقمہ سے سنا کہ عبداللہ بن مسعود بیان کیا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف نماز شروع کرتے وقت ہاتھ اٹھایا کرتے تھے، اس کے بعد کسی جگہ ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ امام اوزاعی نے اس پر کہا۔ زہری، سالم اور عبداللہ بن عمرؓ جیسے مانے ہوئے مدینہ کے راویوں کے مقابلہ میں آپ کس کا نام لے رہے ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے جواب دیا حماد، زہری سے زیادہ فقیہ ہیں اور ابراہیم، سالم سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ رہے عبداللہ بن مسعود تو بھلا ان کا مقابلہ کون کرسکتا ہے؟ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پرانے رفیق، ہمیشہ ساتھ رہنے والے سربرآوردہ صحابیؓ ہیں۔ یہ جواب سن کر امام اوزاعی خاموش ہوگئے۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ فقہ کے دونوں اماموں میں سے کسی کو حدیث کے کسی راوی کی صداقت پر کوئی اعتراض نہیں تھا دونوں کے نزدیک راوی ثقہ اور معتبر ہیں، لیکن تفقہ میں تفاوت اور اپنی اپنی واقفیت اور عقیدت کے حوالہ سے ہر ایک اپنی بات پر زور دے رہا ہے۔

۱۱۔ بعض اوقات ایک مجتہد اور امام فقہ نے ایسے وقت میں اپنی کسی رائے کا اظہار کیا جبکہ اسے کسی حدیث کا علم نہیں تھا اور دوسرے عالم کے علم میں یہ حدیث آئی تو اس وجہ سے دونوں کی رائیں مختلف ہوگئیں ایک کی رائے اپنے اجتہاد کی بنا پر تھی اور دوسرے کی مروی حدیث کی بنا پر۔ پہلے کو اصلاح کا موقع نہ مل سکا کیونکہ وہ ایسے علم سے پہلے فوت ہوگیا تھا۔ اس طرح قبول حدیث کے بارے میں اس امام کے مقلدین تردد میں پڑ گئے۔

۱۲۔ بعض اوقات حزبی تعصب کی وجہ سے بھی قبول حدیث کے بارہ میں اختلاف ہوا۔ مثلاً شیعہ عام صحابہؓ اوران کے شاگردوں کی روایات کو قبول نہیں کرتے اس کے بالمقابل بنواُمیہ اوران کے حامی جو اس وقت برسر اقتدار تھے حضرت علیؓ اوران کے حامیوں کی روایات کو کوئی دینی وقعت دینے کے لئے تیار نہ تھے۔[1]

اسی طرح خوارج ان صحابہؓ کی روایات کو قبول نہیں کرتے تھے جو عثمانؓ کے آخری دور میں ان کے حامی تھے یا حضرت علیؓ کی حمایت کا دم بھرتے تھے۔معتزلہ کا رویہ بھی قبول احادیث کے بارہ میں حوصلہ افزا[2] نہ تھا۔اخبار احاد کی صحت اور حجیت کے بارہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو فرمایا ہے وہ موضوع کے علمی پہلو کو زیادہ واضح کرتا ہے۔آپ فرماتے ہیں۔

''اس میں شک نہیں کہ اکثر حدیثوں کے جمع کرنے والے بڑے متقی اور پرہیز گار تھے۔انہوں نے جہاں تک ان کی طاقت میں تھا۔حدیثوں کی تنقید کی اور ایسی حدیثوں سے بچنا چاہا جو ان کی رائے میں موضوعات میں سے تھیں اور ہر ایک مشتبہ الحال راوی کی حدیث نہیں لی۔بہت محنت کی مگر تاہم چونکہ وہ ساری کارروائی بعد از وقت تھی اس لئے وہ سب ظن کے مرتبہ پر رہی۔[3]

بایں ہمہ یہ سخت ناانصافی ہوگی کہ یہ کہا جائے کہ وہ سب حدیثیں لغو اور نکمی اور بے فائدہ اور جھوٹی ہیں بلکہ ان حدیثوں کے لکھنے میں اس قدر احتیاط سے کام لیا گیا ہے اور اس قدر تحقیق اور تنقید کی گئی ہے جو اس کی نظیر دوسرے مذاہب میں نہیں پائی جاتی۔تاہم یہ غلطی ہے کہ ایسا خیال کیا جائے کہ جب تک حدیثیں جمع نہیں ہوئی تھیں اس وقت تک لوگ نمازوں کی رکعات سے بے خبر تھے یا حج کرنے کے طریق سے ناآشنا تھے کیونکہ سلسلہ تعامل نے جو سنت کے ذریعہ سے ان میں پیدا ہو گیا تھا تمام حدود اور فرائض اسلام ان کو سکھلا دیئے تھے...... تاہم حدیثوں نے اس نور کو زیادہ کیا گویا اسلام نُوْرٌ عَلٰی نُوْر ہو گیا اور حدیثیں قرآن اور سنت کے لئے گواہ کی طرح کھڑی ہو گئیں۔

---

[1] ان اعظم تُهمةٍ كانت تؤدي بالنّاس في ايّام حجّاج ان يحب رجل عليًا ولا يتبرء منه (اَلصّلة بَيْنَ التّصوُّف والتَّشَيُّع صفحه ۴۹۰)

[2] مالک بن انس صفحہ ۱۸۳

[3] كان احاديث رسول الله صلى الله عليه وسلم غير مدوّنة في كتاب بل كان يتلقى من أفواهِ الرّجال (محاضرات في تاريخ المذاهب الفقهية صفحه ۲۱۰)

ہماری جماعت کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ اگر کوئی حدیث معارض اور مخالف قرآن اور سنت نہ ہو تو خواہ کیسی ہی ادنیٰ درجہ کی حدیث ہو اس پر وہ عمل کریں اور انسان کی بنائی ہوئی فقہ پر اس کو ترجیح دیں[1]۔

حدیث سے متعلق چند مزید اصطلاحات

مَرْفُوع وہ حدیث ہے جس کی سند میں صحابی یہ کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا، یا ایسا کہا ہے یعنی بات آنحضرتؐ تک پہنچائی گئی ہو۔

مُرْسَل وہ حدیث ہے جس کی سند میں صحابی کا ذکر نہ ہو۔ تابعی کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے۔

مُنْقَطِع وہ حدیث ہے جس کی سند میں صحابی کی بجائے کوئی اور راوی رہ گیا ہو۔ بَلَاغَات سے مراد یہ ہے کہ راوی کہے۔ بَلَغَنِيْ عَنِ الثِّقَةِ

مُعَلَّق وہ روایت ہے جس کی ابتدائی سند بیان نہ ہوئی ہو مثلاً دوسری یا تیسری صدی کا راوی کہے **عن ابن عمر قال، قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم**۔

مَوْقُوْف وہ حدیث ہے جس میں بات صحابی پر ختم کردی گئی ہوئی کہ فلاں صحابی نے یہ بات بطور حدیث بیان کی ہے۔ اس کا نام اثر بھی ہے۔

مَقْطُوع وہ حدیث ہے جس میں تابعی یا تبع تابعی وغیرہ پر بات ختم کردی گئی ہو۔

ضَعِیْف وہ حدیث ہے جس کی سند کے کسی راوی کا حافظہ کمزور ہو یا راوی نے اپنے سے زیادہ ثقہ راوی کی مخالفت کی ہو یا اسی قسم کا کوئی اور نقص ہو۔

حَسَن وہ حدیث ہے جس کی کمزوری کو دوسرے شواہد کے ذریعہ دور کر دیا گیا ہو۔

صَحِیْح وہ حدیث ہے جس میں صحت کی تمام شرائط موجود ہوں۔ سند مرفوع متصل ہو۔ راوی سارے ثقہ ہوں۔ متن قرآن کریم کے مخالف نہ ہو وغیرہ[2]۔

---

[1] ریویو بر مباحثہ بٹالوی و چکڑالوی، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۲۱۱، ۲۱۲

[2] مالک بن انس صفحہ ۱۹۲ حاشیہ

فتاویٰ صحابہؓ

فقہائے اربعہ نے صحابہؓ کے فتاویٰ کو بھی دینی سند اور شرعی ماخذ کے طور پر تسلیم کیا ہے کیونکہ صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے اور مقاصد شریعت کو زیادہ اچھی طرح جانتے تھے۔[1] بعض دوسرے علماء اس بات کے قائل ہیں کہ اگر تو صحابہؓ کا فتویٰ آنحضرتؐ کے کسی ارشاد پر مبنی تھا تو وہ بلاشک حجت شرعیہ اور واجب التسلیم ہے اور اگر اس کی بنیاد صحابیؓ کے ذاتی اجتہاد پر تھی تو اس میں ساری امت کے علماء ان کے ساتھ شریک ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

یہ جو بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ملفوظات قلمبند کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے یا آپ کے پہلے دو خلفاء کثرت روایت کو پسند نہیں کرتے تھے تو اس ممانعت کی وضاحت یہ ہے کہ ایسا حکم اس احتیاط کی بنا پر تھا کہ قرآن کریم ہر قسم کے اشتباہ سے بچایا جائے اور دوسرے لوگوں کو متنبہ کیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی جھوٹی یا غلط بات منسوب کرنا ایک سنگین جرم ہے اور اس کی روک تھام ضروری ہے۔[2] ورنہ آپ کا تواتر عملی ہمیشہ واجب الاتباع سمجھا جاتا رہا ہے۔ خود آپؐ کا فرمان ہے صَلُّوْا کَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ۔[3] تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح میں پڑھتا ہوں۔ اسی طرح فرمایا عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ[4] کہ میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء کی سنت کی پیروی کرو اور اسے اپناؤ۔

---

[1] قال مالک قول الصحابةؓ سنة تتبع لأنهم الذين شاهدوا و عاينوا و تلقوا عِلْمَ رسول الله ﷺ ...... و يقول ابو حنيفة ان كان للصحابة رأى واحد اخذت به وان اختلفوا اخترت من آرائهم ولا أخرج عنهما إلى آراء غيرهم و اذا جاء الامر الى ابراهيم و الحسن (اى التّابعى) فهم رجال و نحن رجال (محاضرات فى تاريخ المذاهب الفقهيّة صفحه ۸۳،۸۰)

[2] كان ابوبكر لا يقبل الحديث إلّا من اثنين . وعلىّ بن ابى طالب لا يقبل الحديث إلّا بعد إستحلافِ قائله (تاريخ التشريع الاسلامى صفحه ۱۳۶و۱۴۰)

[3] بخارى كتاب الاذان باب الاذان للمسافرين

[4] ترمذى كتاب العلم باب ما جاء فى الأخذ بالسنة

آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ دیا اس کے بارہ میں فرمایا: **اَلَا لِيُبَلِّغَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَلَعَلَّ بَعْضُ مَنْ يُّبَلِّغُهُ يَكُوْنُ اَوْعٰى لَهُ مِنْ بَعْضِ مَنْ سَمِعَهُ** [1] یعنی جو یہاں موجود ہیں اور میرا یہ خطبہ سن رہے ہیں وہ ان لوگوں تک یہ باتیں پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں (یا میری باتیں نہیں سن سکے) کیونکہ ایسا ہوسکتا ہے کہ پہنچانے والے سے زیادہ وہ شخص بات کو یاد رکھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے والا ہو جسے بات پہنچائی گئی ہے۔

حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں مسائل پیش آمدہ کے بارہ میں فیصلہ کرتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کو مدنظر رکھتے تھے جن کا انہیں علم ہوتا اور لوگوں سے بھی دریافت کرتے رہتے کہ اس بارہ میں کسی کو حضورؐ کے کسی ارشاد کا علم ہو تو وہ بیان کرے۔[2]

---

[1] مسند احمد جلد اوّل: صفحہ ۲۳، ۲۳۴ جلد ۲ صفحہ ۶۷۲ مطبوعہ بیروت

[2] محاضرات فی تاریخ المذاهب الفقهیه صفحہ ۱۶

اِجْمَاع

احکام شرعیہ کا تیسرا ماخذ اجماع ہے۔ اجماع سے مراد اُمت مسلمہ کے ارباب حل وعقد اور اجتہاد کا ملکہ رکھنے والے اصحاب علم کا کسی ایسے مسئلہ کے بارے میں اتفاق ہے جس کی ٹھیک ٹھیک وضاحت قرآن یا سنت ثابتہ میں موجود نہ ہو۔ صحابہؓ کے ایسے اتفاق اور اجماع کو اہل السنّت والجماعت حجت شرعیہ تسلیم کرتے ہیں۔[1]

صحابہؓ کے بعد آنے والے مجتہدین کے اتفاق کی کیا اہمیت ہے۔ اس سلسلہ میں اختلاف ہے بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اصولاً یہ اتفاق بھی اجماع اور واجب التسلیم ہے[2] اور بعض دوسرے اہل علم کا کہنا ہے کہ دور صحابہ کے بعد ایسے اجماع کا وجود مشتبہ ہے۔ نہ یہ معین ہے کہ بعد کے زمانہ میں کون کون علماء درجہ اجتہاد پر فائز تھے اور کہاں کہاں اور کس کس ملک میں وہ رہتے تھے اور نہ کسی مسئلہ پر ان سب کے اتفاق کا علم عملاً میسر آسکتا ہے۔[3]

امام مالک اہل مدینہ کے اجماع کو بھی بطور حجت شرعیہ تسلیم کرتے ہیں کیونکہ اہل مدینہ صحابہؓ کے عمل مستمر کے شاہد اور گواہ ہیں اور ان کے اتفاق کو جو انتخاب خلافت کے سلسلہ میں تھا

---

[1] هناک اجماع لا يُسَاغ بمُسلم ان ينكره كالاجماع على عدد ركعات الصّلوة وعدد الفرائض وفرضيّة الزكوٰة و غيرها يخرج عن الاسلام من لم يؤمن بها لِاَنَّ هذا الاجماع مُعْتَمَدٌ على أقوى النّصوص سندا و دلالة و لان العلم بهٰذه الامور علم العامة اى العلم الذى لا يسع لِمُسْلم اَنْ يَّجْهَلَهُ . (محاضرات فى تاريخ المذاهب الفقهيّة صفحه ۷۲،۷۳)

[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ اِنَّ اُمَّتِیْ لَا تجتمع على ضلالة ۔(ابوداؤد كتاب الفتن باب ذكر الفتن ۔ سنن ابن ماجه كتاب الفتن باب السواد الاعظم)

[3] لايمكن ان يتّفق العلماء فى كلّ اَلْاَقاليم الاسلامية المتنائية على رأى واحدٍ ۔(محاضرات فى تاريخ المذاهب الفقهيه صفحه ۷۴)

واجب التسلیم مانا گیا ہے۔[1] شیعہ بھی اپنے مجتہد علماء کے اجماع کو شرعی حجت اور واجب التسلیم قرار دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اگر یہ اجماع غلط ہوتا تو امام غائب خاموش نہیں رہ سکتے تھے وہ ضرور ظاہر ہو کر اس کی تصحیح فرما دیتے۔[2]

[1] انفرد مالک من بین الفقهاء ان اجماع اهل المدینة یلزم کل الامصار لان اهل المدینة هم حملة السنة النبویة وهم اهل الحل والعقد ...... و مبایعتهم کافیة لانعقاد البیعة .(مالک بن انس صفحه ۱۷۴۔محاضرات صفحه ۷۸)

[2] قال الشیعة ان اجماع مجتهدیهم حجة صحیح لانه لو کان باطلا ماسکت الامام الغائب بل یظهر ویعلن الحق۔(محاضرات فی تاریخ المذاهب الفقهیه صفحه ۷۷)

رائے یا اجتہاد

شریعت اسلامیہ کا چوتھا ماخذ ''رائے'' ہے یعنی کوئی عالم یا چند عالم مل کر سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد جو رائے قائم کریں اس کے مطابق عمل کرنا خود ان علما کے لئے بھی ضروری ہے اور ان کے لئے بھی جو ان علماء کے زیر اثر ہیں بشرطیکہ یہ ''رائے'' ان شرائط کے مطابق ہو[1] جن کی تفصیل صفحات آئندہ میں پیش کی جا رہی ہے۔

''رائے'' جس کو ایک حد تک شرعی تقدس حاصل ہے وہ آزادانہ رائے نہیں جو انسان اپنے طور پر اپنی سمجھ اور غور و فکر کے بعد قائم کرتا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ کا حل قرآن کریم یا حدیث صحیحہ سے بالصراحت معلوم نہ کیا جا سکے اور نہ اجماع کے ذریعہ کوئی وضاحت ملے تو پھر قرآن کریم کے مقاصد عامہ اور حدیث کے اصول مبینہ کی روشنی میں اُمت کی بہبود اور مصلحت عامہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے منشاء اور اس کی مرضی کے بارہ میں درجہ اجتہاد پر فائز علماء معلومات حاصل کریں۔ اسی انداز غور و فکر اور کوشش کا دوسرا نام اجتہاد اور رائے ہے۔
اجتہاد بالرائے یعنی مذکورہ بالا انداز غور و فکر کے ذریعہ کوئی رائے قائم کرنے یا کسی فیصلے کے اظہار کی شرعی حیثیت کے بارہ میں خاصہ اختلاف ہے۔ بعض صحابہؓ اور کئی تابعین دینی معاملات میں کسی ''رائے'' کے اظہار سے بچتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ بڑے ظلم کی بات ہے کہ ہم اپنی کسی ''سوچ اور رائے'' کو خدائی حکم یا خدائی منشاء کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کریں[2] اور کہیں کہ ''اس کے

---

[1] اَلرَّأيُ مايراه القلب بعد فكر و تأمل و طلب لمعرفة وجه الصواب أو تأمل وتفكير في تعرُّف ما هوَ الاَ قْرَبُ اِلى كتاب اللّٰه وسنّة رسوله صلى الله عليه وسلم . (محاضرات فى تاريخ المذاهب الفقهيه صفحه ١٧ و٢٦)

[2] من الفقهاء من يقول لا يصلح اخذ الاحكام الاسلاميّة الّا من النّصوص كداوٗد الظّاهرى و ابن الحزم الأندلسيّ. ... . ولكن الذين اخذوا بالرّأى عند عدم وجود نصّ ظاهرٍ هم الأكثرون بل يكاد ينعقد الاجماع على الاجتهاد بالرّأى ۔ (محاضرات فى تاريخ المذاهب الفقهيه صفحه ٦٩)

مطابق تم عمل کرو ورنہ خدا ناراض ہوگا۔" وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اجتہاد بالرائے اختلاف بڑھانے کا سبب ہے ایک انسان کوئی رائے رکھتا ہے اور دوسرا کوئی۔ کس کی رائے کو "الٰہی منشاء" قرار دیا جائے اور کس کی رائے کو مسترد کیا جائے۔ اس بنا پر ایسی سوچ رکھنے والے علماء کے سامنے جب بھی کوئی سوال آتا اور قرآن کریم یا حدیث صحیح میں اس کا حل نہ ملتا تو وہ اس سوال کا جواب نہ دیتے یا بامر مجبوری اگر جواب دینا پڑتا تو ساتھ کہہ دیتے کہ یہ میری رائے ہے۔ اگر یہ غلط ہے تو یہ میری سمجھ کا قصور ہے اور اگر خدا کے نزدیک یہ درست ہے تو یہ میری خوش قسمتی ہے۔[1] ایک دفعہ حضرت ابن عباسؓ سے ایک سوال پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا لَا اَدْرِیْ۔ سائل نے عرض کیا اپنی ذاتی رائے بتا دیجیے۔ آپ نے جواب دیا۔ اللہ سے ڈرتا ہوں کہ پھسل جاؤں اور غلط بات کہہ بیٹھوں۔[2]

امام مالک کہتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر کے بعض علماء کو دیکھا ہے جب ان سے کسی دینی مسئلہ کے بارہ میں کوئی سوال کیا جاتا تو انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے موت ان کے سر پر منڈلا رہی ہے۔[3]

مدینہ کے مشہور تابعی فقیہ قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ ایک دفعہ حج پر گئے تو منیٰ میں ان سے بے شمار سوال کئے گئے وہ اکثر سوالات کے جواب میں کہتے۔ لَا اَدْرِیْ لَا اَعْلَم میں نہیں جانتا مجھے اس کا جواب معلوم نہیں۔ آخر میں تنگ آ کر آپ نے کہا وَاللّٰہِ مَا نَعْلَمُ مَا تَسْئَلُوْنَنَا وَ لَوْ نَعْلَمُ مَا کَتَمْنَا کُمْ۔ امام شافعی کہا کرتے تھے کہ حدیث پر عمل کرو اور "رائے" کو ترک کردو۔[4]

امام مالک اس بات کو سخت ناپسند کرتے کہ فرضی سوال کئے جائیں۔ سوال کرنے والے سے آپ اکثر پوچھ لیا کرتے تھے کہ یہ واقعہ ہوا ہے یا فرض کر کے تم پوچھ رہے ہو۔[5] اس کے برخلاف اہل عراق خاص طور پر حنفی فرضی سوال بنا کر ان کے جواب تیار کرتے اور کہتے کہ لوگوں کی رہنمائی اور ازدیاد علم کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے تا کہ وقت پڑنے پر جواب دینے میں آسانی ہو۔[6]

---

[1] کان یقول ابو بکر الصدیقؓ ھذا رایی فان یَک صوابًا فمن عند اللّٰہ وان یَک خطأً فمنّی ومن الشیطان (الامام الشافعی صفحہ ۱۰۴، ابو حنیفہ صفحہ ۱۴۷)

[2] الامام الشافعی صفحہ ۱۰۴ — [3] مالک بن انس صفحہ ۹۰

[4] قال الشافعی علیکم بحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ودعوا الرای. (الامام الشافعی صفحہ ۱۰۷)

[5] الامام الشافعی صفحہ ۲۴۲

[6] مزید تفصیل کے لئے دیکھیں الامام الشافعی صفحہ ۱۱۷، ۱۳۹۔ مالک بن انس صفحہ ۵۱، ۹۱، ۲۱۸۔ (محاضرات فی تاریخ المذاھب الفقھیہ صفحہ ۲۳۰۔ ابو حنیفہ صفحہ ۱۵۰، ۱۵۱۔ الامام احمد بن حنبل صفحہ ۲۱۸)

اگر غور کیا جائے اور گہری نظر ڈالی جائے تو ''رائے'' کے بارہ میں اختلاف از قسم نزاع لفظی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فقہ کے تمام علماء کسی نہ کسی رنگ میں اور کسی نہ کسی درجہ میں ''رائے'' کے قائل ہیں اور رائے سے کام لیتے رہے ہیں فرق صرف قلت یا کثرت کا ہے، اسلوب اور انداز کا ہے، نام اور اصطلاح کا ہے۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو ذمہ داری کے مقام پر فائز تھے وہ کسی قسم کی فنی یا اصطلاحی پیچیدگیوں میں الجھے بغیر حسب ضرورت و حالات ''رائے'' سے کام لیتے اور سوچ بچار کے بعد ضروری فیصلے کرتے۔ ''رائے'' کا اس طرح استعمال انفرادی بھی تھا اور اجتماعی بھی اور اس کی متعدد مثالیں تاریخ نے محفوظ کی ہیں۔ مثلاً

۱۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب یمن کی طرف والی بنا کر بھیجا تو انہوں نے حضورؐ کے پوچھنے پر عرض کیا میں قرآن و سنت کے بعد اپنی رائے اور سمجھ سے کام لے کر فیصلے کیا کروں گا اور حضورؐ نے ان کے اس اظہار کی تصدیق فرمائی۔[۱]

۲۔ جنگ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ پڑاؤ کیا ایک صحابیؓ نے عرض کی اگر تو یہ پڑاؤ اللہ کے حکم کے ماتحت ہے تو مجال کلام نہیں لیکن اگر آپ نے اپنے طور پر فیصلہ فرمایا ہے تو جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام مناسب نہیں وہ سامنے پانی ہے اس کے قریب لشکر قیام کرے پانی حاصل کرنے میں آسانی رہے گی دوسرے دشمن پر دباؤ قائم رکھنے کا مناسب موقع ملے گا۔ حضور نے اس صحابیؓ کے اس مشورہ کو پسند فرمایا اور اس کی بتائی ہوئی جگہ میں لشکر کو ٹھہرایا۔

۳۔ جنگ احزاب کے دنوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظه کی سرکوبی کے لئے ایک مہم بھیجی اور دستہ کو حکم دیا کہ بڑی تیزی سے جائیں اور عصر کی نماز بنو قریظه کی بستی میں جا کر پڑھیں۔ تیز چلنے کے باوجود عصر کی نماز میں دیر ہو رہی تھی۔ بعض صحابہؓ نے کہا کہ حضور کے فرمان کا منشاء جلدی پہنچنے کا تھا اس لئے انہوں نے عصر کی نماز راستہ میں ہی پڑھ لی۔ کچھ صحابہؓ نے اس بات پر اصرار کیا کہ حضورؐ کے فرمان کی لفظ بلفظ تعمیل ہونی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے سورج ڈوبنے کے بعد بنو قریظه کی بستی میں پہنچ کر نماز پڑھی۔ حضورؐ کے علم میں یہ بات آئی لیکن حضورؐ

۱۔ ابو داؤد کتاب الاقضیة باب اجتهاد الرأی بالقضاء

نے کسی کے استدلال کو رد نہ فرمایا۔[۱]

۴۔حضرت علیؓ یمن کے والی تھے آپ کے سامنے یہ کیس آیا کہ ایک لڑکے کے بارہ میں تین دعویدار تھے کہ یہ ان کا بیٹا ہے ثبوت کسی کے پاس نہ تھا۔آپ نے قرعہ ڈالا جس کے حق میں قرعہ نکلا اس کے سپرد کیا اور دوسرے دو کو اس سے 2/3 دیت دلوائی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس فیصلہ کا علم ہوا تو آپ نے حضرت علیؓ کی فراست کو سراہا اور خوش ہوئے۔[۲]

۵۔ایک شخص فوت ہوا۔دادا اور بھائی وارث چھوڑے۔حضرت ابو بکرؓ کی رائے تھی کہ دادا کی موجودگی میں بھائی وارث نہیں ہو سکتے۔حضرت زید بن ثابتؓ کی رائے تھی دادا کے ساتھ بھائی وارث ہوں گے۔دادا کو ایک بھائی کے برابر حصہ ملے گا بشرطیکہ وہ ثلث 1/3 ترکہ سے کم نہ ہو۔[۳]

۶۔حضرت عمرؓ کے سامنے سوال آیا کہ ایک عورت فوت ہوئی ہے اس کے سگے بھائی بھی موجود ہیں اور اخیافی بھی نیز خاوند بھی زندہ ہے۔آپ نے فیصلہ فرمایا کہ سگے بھائی محروم ہوں گے اور اخیافی بھائی اور خاوند وارث ہوں گے۔ایک سال بعد ایسے ہی ایک کیس میں آپ نے پہلے فیصلہ کے خلاف فیصلہ دیا اور سگے بھائیوں کو بھی حصہ دلایا۔[۴]

۷۔ایک سادہ اور ان پڑھ لونڈی زنا کے جرم میں پکڑی گئی پوچھنے پر وہ کہنے لگی فلاں مرد نے دو درہم دیئے تھے پھر میں کیا کرتی۔حضرت عمرؓ نے موجود صحابہؓ سے مشورہ لیا۔حضرت عثمانؓ نے کہا ان پڑھ اور ناواقف ہے اسے کچھ علم نہیں۔سزا تو اسے دی جاسکتی ہے جو کچھ جانتا ہو اور احکام الٰہی کا تھوڑا بہت علم رکھتا ہو۔حضرت عمرؓ نے یہ مشورہ قبول کیا اور لونڈی کو سزا نہ دی۔

۸۔حضرت عثمانؓ نے جمعہ کے روز دوسری اذان کا طریق جاری کیا تاکہ لوگ تیار ہو کر بر وقت جمعہ کی نماز کے لئے پہنچ سکیں۔[۵]

۹۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے سامنے یہ کیس آیا کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا اور مہر مقرر نہ کیا ابھی رخصتانہ نہیں ہوا تھا کہ وہ شخص فوت ہو گیا۔حضرت ابن مسعودؓ نے فتویٰ دیا کہ اس عورت کو مہر مثل دیا جائے۔

۱،۲ ابو حنیفہ ص ۱۷۰

۳ محاضرات فی تاریخ المذاهب الفقهیه صفحه ۲۷

۴ ابو حنیفه صفحه ۱۴۷ ۵ ابو حنیفه صفحه ۱۴۸،۱۴۹

یہ تو انفرادی سوچ یا جزوی مشورہ کی بنا پر "رائے" کے اظہار یا فتویٰ دینے کی مثالیں ہیں اجتماعی مشورہ کی مثالیں بھی متعدد ہیں۔ صحابہؓ حسب ضرورت دینی مسائل میں اپنی رائے کا اظہار کرتے اور ضروری فیصلے دیتے۔

۱۰۔ بیعت خلافت صحابہؓ کے مشورہ سے ہی منعقد ہوئی۔ حضرت ابو بکرؓ نے صحابہؓ کے مشورہ سے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ سرکاری طور پر مستند "مصحف امام" صحابہؓ کے مشورہ کے بعد ہی تیار ہوا۔[1] سواد عراق کی زمینیں صحابہؓ سے مشورہ کرنے کے بعد حکومت کی ملکیت میں رہنے دی گئیں اور سابقہ دستور کے مطابق فاتح افواج میں تقسیم نہ کی گئیں۔[2]

غرض صحابہؓ حسب ضرورت و حالات رائے کے اظہار اور اپنے اجتہاد کے مطابق فیصلہ دینے میں کوئی حرج محسوس نہ کرتے۔ اگر فوری طور پر ضرورت کے وقت انہیں قرآن و حدیث کی کوئی نص نہ ملتی تو بلا کسی توقف اور مزید تلاش کے ان کے فیصلے صادر ہوتے۔[3] جن صحابہؓ کے بارہ میں یہ مروی ہے کہ وہ رائے کے اظہار میں توقف فرماتے تھے وہ وہ ہیں جن کے سپرد کوئی ذمہ داری نہ ہوتی یا مسائل بیان کرنا وہ اپنا منصب نہیں سمجھتے تھے یا وہ فرضی سوالوں کے جواب سے بچنا چاہتے تھے۔ تاہم اس خدشہ کی روک تھام ضروری سمجھی گئی کہ کج ذہن عناصر "آزادانہ" سوچ کے نام پر گمراہی نہ پھیلا سکیں اور خلاف اسلام نظریات کی اشاعت کا موجب نہ بنیں۔ چنانچہ صحیح رائے پر کھنے اور درست اجتہاد کی راہ ہموار کرنے کے علماء اسلام نے جو اصول تجویز کئے ان کا مختصر بیان "اجتہاد" کے عنوان کے تحت پیش کیا جا رہا ہے۔

انفرادی اور اجتماعی اجتہاد اور اس کی ضرورت

اجتہاد کے لغوی معنے کسی اہم مقصد کے حصول کے لئے پوری پوری جان توڑ کوشش کرنا اور فقہاء

---

[1] ابو حنیفہ صفحہ ۱۴، ۱۴۹، ۱۶۰

[2] الامام الشافعی صفحہ ۲۰۸

[3] عمل الصحابة بما رأوه مصلحة فى شئون المعاملات السّياسيّة والتّدبير و مصالح المرْسلة .... وقد عمل عمرؓ عظام الأعمال دون بحث عن نصوص تشهد لها إلّا كليات الشريعة فى المصلحة (مالک بن انس صفحہ ۱۷۱، ۲۰۷)

کی اصطلاح میں قرآن وحدیث کے دلائل کو سامنے رکھ کر احکام شرعیہ عملیہ کے معلوم کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کر دینے کا نام اجتہاد ہے۔[1] یہ کوشش جس کا نام اجتہاد ہے اُمت مسلمہ کے علماء اور فقہاء کے لئے واجب ہے کیونکہ زندگی کے بے شمار پہلو ہیں ہر پہلو کے لئے شریعت نے ایک خاص ہدایت اور ایک خاص حکم دیا ہے جس کا معلوم کرنا ضروری ہے اور یہ علم اُمت کے فقہاء اور علماء ہی بہم پہنچا سکتے ہیں[2]۔ اجتہاد کے جواز یا وجوب کے بارہ میں وہی اختلاف ہے جو ''رائے'' کے بارہ میں ہے کیونکہ بظاہر اجتہاد اور رائے ایک ہی چیز کے دو نام ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد کا مفہوم رائے کے مفہوم سے زیادہ وسیع اور عام ہے۔ قرآن کریم کے لغوی معنوں پر غور کر کے کوئی حکم مستنبط کرنے کا نام بھی اجتہاد ہے۔ کسی حکم کے بارہ میں حدیث تلاش کرنا اور اسے بطور دلیل پیش کرنا اور لغت کے لحاظ سے اس کے معنے معیّن کرنے کو بھی اجتہاد کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بالمقابل ''رائے'' کا مفہوم محدود ہے۔..... اجتہاد کے بارے میں یہ جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس سے اختلافات ابھرتے ہیں اور تفرقہ بڑھتا ہے اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ اختلاف فروع اور جزئیات میں ہوتا ہے اور اگر عقل اور سمجھ سے کام لیا جائے اور لوگوں کی طبائع اور عادات پر نظر رکھی جائے تو اس اختلاف میں برکت اور سہولت ہے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَةٌ کہ تمدنی، تہذیبی اور معاشرتی مسائل میں گنجائش اور وسعت کے لحاظ سے میری امت کا اختلاف باعث رحمت ہے۔[3]

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اجتہاد کا تعلق ظن غالب اور ظاہر سے ہے حقیقت کیا ہے اور باطن میں

---

[1] الاجتهاد فی اللغة بذل غاية الجهد للوصول الی امر مّن الامور وفی اصطلاح الفقهاء بذل الفقيه وُسعه فی استنباط الاحكام العملية من ادلّتها التفصيليّة (محاضرات فی تاريخ المذاهب الفقهيه صفحه ۱۰۹)

[2] يقول الشافعی انّ لِلّٰه فی كلّ واقعة حكما معيّنًا وعلی المجتهد طلبه والعمل به۔
(الامام الشافعی صفحه ۲۲۴)

فالاجتهاد واجب للمجتهدين ... وليس لاحد ابدًا ان يقول فی شیءٍ حَلَّ اَوْ حَرُمَ اِلَّا من جهة العلم وجهة العلم الخبر فی الكتاب او السنّة او الاجماع اوالقياس ۔(الامام الشافعی صفحه ۲۱۷، ۱۳۸، ۲۴۸۔ مالک بن انس صفحه ۳۳)

[3] يقول عمر بن عبدالعزيز إنّ الصَّحابة فتحوا للناس باب الاجتهاد و جواز الاختلاف فيه لانهم لولم يفتحوه لكان المجتهدون فِی ضِيْقٍ ۔(محاضرات فی تاريخ المذا هب الفقهيه صفحه ۳۹)

کیا ہے یہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ انسان اس کے جاننے کا مکلّف نہیں۔ قاضی اور جج گواہوں کی بنا پر فیصلہ دیتا ہے وہ ان کے ظاہری حالات دیکھتا ہے اور ان کے صدق پر اعتبار کر کے فیصلہ کرتا ہے اور ملزم کو سزا سناتا ہے حالانکہ ممکن ہے کہ گواہ جھوٹ بول گئے ہوں اور ملزم بے گناہ ہو۔ اسی طرح ایک مجتہد مختلف دلائل اور حالات کو مدنظر رکھ کر پوری دیانتداری کے ساتھ ایک رائے کا اظہار کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ رائے درست ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ عنداللہ یہ رائے درست نہ ہو لیکن جب تک واضح دلائل سے یہ غلطی ظاہر نہ ہو جائے مجتہد کی رائے کو درست سمجھا جائے گا اور مجتہد پر کوئی الزام نہ ہوگا اور نہ اس رائے پر عمل کرنے والے کو گنہگار قرار دیا جائے گا۔ اسی اصل کی بنا پر کہا گیا ہے کہ قاضی اور مجتہد دیانتداری کے دائرہ میں رہ کر جو فیصلے کرتے ہیں اور جس رائے کا اظہار کرتے ہیں وہ اگر حقیقت حال کے بھی مطابق ہے تو انہیں دہرا اجر ملے گا اور حقیقت واقعہ کے لحاظ سے وہ فیصلہ غلط ہے تو انہیں ایک ثواب یعنی اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کرنے کا ثواب ملے گا۔[1]

مختلف پیش آمدہ مسائل و معاملات میں اجتہاد کی بنا پر فیصلہ دینے کی متعدد مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:۔

۱۔ مختلف پیشہ ور جیسے درزی، رنگریز، سنار وغیرہ اصلاً امین ہیں، ان کے پاس لوگ جو کپڑے، سونا چاندی رکھ آتے ہیں کہ انہیں سی دو یا رنگ دو یا زیور بنا دو یہ مال ان کے پاس امانت ہوتا ہے اگر ان کی کسی غلطی کے بغیر ضائع ہو جائے تو وہ ذمہ دار نہیں سمجھے جاتے۔ اصل مسئلہ یہی ہے لیکن حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پیشہ وروں کی کئی بددیانتیاں آپ کے سامنے لائی گئیں اس صورت حال کو دیکھ کر آپ نے فیصلہ دے دیا کہ آئندہ یہ لوگ ذمہ دار رہوں گے سوائے اس کے کہ سبب ضیاع بڑا واضح اور سب کے علم میں ہو۔ مثلاً سیلاب آیا یا نامعلوم وجہ سے آگ لگی اور بازار جل گیا۔ فیصلہ کی بنیاد یہ اجتہاد ہے کہ عوام کو نقصان سے بچایا جائے۔

---

[1] یقول الشافعی امرنا باجازۃ شھادۃ العدل ولیس للعدل تَفَرُّقٌ بینہ وبین غیر العدل فی بدنہ ونفسہ و انّما علامۃ صدقہ بما یختبر من حال نفسہٖ .... فَاِذَا ظھر حسنہ قبلنا شھادتہ ...... وقال علیہ السلام اذا حکم الحاکم فاجتھد فاصاب فلہ اجران واذا حکم فاجتھد ثم اخطأ فلہ اجرٌ (الامام الشافعی صفحہ ۱۹۲، ۲۳۲)

۲۔ قتل خطاء کی دیت سو اونٹ ہے یا صحابہ کے وقت کے لحاظ سے ان کی قیمت آٹھ ہزار درہم تھی اور یہ دیت قاتل کے عاقلہ (جدی پشتی قبیلہ کے لوگ) ادا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حالات بدل گئے اونٹوں کی قیمت بڑھ گئی اور عاقلہ کی تعیین میں بھی تبدیلی آ گئی۔ چنانچہ آپ نے قیمت بھی بڑھا دی اور عاقلہ اس لشکر کو قرار دیا جس میں قاتل کام کرتا تھا اور جن کی فہرست میں اس کا نام درج تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ تبدیلی بھی اجتہاد کی بنا پر ہوئی۔ کوئی خاص معیّن نص تو سامنے نہ تھی۔[1]

۳۔ تسعیر کی اجازت نہیں تھی۔ تاجروں اور صارفین کے باہمی غیر شعوری تعاون کی بنا پر بھاؤ چلتے ہیں لیکن تابعین کے زمانہ میں تاجروں نے زیادتی شروع کر دی اور صارفین کے لئے پریشانی بڑھ گئی تو تابعین نے پبلک مصلحت کی بنا پر تسعیر کی اجازت کا فتویٰ دیا یعنی یہ فتویٰ کہ حکومت تاجروں اور صارفین دونوں کی بہبود کو مدنظر رکھ کر کسی چیز کا مناسب بھاؤ مقرر کر سکتی ہے۔[2]

نص تو بظاہر اس کے خلاف تھی لیکن پبلک مصلحت کے پیش نظر نص کی تحدید ضروری سمجھی گئی۔

ایک دفعہ امام شافعی نے اپنے شاگرد ابوثور سے پوچھا نماز کا آغاز فرض سے ہوتا ہے یا سنت سے؟ ابوثور درست جواب نہ دے سکے تو آپ نے وضاحت فرمائی کہ نماز کا آغاز فرض اور سنت دونوں سے بیک وقت ہوتا ہے تکبیر تحریمہ فرض ہے اور رفع یدین یعنی کانوں تک ہاتھ اٹھانا سنت ہے اور یہ دونوں کام بیک وقت کرنے ہوتے ہیں۔[3]

بہر حال اجتہاد کا عمل اپنی جگہ ضروری ہے کوئی ہوش منداس کا انکار نہیں کر سکتا لیکن اس مسئلہ میں ایک اہم پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا جس کی وجہ سے اُمت مسلمہ ایک بہت بڑے نقصان سے دوچار ہوئی اور اس کے باہمی اختلاف بڑھے۔ وہ پہلو جسے نظر انداز نہیں ہونا چاہیے تھا وہ اجتماعی اجتہاد اور شورائی نظام اور اس نظام کے احترام اور دوام کا پہلو تھا لیکن جس طرح خلافت راشدہ کی اہمیت اور اس کے احترام کو نظر انداز کیا گیا اسی طرح اجتماعی اجتہاد بھی جس پر صحابہؓ کاربند تھے

۱۔ احلّ عمرؓ اهل الدیوان محلّ العاقلة في التزام بالمَیّة (مالک بن انس صفحہ ۲۰۶)

۲۔ اجازوا السعیر لنظریة جلب مصلحةٍ ودرءِ مفسدةٍ ۔ (مالک بن انس صفحہ ۲۱۱، الامام الشافعی صفحہ ۲۰۹)

۳۔ الامام الشافعی صفحہ ۱۴۳

پیشِ نظر نہ رہا اور ہر صاحب علم اپنی اپنی جگہ اجتہاد کرنے لگا۔ ہر ایک اپنی سمجھ اور اپنے مجوزہ اصول کے تحت مسائل شرعیہ کی تصریح میں لگ گیا حالانکہ قرآن کریم اور ارشاد نبویؐ دونوں کا تقاضا تھا کہ قومی اور جماعتی مسائل میں اجتماعی اجتہاد کی راہ اختیار کی جاتی اور خلافت راشدہ کی نگرانی میں یہ عمل تکمیل کے مراحل طے کرتا اور مسائل شرعیہ عملیہ کی تعیین اور تطبیق کا فریضہ سرانجام دیا جاتا۔ انفرادی اجتہاد اور علمی بحث وسعت علمی اور آزادئ فکر کا موجب تو ہے لیکن وحدت قومی اور اتحاد عملی کے لئے اجتماعی اجتہاد کی ضرورت سے بھی کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا۔ انفرادی سوچ کی آزادی اور اجتماعی شوریٰ کی اہمیت دونوں کے درمیان توازن ہی قومی امنگوں کا امین ہے۔[1]

---

[1] قال اللّٰہ تعالی و امرھم شوریٰ بینھم ۔(الشوریٰ :۳۹) یعنی ان مومنوں کا طریق زندگی یہ ہے کہ ہر اہم معاملہ کو باہم مشورہ سے طے کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سوال کیا گیا۔ یا رسولَ اللّٰہ اَلْاَمْرُ ینزل بنا لم ینزل فیه القرآن و لم تمض فیه منک سُنَّۃٌ ۔ قال اجمعوا له العالمین من المؤمنین فاجعلوہ شوریٰ بینکم ولا تقضوا فیه بِرَأْیِ واحِدٍ۔(الامام الشافعی صفحه ۲۸۴)

اجتہاد کے ذرائع، اصول اور شرائط

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ رائے یا اجتہاد ''آزادانہ سوچ'' اور بے اصول فکر کا نام نہیں بلکہ اس کی صحت کے اصول و شرائط ہیں۔ بنیادی شرط یہ ہے کہ اجتہاد کرنے والا قرآن و سنت سے واقف ہو۔ معاشرہ کی نفسیات اور تمدن کے تقاضوں کو جانتا ہو۔ مصالح قوم اور عادات الناس پر اس کی نظر ہو۔ دوسرے یہ کہ عوام میں اس کا وقار اور احترام ہو۔ تقویٰ اور خشیة اللّٰہ کے امتیازی وصف کا حامل ہو۔

بہر حال علماء اور فقہاء نے اجتہاد کرتے وقت قرآن و حدیث کے علاوہ جن باتوں کو کم و بیش مدنظر رکھا ہے اور جو اصطلاحات قائم کی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔ **قِیاس**، **اِستِحسَان**، **مَصالحہ مُرسلہ**، **عُرف**، **ذرائع**، **رَفْع حَرج**، **اِستصحاب**۔

ہر ایک کی حسب ضرورت تفصیل آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہے۔

قِیاس

رائے قائم کرنے اور کوئی فیصلہ دینے کا ایک بڑا ذریعہ قیاس ہے۔ قیاس سے حضرت امام ابوحنیفہؒ نے بہت زیادہ کام لیا ہے۔ قیاس کے دوسرے بڑے مؤیّد حضرت امام محمد بن ادریس شافعیؒ ہیں۔

قیاس کے معنے یہ ہیں کہ اشتراک علت اشتراک حکم کا مقتضی ہے۔ اگر ایک کو اوّل آنے کی بنا پر انعام ملا ہے تو دوسرے کو بھی جو اوّل آیا ہے انعام ملنا چاہیے۔ اگر ایک کو چوری کرنے کی وجہ سے سزا ملی ہے تو دوسرے چور کو بھی سزا ملنی چاہیے۔ حکم کی یہ مساوات ایک بدیہی امر ہے اور اسی کا نام قیاس ہے۔

شریعت کے تمام احکام حکمت اور مصلحت پر مبنی ہیں ہر حکم کی کوئی نہ کوئی علت اور وجہ ہے مجتہد کا کام یہ ہے کہ وہ یہ علت یہ وجہ یہ حکمت معلوم کرے[۱] اور پھر اس کے مطابق ایسے مسائل

---

[۱] اذا کانت الشریعة معقولة المعنٰی فللمجتهد ان یفکر فی تعرّف المعانی والعلل و ضبط النتائج باستقراء الاحکام الشرعیة (ابو حنیفه صفحه ۱۷۲ ملخصًا)

پیش آمدہ کے بارہ میں فیصلہ دے یا رائے قائم کرے جن کے بارہ میں نص شرعی تو نہیں ملتی لیکن ان میں وہ علت موجود ہے جو منصوص حکم میں موجود تھی۔[۱] شراب بدمست بنادیتی ہے مدہوش کردیتی ہے۔شراب کے حرام ہونے کی یہی وجہ ہے پس وہ تمام چیزیں جو مدہوشی اور مستی پیدا کرتی ہیں جیسے بھنگ، چرس، ہیروئن وغیرہ سب حرام ہوں گی حالانکہ نص صرف شراب کے بارہ میں ہے۔

بہر حال منصوص حکم کی علّت اور وجہ معلوم کرنا ہی مجتہد کے فرائض میں شامل ہے۔یہ علّت اور وجہ بعض احکام میں واضح ہوتی ہے بلکہ بعض جگہ خود شارع اس کی وضاحت کردیتے ہیں اور بعض اوقات یہ علت مخفی اور عمیق ہوتی ہے اور اس کے معلوم کرنے کے لیے مجتہد کو بڑی کوشش کرنی پڑتی ہے۔بڑے غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے۔حضرت امام ابوحنیفہ کو احکام کی علت اور وجہ معلوم کرنے میں بڑی مہارت حاصل تھی آپ کو اس کا خاص ملکہ تھا جس کا دوست، دشمن دونوں کو اعتراف تھا۔ غرض مساوات علت مساوات حکم کا تقاضا کرتی ہے اور اسی مساوات کے معلوم کرنے کا نام قیاس ہے[۲]۔بہر حال زندگی کے مسائل کے بارہ میں شریعت کا منشاء معلوم کرنا ضروری ہے اور یہ علم یا تو نص صریح سے حاصل ہوسکتا ہے یا پھر نص کی علت اور حکمت کو سمجھ کر مسئلہ کو اس پر محمول کرنے اور اس پر قیاس کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ ضرورت بڑی واضح اور ہر سمجھدار کے علم میں ہے۔

قیاس کی مخالفت

اجتہاد اور رائے کی طرح قیاس کی بھی مخالفت کی گئی ہے۔سب سے زیادہ مخالفت حنبلیوں اور اہل ظاہر کی طرف سے ہوئی ان کے نزدیک احکام دینیہ معلوم کرنے کا واحد ذریعہ نص ہے خواہ نص قرآنی ہو یا سنت وحدیث ہو۔امام احمد کہا کرتے تھے کہ قیاس سے کام لینا اور اس کے ذریعہ شرعی

---

[۱] لا بد من بيان الحكم الشرعي في كل ما ينزل بالانسان.... و هذا الحكم اما ان يثبت بالنص الصريح واما ان يحمل على النص والحمل هو القياس. (محاضرات في تاريخ المذاهب الفقهية صفحه ۲۸۵)

[۲] قیاس کے اصطلاحی مفہوم کو سمجھانے کے لیے علماء نے مندرجہ ذیل وضاحتیں کی ہیں۔

الف۔ القياس الجمع بين المتماثلين والفرق بين المختلفين (الامام احمد صفحه ۲۲۴)

ب۔ الحاق مالا نص فيه في الحكم المنصوص عليه لاتحاد العلة بينهما (مالک بن انس صفحه ۲۱۱)

ج۔ الحاق ما نص فيه بما فيه نصّ لاتحاد علة الحكم في الامرين (ابو حنيفه صفحه ۱۷۲)

نیز دیکھیں الامام الشافعي صفحه ۱۳۸ (محاضرات في المذاهب تاريخ الفقهية صفحه ۷۰ و ۷۱)

حکم معلوم کرنے کی کوشش کرنا بڑا غلط طریق ہے۔[1] امام مالک بھی بالعموم قیاس کے طریق کو ناپسند کرتے تھے اور کہا کرتے کہ قیاس سے زیادہ کام لینے والا سنت وحدیث کا تارک اور اس کی اہمیت کا منکر بن جاتا ہے[2] لیکن قیاس کے بارہ میں یہ ساری مخالفت قائلین قیاس کے نقطۂ نظر کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے ورنہ ہر فقہی مسلک کا حامل کسی نہ کسی درجہ میں قیاس سے کام لینے پر مجبور رہا ہے جیسا کہ آئندہ صفحات کے مطالعہ سے واضح ہوگا۔

قیاس رائے قائم کرنے اور اس کی صحت پر کھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ لَوْ رَدُّوْهُ إِلَى الرَّسُوْلِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهُ مِنْهُمْ ۔[3] یعنی (جو اہم بات ان کے علم میں آئی اگر وہ اس کو ادھر ادھر پھیلانے کی بجائے) رسول تک پہنچاتے یا اپنے ان حکام تک پہنچاتے جو بات کی اصلیت معلوم کرنے اور اس کی تہ تک پہنچنے کا ملکہ رکھتے ہیں تو بہتر ہوتا۔" یہ آیت کریمہ بتاتی ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بات کی گہرائی میں جا کر اصل حقیقت اور صحیح مطلب پا لیتے ہیں اور معاملات کا صحیح رخ متعین کر سکتے ہیں اور ان کو مسائل سلجھانے کا خاص ملکہ عطا کیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو امور مملکت کے سلجھانے اور قضائی فیصلوں کو صحیح رخ دینے کے بارہ میں جو خط لکھا اس کے چند الفاظ یہ ہیں۔ **اَلْفَهْمَ اَلْفَهْمَ فِيْمَا يَخْتَلِجُ فِيْ صَدْرِكَ مِمَّا لَمْ يَبْلُغْكَ فِي الْكِتَابِ اَوِ السُّنَّةِ اَعْرِفِ الْاَمْثَالَ وَالْاَشْبَاهَ ثُمَّ قِسِ الْاُمُوْرَ عِنْدَ ذٰلِكَ**[4] یعنی مسائل پیش آمدہ کے بارہ میں خوب سمجھ سوچ سے کام لو اور جن مسائل کے بارہ میں کتاب وسنت سے کوئی وضاحت نہ ملے ان کے لیے مثالیں اور نظائر تلاش کرو اور ان مسائل کو اُن پر قیاس کرو۔

---

[1] قال احمد ان القیاس فی الدین باطل والرای مثله بل هو ابطل من القیاس واصحاب الرای والقیاس مبتدعة ضلال .(الامام احمد صفحه ۲۲۰ ۔ بحواله طبقات الحنابلة جلد ۱ صفحه ۳۱ ملخصاً)

[2] مالک بن انس صفحه ۲۱۴، مزید تفصیل کے لیے دیکھیں ابو حنیفه صفحه ۱۸۰،۱۷۳

محاضرات صفحه ۵۸۳

[3] النساء: ۸۴

[4] سنن دار قطنی کتاب الاقضیه والاحکام ۔ ابوحنیفه صفحه ۱۴۷

مذکورہ آیت کریمہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط اسی بات کو ثابت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ خاص سمجھ بوجھ کے مالک ہوتے ہیں اور حکمت اور وجہ معلوم کرنے کا عمدہ ملکہ رکھتے ہیں۔ عملی طور پر بھی ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ حسب ضرورت قیاس سے کام لیتے رہتے تھے۔ مثلاً۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور اس گھبراہٹ کا اظہار کیا کہ اس کی بیوی کے ہاں کالے رنگ کا لڑکا ہوا ہے اور اس وجہ سے اسے شبہ ہے کہ یہ اس کا لڑکا نہیں ہے۔ حضورؐ نے اسے سمجھانے کے انداز میں فرمایا کیا تمہارے اونٹ ہیں؟ اس نے عرض کیا ہاں حضور کافی اونٹ ہیں۔ آپ نے پوچھا ان کا رنگ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا سرخ رنگ کے ہیں۔ آپ نے پوچھا ان میں کوئی کالے بھورے رنگ کا بھی ہے؟ اس نے عرض کیا ہاں حضور ایک ایسا بھی ہے۔ آپ نے فرمایا: سرخ اونٹوں میں یہ کالے بھورے رنگ کا کہاں سے آگیا؟ اس نے عرض کیا شاید کوئی رگ جو کسی اونٹ میں تھی اس کا موجب بنی ہو۔ آپ نے فرمایا کہ تیرے بیٹے کے بارہ میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ شاید تیری کوئی نسلی رگ اس کا باعث بنی اور اس کے رنگ پر اثر ڈالا ہو۔[1]

۲۔ قرآن کریم میں دو بہنوں کو بیک وقت بیوی بنا کر رکھنے کی ممانعت آئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر قیاس کرتے ہوئے خالہ اور بھانجی۔ پھوپھی اور بھتیجی کو جمع کرنے سے منع فرمایا اور وجہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا **فَاِنَّکُمْ اِنْ فَعَلْتُمْ ذٰلِکَ قَطَعْتُمْ اَرْحَامَکُمْ**[2] کہ اگر تم ایسا کرو گے تو خالہ اور بھانجی اور پھوپھی اور بھتیجی کے مَوَدَّت کے رشتہ کو مجروح کرو گے۔

۳۔ یمن کے علاقہ میں ایک عورت نے اپنے آشنا کے ساتھ مل کر اپنے خاوند کو قتل کر دیا۔ حضرت عمرؓ کے سامنے یہ کیس آیا تو آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ کہ کیا ایک مقتول کے بدلہ میں زیادہ کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ اگر ایک اونٹ کو چُرا کر کئی لوگ ذبح کر کے اس کا گوشت آپس میں بانٹ لیں تو کیا سب کو سزا نہیں ملے گی پس جس طرح ایک اونٹ کو چرانے اور

۱؎ لَعَلَّهٗ نَزَعَهٗ عِرْقٌ قَالَ وَ هٰذَا لَعَلَّهٗ نَزَعَهٗ عِرْقٌ (ابو حنیفہ صفحہ ۱۷۰)

۲؎ مالک بن انس صفحہ ۱۶۷

ذبح کرنے کے جرم میں یہ سب سزا کے مستحق ہیں۔اس طرح اس کیس میں بھی دونوں مجرم ایک سزا کے مستحق ہیں۔چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس کے مطابق عمل کرایا اور فرمایا کہ اگر ایک گروہ کسی قتل میں برابر کا شریک ہو تو سب کو اس کے بدل میں قتل کردیا جائے گا[1] حالانکہ اس بارہ میں کوئی نص نہ تھی۔

۴۔ شراب پینے کے جرم میں کوئی معین سزا نہ تھی۔حضرت عمرؓ نے صحابہؓ سے مشورہ لیا تو حضرت علیؓ نے ہی مشورہ دیا کہ شرابی بہک کر دوسروں کو گالیاں دیتا ہے اور ان پر تہمت لگاتا ہے اور تہمت کے جرم کی سزا قرآن کریم میں ۸۰ اسّی کوڑے بیان ہوئی ہے اس لیے شرابی کو ۸۰ اسّی کوڑوں کی سزا دینی چاہیے۔چنانچہ صحابہؓ نے اس مشورہ کو قبول کیا اور اسی سزا کو امت نے اپنایا اور اس کا نام حد رکھا۔حالانکہ ایسی کوئی نص موجود نہ تھی۔[2] صرف قیاس اس کی بنیاد تھا۔

قیاس اصولاً ایک ظنی دلیل ہے

دینی اور شرعی مسائل معلوم کرنے کے دو ذریعے ہیں ایک قطعی اور یقینی اور دوسرا ظنی اور رَاجِح یعنی اس خیال کی بنا پر کہ شریعت کا حکم اور اللہ تعالیٰ کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے۔حقیقت اور اصلیت کیا ہے یہ اللہ جانتا ہے ہمارا مقام اس بارہ میں لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا[3] کا ہے اور ہم اسی کے مکلّف ہیں۔

اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ قرآن کریم کی نص ظاہر یا تواترِ عملی سے جو کچھ ثابت ہے وہ قطعی اور یقینی ہے اور جو کچھ اخبار احاد یا علم کے دوسرے ذرائع مثلاً قیاس اور مَصَالِحہ مُرسَلہ وغیرہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے اس کا مآل ظَنّ رَاجِح ہے یعنی حسن ظن کی بناء پر ہم اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ایک آدمی ہمارے علم کے مطابق سچا ہے۔نیک ہے۔اس کی یادداشت اچھی لگتی ہے اور جو خبر وہ دے رہا ہے اس کے درست اور سچے ہونے کے دوسرے قرائن بھی موجود ہیں۔اس لیے ہم اس کی بتائی ہوئی دینی خبر کو سچ ماننے کے مکلّف ہوں گے کیونکہ اسی کے مطابق عالم انسانیت کا نظام چل رہا ہے کہ بالعموم ہم ایک دوسرے کی بات کا احترام کرتے ہیں اور اسے سچ مانتے ہیں۔حقیقت اور اصلیت کیا

---

[1] فکتب عمرؓ الی عاملہ ان اقتلھما فواللّٰہ لو اشترک فیہ اھل صنعاء کلھم لقتلتھم (ابوحنیفہ صفحہ ۱۴۸)

[2] مالک بن انس صفحہ ۱۶۷

[3] البقرہ : ۳۲

ہے اس کے جاننے کے نہ ہم مکلّف ہیں اور نہ ہی اس کے وسائل ہمارے پاس موجود ہیں۔ اخبار احاد کا یہی ماحاصل ہے اپنی وسعت کے مطابق چھان بین اور راویوں کے حالات جاننے کے بعد ہمیں اطمینان ہو جانا چاہیے کہ یہ باتیں اور ان کی روایتیں درست ہیں اور ان کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک اور مثال گواہوں کی گواہی ہے۔ جج گواہوں کی گواہی سنتا ہے۔ ان کے حالات کی چھان بین کرتا ہے گواہ اسے عادل اور سچے لگتے ہیں وہ گواہی کے انداز اور سیاق وسباق کا بھی جائزہ لیتا ہے غرض سارے قرائن یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ گواہوں کی گواہی درست ہے چنانچہ جج اس گواہی کے مطابق فیصلہ سناتا ہے اور وہ اسی کا مکلّف ہے۔ اسی طرح سچے اور نیک لوگوں کی بتائی ہوئی دینی خبروں کا ماننا بھی ضروری ہے دنیا میں اسی طرح کام چلتا ہے اور اس کو اپنائے بغیر چارہ نہیں۔

یہی حال قیاس صحیح کا ہے۔ مجتہد نے غور کیا۔ سوچا۔ حکم کی علت اور وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی اور وہی وجہ مسئلہ زیر بحث میں بھی موجود ہے تو وہ مجتہد یہ فیصلہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ اس مسئلہ زیر بحث کا بھی وہ حکم ہے جو مسئلہ منصوص میں شارع نے بتایا ہے۔ یہ ساری کارروائی حسن ظن اور علم راجح کی بنا پر ہے اور انسان اس کا مکلّف ہے[1]۔ ایک آدمی اس علم کی بنا پر ایک عورت سے شادی کرتا ہے کہ اس عورت سے شادی کرنا اس کے لیے جائز ہے حالانکہ حقیقت میں وہ عورت اس کی بہن ہے لیکن دونوں کو اس کا علم نہیں کہ وہ آپس میں بھائی بہن ہیں۔ مثلاً جنگی افراتفری میں وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور مختلف گھروں میں انہوں پرورش پائی۔ شادی کے بعد ان کے بچے ہوئے کچھ مدت بعد ان کے علم میں آیا کہ وہ تو بہن بھائی ہیں سابقہ عملدرآمد کی بنا پر وہ گنہگار نہ ہوں گے اور جو اولاد ہو چکی ہے وہ ثابت النسب اور دونوں کی وارث ہوگی۔ علم کے بعد جدائی تو ہو جائے گی لیکن مہر ادا کرنا ہوگا اور عورت کے لیے عدت گزارنا ضروری ہوگا۔

حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک صحیح قیاس کی اقسام

حضرت امام شافعیؒ نے قیاس کی تحدید کے سلسلہ میں جو حدود اور شرائط بیان کی ہیں انہیں

[1] مزید تفصیل کے لیے دیکھیں۔ محاضرات فی تاریخ المذاهب الفقهیه صفحه ۲۸۶۔
الامام الشافعی صفحه ۱۳۹

امام شافعی کا خاص کارنامہ قرار دیا گیا ہے اور یہ سمجھا گیا ہے کہ ان توضیحات کی وجہ سے بیجا اور غلط قیاس کی روک تھام ہوئی ہے آپ نے حکم کی علت کے واضح ہونے کے لحاظ سے قیاس کی کئی قسمیں تجویز کی ہیں۔ مثلاً

۱۔ حکم کی علت بڑی واضح اور جانی پہچانی ہو۔ جیسے اگر قلیل اور تھوڑی چیز حرام ہے تو کثیر اور زیادہ تو بطریق اولیٰ حرام ہوگی مثلاً اگر شراب کا ایک گھونٹ حرام ہے تو ایک گلاس تو بطریق اَولیٰ حرام ہوگا۔ اگر ماں باپ کے سامنے اُف کرنا ناجائز ہے تو اُن کو جھڑکنا یا اُن کو مارنا تو بہت بڑا گناہ ہوگا۔ امام شافعی اس طرز استدلال کو قیاس کی ایک قسم قرار دیتے ہیں اور دوسرے فقہاء اسے **دَلَالَۃُ النَّص** یا **دَلَالَۃُ الْمُوَافقة** کہتے ہیں اور اسے قیاس کی قسم نہیں سمجھتے۔

2۔ حکم منصوص کی علت اور مسئلہ زیر بحث میں موجود علت وضاحت کے لحاظ سے مساوی ہوں مثلاً لونڈی اگر جرم زنا کی مرتکب ہو تو اس کی سزا آزاد کی سزا سے نصف ہے اور یہ حکم نص سے ثابت ہے[1] اور اس تخفیف کی وجہ اور علّت اس کی غلامی اور رِقّیّت (آزادی) ہے۔ غلام مرد میں بھی یہی علت پائی جاتی ہے۔ دونوں غلامی کے لحاظ سے مساوی ہیں اس لیے دونوں کی سزا بھی ایک جیسی ہونی چاہیے۔ گویا غلام مرد کی سزا کو غلام عورت (لونڈی) کی منصوص سزا پر قیاس کیا گیا ہے۔ دوسرے فقہا کے نزدیک یہ صورت بھی از قسم قیاس نہیں بلکہ قانون **اَلْمُسَاوَاۃُ فِی التَّکْلِیْف** کی بنا پر ہے یعنی مرد اور عورت مکلّف ہونے کے لحاظ سے برابر کے ذمہ دار ہیں۔

۳۔ منصوص حکم کی علت میں خفا اور ابہام ہو۔ پوری طرح واضح نہ ہو کہ حکم کی جو علت اور وجہ سمجھی گئی ہے حقیقت میں بھی وہی علت اور وجہ ہے یا کوئی اور وجہ ہے۔

پھر خفا اور ابہام کے کئی درجے ہیں اور اصلیت تک پہنچنے کے لیے بڑے غور و فکر اور سوچ بچار کی ضرورت پڑ سکتی ہے نیز غور و فکر کی اہلیت میں بھی بڑا تفاوت ہوتا ہے۔ اس وجہ سے قیاس کی اہمیت اور اس کی صحت کے بارہ میں فرق آئے گا اور وہ کئی قسموں میں منقسم ہو جائے گا۔

علماء اسلام کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ قیاس اس مسئلہ کے بارہ میں کیا جائے جس کا

---

[1] یقسم الشافعی القیاس الی مراتب علی حسب مقدار وضوح العلة وقوتها فی التاثیر بالنسبة للفرع (محاضرات فی تاریخ المذاهب الفقهیة صفحه ۲۸۹)

تعلق عبادات سے نہ ہو۔عبادات میں نص کی ضرورت ہوتی ہے۔ان میں قیاس سے کام لینا درست نہیں مثلاً جرابوں پر مسح کی اجازت ہے اور اس رعایت کی علت اور وجہ انسان کو حرج سے بچانا ہے کہ بار بار جرابیں اتارنے اور پہننے کے تکلف سے وہ بچ سکے۔اب سویٹر اور جیکٹ کو اگر کوئی جرابوں پر قیاس کرے اور کہے کہ اس کے اتارنے اور پہننے میں بھی حرج ہے اس لیے ان پر مسح کرنے کی اجازت ہے تو یہ قیاس درست نہ ہوگا گو حرج کی علت کے موجود ہونے سے انکار نہیں۔اسی طرح یہ قیاس کہ کئی مجبوریاں تخفیف حکم کا باعث بنتی ہیں جنگ یا سفر کی وجہ سے نمازیں جمع بھی کر سکتے ہیں اور قصر بھی اس بنا پر اگر کوئی کہے کہ شدید مصروفیت کے اس زمانہ میں نمازیں پانچ کی بجائے کم ہوسکتی ہیں تو یہ قیاس باطل ہوگا کیونکہ مسلمہ اصول یہ ہے کہ عبادات قیاس کا محل نہیں ان میں نص تک ہی محدود رہنا ضروری ہے۔[۱]

اَلْاِستِحْسَان

اِستِحْسَان کے لغوی معنی ہیں اچھا سمجھنا، بہتر صورت اور بہتر راہ اختیار کرنا اور فائدہ کی بات کو ترجیح دینا۔حنفی مسائل شرعیہ کی تعیین کے لیے استحسان[۲] سے کام لینے کے بھی قائل ہیں اور کوئی دینی رائے قائم کرنے کے لیے استحسان کو وہ بنیاد مانتے ہیں۔اس کی ضرورت بالعموم اس وقت پڑتی ہے جب کہ خبر واحد یا قیاس کسی مشکل کا باعث بن رہے ہوں۔یا کوئی پبلک مصلحت استحسان کے اصول کو اپنانے کی متقاضی ہو۔قیاس کا دائرہ خاصہ تنگ ہے کیونکہ قیاس میں ضروری ہے کہ کوئی نص ہو

---

۱ اَلْوُقُوْف عندالنَّص فی العبادات واجب باجماعٍ (الامام الشافعی صفحہ ۲۴۶)
مزید تفصیل کے لیے دیکھیں۔ الامام الشافعی صفحہ ۱۳۸، ۲۳۰، ۲۴۲
محاضرات فی تاریخ المذاهب الفقهية: صفحہ ۲۵۵، ۲۷۴، ۲۸۵ تا ۲۹۳

۲ الف: اَلْاِسْتِحْسَانُ الحكم فی مسئلةٍ بغیر ما حُكِمَ به فی نظیر ها لدلیلٍ من نَصٍّ أو اجماعٍ او ضرورةٍ او لمعارضة القیاس الظاهر بقیاس اقوىٰ وهو الاستحسان الاصطلاحی عند الحنفيّة امّا عند مالكٍ فعندهٗ الاِستحسان أوسع من ذالک لِأنَّهٗ يشتمل الاستحسان الاصطلاحی والمصلحة المرسلة (محاضرات فی تاریخ المذاهب الفقهیه صفحہ ۱۷۷ و ۳۶۳)

ب: الاستحسان الاخذ بمصلحةٍ جزئيةٍ فی مقابل دليلٍ كُلّیٍّ يُلْجَأُ اِلَيْهِ اذا كانت نتائج القياس لَا تُستاغ۔(ابو حنیفہ صفحہ ۱۷۷)

اور اس نص میں حکم کی علت اور وجہ موجود ہو اور پھر اس وجہ کا مجتہد کو علم ہو جائے۔ یہ باتیں خاصی مشکل اور محدود ہیں۔[1] دوسری طرف ضرورت ہے اور حقیقت تک پہنچنے کے لیے دوسرے ذرائع کی تلاش کی طرف توجہ مبذول کرنی پڑتی ہے جن میں سے ایک ذریعہ استحسان ہے۔ کتب فقہ میں استحسان کی کئی مثالیں مل سکتی ہیں وضاحت کی غرض سے چند ایک کو ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ پیشگی سودا منع ہے حضورؐ نے فرمایا **لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَکَ** یعنی جو چیز تیرے پاس نہیں ہے اس کا سودا نہ کر کیونکہ اگر کوئی اس بنا پر سودا کر لے کہ فلاں وقت یہ چیز میرے پاس آجائے گی تو ادائیگی کر دوں گا لیکن وقت پر وہ چیز نہیں ملتی یا اس کوالٹی کی نہیں ملتی تو فریقین میں جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور جس معاہدہ میں تنازع کے بیج موجود ہوں وہ معاہدہ اصولاً جائز نہیں لیکن بعض اوقات پبلک میں ایسے لین دین کا رواج ہوتا ہے لوگ اس کے ضرورت مند ہوتے ہیں بائع کو جلد رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور مشتری کو بعد میں کسی وقت چیز چاہیے ہوتی ہے اس پبلک رواج اور مصلحت کی بنا پر بعض شرائط کے ساتھ پیشگی سودے کی شارع نے استثنائی اجازت دی ہے اور **بَیعِ سَلَمْ** کی اجازت اسی مصلحت کی بنا پر ہے جو اصول استحسان کی ایک مثال ہے۔[2]

ایک دفعہ دو بہنوں کی اکٹھی شادی ہوئی لیکن رخصتانہ میں دلہنیں بدل گئیں جس کا علم نہ ہو سکا۔ صبح کو جب اس کا علم ہوا تو گھر والے گھبرائے اور فقہاء سے مسئلہ دریافت کیا گیا۔ امام سفیان ثوریؒ نے فتویٰ دیا کہ چونکہ لاعلمی میں ایسا ہوا ہے اس لیے کوئی گناہ کی بات نہیں تاہم مباشرت کی وجہ سے "**تـمَتُّـع**" یعنی مناسب مہر کی ادائیگی ضروری ہے اور دلہنوں کو ان کے اصل خاوندوں کے پاس بھجوا دیا جائے جس جس سے ہر ایک کا نکاح ہوا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ سے بھی استصواب کیا گیا آپ نے فرمایا یہ فتویٰ تو اپنی جگہ درست ہے لیکن نفسیات کا تقاضا کچھ اور ہے کیونکہ جو عورت اپنے خاوند کے علاوہ کسی دوسرے کے پاس رہ آئی ہے چاہے غلطی سے ہی ایسا ہوا ہے، ہو سکتا ہے کہ خاوند کے دل میں کچھ تکدر کا موجب ہو اور اس سے

---

[1] النصوص قليلة وبقلتها تضِيقُ دَائِرَةُ القياس فكلّ اصل شرعي لم يشهد له نصّ معيّن كان ملائما لتصرفات الشرع و مأخوذًا معناه من ادلّة فهو صحيح يُبْنٰي عليه و يرجع اليه (مالک بن انس صفحه ۲۱۴)

[2] محاضرات في تاريخ المذاهب الفقهية صفحه ۳۶۱

دونوں کی زندگی تلخ ہو جائے۔ آپ نے دونوں مردوں کو الگ الگ بلوایا اور کہا کہ جس عورت کے ساتھ تم نے رات بسر کی ہے وہ تمہیں پسند ہے یا نہیں ہر ایک نے کہا کہ اُسے پسند ہے چنانچہ آپ نے ہر ایک کو مشورہ دیا کہ وہ اس عورت کو طلاق دیدے جس سے اس کا نکاح ہوا ہے اور اس سے نکاح پڑھالے جس کے ساتھ اس نے رات بسر کی ہے اور مہر کا بھی ادل بدل ہو جائے۔ کسی عدت کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ خاوند اپنی منکوحہ کو قبل از مباشرت طلاق دے رہا ہے اور جس سے نیا نکاح ہو رہا ہے وہ وہی ہے جس کے پاس وہ رات گزار چکا ہے ایسی صورت میں عدت کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ اس کیس میں نفسیات کے پہلو اور مرد عورت کی آئندہ زندگی کی مصلحت کا خیال رکھا گیا ہے جو اصول استحسان کی ایک مثال ہے۔[1]

حضرت ابوبکرؓ نے ایک بار فرمایا اگر میں کسی کو زنا کرتے ہوئے دیکھ لوں تو نہ اپنے اس علم کی بنا پر ان کو سزا دوں اور نہ کسی کو گواہ بنانے کے لیے بلاؤں آپ کا یہ فرمان پردہ پوشی کی مصلحت پر مبنی ہے اور اس بات پر کہ قاضی اپنے علم کی بنا پر کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا اس کا فیصلہ گواہی پر مبنی ہونا چاہئے۔[2] یہ بھی اصول استحسان کی ایک مثال ہے۔

اِحتِکار یعنی مہنگا بیچنے کی نیت سے مال روکنے کی ممانعت کا تعلق بھی اصول استحسان سے ہے کیونکہ یہ ممانعت پبلک مصلحت کی بنا پر ہے تا کہ صارفین ضرورت کی چیز کے حصول میں کسی مشکل سے دوچار نہ ہوں یا وہ مہنگا خریدنے پر مجبور نہ ہوں۔

قرائن اور ابتدائی ثبوت کے بعد ملزم کو حوالات میں بند کرنے یا اس پر مناسب سختی کرنے کا جواز بھی اصول استحسان پر مبنی ہے۔[3]

حضرت امام شافعی نے اصول استحسان کی مخالفت کی ہے اور اس کی وجہ سے حنفیوں کو نشانۂ تنقید بنایا ہے اور یہاں تک فرمایا ہے کہ استحسان سے کام لینے والا خود شارع بننے کی کوشش کرتا ہے[4] کیونکہ کسی بات کا اچھا لگنا اپنے ذوق یا اپنے مفاد کی بات ہے ایک مفتی بعض وجوہات کی بنا پر

---

[1] ابو حنیفہ صفحہ ۱۷۸ [2] الامام الشافعی صفحہ ۲۴۳ [3] مالک بن انس صفحہ ۲۱۵

[4] قال الشافعی من استحسن فقد شرع لان الاستحسان لا ضابطة له و لا مقیاس (محاضرات صفحہ ۲۹۰)

ایک بات کو اچھا اور مفید سمجھتا ہے اور دوسرا دوسری بات میں بھلائی دیکھتا ہے اس طرح تو شریعت ایک کھیل بن جائے گی اور ظالم حکام دین اور شریعت کے نام پر اپنی خبیث اغراض کی تکمیل کی کوشش کریں گے۔[1]

لیکن امام شافعی کا یہ اعتراف استحسان کے اصول کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ اچھا سمجھنے کا اصول بعض شرائط کے ساتھ مشروط ہے کیونکہ یہ سبھی مانتے ہیں کہ شریعت نے اپنے احکام میں مصلحت اور پبلک مفاد کو مدنظر رکھا ہے اور جن مسائل کے بارہ میں کوئی واضح نص نہیں ان میں بھی اس اصول کو مدنظر رکھا جانا چاہیے کہ مصلحت اور پبلک مفاد کے مطابق ان کا حکم ہونا چاہیے اور اسی کا نام استحسان ہے۔ البتہ مصلحت کے بارہ میں یہ مدنظر رہنا چاہئے کہ مصلحت وہی معتبر ہے جو مقاصد شریعت کے مطابق ہو اور شارع نے کسی نہ کسی جگہ اسے اختیار کیا ہو یہی مصلحت ہے جس پر اصول استحسان مبنی ہے۔[2] اگر استحسان کے بارہ میں اس شرط کو مدنظر رکھا جائے تو اس خطرہ کا امکان باقی نہیں رہتا جس کا اظہار امام شافعی نے کیا ہے۔ یہ بھی مدنظر رہے کہ جن ارباب علم نے استحسان پر اعتراض کیا ہے اور اسے ہدف تنقید بنایا ہے انہوں نے بھی کسی دوسرے نام سے حسب ضرورت اس انداز استدلال کو اپنایا ہے۔ فرق صرف نام کا ہے ورنہ حقیقت ایک ہی ہے۔[3]

مَصَالِح مُرْسَلَهْ

حنفی اگر استحسان سے کام لیتے ہیں اور اس کی مدد سے غیر منصوص احکام کا استنباط کرتے ہیں اور کبھی کبھی اسے قیاس یا خبر واحد پر مقدم کرتے ہیں تو مالکی بھی اسی منہاج پر چلتے ہوئے بلکہ وسیع تر دائرہ میں استصلاح یا اَلْاَ خْذُ بِالْمَصَالِحِ الْمُرْسَلَة کے نام سے اس کے ذریعہ احکام شریعہ

---

[1] یقول وکل حاکمٍ وکل مفتٍ بما استحسن فیقال فی الشیء الواحد لضروبٍ من الفتیاء (الامام الشافعی صفحه ۲۴۳ و نیز صفحه ۲۳۱ بھی دیکھیں)

[2] اشترطوا فی الاخذ بالمصلحة ان تکون من جنس المصالح التی اقرها الشارع وان لم یشهد لها نص خاص واعملوها فی المواضع التی لیس فیها نصوص. (محاضرات صفحه ۲۹۱)

[3] الذین یعترضون علی الاستحسان والا ستصلاح او القیاس یصلون الی الحکم بضروبِ اخریٰ من الاستدلال. (الامام الشافعی صفحه ۲۲۸)

کا استنباط کرتے ہیں اور کبھی کبھی اس عمل کا نام استحسان بھی رکھتے ہیں۔[1]

مصلحت مرسلہ سے مراد ہر وہ مصلحت ہے جس کو واضح رنگ میں تو شریعت نے بیان نہیں کیا لیکن مقاصد شریعت میں اس کا عمومی تاثر ملتا ہے اور ہر صاحب فہم اس کے وجود کو محسوس کرتا ہے۔[2]

بنیادی طور پر قوانین شرع میں انسانی مصالح کا تعلق تین باتوں سے ہے:۔

اوّل: یہ کہ قوانین کم سے کم ہوں اور زیادہ تر انسان اپنے انداز زندگی میں آزاد ہو۔اس کا اصطلاحی نام ''قلت تکلیف'' ہے۔

دوم: قوانین آسان ہوں اور لوگ اس پر بآسانی عمل کرسکیں اس کا اصطلاحی نام ''عدم حرج'' ہے۔

سوم: قوانین کا اجراء آہستہ آہستہ اور بتدریج ہو اس کا اصطلاحی نام ''تَدْرِیج'' ہے۔

نظام تشریع ان تین اصولوں پر مبنی ہے۔کم قوانین۔آسان قوانین اور ان کا نفاذ بتدریج۔ یہی اصول تشریع کی جان ہیں اور مقاصد شریعت میں ان تینوں باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

مقاصد شریعت اور مصالح

بنیادی طور پر مقاصد شریعت پانچ ہیں۔

حفظ دین۔حفظ جان۔حفظ نسل۔حفظ مال اور حفظ عقل۔سارا نظام شریعت انہی مقاصد کے گرد گھومتا ہے۔دین، جان، نسل، مال اور عقل کی بقا اور ان کی حفاظت اور ان کی تہذیب وتربیت اور تکمیل ساری سرگرمیوں کا محور اور مرکز ہے۔ان پانچ امور کی حفظ وبقا اور تہذیب وارتقاء کے لحاظ سے مقاصد کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

---

[1] الاستحسان عند مالک تقدیم الاستدلال المرسل علی القیاس والاستصلاح الا خذ بالمصلحة المناسبة حیث لا نص وکان یقول مالک الاستحسان تسعة اعشار العلم.
(مالک بن انس صفحہ ۲۱۲،۱۰۱۔محاضرات صفحہ ۲۳۶، ۲۳۷)

[2] کل اصل شرعی لم یشهد له نص معین وکان ملائما لتصرفات الشرع و ماخوذا معناه من ادلة الشرع فهو صحیح یبنیٰ علیه ویرجع الیه و یدخل تحت هذا الضرب من الاستدلال المصالح المرسلة والتشریع کله یبتغی مصالح البشر ومثال المصلحة المرسلة "رفع الحرج" وهو مستنبط من عدة نصوص کالتیمم والقصر وجمع الصلوٰة وایضا قیل المصلحة المرسلة ما لا یشهد لها دلیل خاص بالاعتبار او بِالْإِلْغاء۔(مالک بن انس صفحہ ۲۰۳و۲۱۵۔محاضرات صفحہ ۲۳۶)

مقاصد ضروریہ۔ ان کا مقصد امور خمسہ کی اصل اور بنیادی بقا ہے۔
مقاصد حاجیہ۔ ان کا مقصد امور خمسہ کے لیے سہولت اور آسانی مہیا کرنا ہے۔
مقاصد کمالیہ یا تحسینیہ۔ ان کا مقصد امور خمسہ کی تزیین اور ان کے حسن کو بڑھانا ہے۔

مقاصد ضروریہ کے تحت ایسے احکام نافذ کئے جاتے ہیں جن کے ذریعہ امور خمسہ کی بقا کی ضمانت مل سکے۔ مثلاً:

دین کی بقا اور حفاظت کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، عقیدہ اور مذہب کی آزادی، اکراہ اور جبر کی ممانعت، دینی روح کو زندہ اور تازہ رکھنے کے لیے مختلف قسم کی عبادتوں کا تقرر۔

جان یعنی نفس کی بقا اور حفاظت کے لیے ہوا، پانی، خوراک اور رہائش کے حصول کا حق، قتل کی ممانعت، فتنہ و فساد کی روک تھام۔

نسل کی بقا اور حفاظت کے لیے نکاح کی اجازت اور زنا کی ممانعت۔

مال کی بقا اور حفاظت کے لیے حق ملکیت کو تسلیم کرنا، حق اکتساب اور روزگار، چوری اور غصب کی ممانعت۔

عقل کی حفاظت اور بقا کے لیے علم کے حصول کا حق اور ان تمام امور سے انسان کو بچانا جو عقل کو مُختَل کرتے ہیں اور نقصان پہنچاتے ہیں۔ اسی لیے منشیات سے منع کیا گیا ہے اور آبرو اور عزت کی حفاظت پر زور دیا گیا ہے کیونکہ بے عزتی بعض اوقات انسان کو پاگل بنا دیتی ہے یا غصہ کی وجہ سے انسان کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔[1]

پھر ان پانچوں کی بقا کے بعد ان کی ضروریات اور حاجات کا سوال سامنے آتا ہے جس کے لیے مقاصد حاجیہ کی ترتیب و تعیین کا مرحلہ ہے مثلاً:

---

[1] فرمایا: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرة:۲۵۶) لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (الكافرون:۶) وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (البقرة:۱۹۳) اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (البقرة:۱۹۱) لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (الغاشيہ:۲۲)

حماية النفس من اعتدا على النفس بالقتل او قطع الاطراف و المحافظة على الكرامة الانسانية بمنع القذف و السب (محاضرات صفحه ۹۴)

دین کے سلسلہ میں توحید اور ایمان کی وضاحت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تبشیری نظام، عبادات کی ادائیگی کا اہتمام، نماز کے لیے جگہ، طہارت، ستر عورت، قبلہ کی تعیین، نماز با جماعت کا اہتمام، قرب الٰہی کے ذرائع، اچھے اخلاق، نیک عادات وغیرہ۔

جان کی بقا کے بعد زندگی کی ابتدائی ضرورتیں۔ پانی کی سہولت، رہائش کی سہولت، لباس، گرمی سردی سے بچاؤ کی سہولت، امن وامان کا قیام، شرپسند عناصر کی نگرانی، اسلحہ کی روک تھام۔

نسل کی بقا کے بعد بچوں کی پرورش اور ان کی بہتر نشوونما کے بارہ میں ہدایات۔ مناسب پردہ کا خیال، غیر محرم مرد عورت کے خلاملا پر پابندی، شادیوں کی سہولت وغیرہ۔

مال کی بقا اور حق ملکیت تسلیم کرنے کے بعد اس کے حصول اور مال بڑھانے کے مختلف ذرائع۔ زراعت، صنعت وحرفت، نظام زر کی ترویج، بازاروں اور منڈیوں کا قیام، تجارت کا فروغ، اِحتِکار اور رِبَا کی روک تھام۔ ذرائع آمد ورفت میں سہولت۔ راستوں کی درستگی وغیرہ۔

عقل کی بقا اور حفاظت کے بعد اُس کی جلا کے لیے مختلف علوم کا فروغ۔ دینی علوم حاصل کرنے کی سہولت۔ مختلف قسم کے مدارس کا قیام۔ کتب ضروریہ کی اشاعت وغیرہ۔

مقاصد کمالیہ یا تحسینیہ کے لیے بھی مختلف قسم کی ہدایات دین وشریعت کا حصہ ہیں مثلاً

دین کے حسن کے فروغ کے لیے نوافل، طوعی صدقات، اطاعت کی باریکیاں، اخلاق حسنہ کی تفصیلات خضوع وخشوع میں کمال، مساجد آباد رکھنا، دینی جلسوں کا انعقاد، وعظ وتذکیر، عمدہ عمدہ مذہبی معلومات پر مشتمل کتب کی وسیع اشاعت۔

جانِ زندگی کے لیے مختلف قسم کی عمدہ سہولتیں، صاف ستھری عمدہ اور لذیذ خوراک، پاکیزہ اور لذیذ مشروبات، طرح طرح کے پھل، مختلف قسم کی اچھی خوشبوئیں، رہائش کے لیے عمدہ اور سہولتوں سے مزین مکان، پُرفضا ماحول، اعلیٰ لباس، امن وامان کا دور دورہ، راستوں اور گلیوں کی صفائی، کشادہ سڑکیں، روشنی کا انتظام، سیرگاہوں کا اہتمام، دوستانہ تعلقات کا فروغ، مضر صحت خوراک اور خراب مشروبات سے پرہیز۔

نسل کی بہترین نشو ونما کے لیے عمدہ مدارس کا قیام۔ کھیل کے میدان، ورزش کا انتظام اور بچوں کی ایسے رنگ میں تربیت کہ وہ بہترین شہری بنیں، تنومند، بہادر اور ملک وقوم کے لیے

باعث فخر ہوں علم و سنجیدگی کے پیکر سمجھیں جائیں۔

مال کی فراوانی اور فراخی کے لیے کسب اور تقسیم دولت کے بہترین متوازن اصول۔ بہتر تجارتی سہولتیں، منڈیاں بازار اور سٹورز، تحقیقات اور ریسرچ کے ادارے بہترین اور تیز رفتار ذرائع آمد و رفت، صنعت و حرفت کے فروغ کے لیے بڑے بڑے کارخانوں کا اہتمام وغیرہ۔

عقل کی جلا اور ترقی کے لیے اعلیٰ علوم کی یونیورسٹیاں، عمدہ لائبریریاں، اشاعتی ادارے، عمدہ اخبارات، مطالعہ کی سہولتیں، بداخلاقی اور آوارہ ذہنی کی روک تھام۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ شریعت کے تمام احکام اور اس کی ساری ہدایات نسل انسانی اور مسلم سوسائٹی کی بہبود اور اس کی مصالح پر مشتمل ہیں۔[1]

کہیں تو ان مصالح کی تصریح اور وضاحت کر دی گئی ہے اور کہیں انہیں ارباب علم و دانش کی سمجھ بوجھ پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اس خفا اور ابہام سے پردہ اٹھانے کے لیے اصول و ضوابط، قرائن و امارات کی سہولت بہم پہنچائی گئی ہے تا کہ بحیثیت مجموعی ان قرائن پر غور کر کے ارباب حل و عقد اور دانشمند علماء قومی بہبود کی راہیں متعین کر سکیں۔ "مصالح مرسلہ" اسی قسم کے طرز استدلال کا ایک حصہ ہیں جن کو بنیاد بنا کر حضرت امام مالکؒ نے اجتہاد کی راہ ہموار اور وسیع کرنے کی کوشش کی ہے[2] اور مصالح پر مبنی فقہ کا ایک عمدہ ذخیرہ آئندہ نسل کی راہنمائی کے لیے مہیا کیا ہے۔ "مصالح مرسلہ" کی بنا پر استدلال و استنباط کی متعدد مثالیں تاریخ فقہ نے محفوظ کی ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر درج ذیل ہے۔

۱۔ اسلام میں اہل کتاب خواتین سے شادی کرنے کی اصولی اجازت ہے لیکن حضرت عمرؓ نے قومی مصالح کے پیش نظر صحابہؓ اور حکام کو ایسی شادی سے منع کر دیا تھا کیونکہ ایسا کرنے میں بعض خطرات کا اندیشہ تھا۔ حضرت حذیفہؓ نے ایک یہودی عورت سے شادی کر لی۔ حضرت عمرؓ کو جب

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیں۔ محاضرات فی تاریخ المذاهب الفقهية صفحه ۹۳ تا ۱۰۳
(مالک بن انس صفحه ۱۶۶، ۲۰۲۔ الامام الشافعي صفحه ۲۲۴)

۲۔ مامن امر شرعه الاسلام بالكتاب والسنة الا كانت فيه مصلحة حقيقية ومن المصالح لا يشهد لها او لضدها اصل شرعي ولكن يبيحها العقل ولا يأباها الشرع (محاضرات صفحه ۹۲، ۹۷۔ الامام الشافعي صفحه ۲۲۴)

اس کا علم ہوا تو آپ نے حضرت حذیفہؓ کو حکم دیا کہ اس عورت کو فوراً طلاق دے دو تمہاری یہ شادی مصالح اُمت کے خلاف ہے۔[1]

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کو اجازت دی کہ اگر وہ چاہے تو اپنی ہونے والی بیوی کو نکاح سے پہلے دیکھ لے۔ اس کی شکل وصورت طبیعت اور رہن سہن کا جائزہ لے لے۔ اس کے بالمقابل عورت کو بھی ایسے ہی جائزہ کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ یہ سب کچھ ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کی مصلحت پر مبنی ہے۔

۳۔ ایک وقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پہلے دو خلفاء نے کتابت حدیث کے خاص اہتمام سے منع فرمایا تا کہ قرآن کریم کے ساتھ اشتباہ پیدا نہ ہو۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ قرآن کریم کا امتیاز لوگوں میں راسخ ہو گیا اور اشتباہ کا خطرہ باقی نہ رہا۔ دوسری طرف دینی تاریخ کو محفوظ کر لینے کی ضرورت سامنے آئی۔ چنانچہ پانچویں خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے وقت کے ماہر علماء کو حکم دیا کہ وہ احادیث اور روایات کو اکٹھا کریں اور لکھ لیں کیونکہ اس وقت اسی میں مصلحت مضمر تھی۔

۴۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو حضرت عمرؓ کے حکم سے جزیرۃ العرب سے نکال دیا گیا تا کہ حکومت کا مرکز ان کے فتنہ اور سازش کی آماجگاہ نہ بن سکے۔[2]

۵۔ حضرت عمرؓ نے کبار صحابہؓ کو مدینہ منورہ سے باہر دوسرے ملکوں اور شہروں میں رہائش اختیار کرنے سے روکے رکھا۔ اس میں متعدد مصالح آپ کے پیش نظر تھے۔ مثلاً ایک یہ کہ امور مہمہ میں ان سے بروقت مشورہ لیا جا سکے نیز دوسری جگہیں مرکز عقیدت نہ بنیں اور خلافت کا احترام کم نہ ہو۔

۶۔ ملکہ روم نے حضرت عمرؓ کی زوجۂ محترمہ حضرت ام کلثومؓ کو ایک قیمتی ہار بطور تحفہ بھیجا لیکن حضرت عمرؓ نے وہ ہار بیت المال میں جمع کرا دیا۔ مقصد یہ تھا کہ حکام اسے پبلک سے تحائف

۱۔ کتب عمرؓ الی حذیفۃ اعزم علیک ان لا تضع کتابی ھذا حتی تخلی سبیلھا فانی اخاف ان یقتدیٰ بک المسلمون فیختاروا اھل الذمۃ لجمالھن وکفیٰ بذالک فتنۃً لنساء المسلمین. (الامام الشافعی صفحہ ۲۰۸)

۲۔ مالک بن انس صفحہ ۲۵، ۲۶، ۲۰۸، ۲۱۲

وصول کرنے کا بہانہ نہ بنا لیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ والیوں کی مالی حالت کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیتے رہتے تھے اور بعض اوقات جس کے پاس اندازہ سے زیادہ مال پاتے آدھا بیت المال میں جمع کرا دینے کا حکم دیتے۔

۷۔ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو مدینہ سے نکال دیا تھا کیونکہ وہ بن ٹھن کر رہتا گلیوں میں آوارہ پھرنے کا شوقین تھا اور بعض عورتوں کے لیے فتنہ کا باعث بنا تھا۔[۱]

۸۔ فتح دمشق کے موقع پر جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان علاقوں میں تشریف لے گئے تو ان دنوں وہاں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت عمرؓ کو مشورہ دیا گیا کہ آپ کے ساتھ بڑے بڑے صحابہؓ ہیں خود آپؓ کا وجود بھی ایک قومی امانت ہے اس لیے وبا زدہ علاقوں میں جانا درست نہیں۔ آپ نے صحابہؓ کو بلا کر مشورہ کیا۔ کچھ کی رائے تھی کہ آپ کو واپس چلے جانا چاہیے اور کچھ کہتے تھے کہ جب اتنا سفر کر کے آپ آئے ہیں تو آپ کا فوجوں سے ملے بغیر واپس چلے جانا مناسب نہیں۔ مشورہ کے دوران قرآن کریم کی کوئی آیت یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود آپ نے ارباب دانش کے مشورہ کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ مصلحت اسی میں ہے کہ آگے بڑھنے کی بجائے واپس چلے جائیں۔ حضرت ابو عبیدہؓ جو اس علاقہ کی فوجوں کے سربراہ تھے وہ حضرت عمرؓ کا فیصلہ سن کر کہنے لگے۔ اَفِرَارًا مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ؟ کہ اللہ کی تقدیر سے بھاگنے کے کیا معنے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا ابو عبیدہ! تمہارے علاوہ کوئی اور یہ بات کہتا تو مجھے تعجب نہ ہوتا دیکھیں اگر وادی کا ایک کنارہ سرسبز ہو اور دوسرا بنجر اور خشک تو تم اپنے جانور جس کنارہ پر چراؤ گے وہ خدا کی تقدیر ہی ہوگی۔ خدا کی تقدیر تو ہر حال میں ہے۔ اس لیے عقل اور سمجھ کے مطابق کوئی فیصلہ کرنا تقدیر سے فرار نہیں کہلا سکتا۔ مشورہ کے وقت حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ موجود نہ تھے وہ جب آئے اور ان کو اس مشورہ کا علم ہوا تو انہوں نے بیان کیا کہ اس بارہ میں حضورؐ کا ایک فرمان ان کو یاد ہے حضورؐ نے فرمایا تھا کہ وبا زدہ علاقہ میں نہ جاؤ اور جو لوگ وبا زدہ علاقہ میں رہ رہے ہیں وہ وبا سے ڈر کر دوسرے علاقوں میں نہ جائیں۔ (بلکہ اسی علاقہ میں رہ کر احتیاطی تدابیر اختیار کریں)

---

[۱] الامام احمد صفحہ ۲۲۹

حضرت عمرؓ نے یہ روایت سن کر بے انتہا خوشی کا اظہار فرمایا۔[1]

۹۔ نماز باجماعت ہو رہی ہے قریب ہی ایک شخص ڈوبنے لگا ہے یا گھر کو آگ لگ گئی ہے تو نماز توڑ کر ڈوبنے والے کو بچانا اور آگ بجھانا ضروری ہے کیونکہ مصلحت کا یہی تقاضا ہے کہ ایک واجب کو دوسرے واجب پر ترجیح دی جائے۔[2]

۱۰۔ جس سودے میں "غَرَر" یعنی نقصان اور جھگڑا اٹھ کھڑے ہونے کا امکان ہو وہ سودا منع ہے لیکن اگر ایسے مبہم یعنی نقصان یا نفع کے احتمال والے طریق تجارت کا رواج ہو یا لوگ ایسے طریق لین دین کے ضرورت مند ہوں تو غَرَر کے اندیشے کو نظر انداز کر کے اس کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے کیونکہ احتمالی غرر کے مقابلہ میں پبلک ضرورت یا عرف کی اہمیت زیادہ ہے کہ نفع و نقصان کا احتمال تو کم و بیش ہر تجارت میں ہوتا ہی ہے اور لوگ اس کے عادی ہوتے ہیں۔ اسی اصول کی بنا پر بَیْعِ سَلَم۔ مُزَارعت۔ اِجَارَہ اور باغ ٹھیکہ پر دینے کی اجازت دی گئی ہے۔

۱۱۔ نابالغ بچے کھیل کھیل میں لڑ پڑیں اور کوئی لڑکا قتل ہو جائے تو نابالغ بچوں کی گواہی درست ہوگی۔ مصالحہ مرسلہ کے اصول کی بنا پر امام مالک نے اس کا فتویٰ دیا ہے۔

۱۲۔ اصول استصلاح کی بنا پر حنبلی اس بات کو جائز سمجھتے ہیں کہ اگر کسی حادثہ کی وجہ سے لوگ بے گھر ہو جائیں اور ان کے ٹھہرانے کی کوئی مناسب جگہ نہ ہو تو حکومت کو اختیار ہے کہ دوسرے لوگوں کے گھروں میں ان کو ٹھہرائے خواہ وہ اس کے لیے راضی ہوں یا نہ ہوں۔[3]

غرض تلاش اور جستجو سے "مصالح مرسلہ" کی بنا پر استنباط اور استدلال کی کئی مثالیں مل سکتی ہیں اور فقہاء کی ایک بھاری تعداد امام مالک کے اس مسلک کی مؤید ہے۔

امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ مصلحت ثابتہ کی بنا پر خبر واحد کو ترک کر دیا جائے چنانچہ امام مالک کے نزدیک یہ روایت درست نہیں کہ میت کی طرف سے کوئی دوسرا روزے رکھ سکتا ہے یا حج کر سکتا ہے کیونکہ عبادات میں قائمقامی اصولاً غلط ہے۔[4]

۱۔ بخاری کتاب الطب باب ما یذکر فی الطاعون ۔ مالک بن انس صفحہ ۲۰۴

۲۔ محاضرات صفحہ ۱۰۱ و ۳۶۲

۳۔ مالک بن انس صفحہ ۲۲۱ ۔ الامام احمد صفحہ ۲۳۰

۴۔ مالک بن انس صفحہ ۱۷۸

حضرت امام شافعیؒ جس طرح استحسان کے خلاف ہیں اور حنفیوں کو نشانہ تنقید بناتے ہیں اسی طرح وہ مصالح مرسلہ اور استصلاح کے بھی خلاف ہیں۔ان کی رائے ہے کہ چونکہ مصلحت کی کوئی حد بندی نہیں کی جاسکتی اس لیے اس اصول کو اپنانے میں کافی خطرات ہیں۔اس سے شریعت کا حلیہ بگڑ سکتا ہے۔ظالم حکام مصلحت کی آڑ لے کر ظلم کے لیے جواز نکالنے میں شیر ہو جائیں گے۔ علاوہ ازیں ان کے نزدیک اس اصول کو اپنانے کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ قرآن وحدیث کے بعد اگر قیاس کے اصول کو عقلمندی اور عمیق سوچ کے ساتھ استعمال کیا جائے تو احکام کا معلوم کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔اول تو نصوص ہی کچھ کم نہیں ہیں پھر ان میں جو علل اور وجوہات مضمر ہیں ان کا دائرہ بھی بڑا وسیع ہے ان کا پتہ لگا کر معاملات غیر منصوصہ کو ان پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔لیکن جیسا کہ استحسان کے بیان میں گزر چکا ہے امام شافعیؒ کا اختلاف ازقسم نزاع لفظی ہے کیونکہ مصلحت اور استصلاح کے قائل مصلحت کی تحدید کرتے ہیں۔ذاتی اغراض کو وہ مصلحت کے طور پر تسلیم نہیں کرتے بلکہ اسی مصلحت کی تائید کرتے ہیں جو مقاصد شریعت کے مطابق ہے اور عام پبلک اور عوام کی اکثریت کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے اور شریعت کے مجموعی احکام اس کے مؤید ہوں۔[1]

عُرف

استنباط کی ایک بنیاد "عرف" ہے۔عرف سے مراد یہ ہے کہ کسی جگہ کے مسلمانوں میں ایسا رواج ہے جو بجائے خود مفید ہے یا کم از کم لوگ اس میں دلچسپی رکھتے ہیں۔اور وہ شریعت کی کسی نص کے بھی خلاف نہیں۔[2]

عرف سے زیادہ تر کام کاروبار۔لین دین اور غیر مضر تمدنی رسم ورواج میں لیا جاتا ہے مثلاً اہل مدینہ میں بیع سلم کا رواج تھا اور لوگ اس کاروبار کے عادی تھے اس لیے استثنائی طور پر اس کی

---

[1] انما فر العلماء من تقریر هذا الا صل (الاخذ بالمصلحة) تقریرًا صریحًا مع اعتباره کلهم خوفا من اتخاذ ائمة الجور ایاه حجة لا تباع اهوائهم. (مالک بن انس صفحه ۲۱۷، ۲۱۸ و ۲۵۷ الامام احمد صفحه ۲۳۰ ـ الامام الشافعی صفحه ۲۳۵ ـ محاضرات صفحه ۲۳۵)

[2] العرف ان یکون عمل المسلمین علی امر لم یرو افیه نص من القرآن والسنة او عمل الصحابة. والعرف التجاری والتعامل بین التجار میزان ضابط للتجارة اذا لم یکن مخالفًا للنص ـ (محاضرات صفحه ۱۷۷ و ۱۷۹)

اجازت دی گئی تا کہ لوگ تنگی محسوس نہ کریں۔ یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ عرف کے بدلنے سے بالعموم احکام غیر منصوص بدل جاتے ہیں۔ ننگے سر پھرنا اہل مشرق کے ہاں معیوب بات ہے اور اس عیب کی وجہ سے بعض اوقات گواہ کی عدالت اور ثقاہت پر اثر پڑ سکتا ہے لیکن مغرب کے ممالک میں اس کا رواج ہے اور اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا اس لیے مغرب کے رہنے والوں میں اسے بطور جرح وتنقید استعمال نہیں کیا جا سکے گا۔[۱]

امام مالکؒ اور مدینہ کے بعض قضاۃ اہل مدینہ کے عرف کو خاص اہمیت دیتے تھے اور بعض اوقات اس کی وجہ سے خبر واحد کو رد کر دیتے تھے[۲] اور جب کسی مدنی قاضی کے سامنے روایت پیش کی جاتی کہ حدیث میں ایسا آیا ہے تو وہ یہ کہہ کر اس روایت کو رد کر دیا کرتے تھے کہ اہل مدینہ کا عرف اور رواج اس کے خلاف ہے۔

ایک دفعہ امام مالکؒ کے سامنے یہ ذکر ہوا کہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے صاع کی مقدار آٹھ رطل ہے۔ امام مالک نے مدینہ کے مختلف گھروں سے صاع منگوائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے تھے جب اندازہ کیا گیا تو وہ ۱/۳-۵ رِطَل کے تھے۔ اس پر آپ نے فرمایا جب حضور کے زمانہ کے یہ صاع اس مقدار کے ہیں اور انہی کے مطابق لوگ صدقۃ الفطر اور دوسرے واجبات مالی ادا کیا کرتے تھے تو ابو حنیفہ کی رائے کو ہم کیسے درست مان سکتے ہیں۔[۳]

بنو اُمیہ کے زمانہ میں کالے رنگ کے کپڑے کا استعمال عیب سمجھا جاتا تھا۔ بنو عباسؓ برسر اقتدار آئے تو انہوں نے کالی وردی اپنائی اس طرح کالے رنگ کے کپڑے کی قدر و قیمت بڑھ گئی اور اس کے دام بڑھ گئے اور قضاءً یہ رنگ معیوب نہ رہا۔[۴]

ذرائع

استنباط احکام کی ایک بنیاد ''ذرائع'' بھی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو ذرائع اور اسباب جَلْبِ مَنْفَعَت کا باعث اور مفید ہیں وہ شرعاً مطلوب اور مقصود ہیں اور جو ذرائع اور اسباب فساد نقصان اور ضرر کا باعث ہیں اور بدی کا ذریعہ بن سکتے ہیں وہ شرعاً ممنوع اور مردود ہیں کیونکہ

---

۱ مالک بن انس صفحہ ۲۲۵ ۲، ۳ مالک بن انس صفحہ ۱۷۶ و ۱۷۸

۴ رأی صاحبا ابی حنیفۃ ان صبغ الثوب باللون الاسود یزید قیمتہ۔ (مالک بن انس صفحہ ۲۲۵)

اگر بدی منع ہے تو بدی تک پہنچانے والے ذرائع اور اسباب بھی منع ہونے چاہئیں اور اُن کی روک تھام کی کوشش کی جانی چاہئے۔[۱]

فقہ میں عموماً ان ذرائع پر زیادہ بحث کی جاتی ہے جو ممنوع ہیں اور فساد یا بدی کا باعث بنتے ہیں۔ اسی لیے بعض اوقات اس بحث کا عنوان ''سد ذرائع'' لکھا جاتا ہے یعنی ان ذرائع کی تفصیل اور ان کی روک تھام کا اہتمام جو مُفْضِيْ اِلَى الْاِثْم ہیں اور معاشرتی برائیوں کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ بتوں کو گالیاں نکالنا منع ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جو لوگ ان بتوں کا احترام کرتے ہیں اور انہیں پوجتے ہیں ان کو برا لگے گا اور وہ چڑ کر مسلمانوں کے معبود اور سچے خدا کو گالیاں نکالنے اور برا بھلا کہنے لگیں گے۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ اگر مکہ کے نئے مسلمانوں کے ابتلا کا ڈر نہ ہوتا تو میں کعبہ کو گرا کر ابراہیمؑ کی بنیادوں پر اس کی تعمیر کرتا۔

۳۔ منگنی کا پیغام گیا ہوا ہے جب تک اس کا فیصلہ نہ ہو جائے کسی دوسرے کے لیے جائز نہیں کہ وہ پیغام بھجوائے۔ اس ارشاد کا مقصد دل شکنی اور باہمی بدمزگی کے ذرائع کی روک تھام ہے۔[۲]

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ متصدق صدقہ میں دی ہوئی چیز خود نہ خریدے کیونکہ یہ امر اس بدگمانی کا باعث بن سکتا ہے کہ اس نے یہ چیز سستے داموں خریدی ہے اور ایک چیز حاصل کرنے کا بہانہ بنایا۔

۵۔ حضرت عمرؓ نے جانوروں کی قلت کے پیش نظر حکم دیا تھا کہ ہفتہ میں دو دن گوشت کا ناغہ کیا جائے آپ اس حکم کی تعمیل بڑی سختی سے کراتے تھے۔ حضرت زبیرؓ کی ملکیت میں ایک مذبح تھا

۱۔ الذرائع هی الوسائل وان الشارع اذا طلب بامر فكل ما يوصل اليه مطلوب واذا نهى عن امر فكل ما يوصل اليه نهى عنه.... وكل امرِ مباحٍ يوصل الى مفسدةٍ فهو ممنوع من حيث الوسيلة الى مفسدةٍ والحنابلة اشد المذاهب اخذا بالذرائع. مزید تفصیل کے لیے دیکھیں۔ مالک بن انس صفحہ ۲۲۱، ۲۲۲ الامام احمد صفحہ ۲۳۲۔ محاضرات صفحہ ۲۳۷، ۳۶۳، ۳۶۴

۲۔ الامام احمد صفحہ ۲۳۰

آپ خاص طور پر اس کی نگرانی کرتے[1]

۶۔ حضرت عمرؓ نے قحط سالی کے زمانہ میں حکم دیا تھا کہ لوگوں کی ضرورتیں بیت المال سے پوری کی جائیں اور اگر بیت المال میں گنجائش نہ رہے تو صاحب حیثیت لوگ ذمہ دار ہیں کہ وہ خرچ کریں۔

۷۔ حضرت عمرؓ کا طریق تھا کہ زنا کے مجرم کو مقررہ سزا کے علاوہ ایک سال کے لیے شہر بدر کر دیا کرتے تھے لیکن ایک بار ایسا ہوا کہ ایک مجرم دشمن کے ساتھ جا ملا اور ڈر پیدا ہو گیا کہ ایسے لوگ مسلمانوں کے خلاف مخبری نہ کریں۔ چنانچہ آپ نے سزا کا یہ حصہ منسوخ کر دیا۔[2]

۸۔ دشمن یا شر پسند عناصر کے پاس اسلحہ کی فروخت منع ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ یہی ہتھیار مسلمانوں اور امن پسند شہریوں کے خلاف استعمال کریں۔

۹۔ مخالف اور دشمن کی گواہی قابل رد ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ پرانی مخالفت کی بنا پر وہ غلط بیانی کرے۔

۱۰۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے لیکن اس کے لیے پر امن ذرائع اختیار کرنے کی ہدایت ہے۔ سختی کرنا، جنگ بپا کرنا اور گالی گلوچ تک نوبت پہنچانا درست نہیں کیونکہ اس سے فتنہ بڑھتا ہے اور امن و امان کو نقصان پہنچتا ہے اور حصول مقصد کی امید معدوم ہو جاتی ہے۔[3]

۱۱۔ دوسرے تاجر کو نقصان پہنچانے کے لیے اپنے تجارتی مال کا بھاؤ گرانا منع ہے کیونکہ یہ طریق دوسرے کی تجارت کا بھٹہ بٹھانے کے مترادف ہے۔[4]

غرض ذخیرہ فقہ میں ایسے ذرائع کی متعدد مثالیں ملیں گی جو اصلاً مباح ہیں لیکن وہ مفسدہ یا بدی کا باعث ہیں یا باعث بن سکتے ہیں اس لیے ان سے منع کیا گیا ہے اور ان سے مجتنب رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

۱؎ کان عمرؓ سباقاً لسد الذرائع والعمل بالصالح. مالک بن انس صفحہ ۲۵۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں الامام الشافعی صفحہ ۲۵۶۔

۲؎ مالک بن انس صفحہ ۲۰۶۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں مالک بن انس صفحہ ۳۲۲

۳؎ فمالک لا یریٰ سل السیف فی سبیل الامر بالمعروف والنھی عن المنکر (والمعتزلة یری ذالک واجباً) سدا للذرائع الی الفتنة ولان الدنیا یصلحھا السلام والامن. (مالک بن انس صفحہ ۳۴۵)

۴؎ محاضرات صفحہ ۳۶۵

رَفْعِ حَرَج

استنباط احکام کا ایک اصل ''رفع حرج'' ہے یعنی جس چیز سے لوگ تنگی، تلخی اور بے چینی سے دوچار ہوتے ہوں اور مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہو اس چیز کا ازالہ اور اسے ہٹانا مقصود شریعت ہے۔ حرج اور بوجھ مطلوب شرع نہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ [1] مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ [2] اسی طرح فرمایا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا۔ [3]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے بُعِثْتُ بِالْحَنِيْفِيَّةِ السَّمْحَةِ . خُذُوْا مِنَ الْعَمَلِ مَا تُطِيْقُوْنَ ۔ میں سیدھی سادی اور بالکل آسان شریعت لے کر مبعوث ہوا ہوں۔ طاقت اور برداشت کے مطابق راہ عمل اختیار کرو۔ [4] رفع حرج کے اصول میں اس بات کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے کہ دو مشکلوں میں سے کون سی کم مشکل ہے۔ کس میں کم نقصان ہے۔ جو کم مشکل ہے جس میں کم نقصان ہے اسے اختیار کیا جائے۔

رفع حرج کی متعدد مثالیں نظام فقہ میں موجود ہیں جن میں سے بعض منصوص ہیں اور بعض غیر منصوص۔ جیسے تیمم، سفر میں افطار، جرابوں پر مسح۔ جمع نماز اور بعض ایسی بیوع جن کے منع ہونے کے بارہ میں نص موجود ہے مثلاً۔ بَيْعِ غَرَر، بَيْعِ ثِمَار قبل از بدو صلاح وغیرہ اور بعض غیر منصوص اور فقہاء کے اجتہاد پر مبنی ہیں، جیسے حسب ضرورت عورت کا فوٹو کھنچوانا۔ مرد ڈاکٹر سے علاج کروانا۔ زندگی بچانے کے لیے دوسرے کا خون دینا۔ اعضاء کی پیوند کاری کا جواز وغیرہ رفع حرج کے اصول سے ہی وابستہ ہیں اور حقیقت شناس علماء اور گہری نظر رکھنے والے فقہاء اس اصل کی وسعت کے قائل ہیں۔ [5]

---

[1] سورۃ الحج: ۷۹ [2] سورۃ المائدہ: ۷ [3] سورۃ النساء: ۲۹
[4] مالک بن انس صفحہ ۲۰۰، ۲۰۱
[5] مزید تفصیل کے لیے دیکھیں محاضرات فی تاریخ المذاهب الفقهیه صفحہ ۱۰۴ تا ۱۰۶ مالک بن انس صفحہ ۲۰۰، ۲۰۱ و ۲۱۵ و ۲۳۱

استصحاب

استنباطِ احکام کا ایک اصول استصحاب[1] ہے۔ استصحاب کے معنے ساتھ رکھنے، قائم رہنے دینے اور اصلی حالت پر موجود رہنے دینے کے ہیں۔ شریعت کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت اور جواز ہے پس جب تک نص کسی چیز کو حرام قرار نہ دے اور اس سے منع نہ کرے وہ چیز مباح اور جائز ہوگی اور اس کا یہ وصف قائم ودائم رہے گا اسی استنباط کا نام فقہاء نے استصحاب رکھا ہے مثلاً بنیادی طور پر پانی پاک ہے دوسری چیزوں کو پاک کرسکتا ہے اس کا یہ وصف قائم ودائم اور موجود رہے گا سوائے اس کے کہ نص یہ کہے کہ اب یہ پانی ناپاک ہے۔ حدیث میں ہے اگر نجاست پانی کے مزہ یا بو یا رنگ کو بدل دے تو پانی ناپاک اور نجس ہوجاتا ہے ورنہ پاک رہتا ہے۔

ایک شخص گم ہوگیا وہ قانونی اغراض کے لیے اس وقت تک زندہ سمجھا جائے گا جب تک کہ دلائل اور واضح قرائن اس کے فوت ہوجانے کے سامنے نہ آجائیں۔

ایک شخص ایک جائیداد کا مالک اور اُس پر قابض چلا آرہا ہے اور اردگرد کے رہنے والے بھی یہ بات جانتے ہیں پس اس کی ملکیت اس وقت تک مسلّم ہوگی اور اس کا قبضہ مالکانہ ہوگا جب تک کہ کوئی قطعی دلیل مثلاً فروخت کا قطعی ثبوت مہیا نہ ہوجائے۔[2]

اہل ظاہر مثلاً امام داؤد ظاہری اور امام ابن حزم الاندلسی استصحاب کے اصول کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ وہ نصوص کی پیروی کی تلقین کرتے ہیں اور اگر کسی مسئلہ کے بارہ میں کوئی نص نہ ملے تو **اباحت اصلیہ** یا **استصحاب** کے اصول کی پابندی کرتے ہیں اور اس بارہ میں اس قدر متشدد ہیں کہ بعض شذوذ اور بعید از عقل جزیات کو اپنانے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔

---

[1] الاستصحاب استدامة اثبات ما كان ثابتا و نفي ما كان نفيا ...... بقاء الحكم على ما هو عليه حتى يقوم دليل على التغير ....واجمع الائمة على الاخذ به قلة وكثرة وقال الله تعالى " خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرة :۳۰)۔ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ " (البقرة :۳۷)

[2] الامام احمد صفحه ۲۲۶۔۲۲۷

شرعی اور فقہی نظام کی تدوین کے لحاظ سے اہل السنّت والجماعت کی شاخیں

جن ائمہ فقہ نے تدوین فقہ کی بنیاد رکھی اور اس سلسلہ میں قابل قدر کام کیا اور ان کے ماننے والے دنیائے اسلام میں بالعموم پائے جاتے ہیں اور جن کی مختصر سوانح کا لکھنا اس جگہ مقصود ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ۔ حضرت امام مالکؒ۔ حضرت امام شافعیؒ۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ۔ حضرت امام ابن تیمیہؒ۔ حضرت امام ابن قیمؒ۔ حضرت امام داؤد الظاہریؒ۔ حضرت امام ابن حزمؒ۔ حضرت امام لیث بن سعدؒ۔ حضرت امام جریر الطبریؒ۔

رجحانِ طبع اور تفاوتِ حالات کی وجہ سے مذکورہ بالا ائمہ نے تدوین فقہ کے لیے مختلف نہج اختیار کئے۔ بعض روایات میں ماہر تھے اور فقہ کی بنیاد روایات پر رکھنے کے قائل تھے وہ ضعیف سے ضعیف روایت کو بھی رائے اور قیاس پر ترجیح دیتے تھے اور بعض دوسرے فراست اور تفقّہ سے کام لینے کے عادی تھے اور گہرائی میں جانے کا ذوق رکھتے تھے اور قرآن کریم کے بعد انہی روایات کو قبول کرتے تھے جو ان کے نزدیک یقینی اور قطعی الثبوت تھیں ورنہ وہ رائے قیاس اور علم کے دوسرے ذرائع کی مدد سے مسائل فقہ مستنبط کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ علم کثرت روایت کا نام نہیں علم تو ایک نور ہے ایک بصیرت ہے۔ استنباط مسائل میں اس سے کام لینا چاہیے اور اس کی مدد سے کسی روایت کا صحیح رخ متعین کرنا چاہیے۔ ان کے خیال میں یہ ضروری تھا کہ مقاصد شریعت کو مدنظر رکھ کر تفقہ کا فریضہ سرانجام دیا جائے۔[1]

---

[1] الف. لیس العلم بکثرت الروایة انما ہو نور یضعہ اللہ فی القلب ۔(مالک بن انس صفحہ ۱۰۵)

ب . سئل عبدالرحمن بن المہدی عن سفیان الثوری والاوزاعی ومالک (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ائمہ فقہ

۱۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ

آپ کا نام نعمان بن ثابت بن زوطی کنیت ابوحنیفہ [۱] اور لقب امام اعظم تھا۔ آپ ۸۰ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں جب کہ آپ کی عمر ستر سال کے قریب تھی بغداد میں فوت ہوئے۔

آپ کا گھرانہ کابل (افغانستان) کے ایک معزز اور مذہبی طور پر پیشوا خانوادہ سے تعلق رکھتا تھا جو کابل کے مجوسی معبد کا مُوبَد خاندان تھا۔ کابل کی فتح کے بعد امام ابوحنیفہ کے دادا زُوطی اپنے خاندان کے ساتھ کوفہ میں آبسے تھے یا قید ہو کر آئے مسلمان ہو گئے اور بنو تیم بن ثعلبہ [۲] سے عقد ولاء قائم ہوا۔ [۳] کہا جاتا ہے کہ زوطی کو حضرت علیؓ سے بے حد عقیدت تھی۔ آپ نے ایک لذیذ مشروب

(بقیة صفحه ۱۱۰) فقال سفیان امام و لیس بامام فی السنة والاوزاعی امام فی السنة و لیس بامام فی الحدیث ومالک امام فیهما۔(مالک بن انس صفحه ۱۸۳)

ج. یقال ابن عمرؓ جید الحدیث ولیس بجید الفقه (مالک بن انس صفحه ۱۷۳)

د: فاق بعض العلماء فی معرفة الحدیث واسانیده ورجاله وبعضهم فاق بالفقه فی الحدیث والا ستدلال به ۔ (الامام الشافعی صفحه ۱۹۸)

ه۔ قال ابو حنیفة مثل من یطلب الحدیث ولا یتفقه کمثل الصید لانی یجمع الادویة ولا یدری لای دآء هی حتی یجیء الطبیب... هکذا طالب الحدیث لا یعرف وجه حدیثه حتی یجیء الفقیه .... (محاضرات فی تاریخ المذاهب الفقهیة صفحه ۱۵۳ بحواله المناقب جلد۲ صفحه ۹۱۔ ابو حنیفه صفحه ۱۸۳،۱۸۲)

۱۔ یہ کنیت کیوں مشہور ہوئی، اس میں اختلاف ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ آپ چونکہ اعتدال کے عادی تھے، افراط وتفریط سے بچتے تھے، آپ نے بڑی معتدل راہ اختیار کر رکھی تھی اس لیے آپ ابوحنیفہ کی کنیت سے مشہور ہوئے۔ بعض کا خیال ہے کہ عراقی زبان میں حنیفہ دوات کو کہتے ہیں چونکہ تدوین فقہ کے کام کے سلسلہ میں ہر وقت آپ کی مجلس دواتوں سے بھری رہتی تھی۔ آپ کے ہر شاگرد کے پاس دوات ہوتی تھی اس لیے آپ کی شہرت ابوحنیفہ کی کنیت سے ہوئی۔ (ابو حنیفه صفحه ۱۶۳)

۲۔ هم قبیلة من العرب غیر التیمیین من قریش (محاضرات صفحه ۱۴۳)

۳۔ عجم کے رہنے والے جو عرب مسلمانوں کے معاشرہ کا حصہ بن جاتے ہیں ان کو موالی کہا جاتا تھا۔ هم قوم منتسبون الی بیوت العرب بعقد الولاء منهم الارقاء ومنهم غیر الارقاء (ابو حنیفه صفحه ۲۳)

جس کا نام فالودہ تھا اور کابل کے لوگ اس کے بنانے میں ماہر تھے حضرت علیؓ کی خدمت میں نذر کیا۔آپ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو اس کا نام ثابت رکھا اور اس کی کامیاب زندگی اور مبارک ذریت کے لیے حضرت علیؓ سے دعا کرائی۔

امام ابو حنیفہ طویل القامت، کھلا اور بشاش چہرہ، کھلتا سفید گندمی رنگ، گھنی داڑھی، وضع قطع کے لحاظ سے بڑے خوش پوش، صاف ستھرے رہن سہن کے مالک بزرگ تھے اور ہمیشہ خوش رہنے والے مطمئن مزاج صابر وشاکر عالم سمجھے جاتے تھے۔[1] آپ کے دادا زوطی نے کوفہ آکر کپڑے کا کاروبار شروع کیا اور اس میں خوب ترقی کی۔یہ تجارتی کاروبار امام ابو حنیفہؒ کو ورثہ میں ملا۔آپ بھی تجارت کا بڑا گہرا ملکہ رکھتے تھے۔بچپن سے ہی اپنے والد ثابت کے ساتھ کام کاج میں حصہ لینے لگے۔ پھر جب آپ پر پورا بوجھ پڑا تو آپ نے اپنی ذمہ واری کو سمجھتے ہوئے نہ صرف کاروبار کو سنبھال لیا بلکہ اس کو مزید ترقی دی۔اس زمانہ میں کپڑے کی ایک مشہور قسم بہت پسند کی جاتی تھی۔اس کا نام خز تھا اور خوب بکتا تھا۔ریشم اور اون کی ملاوٹ سے بنتا تھا۔آپ نے اس کپڑے کے بنانے کی کھڈیاں لگوائیں اور شرکت کے اصول پر کاروبار کو چلایا۔مختلف شہروں میں اس کی ایجنسیاں قائم کیں جہاں آپ مال بھجواتے اور خوب منافع کماتے۔تجارتی مہارت کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی اپنی اپنی رقمیں کاروبار میں لگانے یا محفوظ رکھنے کے لیے آپ کو دیتے رہتے۔

ایک دفعہ آپ نے ایک نوجوان کو ایک لاکھ ستر ہزار درہم بھجوائے اور کہا کہ تمہارے والد کی یہ رقم میرے پاس تھی جو وہ وفات سے پہلے واپس نہیں لے سکے تھے۔اسی طرح تاریخ نے اس واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے۔جب آپ فوت ہوئے تو پچاس ہزار کے قریب ایسی رقمیں آپ کے پاس لوگوں کی تھیں[2] جو وفات کے بعد واپس ہوئیں۔بہر حال مالی لحاظ سے امام ابو حنیفہؒ بڑے خوشحال تھے اور آپ کو کبھی بھی کسی قسم کی مالی پریشانی سے دوچار نہیں ہونا پڑا تھا۔

امام ابو حنیفہؒ اور علم

جیسا کہ ذکر آچکا ہے آپ شروع سے ہی ہوش سنبھالتے ہی تجارتی کاروبار سے متعلق ہو گئے تھے

[1] ابو حنیفہ صفحہ ۱۰ [2] ابو حنیفہ صفحہ ۳۸

اور مروجہ علوم کی طرف توجہ مبذول نہ کر سکے تھے۔ آپ کی عمر پندرہ سال کے قریب ہوگی کہ ایک روز بازار میں جاتے جاتے اس زمانہ کے مشہور محدث حضرت امام **شعبیؒ** سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ کسی بات پر انہوں نے محسوس کیا کہ بچہ ذہین اور قابل لگتا ہے۔ اس پر انہوں نے ابو حنیفہ کو نصیحت کی کہ وہ تحصیل علم کی طرف توجہ کریں۔[1] آپ امام **شعبیؒ** کی نصیحت سے متاثر ہوئے اور طبعی مناسبت کے لحاظ سے کوفہ کے مختلف مدارس کا جائزہ لیا۔ شروع شروع میں آپ نے علم کلام[2] میں دلچسپی لی اور اس کے لیے بصرہ بھی گئے جو اس زمانہ میں علم کلام کا مرکز تھا لیکن کچھ مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس علم میں توغل اور انہماک انسان کو جھگڑالو اور مکابرہ پسند بنا دیتا ہے۔ اس کی ساری بحثیں بے کار اور بے نتیجہ ہیں ان کا مآل سخت دلی اور سیاہ باطنی ہے۔ یہ باتیں سوچ کر آپ نے اس شغل کو ترک کر دیا[3] لیکن علم سے جو دلچسپی اور انس پیدا ہو گیا تھا اس نے آرام سے نہ بیٹھنے دیا۔

آپ نے فقہ کے مدارس کا جائزہ لیا کیونکہ اس زمانہ میں اس علم کا بھی خاصہ چرچا تھا۔ آپ کو حضرت حمّاد بن ابی سلیمانؒ کا درس فقہ بہت پسند آیا۔ حمّاد روایت اور درایت کے جامع تھے اور کوفہ کے سربرآوردہ عالم اور فقیہ مشہور تھے۔ چنانچہ ابو حنیفہ ان کے مدرسہ سے منسلک ہو گئے اور فقہ کا درس لینا شروع کیا اور پھر استاد اور شاگرد مناسبت طبع کے لحاظ سے فیضان علمی کا سرچشمہ بن گئے اور یہ تعلق بڑھتے بڑھتے عاشقانہ رنگ اختیار کر گیا۔ حضرت حمّاد امام ابراہیم نخعی کے شاگرد تھے اور نخعی کو بواسطہ علقمہ مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حضرت ابن مسعودؓ کو حضرت عمرؓ نے علم دین سکھانے کے لیے کوفہ بھیجا تھا۔ نخعی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی استفادہ کیا تھا۔ اس طرح امام ابو حنیفہؒ کا سلسلۂ علم ایک ایسے اجتہاد پرور مدرسہ سے وابستہ تھا جو اس زمانہ میں روایت اور درایت نصوص اور تفقہ کا مجمع البحرین تھا۔ امام ابو حنیفہؒ نے قریباً اٹھارہ سال

---

[1] قال الشعبی علیک بالنظر فی العلم ومجالسة العلماء فانی اریٰ فیک یقظة وحرکة (ابو حنیفه صفحه ۱۱)

[2] هو علم التوحید والجدال فی العقاید (ابو حنیفه صفحه ۱۱)

[3] یقول الامام تفکرت وقلت السلف کانوا اعلم بالحقائق ولم ینتصبوا مجادلین ...... ورایت المشتغلین بالکلام لیس سیماهم سیماء الصّٰلحین قاسیة قلوبهم غلیظة افئدتهم فترکت الکلام واشتغلت بالفقه ۔(ابو حنیفه صفحه ۱۲)

تحصیل علم میں صرف کئے لیکن ساتھ ساتھ کاروبار کی نگرانی کا فریضہ بھی سرانجام دیتے رہے۔ تجارتی سوجھ بوجھ اور دیانتدار، تعاون کرنے والے شرکاء کی وجہ سے آپ کی تجارت ہمیشہ روبہ ترقی رہی اور تحصیل علم کی مصروفیت کو آپ نے تجارتی امور پر کسی طور پر بھی اثر انداز نہ ہونے دیا۔[1]

امام ابوحنیفہ اور درس وتدریس

تحصیل علم کے بعد آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری کردیا۔ اس زمانہ میں مسجد ہی مدرسۃ العلم بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ آپ نے بھی مسجد کو ہی اس غرض کے لیے پسند کیا اور کوفہ کی جامع مسجد کے ایک حصہ میں اپنا مدرسہ قائم کیا جس نے آہستہ آہستہ ترقی کے مراحل طے کئے اور بالآخر اس زمانہ کے لحاظ سے عظیم الشان حلقہ ہائے درس میں شمار ہونے لگا۔[2]

تقسیم کار کے لحاظ سے ہفتہ بھر کے دن آپ نے اس طرح تقسیم کئے ہوئے تھے۔ سبت کا دن گھر کے کام کاج اور جائیداد کی دیکھ بھال کے لئے وقف تھا۔ اس روز نہ آپ تجارتی کاروبار سے سروکار رکھتے اور نہ درس وتدریس کے حلقہ میں شامل ہوتے۔ ہر جمعہ کو آپ عبادت الٰہی کے علاوہ اپنے دوست احباب اور ممتاز شاگردوں کی دعوت کرتے اور یہ دن ان سے ملنے ملانے اور بات چیت کرنے میں صرف کرتے۔ باقی دنوں میں درس وتدریس میں بھی حصہ لیتے اور تجارتی امور کی نگرانی بھی فرماتے۔ کام کے ان دنوں میں آپ نے بالعموم اپنے اوقات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ دن کے پہلے حصہ میں عبادت اور ذکر الٰہی سے فارغ ہونے کے بعد گھریلو کام سرانجام دیتے۔ چاشت کے بعد بازار جاتے اور اپنے کاروبار کی نگرانی کرتے۔ تجارتی کارکنوں کو ہدایات دیتے۔ آمد وخرچ اور نفع ونقصان کا جائزہ لیتے۔ دوپہر کے بعد کھانا وغیرہ کھا کر اور کچھ دیر آرام کے بعد عصر کی نماز مسجد میں ادا کرتے اس کے بعد درس وتدریس کا دور شروع ہوتا۔ آپ کا مدرسہ کوئی ابتدائی مدرسہ نہ تھا بلکہ اونچے درجہ کے مختلف قابلیتیں رکھنے والے طلبہ درس میں شامل ہوتے تھے، کوئی لغت اور زبان کا ماہر، کوئی حدیث وتاریخ میں ممتاز، کوئی تفقہ قیاس اور معاشرہ کے

---

[1] ان الصدق والحزامة فی التجارة قد هيأ له من النجاح اسباباً مواتية للتفرغ للدرس والتدريس وخدمة دين الله۔ (ابو حنيفه صفحه ۳٦ ملخصاً)

[2] ابو حنيفه صفحه ۱۰۱

رسم ورواج عرف اور عادات الناس کے مطالعہ کا خوگر۔غرض آپ کا مدرسہ مختلف استعدادوں کے حامل ارباب علم کا مرکز تھا۔طلبہ کو مختلف مسائل کے بارہ میں سوال اٹھانے اور بحث میں حصہ لینے کی کھلی اجازت تھی۔ ہر رائے پر خواہ وہ استاد کی رائے ہو تنقید ہوتی تھی۔آخر بحث مباحثہ اور علمی تحقیقات کے بعد جب کسی مسئلہ کا حل نکل آتا اور کوئی رائے قائم ہو جاتی اور بات طے کر لی جاتی تو اسے مناسب سیاق وسباق کے ساتھ لکھ لیا جاتا اور رات گئے تک درس و تدریس کا یہ سلسلہ جاری رہتا صرف نماز کا وقفہ ہوتا۔[1]

علمی وسعت کے ساتھ ساتھ امام ابوحنیفہؒ بڑے غَنِیُّ النَّفْس اور سَخِیُّ الطَّبع بزرگ تھے۔آپ جس قدر مالدار تھے اتنے ہی زیادہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے بھی تھے۔اپنے شاگردوں پر دل کھول کر خرچ کرتے ان کی ضرورتوں کا ہمیشہ خیال رکھتے۔

امام ابو یوسفؒ کے والد بڑے غریب، تنگ دست اور مزدوری پیشہ بزرگ تھے۔انہوں نے اپنے بیٹے سے ایک بار کہا ابوحنیفہ کے درس میں جانے کی بجائے کوئی کام کرو تا کہ چار پیسے آئیں اور گھر کا گزارا چلے۔ چنانچہ والد کے اصرار پر آپ نے حلقۂ درس میں جانا چھوڑ دیا اور درزی کا کام شروع کر دیا۔امام ابوحنیفہؓ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے ابو یوسف کو بلا کر حالات دریافت کئے اور ان کا معقول وظیفہ مقرر کر دیا اور پھر ہمیشہ ان کی ضروریات کا خیال رکھا۔ دوسرے ضرورتمند طلبہ کے بارہ میں بھی آپ کا یہی طریق تھا۔آپ چاہتے تھے کہ قابل ذہن غربت کی وجہ سے ضائع نہ ہونے پائے اور علم کے زیور سے محروم نہ رہ جائے۔چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کے مدرسہ کے پروردہ بعد میں عظیم الشان مناصب پر فائز ہوئے اور آسمانِ علم کے ستارے اور سورج بن کر چمکے۔

غرض حضرت امام ابوحنیفہ کو اللہ تعالیٰ نے دین ودنیا، علم و مال کی دونوں دولتیں وافر مقدار میں بخشی تھیں جن کی تقسیم میں آپ نے کبھی بھی بخل سے کام نہ لیا۔علم کی دولت بھی لٹائی اور دنیا کی دولت سے بھی دوسروں کو مالا مال کیا۔[2]

---

[1] ابو حنیفہ صفحہ ۱۶۴

[2] کان ابو حنیفہ یعطی و یقول انفقوا فی حوائجکم ولا تحمدوا اِلّا اللّٰہ سبحانہ وتعالٰی فانھا ارباح بضائعکم ممّا یجری اللّٰہ لکم علی یدی ۔(ابو حنیفہ صفحہ ۹۸و۱۰۱)

آپ کے ایک شریک تجارت حفص نامی بڑے صاحب علم بزرگ تھے وہ تیس سال تک آپ کے ساتھ کاروبار میں شریک رہے۔ ایک بار انہوں نے کہا: میں بڑے بڑے علماء، فقہاء، قضاۃ، **زُہّاد** اور **تُجّار** کے ساتھ رہا ہوں میں نے امام ابوحنیفہ جیسا جامع الصفات بزرگ کوئی نہیں دیکھا۔ وہ ان ساری صفات اور قابلیتوں کے جامع تھے جو دوسروں میں فرداً فرداً پائی جاتی تھیں۔[1]

امام ابوحنیفہ اور حکومت

آپ نے بنوامیہ اور بنوعباس دونوں حکومتوں کے دور دیکھے۔ قریباً باون سال بنواُمیہ کے دور حکومت میں گزرے اور اٹھارہ سال بنوعباس کا دور دیکھا۔ بنوامیہ کے عروج کا زمانہ اور پھر زوال کے سارے مراحل آپ کی آنکھوں کے سامنے گزرے۔

آپ دونوں حکومتوں کے انداز کو پسند نہیں کرتے تھے اور **عَلَوِیُّ الْھَوٰی** تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ سادات کے نیک لوگ برسر اقتدار آئیں لیکن اس کے باوجود آپ نے کبھی بغاوت اور خروج علی الحکّام میں حصہ نہیں لیا۔ آپ کا نظریہ یہ تھا کہ قائم شدہ حکومت کے ساتھ اس کے اچھے کاموں میں تعاون کرنا چاہیے۔ نصیحت اور خیر خواہی کے اصول کو آپ نے ہمیشہ مدنظر رکھا۔ آپ کا کہنا تھا کہ بغاوت فتنہ کا ایک انداز ہے۔ اس میں خون ریزی کے جو طوفان اٹھتے ہیں وہ حکام کے انفرادی ظلم و جور سے کہیں زیادہ بھیانک ہوتے ہیں اس لیے بغاوت کوئی طریق اصلاح نہیں۔

بنواُمیہ کی حکومت نے بھی کوشش کی کہ وہ آپ کا قریبی تعاون حاصل کرے اور حکومت کے کاموں میں آپ شریک ہوں لیکن آپ نے کبھی کوئی عہدہ قبول نہ کیا۔ پھر بنوعباس کے دور میں بھی یہ کوشش ہوئی اور آپ پر زور دیا گیا کہ آپ قاضی کا عہدہ قبول کریں لیکن آپ اس پر راضی نہ ہوئے۔ حکومت ائمہ دین کا تعاون اس غرض سے حاصل کرنے کی متمنی رہتی تھی کہ عام پبلک ائمہ دین کا نمونہ دیکھ کر اطاعت شعار بن جائے لیکن حکومت کی عام پالیسی ایسی نہ تھی کہ ائمہ دین حکومت میں شرکت کی طرز کا تعاون دیتے اور حکومت کا حصہ بنتے کیونکہ یہ بات حکومت کے ظلم و ستم

---

[1] ابو حنیفہ صفحہ ۴۰۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں محاضرات صفحہ ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۶۵ و ابو حنیفہ صفحہ ۵۶، ۹۸ تا ۱۰۱ و مالک بن انس صفحہ ۱۱۷

میں شرکت کے مترادف ہوتی اور ائمہ دین یہ تاثر دینے سے پرہیز کرتے تھے اور کسی درجہ میں بھی حکومت کا آلۂ کار بننے کے لیے تیار نہ تھے۔

ایک دفعہ عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے آپ سے کہا کہ آپ قضاء کا عہدہ کیوں قبول نہیں کرتے آپ نے جواب دیا کہ میں اس عہدہ کے لیے اپنے آپ کو اہل نہیں پاتا۔ منصور نے غصہ کے انداز میں کہا آپ جھوٹ بولتے ہیں آپ پوری طرح اس عہدہ کے اہل ہیں۔ امام صاحب نے بڑے ادب سے عرض کیا کہ اس کا فیصلہ خود امیر المومنین نے کر دیا ہے۔ اگر میں جھوٹ بولتا ہوں جیسا کہ امیر المومنین نے فرمایا ہے تو جھوٹا آدمی قاضی نہیں بن سکتا اور وہ اس ذمہ داری کا اہل نہیں۔ یہ برجستہ جواب سن کر منصور گم سم ہو کر رہ گیا اور اسے کوئی مزید سوال کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔[۱]

ایک اور موقع پر ابوجعفر منصور نے آپ سے خفگی کے رنگ میں کہا۔ میری حکومت میں نہ آپ کوئی عہدہ قبول کرتے ہیں اور نہ میری طرف سے بھجوائے گئے تحائف اور نذرانے لیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ حکومت کے مخالف ہیں۔ آپ نے جواب دیا یہ بات نہیں۔ قضاء کی ذمہ داریاں میں اٹھا نہیں سکتا۔ امیر المومنین جو تحفہ دینا چاہتے ہیں وہ امیر المومنین کا ذاتی مال نہیں بلکہ بیت المال کی رقم ہے جس کا میں مستحق نہیں کیونکہ نہ میں فوجی ہوں اور نہ فوجیوں کے اہل وعیال سے میرا کوئی تعلق ہے اور نہ میں محتاج اور ضرورتمند ہوں اور بیت المال میں انہی گروہوں کا حق ہے۔ جب میں اس رقم کا حقدار نہیں تو اس کا لینا میرے لیے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ اس پر منصور نے کہا کہ آپ یہ مال لے کر غرباء میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا امیر المومنین کے وسائل مجھ درویش سے زیادہ ہیں۔ آپ اچھی طرح جان سکتے ہیں کہ کون غریب ہے اور کون امیر اس لیے آپ کی تقسیم زیادہ مناسب ہو گی۔

غرض آپ نے سختیاں برداشت کیں، خلفاء اور حکام کے ظلم سہے، کوڑے کھائے، قید وبند کے مصائب جھیلے، کوفہ چھوڑ کر دارالامان مکہ کی طرف ہجرت کی لیکن حکومت وقت کا نہ کوئی عہدہ اختیار

---

۱ ابو حنیفہ صفحہ ۲۰۲

کیا اور نہ کوئی انعام یا نذرانہ قبول کیا۔کوئی عہدہ قبول نہ کرنے کی وجہ ایک جگہ آپ نے خود بیان کی ہے۔بنو امیہ کی طرف سے والی کوفہ ابن ہُبَیرہ نے جب آپ سے کہا کہ آپ محکمہ قضاء میں یہ عہدہ قبول کریں کہ حکومت کی مہر آپ کے پاس رہے اور جب تک آپ کی مہر ثبت نہ ہو کسی کا فیصلہ نافذ نہ ہو۔اس پر آپ نے فرمایا **هُوَ يُرِيْدُ مِنِّيْ اَنْ يَّكْتُبَ دَمَ رَجُلٍ يَضْرِبُ عُنُقَهٗ وَاَخْتِمُ اَنَا عَلٰى ذَالِكَ الْكِتَابِ فَوَاللّٰهِ لَا اَدْخُلُ فِيْ ذَالِكَ اَبَدًا**[1] کہ ابن ہبیرہ کا مقصد یہ ہے کہ وہ کسی کے قتل کا فیصلہ کرے اور میں اس پر اپنی مہر تصدیق ثبت کروں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

ابوجعفر منصور کے اصرار کے بارہ میں آپ نے فرمایا **لا يصلح للقضاء اِلَّا رَجُلٌ يَّكون له نفس يحكم بها عليك وعلى ولدك و قُوَّادك وَ لَيْسَتْ تلك النَّفْس لي** یعنی قاضی ایسے دل گردہ کا ہونا چاہیے کہ اگر اسے آپ کے خلاف یا آپ کے بیٹوں اور سرداران لشکر کے خلاف فیصلہ کرنا پڑے تو بے دھڑک کرے لیکن میرا یہ دل گردہ نہیں ہے۔

دراصل آپ علم و عمل کی تربیت کے لیے اپنے آپ کو وقف رکھنا چاہتے تھے۔دوسرے ائمہ فقہ کا بھی یہی انداز فکر تھا کہ حکومت کا کوئی عہدہ قبول کرنے کی بجائے حکومت کی ذمہ داریاں قبول کرنے والوں کی علمی اور عملی تربیت کا فریضہ سرانجام دیں تا کہ وہ پبلک کی بہتر خدمت کر سکیں۔یہی وجہ ہے کہ ان ائمہ دین کے تربیت یافتہ علماء اور صلحاء نے بعد میں حکومت کے بڑے عہدے قبول کئے اور اپنے علم اور اپنے انصاف کے ذریعہ عوام کی خدمت کا فریضہ سرانجام دیا اور اپنی رہنمائی کے کارناموں میں شہرت دوام پائی۔[2]

حضرت امام ابوحنیفہؒ نے ایک دفعہ اپنے شاگردوں کو جمع کیا۔ان میں آپ کے ممتاز اور شہرت یافتہ شاگرد بھی تھے جن کی چالیس کے قریب تعداد تھی اور وہ آپ کی مجلس فقہ کے رکن تھے۔آپ نے ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔میں نے تمہاری علمی اور عملی تربیت اس رنگ میں کی ہے کہ اب تم ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل بن گئے ہو اور حکومت کے منہ زور گھوڑے کو قابو میں رکھ سکتے ہو۔صدق و ثبات کے قدم مضبوطی کے ساتھ جما سکتے ہو۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی محنت کو

---

[1] محاضرات في تاريخ المذاهب الفقهية صفحه ۱۶۸ و ۱۷۲ و مالک بن انس صفحه ۱۹۹

[2] ابوحنیفہ صفحہ ۹۳، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۱۶ تا ۲۰۱

بارآور کیا، آپ کی خواہش کو شرف قبولیت بخشا۔ آپ کے شاگردوں کو بڑے بڑے عہدے ملے اور وہ ان عہدوں کے اہل ثابت ہوئے اور تاریخ ان کے کارناموں پر شاہد ناطق ہے[۱]۔

حضرت امام ابوحنیفہ کا فقہی منہاج یہ تھا کہ سب سے پہلے قرآن کریم پر غور کرتے اور اس سے رہنمائی حاصل کرتے۔ اگر قرآن کریم میں تصریح نہ ملتی تو سنت ثابتہ کی پابندی کرتے۔ اگر سنت میں وضاحت نہ ہوتی تو پھر صحابہؓ کے اجتماعی عمل کی پیروی کرتے اور اگر مسئلہ زیرغور کے بارہ میں ان کا کوئی اجتماعی عمل معلوم نہ ہوتا تو پھر صحابہؓ کے مختلف اقوال میں سے اس قول کو اختیار کرتے جو ان کی سمجھ کے مطابق قرآن کریم یا سنت ثابتہ کے عمومی منشاء کے قریب تر ہوتا۔ اس کے بعد دوسرے ذرائع علم واستنباط مثلاً قیاس، استحسان اور عرف وغیرہ کو آپ اختیار کرتے اور استخراج مسائل وغیرہ کا فریضہ سرانجام دیتے۔ تدوین فقہ کے یہی ذرائع آپ کے سامنے تھے اور انہی ذرائع کو اختیار کرنے کی آپ نے اپنے شاگردوں کو تلقین کی[۲]۔

آپ ہمیشہ کہا کرتے کہ ہم نے اپنی سمجھ کے مطابق مذکورہ بالا ماخذ سے مسائل مستنبط کئے ہیں، اگر کوئی اور اس سے بہتر استنباط اور اجتہاد پیش کرے تو ہم اس کی پیروی کریں گے اور اپنی رائے پر ہمیں اصرار نہیں ہوگا۔[۳] اگر آپ نے کسی روایت کا انکار کیا یا وہ نظر انداز ہوئی تو اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ وہ روایت بوجوہ ان کے نزدیک ثابت نہیں تھی یا زیادہ ثقہ روایت ان کے علم میں تھی یا ایسی کوئی روایت ان کے علم میں نہیں آئی تھی[۴] کیونکہ روایات بہت بعد میں جمع ہوئی ہیں اور بتدریج ان میں اضافہ ہوا ہے جیسا کہ سنت وحدیث کے باب میں گذر چکا ہے۔ نیز آپ کے زمانہ میں مختلف اسباب کی وجہ سے وضع احادیث کا زور بڑھ گیا تھا۔ اس وجہ سے بھی اخذ روایات میں آپ بڑی احتیاط برتنے پر مجبور تھے۔[۵] حضرت امام ابوحنیفہ نے تدوین فقہ میں ایک اور نیا انداز بھی

---

۱ لمحات النظر للکوثری صفحہ ۲۰۔ مطبوعہ القاھرہ ۱۳۶۸ھ
محاضرات صفحہ ۱۵۴ ۔ ابو حنیفہ صفحہ ۵۳

۲ محاضرات صفحہ ۱۵۷ بحوالہ تاریخ بغداد للخطیب جلد ۱۳ صفحہ ۳۲۸

۳ محاضرات صفحہ ۱۶۰ بحوالہ تاریخ بغداد جلد ۱۳ صفحہ ۳۵۲

۴ الامام الشافعی صفحہ ۲۱۴

۵ الامام الشافعی صفحہ ۷۲

اختیار کیا تھا۔ آپ نے ممکنہ مسائل زندگی کا جائزہ لے کر اوران کے بارہ میں سوالات ترتیب دے کر قرآن کریم، احادیث نبویہ اور اصول استخراج کی مدد سے ان سوالات کے جواب تلاش کئے اور انہیں مدون کرایا تا کہ ضرورت کے وقت ارباب علم ان جوابات سے مدد لے سکیں۔ اس طرح آپ کے شاگردوں کی کوشش اور آپ کی رہنمائی سے ''فقہ تقدیری'' یا ''فقہ فرضی'' کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مہیا ہو گیا۔

یہ انداز تدوین دوسرے ائمہ اور علماء کو پسند نہ تھا۔ اس وجہ سے آپ پر اعتراض بھی ہوئے۔ سخت تنقیدیں بھی ہوئیں[1] ان کی رائے تھی کہ جب کوئی واقعہ سامنے آئے اور عملاً اس سے سابقہ پڑے تو پھر اس کے حل کی کوشش ہونی چاہیے اور جواب تلاش کرنا چاہیے۔ پہلے سے امکانی سوال گھڑ گھڑ کر یا فرضی صورتیں بنا بنا کر ان کے جواب تلاش کرنے کی کوشش ایک بدعت اور نقصان کا باعث ہے لیکن آپ کا کہنا تھا کہ یہ سب کچھ نیک نیتی، علم کی ترقی اور **تَصْقِيْلِ ذِهني** کے لیے کیا گیا ہے اور بعد میں قریباً تمام ائمہ کے شاگردوں نے تدوین کے اس نہج کو اپنایا اور فقہ کے بڑے بڑے دائرۃ المعارف تیار ہوئے۔ **مُدَوَّنَہ سَحْنُوْن** جو ۳۶ ہزار مسائل پر مشتمل مالکی فقہ کی کتاب ہے۔ اسی طرح ''**المختصر الكبير لابن عبدالحكم**''۔ ''**مغنی لابن قُدامة**'' اور ''**مُحلّی ابن حَزم**'' اس کی بہترین مثالیں ہیں اور فقہی مسائل کے بہت بڑے ذخیرہ پر مشتمل ہیں۔

امام ابوحنیفہ اور تدوین کتب

امام ابوحنیفہؒ نے بذات خود کوئی بڑی کتاب نہیں لکھی۔ بعض چھوٹے چھوٹے رسائل آپ کی طرف منسوب ہیں جیسے ''**اَلْفِقْهُ الْاَكْبَر**'' جس میں عقائد کا ذکر ہے ''**كِتَابُ الْعَالِمِ وَالْمُتَعَلِّم**'' جس میں آداب تعلیم کا بیان ہے آپ کا ایک خط اس زمانہ کے ایک مشہور عالم **عُثْمَانُ اللَّيْثِي** کے نام

---

[1] قال الشّعبی مرّۃ احفظ عنّی ثلاثۃ اذ سئلت عن مسئلۃ فاجبت فیھا فلا تتبع مسئلتک أرأیت فان اللّٰہ قال فی کتابہ "اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰہُ (الآیۃ) . والثانیۃ اذا سئلت عن مسئلۃ فلا تقس شَیْئًا فربما حللت حرامًا و حرمت حلالًا . و الثالثۃ . اذا سئلت عما لا تعلم فقل، لا اعلم ...... و کان مالک یسمّی اھل العراق (ای الحنفیہ) الأریتیین ـ(مالک بن انس صفحہ ۱۱۳)

ابو حنیفہ صفحہ ۶۴و۱۸۳

ہے جس میں مسئلہ ارجاء کی وضاحت کی گئی ہے۔علم فقہ کے بارہ میں آپ کے مسلک کی تفصیلات آپ کے دو لائق شاگردوں نے محفوظ کی ہیں۔یہ دونوں شاگرد تاریخ فقہ میں "صَاحِبَیْن" کے نام سے مشہور ہوئے۔ان میں سے ایک حضرت امام یعقوب بن حبیب الانصاری ہیں جو اپنی کنیت "ابو یوسف" کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔دوسرے حضرت امام محمد بن حسن الشیبانی ہیں۔

امام ابو یوسفؒ ہارون الرشید کے عہد میں قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز تھے جو خلافت عباسیہ میں ایک معزز عہدہ تھا اور آپ ہی پہلے شخص ہیں جو اس عہدہ پر فائز ہوئے اور قاضی القضاہ کے لقب سے شہرت پائی۔آپ نے دولت عباسیہ میں جو قاضی مقرر کئے وہ زیادہ تر حنفی المسلک تھے جس کی وجہ سے ساری مملکت میں حنفیوں کا اثر ورسوخ بہت بڑھ گیا۔امام ابن حزم الاندلسی کہا کرتے تھے کہ دو فقہی مذہبوں نے حکومت کی سرپرستی میں ترقی کی۔خلافت عباسیہ میں حَنَفِیَّت کو ترقی کا موقعہ ملا اور خلافت ہسپانیہ میں مالکی مذہب پروان چڑھا۔ایک وقت میں جبکہ مصر اور شام میں ایوبی برسراقتدار تھے اور ماوراء النہر میں سلطان محمود سبکتگین کی حکومت تھی شافعیوں کی پوزیشن بھی یہی تھی اور شافعیت سرکاری مذہب تھا[1]۔

حضرت امام ابو یوسف، صاحب تصنیف بھی تھے۔آپ کی تصنیف "کِتَابُ الْخِرَاج" کو بہت زیادہ شہرت ملی۔اسی طرح آپ کی دوسری تصنیف کتاب "آلا ثار" اور رسالہ "اختلاف ابن ابی لیلیٰ" اور "اَلرَّدُّ عَلٰی سِیَرِ الْاَوْزَاعِی" بھی مشہور ہیں۔امام ابو یوسف 183ھ میں فوت ہوئے۔آپ نے بے شمار دولت ترکہ میں چھوڑی۔آپ کی وصیت تھی کہ آپ کے ترکہ سے ایک لاکھ درہم مکہ کے غرباء میں اور ایک لاکھ مدینہ کے مستحقین میں اور ایک لاکھ بغداد کے حاجتمندوں میں تقسیم کئے جائیں اور ایک لاکھ اس شہر کے لیے مختص ہو جہاں ان کا بچپن گزرا جہاں انہوں نے دولت علم حاصل کی اور جس کے رہنے والے ایک غریب درزی کے بیٹے کو اللہ تعالیٰ نے یہ عظمت بخشی یعنی یہ ایک لاکھ کی رقم کوفہ کے ضرورتمندوں میں تقسیم کی جائے۔[2]

امام ابو حنیفہ کے دوسرے لائق شاگرد، امام محمد بن حسن الشیبانی تھے آپ بھی قاضی رہے لیکن

---

[1] ابو حنیفہ صفحہ ۱۰۵ و مالک بن انس صفحہ ۲۷۱

[2] ابو حنیفہ صفحہ ۱۰۸

آپ کا رجحان طبع زیادہ تر تصنیف وتالیف کی طرف تھا اس لیے آپ حضرت امام ابوحنیفہ کی آراء کے سب سے بڑے جامع سمجھے جاتے ہیں۔

امام محمد بن حسن 132ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک خوشحال گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ آپ نے 189ھ میں وفات پائی۔ تین سال کے قریب امام ابوحنیفہؒ سے شرف تلمذ رہا۔ اس وقت آپ بالکل نوعمر تھے اور امام صاحب اس نونہال کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال رکھا کرتے تھے اور درس کے وقت اپنے پہلو میں بٹھاتے تھے۔ اسی لیے آپ طرفَین یعنی استاد کے پہلو میں بیٹھنے والے کے لقب سے بھی مشہور ہیں۔ امام صاحب نے جب 150ھ میں وفات پائی تو اس کے بعد آپ نے علم کی تکمیل امام ابو یوسفؒ سے کی اور تین سال کے قریب حضرت امام مالکؒ سے بھی شرف تلمذ حاصل رہا۔ حضرت امام مالک کی روایات کا مجموعہ جو مؤطا کے نام سے مشہور ہے اس کے کئی نسخے ہیں جن سے دو کو شہرت دوام حاصل ہے ایک کا نام مؤطا امام مالک ہے جو بروایت یحیٰی بن یحیٰی اللیثی الاندلسی ہے اور دوسرے نسخے کا نام مؤطا امام محمد ہے جو بروایت محمد بن حسن الشیبانی ہے[1]۔ امام محمد بن حسن الشیبانی کئی ضخیم کتابوں کے مصنف ہیں جن میں زیادہ تر میں حنفی مسلک کا بیان ہے ان کتب میں سے مندرجہ ذیل کتب بہت مشہور ہیں۔

کتاب المبسوط، کتاب الزیادات، الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، السیر الصغیر، السیر الکبیر۔ یہ چھ کتابیں ''ظاہر الروایات'' کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی دو اور کتابیں بھی اسی درجہ کی سمجھی جاتی ہیں۔ ایک کتاب ''الرد علی اہل المدینہ'' اور دوسری کتاب الآثار۔ مؤطا امام محمد بھی کافی مشہور ہے۔

امام ابوحنیفہ کے اور بھی لائق شاگرد بڑے بڑے حکومتی عہدوں پر سرفراز رہے اور علم کے میدان میں بھی بعض کی شہرت کچھ کم نہ تھی۔ امام زُفر، داؤد طائی، حسن بن زیاد لؤلؤی، عبداللہ بن المبارک اپنے زمانہ کے مشہور بزرگ تھے۔ آپ کے شاگردوں کی وجہ سے آپ کی فقہی آراء کو بڑا فروغ ملا۔ عراق، شام، مصر، ترکستان، افغانستان اور ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی بھاری تعداد حنفی المسلک ہے۔ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی آپ کے پیرو بکثرت ملتے ہیں۔

---

[1] مالک بن انس صفحہ ۹۳ و الامام الشافعی صفحہ ۸۰

ترکوں کی عثمانی حکومت حنفی المذہب تھی۔ان کی وجہ سے بھی حنفی مذہب کو خوف فروغ ملا۔[۱]

حضرت امام ابوحنیفہ کی سیرت کے بعض حسین پہلو

حضرت امام ابوحنیفہ کسی اختلافی معاملہ میں بات کرنے کا بڑا حسین سلیقہ اختیار کرتے تھے۔ آپ کی کوشش ہوتی کہ بات واضح بھی ہوجائے اور کسی کا دل بھی نہ دکھے۔آپ نے اس انداز کی ایک بہت عمدہ مثال بیان کی ہے۔آپ نے فرمایا اگر ایک سفید کپڑے کے بارہ میں چار آدمی اختلاف کریں۔ایک کہےاس کا رنگ سرخ ہے،دوسرا کہے مجھےتو یہ سیاہ نظر آتا ہے،تیسرا بولے یہ تو سبز ہےتو چوتھا جوحقیقت سے واقف ہےاور جانتا ہے کہ کپڑا تو سفید ہے اور یہ تینوں محض ضد میں آکراوررنگ بتارہے ہیں ۔اسے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ تم تینوں غلط کہہ رہے ہو بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جہاں تک مجھے نظر آتا ہے یہ کپڑا سفید ہے۔[۲]

امام ابوحنیفہ بڑے صفائی پسند تھے،بڑا اچھا صاف ستھرا لباس خود بھی پہنتے اور دوسروں کے لئے بھی یہی پسند کرتے کہ وہ صاف ستھرے رہیں۔آپ کی خدمت میں کچھ صاحب علم لوگ حاضر ہوئے۔ان میں سے ایک شخص کے کپڑے پھٹے پرانے اور میلے کچیلے تھے۔بات چیت کے بعد جب وہ لوگ جانے لگےتو آپ نے میلے کپڑوں والے دوست سے کہا آپ تھوڑی دیر کے لیے ٹھہریئے جب سب لوگ چلے گئےتو آپ نے اس شخص کو ہزار درہم دیئے کہ وہ عمدہ نئے کپڑے خرید کر استعمال کرے۔اس شخص نے عرض کیا میں تو کھاتا پیتا دولت مند آدمی ہوں،مجھے ایسی کسی مدد کی ضرورت نہیں۔آپ نے فرمایا اللہ کے بندے جب خدا نے آپ کو رزق دیا ہے اورخوشحال بنایا ہےتو تمہیں خدا تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر بھی ادا کرنا چاہیے اور اس کے فضل کا اظہار بھی ہونا چاہیے اس طرح میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے پہننا تو ناشکری کی بات ہے اور وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّث کے خلاف ہے اوراس حدیث کے بھی خلاف ہےجس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا اظہار بھی ہونا چاہیے۔[۳]

---

۱ الاسلام والحضارۃ العربیۃ جلد۲ صفحہ ۶۸

۲ محاضرات صفحہ ۱۵۶

۳ ابوحنیفہ صفحہ ۵۱

حضرت امام ابو حنیفہؒ بہترین ہمسایہ اور اصلاح کا بڑا حسین ذوق رکھتے تھے۔ آپ کا ایک ہمسایہ آوارہ مزاج، شرابی اور ہنگامہ پرور تھا۔ رات اس کے ہاں اس کے شرابی دوست جمع ہوتے رقص و سرود، شراب و کباب کی محفل جمتی خوب ہنگامہ اور شور شرابہ ہوتا۔ امام صاحب کے لیے یہ صورت حال بڑی بے آرامی اور تکلیف کا موجب تھی لیکن ہمسایہ سے بہتر سلوک کی ہدایت کے پیش نظر آپ نے اس کے خلاف شکایت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ایک رات ادھر سے کوتوال شہر کا گزر ہوا اس نے جو ہنگامہ اور شور کی آواز سنی تو اندر جا کر حالات معلوم کئے اور سب کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا۔

دوسرے دن امام صاحب کو پتہ چلا کہ ان کا ہمسایہ گرفتار ہو گیا ہے تو آپ والیٔ شہر کے پاس گئے اور ہمسایہ کی نیک چلنی کی ضمانت پیش کی اور اسے رہا کرا کر ساتھ لے آئے اور کہا تم شعر پڑھا کرتے تھے کہ ہمسایہ ایسا ہونا چاہیے جو وقت پر مدد کر سکے سو تم نے مجھے کیسا ہمسایہ پایا۔ اس ہمسایہ کے گھر سے اکثر یہ شعر گنگنانے کی آواز آتی رہتی تھی۔

اَضَاعُوْنِیْ وَ اَیَّ فَتًی اَضَاعُوْا
لِیَوْمِ کَرِیْهَةٍ وَّ سِدَادِ ثَغْرٍ

آپ نے اس ہمسایہ کو رہا کرانے کے بعد ازراہ تلطف فرمایا: هَلْ اَضَعْنَاکَ؟ امام صاحب کے اس سلوک سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے تمام شرارتوں سے توبہ کر لی اور امن پسند نیک اور بڑی شریفانہ زندگی بسر کرنے لگا۔[1]

امام ابو حنیفہ بڑے حوصلہ مند اور دانا مصلح تھے۔ دوسرے کے سخت سے سخت الفاظ اور درشت کلامی کا جواب ایسے طریق سے دیتے کہ وہ شرمندہ بھی ہو جائے اور اپنی اصلاح بھی کر لے۔ بعض اوقات فقہی مسلک میں اختلاف کی وجہ سے دوسرے علماء آپ کے بارہ میں سخت الفاظ استعمال کرتے اور ان کے جاہل پیرو مخالفت کے جوش میں انتہا کو پہنچ جاتے لیکن سب آپ کی قوت برداشت اور حوصلہ دیکھ کر اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جاتے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کو

---

[1] ابو حنیفہ صفحہ ۱۸۰،۱۷

بدعتی اور زِندیق کہا آپ نے جواباً فرمایا اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے! میرے اندر وہ بات نہیں جس کا اظہار آپ کر رہے ہیں۔ جب سے میں ایمان لایا ہوں اور اللہ کی معرفت کی نعمت مجھے ملی ہے صرف اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں دوسرے کو نہ کارساز سمجھتا ہوں اور نہ اسے خدا کا درجہ دیتا ہوں۔ کیا زندیق ایسے ہی ہوا کرتے ہیں یہ جواب سن کر وہ شخص شرمندہ ہوا اور معافی مانگنے لگا۔ آپ نے فرمایا جو شخص اَن جانے میں کوئی غلطی کرتا ہے تو توبہ پر اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دیتے ہیں۔[1]

ایک دفعہ امام ابوحنیفہ مسجد میں بیٹھے تھے ایک شخص جو کسی مخالف عالم کا عقیدت مند تھا آیا اور آپ کو کوسنے لگا۔ اس کی گالی گلوچ پر آپ خاموش رہے وہ شخص اور تیز ہو گیا آپ اٹھ کر جانے لگے تو آپ کے پیچھے پیچھے ہولیا اور برا بھلا کہتا چلا گیا۔ آپ گھر کے دروازے پر پہنچے تو مڑ کر اس شخص سے کہا یہ میرا گھر ہے۔ اب مجھے اندر جانا ہے اگر کچھ کسر رہ گئی ہو تو نکال لو یہ نہ کہنا کہ ابھی حسرت باقی تھی وہ شخص یہ سن کر سخت شرمندہ ہوا اور اپنی حرکت سے توبہ کی۔[2]

بنو اُمیہ کے زمانہ میں کوفہ کا والی ابن هُبَیْرہ اور بنو عباس کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور نے مسلسل کوشش کی کہ آپ قضاء کا عہدہ قبول کر لیں لیکن آپ کو یہ منظور نہ تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے زمانہ میں سختی کی، کوڑے لگوائے، قید کیا، آپ نے سب کچھ برداشت کیا، لیکن اپنے ضمیر کے خلاف اقدام پر راضی نہ ہوئے۔ ایک دفعہ آپ کی والدہ نے گھبرا کر کہا بیٹا اس علم سے آپ کو کیا ملا مصیبتیں اور کوڑے۔ آپ نے ماں سے عرض کیا۔ " **يَا اُمَّاهُ يُرِيْدُوْنَنِيْ عَلَى الدُّنْيَا وَ اِنِّي اُرِيْدُ الْآخِرَةَ وَ اِنِّيْ اَخْتَارُ عَذَابَهُمْ عَلٰى عَذَابِ اللّٰهِ۔** " اے ماں یہ لوگ دنیا پیش کرتے ہیں۔ میں آخرت چاہتا ہوں ان کے دکھوں کو سہتا ہوں تاکہ اللہ کے عذاب سے بچ جاؤں۔[3]

حضرت امام ابوحنیفہ بڑے متواضع مزاج اور تقویٰ شعار بزرگ تھے۔ ایک دفعہ حاکم شہر کے پاس علماء جمع تھے۔ کسی مسئلہ کے بارہ میں بحث چلی۔ ہر ایک نے جواب دیا امام صاحب نے بھی اپنی رائے دی۔ ان میں ایک عالم حسن بن عمارہ بھی تھے انہوں نے جب رائے دی تو امام صاحب

---

[1] ابو حنیفہ صفحہ ۵۶ و محاضرات صفحہ ۱۵۷

[2] ابو حنیفہ صفحہ ۲۱

[3] ابو حنیفہ ابو حنیفہ ۲۲

نے کہا یہ رائے زیادہ درست ہے ہم سب غلط سمجھ رہے تھے۔ حسن بن عمارہ نے یہ سن کر کہا ابوحنیفہ اگر چاہتے تو اپنی رائے پر اصرار کرسکتے تھے لیکن اپنے تقویٰ کی وجہ سے وہ حق کے سامنے جھک گئے۔[1]

ایک دفعہ حکومت کی طرف سے آپ پر پابندی لگی کہ آپ نہ کوئی فتویٰ دے سکتے ہیں اور نہ کوئی مسئلہ بتاسکتے ہیں۔ آپ کے بیٹے حمّاد نے گھر میں کسی مسئلہ کے بارہ میں پوچھا تو آپ نے جواب میں فرمایا مجھے حکومت نے مسئلہ بتانے سے منع کیا ہوا ہے۔ اگر حکومت کا کوئی افسر پوچھے کہ تم نے کسی کو کوئی مسئلہ بتایا تھا تو اس وقت میرا جواب کیا ہوگا۔[2]

حضرت امام ابوحنیفہ اپنے ہمعصر علماء سے ممکن حد تک دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات رکھتے تھے۔ حضرت امام مالکؒ کا بڑا احترام کرتے جب بھی ملتے مسائل دینیہ پر تبادلہ خیال رہتا۔ دوسرے اعتدال پسند علماء کے ساتھ بھی تعلقات کا یہی انداز تھا۔[3]

امام ابوحنیفہ نے بڑی بے نیاز اور قناعت پسند طبیعت پائی تھی۔ ایک دفعہ ابوجعفر منصور کی ایک بیوی نے آپ سے ایک مسئلہ پوچھا آپ نے جو جواب دیا وہ اسے اس قدر پسند آیا کہ اس نے خوش ہوکر آپ کی خدمت میں پچاس ہزار درہم ایک لونڈی اور سواری کا گھوڑا بطور نذرانہ بھجوایا لیکن آپ نے کہلا بھیجا کہ میرا فتویٰ کسی انعام کے لالچ کے پیش نظر نہ تھا۔ مجھے جو حق نظر آیا وہ بیان کردیا چنانچہ شکریہ کے ساتھ آپ نے یہ تحفہ واپس کردیا۔[4]

امام ابوحنیفہ اور حاضر جوابی

امام ابوحنیفہ بڑے حاضر جواب تھے سخت سے سخت حالات میں بھی آپ ایسی بیدار مغزی کے ساتھ صورتِ حال سے نبٹنے کی کوشش کرتے کہ سب حیران رہ جاتے۔

آپ کے زمانہ میں خوارج کے فتنے کا خاصا زور تھا یہ لوگ عموماً اُجڈ، تھڑ ر پسند اور دنگا فساد

---

۱ ابو حنیفه صفحه ۸۸

۲ ابو حنیفه صفحه ۴۱

۳ ابو حنیفه صفحه ۶۵ تا ۶۷ و ۱۸۷ و الامام الشافعی صفحه ۷۰

۴ ابو حنیفه صفحه ۲۲۱

کے لئے ہمیشہ تیار رہنے والے اور اپنے اصول کے بڑے پکے تھے۔ایک دفعہ خوارج کا ایک گروپ اچانک کوفہ کی جامع مسجد میں آگھسا۔امام ابوحنیفہؒ پڑھا رہے تھے۔آپ نے سب سے کہا کوئی گھبراہٹ کا اظہار نہ کرے اور پورے سکون سے بیٹھا رہے۔گروپ کا سردار آیا اور بڑی درشتی سے پوچھنے لگا آپ کون لوگ ہیں؟امام صاحب نے برجستہ جواب دیا نَحْنُ مُسْتَجِيْرُوْنَ ہم پناہ گیر ہیں خارجی سمجھے ان کا اشارہ اُس آیت کی طرف ہے جس میں آتا ہے کہ اگر کوئی مشرک تم سے قرآن کریم سننے کے لئے پناہ چاہے تو اسے پناہ دو تا کہ وہ اللہ کے کلام کو سن سکے اس کے بعد اُن کو پُرامن جگہ یعنی ان کے گھروں تک پہنچا دو۔[1] بہر حال سردار نے اپنے آدمیوں سے کہا ان کو قرآن کریم سناؤ اور پھر بحفاظت گھروں تک پہنچا دو۔اس طرح آپ کی حاضر دماغی کے طفیل نہ صرف سب کی جانیں بچ گئیں بلکہ وہ بحفاظت اپنے اپنے گھر بھی پہنچ گئے۔[2]

ایک دفعہ کچھ خارجی آدھمکے۔خارجیوں کے سردار ضَحّاک بن قَیس نے امام صاحب سے کہا کہ اگر تم تحکیم (علیؓ اور معاویہؓ کے درمیان حکم مقرر کرنے کے واقعہ) کے جائز ہونے کے قائل ہو تو اس عقیدہ سے توبہ کرو ورنہ ہم تمہیں قتل کرتے ہیں۔امام صاحب نے جواب میں فرمایا زبردستی کرنا چاہتے ہو یا دلیل سے بات کرنے کا موقع دو گے؟اس نے کہا ہاں ہاں اگر کوئی دلیل ہے تو پیش کرو۔آپ نے کہا یہ کون فیصلہ کرے گا کہ دلیل ٹھیک ہے یا غلط؟اُس نے کہا کسی کو ثالث مان لیتے ہیں۔ آپ نے کہا ٹھیک ہے تمہارے ہی گروہ کے فلاں آدمی کو ثالث مان لیتے ہیں۔ضحاک نے کہا ٹھیک ہے۔اب اپنی دلیل پیش کرو۔آپ نے برجستہ جواب دیا اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوگی کہ آپ نے خود ثالثی کی تجویز کو تسلیم کر لیا ہے اور اسی کا نام تو تَحْكِيْم ہے۔ ضَحّاک شرمندہ ہو کر چپ کا چپ رہ گیا۔[3]

ایک دفعہ خوارج ہی کا ایک گروہ آپ کے پاس آیا۔تلواریں ان کے ہاتھ میں تھیں۔وہ چونکہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر اور دائی جہنمی سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے آپ سے کہا ہم تم سے دو سوال پوچھتے ہیں ان کا جواب دو ورنہ ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔آپ نے فرمایا سوال کیا ہیں؟

---

[1] التوبۃ: ۶ [2] ابوحنیفہ صفحہ ۶۳

[3] محاضرات صفحہ ۱۶۱

انہوں نے کہا کہ پہلا سوال یہ ہے کہ ایک شخص نے بہت شراب پی لی اور مدہوشی کی حالت میں ہی مر گیا۔ ایک عورت نے زنا کیا حاملہ ہوئی اور زچگی کے دوران ہی مر گئی بتاؤ کیا یہ دونوں مسلمان ہیں؟ آپ نے پوچھا کیا وہ یہودی تھے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ کیا وہ عیسائی تھے؟ انہوں نے جواب دیا نہیں۔ کیا وہ مجوسی تھے؟ انہوں نے کہا مجوسی بھی نہیں تھے۔ آپ نے پوچھا پھر وہ کس مذہب سے تعلق رکھتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا وہ مسلمان تھے۔ آپ نے برجستہ کہا قَدْ اَجَبْتُمْ جواب تو تم نے خود ہی دے دیا یعنی جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اُسے ہم بھی مسلمان ہی کہیں گے وہ شرمندہ ہوکر کہنے لگے اچھا یہ بتاؤ کہ یہ جنتی ہیں یا دوزخی۔ آپ نے کہا میرا جواب وہی ہے جو ابراہیمؑ اور مسیحؑ کا تھا۔ ابراہیمؑ نے کہا تھا فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَ مَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ [1] اور مسیحؑ نے کہا تھا اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۔[2] یہ جواب سن کر وہ شرمندہ واپس چلے گئے۔[3]

ایک دفعہ امام ابو حنیفہ ابو جعفر منصور کے دربار میں گئے وہاں منصور کا ایک درباری سردار ابو العباس طوسی بھی بیٹھا تھا جو ابو حنیفہ سے دشمنی رکھتا تھا اُسے شرارت سُوجھی اور دل میں کہا آج اسے سزا دلوا کر چھوڑوں گا چنانچہ اس نے منصور کے سامنے امام ابو حنیفہ سے سوال کیا کہ امیر المومنین ایک شخص کو بُلاتے ہیں اور اُسے فرماتے ہیں فلاں شخص کی گردن اڑا دو جبکہ اسے معلوم ہی نہیں کہ اس شخص کا قصور کیا ہے کیا وہ حکم کی تعمیل کرے۔ امام صاحب اس کی شرارت کو سمجھ گئے اور اُس سے پوچھا آپ کے نزدیک امیر المومنین انصاف اور حق کی بنا پر حکم دیتے ہیں یا ناحق بلاوجہ دوسروں کی گردنیں اُڑانے کا شوق رکھتے ہیں اس مقابل سوال پر ابو العباس طوسی گھبرا گیا اور فوراً اُس کے منہ سے نکلا امیر المومنین کا حکم حق پر مبنی ہوا کرتا ہے اس پر آپ نے کہا کہ درست حکم کی تعمیل ہونی چاہیے۔[4]

ایک شخص نے امام ابو حنیفہ کے حق میں وصیّت کی جبکہ آپ موجود نہ تھے۔ حسب قاعدہ وفات

---

[1] سورۃ ابراھیم:۳۸ [2] سورۃ المائدہ:۱۱۹

[3] فَنَکَسُوْا رُؤُوْسَهُمْ.......... وَانْصَرَفُوْا. ابو حنیفه صفحه ۷۴

[4] ابو حنیفه صفحه ۲۲۲

کے بعد اُس شخص کی جائیداد قاضی کے قبضہ میں آگئی۔امام صاحب جب آئے تو انہوں نے نالش کی اور قاضی کے سامنے صورتِ حال کی وضاحت کی چنانچہ گواہوں نے گواہی دی کہ واقعی اس شخص نے ان کے سامنے ابوحنیفہ کے حق میں وصیت کی تھی۔اس پر قاضی نے امام صاحب سے کہا کہ کیا آپ قسم کھا سکتے ہیں کہ گواہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے۔امام صاحب نے جواب دیا کہ میں خود موقع پر موجود نہ تھا قسم کیسے کھا سکتا ہوں۔قاضی نے کہا تو بس آپ مقدمہ ہار گئے۔بڑے قیّاس مشہور تھے۔آپ نے جب دیکھا کہ قاضی اُن کی اہلیت قیاس کا امتحان لے رہا ہے تو آپ نے قاضی سے کہا ایک اندھے آدمی کو کوئی شخص مارتا ہے زخمی کرتا ہے گواہ گواہی دیتے ہیں کہ اس اندھے کو فلاں شخص نے مارا ہے اور ہم اس وقت وہاں موجود تھے اور اُسے مارتے ہوئے دیکھ رہے تھے کیا آپ اندھے کو قسم دلائیں گے کہ گواہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ درست ہے۔قاضی امام صاحب کی حاضر جوابی اور قوّتِ قیاس کی مثال دیکھ کر حیرت میں ڈوب گیا اور امام صاحب کے حق میں فیصلہ صادر کیا۔[1]

کوفہ میں ایک دیوانی عورت اُمّ عمران بازار میں اِدھر اُدھر گھومتی رہتی تھی ایک شخص نے اسے چھیڑا اور تنگ کیا وہ غصہ سے بے قابو ہو کر گالیاں دینے لگی اور اُسے '' یَا ابْنَ الزَّانِیَیْنِ '' کا طعنہ دیا کہ تم دو زانیوں کی اولاد ہو تمہارا باپ بھی زانی اور تمہاری ماں بھی زانی۔یہ واقعہ جامع مسجد کے بازار میں ہوا تھا اور کوفہ کے قاضی ابن ابی لیلیٰ خود اس ہنگامہ کو دیکھ رہے تھے۔انہوں نے عورت کو پکڑ لینے کا حکم دیا اور سزا کے طور پر اُسے ڈبل کوڑے لگوائے۔امام ابوحنیفہؒ کو جب اس فیصلہ کا علم ہوا اور غریب عورت پر ظلم کے بارہ میں سُنا تو آپ سے رہا نہ گیا۔فیصلہ پر تنقید کی اور فرمایا قاضی سے اس فیصلہ میں کئی غلطیاں ہوئی ہیں مثلاً یہ کہ:

۱۔ یہ عورت دیوانی ہے اور دیوانہ مرفوع القلم ہوتا ہے اُسے سزا نہیں دی جا سکتی۔

۲۔ مسجد کے اندر سزا دی ہے وَالحُدُوْدُ لَا تُقَامُ فِي الْمَسَاجِدِ مسجدیں سزا کی جگہ نہیں۔

۳۔ جب عورت کو کوڑے لگوائے گئے تو وہ کھڑی تھی حالانکہ عورت کو بٹھا کر سزا دیتے ہیں۔ کھڑا کر کے عورت کو سزا دینا منع ہے۔

---

[1] محاضرات صفحہ ۱۶۱

۴۔ قاضی نے عورت کو دو جرموں کا مرتکب قرار دے کر دہری سزا دی ہے حالانکہ ایک سزا کافی تھی کیونکہ اگر ایک آدمی ایک پوری جماعت پر تہمت لگائے تو سزا ایک دفعہ ہی دی جائے گی یعنی صرف اسی کوڑے لگیں گے۔

۵۔ قاضی نے دونوں سزائیں اکٹھی دی ہیں حالانکہ ایسی دو سزاؤں کے درمیان جو حد کے طور پر دی جاتی ہیں کچھ دنوں کا وقفہ ہونا چاہیے تاکہ پہلی سزا کے زخم مندمل ہو جائیں۔

۶۔ جن پر تہمت لگی ہے یعنی جن کو زانی کہا گیا ہے اُن کا مقدمہ اور سزا کے وقت موجود ہونا ضروری ہے اور ان کا بیان ہونا چاہیے کہ یہ الزام تہمت ہے اس میں کوئی سچائی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کیس میں ایسا نہیں ہوا۔

قاضی ابن ابی لیلیٰ نے اس بارہ میں والی شہر کے پاس شکایت کی کہ ابوحنیفہ ان کے فیصلوں پر تنقید کرتے ہیں اور توہین عدالت کے مرتکب ہوئے ہیں چنانچہ والی نے آپ پر کچھ عرصہ کے لئے پابندی لگا دی کہ وہ نہ کوئی فتویٰ دے سکتے ہیں اور نہ کسی مسئلہ کا جواب دے سکتے ہیں۔[1]

امام ابوحنیفہؒ شرعی مسائل میں تنقید کو جائز سمجھتے تھے۔ تنقید کرتے بھی تھے اور تنقید سنتے بھی تھے۔ اُس زمانہ کے ایک مشہور قاضی ''شُریک'' آپ کے سخت خلاف تھے۔ ایک دفعہ قاضی شُریک کے سامنے یہ سوال آیا کہ ایک شخص کو شبہ ہے کہ آیا اُس نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے یا نہیں۔ قاضی شُریک نے اس کا یہ جواب دیا کہ وہ شخص اپنی بیوی کو طلاق دیدے اور پھر رجوع کرے تاکہ اُس کے دل کا تردّد دُور ہو جائے۔ امام ثوریؒ نے کہا طلاق کی ضرورت نہیں۔ خاوند کا ارادہ ہی رجوع کے مترادف ہے۔ امام زُفرؒ نے فرمایا نکاح تو یقینی ہے اور شک یقین کو زائل نہیں کر سکتا اس لئے وہ حسب سابق اس کی بیوی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کو جب ان آراء کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا زُفر کی رائے اُصول فقہ کے مطابق ہے۔ سُفیان ثوری کا فتویٰ تقویٰ پر مبنی ہے اور شُریک کی تجویز تو ایسی ہے جیسے کوئی فتویٰ پوچھے کہ مجھے شک ہے کہ میرے کپڑوں پر پیشاب کے چھینٹے پڑے ہیں یا نہیں وہ کیا کرے تو اُسے جواب دیا جائے کہ پہلے اپنے کپڑوں پر پیشاب کر دو اور پھر ان کو دھولو۔[2]

---

[1] ابوحنیفہ صفحہ ۸۷ [2] ابوحنیفہ صفحہ ۱۱۳

قاضی شُریک کو امام صاحب کی یہ کڑی تنقید بہت بُری لگی اور ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں گرہ ڈال لی۔

قاضی شُریک کے سامنے ایک مقدمہ آیا جس کے ایک گواہ نضر بن اسماعیل تھے اور دوسرے امام ابوحنیفہؒ کے بیٹے **حمّاد** دونوں بڑے فقیہ اور معزز شہری تھے لیکن قاضی شُریک نے دونوں کی گواہی رَدّ کردی۔ **نضر** پر تو یہ اعتراض کیا کہ یہ فلاں مسجد کے امام الصلوٰۃ ہیں اور تنخواہ لیتے ہیں اور **حمّاد** پر یہ اعتراض کیا کہ یہ اور ان کے والد دونوں بدعقیدہ ہیں اور کہتے ہیں کہ شریر ترین اور نیک ترین انسان دونوں کا ایمان برابر ہے۔[1]

نضر پر اعتراض کے سلسلہ میں جب اُن سے کہا گیا کہ آپ بھی تو تنخواہ دار قاضی ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ جب مَیں گواہ بن کر تیری عدالت میں آؤں تو بے شک میری گواہی رڈ کر دینا۔ قاضی شریک کہا کرتے تھے کہ حنفی کا وجود اسلام کی بدبختی ہے۔[2]

امام ابوحنیفہ پر اعتراضات

ایک دفعہ والیٔ شہر کو کوئی علمی مضمون مطلوب تھا قاضی ابن شبرمہ اور قاضی ابن ابی لیلیٰ کافی دیر مغز ماری کرتے رہے لیکن وہ والی کی مرضی کا مضمون تیار نہ کر سکے۔ امام ابوحنیفہ کی طرف رجوع کیا گیا تو آپ نے نہایت جچے تلے الفاظ میں مضمون لکھوا دیا جو والی کو بے حد پسند آیا اور اُس نے امام صاحب کی تعریف کی۔

قاضی ابن ابی لیلیٰ جب والی کے دربار سے باہر آئے تو انہوں نے اپنے ساتھی قاضی ابن شبرمہ سے کہا۔ اس پاولی اور جُلاہے کے بچہ کو دیکھو کیسے سبقت لے گیا ہے۔ ابن شبرمہ نے جواب دیا پاولی اور جلاہا تو وہ ہے جس سے چند سطریں بھی نہ لکھی جا سکیں اور غصّہ میں آپے سے باہر ہو کر علماء کو گالیاں دے رہا ہے۔

---

[1] یہ دراصل امام ابوحنیفہ کے اس مسلک کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے نزدیک ایمان گھٹتا بڑھتا نہیں۔ **الایمان لا یزید و لا ینقص**

[2] **کان شریک یقول فی اصحاب ابی حنیفة انه لم یُوْلَدْ فی الاسلام مَنْ هُوَ اَشْأَمُ منه علی الاسلام** **(ابو حنیفه صفحه ۱۸۸)**

مخالفین کی طرف سے آپ کو کئی قسم کی گالیاں دی جاتی تھیں آپ پر اعتراض کئے جاتے کوئی کہتا اس کو عربی نہیں آتی۔ علم حدیث سے بے بہرہ ہے۔ کسی کا اعتراض تھا مرجیہ فرقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اعمال کی اہمیت کو نہیں مانتا۔ وہ شیعہ ہے۔ اہلِ بیت کی محبت کا دم بھرتا ہے۔ یہ زندیق ہے کافر اور یہودی ہے۔ ہزاروں اعتراض ہوئے لیکن خدا جس کو بڑھانا چاہے اور جس کو نوازے اُسے کون گرا سکتا ہے۔ بُرا کہنے والے مٹ گئے ان کا کوئی نام بھی نہیں جانتا لیکن امام صاحب اور ان کے لائق شاگرد اب بھی قابل احترام بزرگ سمجھے جاتے ہیں اور ایک دنیا اُن کی عقیدت مند ہے۔[۱]

ایک دفعہ قاضی القضاۃ حضرت امام ابو یوسف سے پوچھا گیا۔ آپ کو عظیم ترقیات ملیں کیا اب بھی کوئی تمنا باقی ہے۔ آپ نے جواب دیا دو تمنائیں ہیں ایک حضرت مُسعر بن کدام جیسا زُہد نصیب ہو۔ دوسرے ابوحنیفہ جیسا فقیہ بنا قسمت میں لکھا ہو۔ ہارون الرشید نے یہ جواب سن کر کہا یہ تو خلافت کی تمنا سے بھی بڑی تمنا ہے۔[۲]

امام ابوحنیفہؒ کی عظمت

غرض حضرت امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت ایک عظیم فقیہ۔ بے مثال امام اور بڑی کامل شخصیت کے مالک بزرگ تھے۔ اُمّت نے آپ کو امام اعظم کا لقب دیا اور آپ اس لقب کے بجا طور پر مستحق تھے۔ عمر کے لحاظ سے بھی تمام مشہور ائمہ فقہ سے بڑے تھے۔ آپ کی علمی سبقت کو بھی سبھی مانتے تھے۔ تدوین علم فقہ کے آغاز کا شرف بھی آپ کو حاصل ہے۔[۳] آپ کے حلقۂ درس میں ایسے طلبہ شریک تھے جو بعد میں عظیم انسان تسلیم کئے گئے اور ان عظیم شاگردوں کو اپنے استاد کی عظمت پر فخر تھا۔ اُصول کی وسعت اور تفریعات کی کثرت کے لحاظ سے بھی آپ کی فقہ ایک

---

۱ تفصیل کے لئے دیکھیں ابو حنیفه صفحه ۴۴، ۶۵، ۱۴۲، ۱۸۶، ۱۸۸ و مالک بن انس صفحه ۱۱۷، ۱۹۹

۲ ابو حنیفه صفحه ۵۸ نیز دیکھیں آپ کے شاگردوں کی تفصیل۔ ابو حنیفه صفحه ۵۳، ۷۵، ۷۶

۳ كان لابی بكرؓ وعمرؓ الفضل فی جمع القرآن العزيز وكان لعمر بن عبدالعزيز فضل التفكير فی تدوين السُننْ...... فان لابی حنيفه فضل تدوين الفقه الاسلامی وتدريسه بَابًا بَابًا...... فَلْوِّنَتْ فی حياته وتَضَخَّمَتْ بعد وفاته (ابوحنیفہ صفحہ ۵۶ و ۱۶۴ ملخصًا)

بحر ذخار قرار پائی۔مختلف ادوار کی اسلامی حکومتوں نے آپ کے فقہی مسلک کو اپنایا اور اس کی سرپرستی کی۔آپ کے پیرو بھی دوسرے ائمہ فقہ کے پیروؤں سے نسبتاً زیادہ ہیں یہی وجہ ہے کہ امام الزمان حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپ کی تعریف میں فرمایا:

> ''اصل حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب موصوف اپنی قوت اجتہادی اور اپنے علم اور درایت اور فہم و فراست میں ائمہ ثلاثہ سے افضل و اعلیٰ تھے اور ان کی خداداد قوت فیصلہ ایسی بڑھی ہوئی تھی کہ وہ ثبوت، عدم ثبوت میں بخوبی فرق کرنا جانتے تھے اور اُن کی قوت مدرکہ کو قرآن شریف کے سمجھنے میں ایک خاص دستگاہ تھی اور ان کی فطرت کو کلام الٰہی سے ایک خاص مناسبت تھی اور عرفان کے اعلیٰ درجہ تک پہنچ چکے تھے اور اسی وجہ سے اجتہاد و استنباط میں اُن کے لئے وہ درجہ علیا مسلّم تھا جس تک پہنچنے سے دوسرے سب لوگ قاصر تھے''۔[1]

---

[1] ازالہ اوہام ۔ روحانی خزائن جلد۳ صفحہ ۳۸۵

۲۔ حضرت امام مالکؒ

مالک بن انس بن مالک بن ابو عامر الاصبحی نام، امیر المومنین فی الحدیث اور امام دار الہجرت لقب تھا۔ آپ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔ چھیاسی سال عمر تھی۔ آپ حضرت امام ابو حنیفہؒ سے تیرہ سال چھوٹے تھے لیکن حیات کے لحاظ سے سب ائمہ فقہ سے طویل عمر پائی۔ اتنی لمبی عمر اور کسی امام فقہ کو نہیں ملی۔

یمن کے ذی اصبح قبیلہ سے آپ کے خاندان کا تعلق تھا۔ بعض حالات سے مجبور ہو کر آپ کے دادا مالک یمن سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ بسے۔ بہت سے صحابہؓ سے ملے اور اُن سے احادیث روایت کیں۔ آپ کا شمار کبار تابعین میں ہوتا تھا۔ آپ کے بیٹے نَضر بھی خاصے بڑے محدث مانے جاتے تھے لیکن آپ کے دوسرے بیٹے انس یعنی امام مالک کے والد کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ تیر بنانے اور بیچنے کا کاروبار کرتے تھے یہی ذریعہ آمدن تھا اور اس وجہ سے گزارا معمولی تھا۔[۱] لاڈ یا رواج کی وجہ سے بچپن میں مالک کے کانوں میں چھوٹی چھوٹی مُرکیاں ہوتی تھیں جو بھلی لگتیں۔ بچپن میں آپ نے قرآن کریم حفظ کیا اس کے بعد ماں کی تحریک اور شوق دلانے پر مدینہ کے ممتاز عالم ربیعہ بن عبد الرحمٰن اَلْمُلَقَّبُ بِهٖ رَبِیْعَةُ الرَّائِی کے ہاں پڑھنے کے لئے جانے لگے۔[۲]

امام مالکؒ کے دوسرے استاد عبد الرحمٰن بن ہُرمُز تھے۔ آپ قریباً تیرہ سال اُن کے حلقۂ درس میں رہے۔ ابن ہُرمُز حدیث کے علاوہ فقہ، عقائد اور اس زمانہ کے مختلف فرقوں کے نظریات اور ان کی تاریخ سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ لائق شاگرد نے اُن سے بہت کچھ سیکھا۔ علم بھی اور ادب بھی۔ ابن ہُرمُز کا فرمان تھا کہ جب ایک بات کا جواب نہیں آتا تو تکلّف سے کام مت لو

۱؎ مالک بن انس صفحہ ۵۰، محاضرات صفحہ ۲۱۷

۲؎ قال بعض معاصری مالک رأیت مالکا فی حلقة ربیعة و فی اُذُنه شنف و قالت له اُمه اذهب الی ربیعة فتعلم من علمه قبل ادبه (محاضرات صفحه ۱۹۴، مالک بن انس صفحه ۱۲۳)

اور صاف کہہ دو کہ میں نہیں جانتا اسی میں عزت ہے۔[1] امام مالکؒ نے ہمیشہ اس نصیحت کو مدنظر رکھا۔ جب آپ سے کوئی سوال کیا جاتا اور اس کا جواب آپ کو معلوم نہ ہوتا تو صاف کہہ دیتے "لَا اَدْرِیْ" میں نہیں جانتا۔ ایک شخص نے ایک دفعہ افریقہ سے آ کر آپ سے کہا آپ اتنے بڑے عالم ہیں اور مَیں اتنی دُور سے سوال پوچھنے آیا ہوں اور آپ کہتے ہیں کہ لَا اَدْرِیْ مجھے اس کا جواب نہیں آتا۔ آپ نے فرمایا: ہاں ہاں ساری دنیا میں اعلان کر دو کہ مالک کو اس کا جواب نہیں آتا۔

مذکورہ بالا دو اُستادوں کے علاوہ آپ نے نافع مولیٰ ابن عمرؓ، محمد بن شہاب زُہریؒ اور امام جعفر صادقؒ سے بھی شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ امام جعفر صادقؒ علم اہل بیت کے امین تھے۔ ابن شہاب زہری، حضرت سعید بن مُسیّب کے شاگرد اور حضرت زید بن ثابتؓ کی روایات کے وارث تھے اور نافع، ابن عمرؓ اور علم مدینہ کے حامل تھے۔ یحییٰ بن سعید الانصاری سے بھی آپ نے حدیث اور فقہ پڑھی تھی لیکن اپنے اساتذہ میں سے سب سے زیادہ متاثر آپ ابن ہُرمُز اور ابن شہاب زُہری سے تھے۔

اَخذ حدیث میں حضرت امام مالک بڑے محتاط تھے ایک بار آپ نے فرمایا مَیں نے ستر سے زیادہ علماء کو دیکھا ہے جو مسجد نبویؐ کے ان ستونوں کے درمیان بیٹھے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ کا درس دے رہے ہوتے تھے وہ سب نیک، بڑے دیانتدار اور مالی معاملات میں بڑے امین تھے لیکن مَیں نے اُن سے حدیث کا ایک لفظ بھی نہیں سیکھا کیونکہ میرے نزدیک وہ محدث ہونے کے اہل نہ تھے۔[2]

امام مالکؒ نے حصولِ علم کے لئے خوب محنت کی۔ سخت سے سخت موسم میں بھی آپ اپنے استاد کے ہاں جاتے اور جہاں تک ممکن ہوتا سبق میں ناغہ نہ ہونے دیتے۔ خاص طور پر علم حدیث کا حصول آپ کا نصب العین زندگی تھا۔ آپ نے بوساطت بحرالعلوم ابن شہاب زُہری، ابن ہُرمُز، رَبِیْعَۃُ الرَّائِی، یحییٰ بن سعید الانصاری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث جمع کیں۔ اسی طرح صحابہ مدینہ خاص طور پر حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ

---

[1] كان يقول ابن هرمز لتلا ميذه ينبغي للعالم ان يُورث جُلَسَا ئَهُ قول لا ادري (محاضرات صفحه ۲۰۹)

[2] اَفَهَمْ لم يكونوا من اهل هذاالشأن (محاضرات صفحه ۱۹۹)

اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے فتاویٰ اکٹھے کئے۔ کبار تابعین خصوصاً فقہائے سبعہ مدینہ کی فقہی آراء پر عبور حاصل کیا، لیکن انتخاب اور بیان کے وقت آپ نے جن احادیث اور فتاویٰ وغیرہ کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپ کی کتاب مؤطا میں شامل ہوں اُن کی کل تعداد جیسا کہ گزر چکا ہے ۱۷۲۰ تھی ان میں ابن شہاب زہری کی کل مرویات ایک سو ہیں۔ آپ بیان حدیث میں بھی بڑے محتاط تھے نہ ہر کہ ومہ کی حدیث روایت کرتے اور نہ ہر روایت کو قابل حجت سمجھتے۔ ابن ہُرمُز عمل اہل مدینہ کو اخبار احاد پر ترجیح دیتے تھے اور کہا کرتے تھے اَلفٌ عَنْ اَلْفٍ خَیْرٌ مِنْ وَّاحِدٍ عَنْ وَاحِدٍ۔ امام مالک بھی اپنے استاد کی اس رائے سے متفق تھے اور عمل اہلِ مدینہ کو بڑی اہمیت دیتے تھے[1]۔ امام مالک کے تمام اساتذہ مدینہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مدینہ ہی آپ کا مدرسہ علم تھا کسی اور جگہ آپ حصول علم کے لئے نہیں گئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے بھی آپ کو بڑی عقیدت تھی۔ ان کی آراء کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کے کارناموں کو سراہتے تھے۔

امام مالکؒ کے شاگرد

امام مالک حصول علم کے بعد اپنے اساتذہ کی اجازت اور ان کے مشورہ کے بعد مسند تدریس پر متمکن ہوئے۔ مسجد نبویؐ میں اپنا حلقہء درس قائم کیا۔ آہستہ آہستہ اس مدرسہ نے شہرت حاصل کی اور آپ کے درسِ حدیث کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ عظمت نے قدم چومے اور اُمت کی طرف سے آپ کو امام دارالہجرت، استاذ مدینۃ الرسول اور امیر المؤمنین فی الحدیث کے خطاب ملے[2]۔ شاگردوں کے لحاظ سے بھی آپ بڑے خوش نصیب تھے۔ اندلس، افریقہ اور ترکستان تک سے آپ کے پاس علم سیکھنے لوگ آئے اور دولت علم سے مالا مال ہو کر واپس گئے۔ دو ائمہ مذاہب یعنی امام شافعیؒ اور

---

[1] قال مالک سمعتُ من ابن شهابٍ احادیث کثیرة ما حدثت بها قطُّ ولا احدث بها قیل لم قال لیس علیها العمل (مالک بن انس صفحه ۱۰۵ و ۱۸۷) مزید تفصیل کے لئے دیکھیں۔ مالک بن انس صفحه ۶۳، ۷۱، ۱۶۹، ۱۷۵ و محاضرات صفحه ۲۰۳

[2] لمّا بلغ مالک خمسین لم یکن فی المدینة مثله ولمّا فَارَق ابو حنیفة الحیاة الدنیا فی منتصف القرن الثانی لم یبق علی ظهر الارض لدة له مدة ثلاثین عاماً (مالک بن انس صفحه ۹۳)

امام محمد بن حسن الشیبانیؒ آپ کے براہ راست شاگرد ہیں۔امام شافعیؒ آپ کے حلقۂ درس میں دس سال کے قریب رہے اور امام محمدؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی وفات کے بعد عراق سے مدینہ آئے اور تین سال کے قریب آپ کے پاس رہ کر علم حدیث حاصل کیا۔ان کے علاوہ چھ خلفاء عباسیہ بھی آپ کے حلقہء درس سے مستفید ہوئے اور موطا کا سماع حاصل کیا۔ابوجعفر منصور، ہادی، مہدی، ہارون الرشید، الامین اور مامون الرشید۔سبھی نے آپ کی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔[1] مصر اور اندلس کے جن شاگردوں کے ذریعہ آپ کا فقہی مسلک ان ملکوں میں مقبول ہوا وہ اپنے زمانہ کے مانے ہوئے بااثر فقیہ تھے۔عبدالرحمٰن بن قاسم، عبداللہ بن وہب، اشہب بن عبدالعزیز، عبداللہ بن غانم الافریقی اور یحیٰی بن یحیٰی الاندلسی آپ کی خدمت میں پڑھنے کے لئے آئے اور امام مصر اور امام اندلس بن کر واپس گئے۔

عبدالرحمٰن بن عبدالقاسم قریباً بیس سال تک امام مالک کی خدمت میں رہے مالکیوں میں ان کی وہی حیثیت ہے جو حنفیوں میں امام محمد بن حسن الشَّیْبانی کی تھی۔امام ابن حزم الاندلسی کہا کرتے تھے کہ مالکی فقہ کے مدون ابن القاسم ہیں۔مالکی فقہ کی مشہور کتاب "اَلْمُدَوَّنه" انہی کا ذہنی شاہکار ہے۔[2]

اسد بن فرات اور عبدالسلام بن سعید الملقب بہ **سحنون** دونوں نے اپنے استاد ابن القاسم سے متعدد فقہی سوالات کئے ان میں سے بعض سوالات امام محمد بن حسن الشیبانی کی آراء سے مستنبط تھے۔ابن القاسم نے ان سوالات کے جو جوابات دیئے وہ حضرت امام مالک کی آراء کی روشنی میں تیار کئے گئے تھے۔یہی سوال و جواب بعد میں "مُدَوَّنہ سحنون" کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ کتاب قریباً ۳۶ ہزار مسائل پر مشتمل ہے۔[3] ابن القاسم ۱۹۱ھ میں فوت ہوئے۔

---

[1] قال احد وزیر صلاح الدین الایوبی ما اعلم رحلة خلیفة الی عالم فی طلب العلم الا للرشید فانه رحل بولَدَیْهِ الامین و المأمون لسماع المؤطا الی مالک ...... وقَبْلَ ذَالک بعث المهدی الیه ولدیه الهادی والرشید (مالک بن انس صفحه ۹۵)

[2] المدونة قد صدرت عن اجاباتِ لابن القاسم باراء مالکِ......وان کثیراً من المنقول عن اصحاب مالک هورَأیُ ابن القاسم و استحسانه و قِیَاسُهٗ ...... و روایة عن مالکِ ارجح الروایات فی المذهب (مالک بن انس صفحه ۲۶۵، ۲۶۸، ۲۷۸ ــ الامام الشافعی صفحه ۱۷۵)

[3] یقول المالکیة الأمهات اربع المدونة لسحنون، الواضحة لابن حبیب و العتبیةُ للعتبی تلمیذ لابن حبیب و الموازیة لمحمد ابن المواز ــ (مالک بن انس صفحه ۲۷۳)

امام مالک کے دوسرے بڑے مشہور مصری شاگرد عبداللہ بن وہب ہیں۔ ان کو مالکی ''دیوان العلم'' کہتے تھے۔ امام مالک کہا کرتے تھے کہ اِبنُ وَهْبٍ عَالِمٌ وَابنُ القَاسِم فَقِيهٌ۔ ان کی بڑی عمدہ کتاب ''جامع ابن وہب'' حال ہی میں مخطوطہ کی صورت میں دریافت ہوئی ہے۔[1] ابن وہب ۱۹۷ھ میں فوت ہوئے۔ امام مالک کے تیسرے مشہور مصری شاگرد اشہب بن عبدالعزیز ہیں۔ امام شافعی کہا کرتے تھے کہ مَیں نے اَشْہَبْ سے زیادہ فقیہ کوئی نہیں دیکھا لیکن ان کی طبیعت بڑی زود رنج تھی۔ امام ابن القیم بھی ان کو مالکیوں کا سب سے بڑا فقیہ سمجھتے تھے۔[2] اَشْہَبْ ۲۰۴ھ میں فوت ہوئے۔ عبداللہ بن الحکم بھی امام مالکؒ کے بڑے مخلص شاگرد اور بہت بڑے پایہ کے فقیہ تھے۔ ان کی کتاب ''المختصر الکبیر'' اٹھارہ ہزار مسائل پر مشتمل ہے۔ انہوں نے امام مالکؒ کی روایات پر مشتمل حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی سیرت بھی مرتب کی تھی۔ یہ مصر کے ایک حصّہ کے والی بھی رہے۔ حضرت امام شافعیؒ کے ساتھ بڑے مخلصانہ تعلقات تھے۔ امام شافعیؒ جب مصر آئے تو انہوں نے ان کی بڑی مدد کی اور ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی۔

اندلس میں عیسٰی بن دینار اور یحیٰی بن یحیٰی اللّیثی کے ذریعہ مالکی مذہب کو فروغ ملا یہ دونوں امام مالک کے بڑے مخلص اور قابل شاگرد تھے۔[3] یحیٰی بربری الاصل تھے۔ وہ اٹھائیس سال کی عمر میں مدینہ منورہ آئے۔ امام مالک سے مؤطا کا اکثر حصہ پڑھا۔ امام صاحب کی وفات کے بعد مکہ گئے اور سفیان بن عیینہ سے احادیث کا درس لیا۔ پھر مصر آکر ابن القاسم کے شاگرد رہے۔ تحصیل علم کے بعد واپس اندلس آئے۔ وہاں کے علمی حلقوں میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ اُموی امیر الحکم بن ہشام آپ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ آپ سے مشورہ لے کر اندلس میں قاضی مقرر کرتا۔ باوجود اصرار کے خود انہوں نے حکومت میں کوئی عہدہ قبول نہ کیا۔ امیر پر ان کے اس اخلاص کا بھی اثر تھا۔ بہر حال ان کی وجہ سے اندلس میں مالکی فقہ کو بہت فروغ ملا۔ مؤطا امام مالک کی مشہور روایت انہی کی طرف منسوب اور مستند ترین روایت شمار ہوتی ہے۔

---

[1] ويُعَدُّ من اقدم المخطوطات العربية في العالم (مالک بن انس صفحه ۲۶۶)

[2] مارأيت افقه من اشهب لولا الطيش فيه (نفس المصدر)

[3] بهما انتشر فقه مالک في الاندلس (مالک بن انس صفحه ۲۷۰)

امام مالکؒ کا فقہی مسلک

امام مالکؒ اصلاً محدث تھے۔کتاب وسنت کے بعد فتاویٰ صحابہؓ اور عمل اہل مدینہ کی پابندی آپ کا مسلک تھا۔بدعات سے بھاگتے اور صرف ضرورت کے وقت اجتہاد سے کام لیتے اور مسئلہ پیش آمدہ کے بارہ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔

امام مالکؒ کی رائے اجتہاد کا ماخذ زیادہ تر ''مصالح مرسلہ'' تھیں اور حسب ضرورت جبکہ نص کی علت اور وجہ واضح ہوتی آپ قیاس سے بھی کام لیتے۔امام مالکؒ کو سند کے لحاظ سے یہ شرف بھی حاصل تھا کہ مضبوط ترین اور مختصر ترین سند کے آپ حامل تھے۔اس سند کو **سلسلۃُ الذّھب** کہا جاتا ہے جیسے **مالک عن نافع عن ابن عمر عن رسول اللّٰہ** ﷺ[1]۔اس قسم کی اعلیٰ سند کا شرف کسی اور امام فقہ کو حاصل نہیں تھا یہاں تک کہ حضرت امام ابوحنیفہ جو عمر میں آپ سے بڑے تھے ان کی سند بھی کم از کم چار واسطوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔جہاں تک تصنیف کا تعلق ہے امام مالک کی اصل تصنیف مؤطا ہے جس میں ۱۷۲۰ روایات درج ہیں۔کل راوی پچانوے ہیں۔سوائے چھ کے باقی سب راوی مدینہ کے رہنے والے تھے۔ان چھ میں سے دو راوی بصرہ کے، ایک راوی مکہ کا، ایک الجزیرہ کا، ایک شام اور ایک خراسان کا ہے۔

مؤطا حدیث اور فقہ کی ملی جلی کتاب ہے۔پانچ سو کے قریب مسند مرفوع احادیث ہیں۔تین سو کے قریب مرسل ہیں۔باقی حصہ بلاغات صحابہؓ اور تابعین کے فتاویٰ اور عمل اہل مدینہ کے ذکر پر مشتمل ہے۔اس کے تیس کے قریب نسخے ہیں جن میں تھوڑا بہت اختلاف ہے لیکن دو نسخے سب سے زیادہ متداول ہیں۔ایک نسخہ یحییٰ بن یحییٰ اللیثی الاندلسی کا تیار کردہ ہے جو مؤطا امام کے نام سے مشہور ہے اور دوسرا امام محمد بن حسن الشیبانی کا مرتب کردہ ہے اور انہی کے نام سے مشہور ہے یعنی مؤطا امام محمد۔جس میں امام محمد نے حسب موقع ومحل حنفی مسلک کا بھی جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔

امام شافعیؒ مؤطا کے بارہ میں کہا کرتے تھے مَا فِي الْاَرْضِ كِتَابٌ فِي الْفِقْهِ وَ الْعِلْمِ أَكْثَرُ

---

[1] مالک بن انس صفحہ ۷۳

صَوَابًا مِّنْ کِتَابِ مَالِکٍ ۔[۱]

حضرت امام مالک کے فقہی مسلک کو بڑی تفصیل کے ساتھ آپ کے متعدد شاگردوں نے مدوّن کیا ہے جن میں سے مندرجہ ذیل زیادہ مشہور ہیں اَلْمُدَوَّنَةُ لِسَحْنُون ۔ کتاب المجالسات لابن وھب ۔المختصر الکبیر لابن عبدالحکم ۔

امام مالکؒ علم کی تحدید کے قائل تھے ۔آپ کی رائے تھی کہ علم کی تین قسمیں ہیں ۔

علم کی ایک قسم وہ ہے جسے ہر خاص وعام کو سیکھنا چاہیے اور وہ حدیث ،صحابہؓ اور تابعین کے فتاویٰ کا علم ہے ۔یہ علم اس لئے سیکھنا چاہیے تا کہ ہر ایک اپنی زندگی اس علم کے مطابق ڈھال سکے اور دین ودُنیا کی برکات کا وارث بنے ۔

علم کی دوسری قسم کا تعلق عقائد ،مختلف فرقوں کے نظریات اور جدل ومناظرہ سے ہے ۔ یہ علم صرف ذہین لیکن نیک فطرت علماء کے جاننے کا ہے ۔عوام ان باتوں کو سمجھ نہیں سکتے اور گمراہی کی طرف جھک جاتے ہیں اس لئے عوام کو اس سے بچانا چاہیے ۔

علم کی تیسری قسم وہ ہے جو ''فقہ الرائے'' کے نام سے مشہور ہے یعنی اجتہاد اور اس کے لئے مختلف ذرائع سے کام لینے کا سلیقہ اور ملکہ ۔اس میں توغّل اور انہماک بھی انسان کو حَدِّ اِعتدال سے نکالنے کا باعث بنتا ہے صرف ضرورت کے وقت اس علم سے کام لینا چاہیے اور کسی معاملہ میں اسی وقت رائے کا اظہار کرنا چاہیے جبکہ واقعۃً اس کا سامنا ہوا ور کوئی نص نہ ملتی ہو ۔قبل از وقت فرضی مسائل اور ان کے جواب تیار کرنا اور ''فقہ تقدیری'' کے انبار لگانا درست طریق نہیں اور نہ ایسے علم کا کوئی دینی فائدہ ہے ۔

امام صاحب کا طریق علمی یہی تھا کہ جب کوئی واقعہ آپ کے سامنے آتا اور آپ کو نص نہ ملتی تو بالعموم ''مصالح اُمّت'' کو مدِّنظر رکھتے ہوئے بڑے غور وفکر کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے اور وہ رائے ہر لحاظ سے معقول اور دل کے لئے قابل اطمینان ہوتی ۔حنفیوں کی طرز فکر کے آپ قائل

---

[۱] ویقول العلماء المؤطا ھو الاصل الاول و البخاری ھو الاصل الثانی (مالک بن انس صفحہ ۱۸۷، ۱۸۸) ۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھیں ۔مالک بن انس صفحہ ۱۰۱، ۱۰۳، ۱۹۳، ۲۶۳، ۲۶۵ ۔ محاضرات صفحہ ۲۳۸

نہ تھے، نہ فرضی مسائل سوچتے اور نہ زیادہ قیاس سے کام لیتے۔[1]

امام مالکؒ کی معیشت

جیسا کہ لکھا گیا ہے امام مالک کا گھرانہ مالی لحاظ سے کوئی خوشحال گھرانہ نہ تھا۔ معمولی گزارا تھا۔ آپ نے بڑی تنگی کے حالات میں تعلیم حاصل کی۔ جب مسندِ تدریس پر بیٹھے تب بھی حالات قریباً جوں کے توں تھے۔ آپ کے پاس چار سو کے قریب دینار تھے جن کو تجارت میں لگا رکھا تھا اسی سے جو کچھ آتا گھر کا گزارا چلتا۔[2] ایک آزاد شدہ لونڈی سے شادی کی تھی اور اُسی کے ساتھ خوش خوش زندگی گزار دی۔

پھر جب آپ کی مقبولیت بڑھی اور دنیا کی عقیدت نے آپ کے قدم چومے۔ حُکّام اور خلفاء آپ کی مجلس میں آنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے بتدریج آپ کے مالی حالات کو بھی سدھار دیا۔ آپ عام حُکّام سے کسی قسم کا نذرانہ قبول نہ کرتے تھے لیکن خلفاء کی طرف سے جو تحائف آپ کی خدمت میں پیش ہوتے وہ آپ بخوشی قبول کر لیتے تھے۔ آپ کا نظریہ تھا کہ خلفاء کی طرف سے جو نذرانہ آئے اور اُس کے ساتھ کوئی غلط خواہش وابستہ نہ ہو تو اسے قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ حقیقت کے لحاظ سے بیت المال میں اُن لوگوں کا بھی حق ہے جنہوں نے علم کی اشاعت کے لئے اپنے آپ کو وقف کیا ہوا ہے۔ خلفاءِ عباسیہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں جو رقمیں پیش کی جاتیں ان کا اکثر حصّہ آپ اپنے مدرسہ کے طلبہ پر خرچ کرتے تھے۔ امام شافعیؒ کے زمانۂ طالب علمی کے اکثر اخراجات امام صاحب نے اپنے ذمہ لے رکھے تھے اور دوسرے طلبہ کی مدد کا بھی یہی حال تھا۔

---

[1] كان منهاج الراى عند المدنيين "المصلحة" اتباعًا لسعيد بن المسيب و الزهرى و عند العراقيين "القياس" اتباعًا لعبد الله بن مسعودؓ و على بن ابى طالبؓ.
كان مالك يقول سَلْ عَمَّا يكون و دَعْ عمّا لا يكون ...... فلا يجيبُ عن مسئلة لم تقع و ان كانت متوقعة بخلافِ عمل ابى حنيفة فانه يجيب عن كل مسئلة وقعت اولم تقع.
قال ابن رشد مالك امير المؤمنين فى الرأى و القياس ايضاً ۔ تفصیل کے لئے دیکھیں۔ مالک بن انس صفحه ۱۹۵ . محاضرات صفحه ۲۰۳ و ۲۰۸

[2] محاضرات صفحه ۲۱۷

خلفاء کی طرف سے نذرانے قبول کرنے کے مسلک میں امام شافعیؒ کا نظریہ بھی یہی تھا کو ذوی القربیٰ میں ہونے کی وجہ سے آپ بیت المال کے اس شعبہ سے مدد لینا زیادہ پسند کرتے تھے۔

اس کے بالمقابل امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا نظریہ یہ تھا کہ ان خلفاء اور حکام کی طرف سے پیش کیا گیا کسی قسم کا نذرانہ قبول نہ کیا جائے کیونکہ ان کے ساتھ بعض اوقات نامناسب اغراض وابستہ ہوتی ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کو تو اس قسم کے نذرانوں کی ضرورت بھی نہ تھی۔ آپ کی بڑی وسیع تجارت تھی جس سے آپ کو ہزاروں کی آمدن تھی لیکن امام احمدؒ کا گزارا بڑا معمولی تھا۔ کچھ جائیداد کا کرایہ آتا تھا اُسی سے گزارا چلاتے تھے اور ضرورت پڑنے پر مزدوری بھی کر لیتے تھے۔ فصل کٹنے کے زمانہ میں باہر کھیتوں میں جا کر گرے پڑے سٹے اور بالیں بھی چن لاتے تھے کیونکہ یہ ہمیشہ سے مباح اور غرباء کا حق سمجھی گئی ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود آپ اس بات کے کبھی روادار نہ ہوئے کہ خلفاء کی طرف سے آئے ہوئے نذرانے اور تحائف قبول کریں۔[1]

امام مالکؒ اور حکومت

امام مالک نے بنو اُمیہ اور بنو عباس دونوں کا زمانہ عروج دیکھا۔[2] دونوں استبدادی حکومتیں تھیں۔ آپ چونکہ ایک لمبا عرصہ بنو اُمیہ کی حکومت میں رہے تھے اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے تو آپ کو خاص عقیدت تھی۔ پھر حضرت عثمانؓ کے ساتھ جو زیادتی ہوئی اور آپ کے خلاف جو بغاوت منظم کی گئی وہ سراسر زیادتی تھی اور آپ اس کا بَرملا اظہار کرتے تھے۔[3] اس لئے ان وجوہات کی بنا پر آپ کے بارہ میں یہ مشہور تھا کہ آپ اُموی الھوٰی ہیں۔ دراصل آپ بنیادی طور پر بغاوت کے خلاف تھے۔ آپ کا نظریہ یہ تھا کہ بغاوت کے نتیجہ میں جو خون ریزی ہوتی ہے اُس کی کوئی انتہاء نہیں۔ پھر اگر بغاوت کامیاب بھی ہو جائے تو جس کو اقتدار ملتا ہے وہ پہلے جیسا یا پہلے سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ کسی خیر اور بہتری اور بھلائی کی اُمید نہیں ہوتی۔ بنو عباس کی باغیانہ تحریک کے بارہ میں بھی

---

[1] وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا. قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (محاضرات صفحہ ۱۶۳، ۲۱۷)

[2] مالک بن انس صفحہ ۲۵۸

[3] مالک بن انس صفحہ ۴۱، ۱۴۱، ۲۵۱ (محاضرات صفحہ ۲۲۰، ۲۲۲)

آپ کے اسی قسم کے خیالات تھے اور اسی وجہ سے شروع شروع میں عباسی آپ سے بدگمان بھی تھے۔ بہرحال بنو اُمیّہ کے دور کا کوئی خاص واقعہ جس کا تعلق آپ سے ہو تاریخ نے ریکارڈ نہیں کیا اور نہ یہ معلوم ہے کہ عام خلفاء بنو اُمیّہ سے آپ کے تعلقات کیسے تھے اور ان کی عقیدت کا کیا حال تھا۔ یہ زمانہ بھی آپ کے عروج کے آغاز کا تھا اس لئے بھی ایسا ہونا مشکل تھا کہ حکومت کے لئے آپ کسی درجہ میں مرکز توجہ ہوتے۔

بنو عباس کی حکومت کا جب آغاز ہوا تو جیسا کہ اشارۃً گزر چکا ہے آپ کو بعض مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک تو ان جبری قسموں کا معاملہ تھا جو نئی حکومت کی طرف سے پبلک سے لی جا رہی تھیں۔ ان کی شرعی حیثیت آپ کے نزدیک کچھ بھی نہیں تھی اور آپ سوال ہونے پر اس کا بَرملا اظہار بھی کرتے تھے۔ دوسرے ائمہ دین طبعاً بے نیاز تھے اور وہ استبدادی حکومت سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتے تھے۔

اس کے بالمقابل نئی حکومت کی یہ پالیسی اور خواہش تھی کہ وہ پبلک میں مقبول ارباب حل وعقد اور اثر ورسوخ کا قریبی تعاون حاصل کرے اور اُن سے حکومت کے استحکام میں مدد لے۔ ایسے حالات میں جو حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے اور قریبی تعاون دینے کے لئے تیار نہ تھے لازم تھا کہ وہ حکومت کی سختی کا نشانہ بنتے۔ چنانچہ عراق میں امام ابوحنیفہ اور مدینہ میں امام مالک کو اسی صورت حال کا سامنا تھا اور دونوں اپنے اپنے حالات اور رجحانات کے تحت اس سے نبٹ رہے تھے۔ جیسا کہ ذکر آچکا ہے خلفائے عباسیہ خصوصاً دوسرے خلیفہ ابوجعفر منصور کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ لوگ حکومت کے خلاف اُٹھنے کی جرأت نہ کریں۔ ادھر بنو اُمیہ کے ہوا خواہ اور مفادیافتہ دل سے عباسی حکومت کے مؤیّد نہ تھے اور بغاوت کے مواقع تلاش کرتے رہتے تھے۔ دوسرے علوی بھی خوش نہ تھے کیونکہ تحریک انہی کے نام پر چلی تھی اور انہیں پوری پوری توقع تھی کہ بنو اُمیہ کے بعد خلافت ان کو ملے گی اس لئے جب ایسا نہ ہوا تو شیعانِ اہل بیت عبّاسیوں کے سخت خلاف ہو گئے اور عبّاسیوں کو بے وفا اور غاصب سمجھنے لگے۔

ایسے حالات میں رعایا کو قابو میں رکھنے کے لئے عباسیوں نے جو تدابیر اختیار کیں ان میں ایک تدبیر قسمیں لینے کی بھی تھی۔ لوگوں کو مجبور کیا جاتا کہ وہ بیعت کرتے وقت قسم اُٹھائیں کہ اگر

انہوں نے عقدِ بیعت توڑا تو ان کی ساری بیویوں کو طلاق ہو جائے گی اور آئندہ ساٹھ سال تک جو نکاح بھی وہ کریں گے وہ بھی طلاق کی زد میں آئے گا نیز ان کے سارے غلام آزاد اور ساری دولت صدقہ ہوگی۔ غرض عباسی اس قسم کی عجیب و غریب قسمیں جبڑالیا کرتے تھے۔ امام مالک سے کسی نے ایسی قسموں کی شرعی حیثیت کے بارہ میں مشورہ پوچھا تو آپ نے کہا کہ شرعاً تو ایسی قسم لغو ہوتی ہے۔[1] مدینہ کا عباسی والی خاصہ ناسمجھ تھا۔ اُس نے حکمتِ عملی سے کام لینے کی بجائے سختی کا طریق اختیار کیا اور امام مالک کو تشدّد کا نشانہ بنایا۔ جب منصور کو اُس کی اس بے وقوفی کا پتہ چلا تو اُسے سخت افسوس ہوا اور وہ اس احمقانہ حرکت کے اثرات کو زائل کرنے کی کوشش میں رہا کیونکہ اوپر کی سطح پر تو خلفاء کا منشا یہ تھا کہ علماء کا تعاون حاصل کیا جائے اور تشدّد کی اس طرح کی پالیسی اس کے خلاف تھی۔ بہر حال حج کے دنوں میں منصور کو اس کا موقع مل گیا۔ منصور نے امام مالک کو پیغام بھجوایا کہ مجھے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں آپ حج کے بعد مجھ سے ملیں۔ چنانچہ ملاقات ہوئی دوران ملاقات منصور نے بڑی معذرت کا اظہار کیا اور یقین دلایا کہ نہ میں نے ایسے تشدد کا حکم دیا ہے اور نہ اس کا مجھے علم تھا اور جب پتہ چلا تو والی پر جو میرا رشتہ دار ہے سخت ناراض ہوا۔ ننگے اونٹ پر بٹھا کر اُسے بغداد منگوایا اور میرا ارادہ ہے کہ اُس سے اُس زیادتی کا بدلہ لوں۔ آپ نے فرمایا امیر المومنین ایسا نہ کریں وہ آپ کے رشتہ دار ہیں، اہل بیت سے ہیں مَیں نے ان کو معاف کر دیا ہے، آپ بھی انہیں معاف کر دیں۔

منصور پر آپ کی اس فراخ دلی کا بڑا اثر ہوا اور معذرت کے انداز میں کہا۔ آپ جیسے لوگ حرمین شریف یعنی مکہ اور مدینہ میں بطور تعویذ کے ہیں۔ یہاں کے لوگ بہت جلد شر پسندوں کے بہکاوے میں آجاتے ہیں۔ آپ جیسے حضرات ان کو سمجھا سکتے ہیں، آئندہ کے لئے میں آپ کو اختیار دیتا ہوں کہ جب بھی آپ کو پتہ چلے کہ مدینہ منورہ یا حجاز کے والی نے کوئی کام انصاف کے خلاف کیا ہے اور وہ ظلم کا مرتکب ہوا ہے تو آپ اس کی مجھے ضرور اطلاع دیں، والی کو فوراً معزول کر دیا جائے گا۔ امام مالک پر منصور کے اس سلوک کا بہت اچھا اثر ہوا۔

خلفاء عباسیہ مسلسل ان تعلقات کو بڑھاتے رہے وہ مختلف قسم کے تحائف اور جوائز آپ کی

[1] لیس علی المکرہ یمین و طلاق المکرہ لا یجوز

خدمت میں بھجواتے اپنے بچوں کو شرفِ تلمذ حاصل کرنے کے لئے مدینہ لاتے۔بعض اوقات مجلس درس میں خود بیٹھ کر درس سنتے۔

دوسری طرف اندلس کے اُموی امراء بھی آپ سے بڑی گہری عقیدت رکھتے تھے اور آپ کی خدمت میں تحائف بھجوانے میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔اس کی سیاسی وجوہات بھی تھیں کیونکہ اندلس کی حکومت بنوعباس کی خلافت کے مخالف تھی اس لئے مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ ہی ایسی جگہیں تھیں جہاں اندلس اور قرب وجوار کے لوگ آزادانہ آجاسکتے تھے اور ان علاقوں کے طلبہ کا رخ بھی **مدینة الرسول** کی طرف ہوتا تھا۔

بہرحال امام مالکؒ استاذ **مدینة الرسول** ہونے کی وجہ سے دونوں حکومتوں کے مرکزِ توجہ تھے اور جہاں تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تعلق ہے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے نہ امام مالکؒ نے کوئی موقع ہاتھ سے جانے دیا اور نہ دوسرے بزرگ ائمہ نے اس میں کسی قسم کی کوتاہی روا رکھی۔اپنے اپنے انداز میں ہر ایک یہ فریضہ سرانجام دیتا رہا۔[1]

حکومتِ عباسیہ ائمہ دین کا تعاون حاصل کرنے کے لئے مسلسل کوشاں رہی تا کہ اُن کے تعلق کی وجہ سے لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں۔عراق میں امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کا اثر ورسوخ تھا۔اُن سے تعلقات استوار کرنے کے لئے مختلف رنگوں میں جو کوششیں ہوئیں اُن کا مختصر ذکر گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے۔امام ابوحنیفہ تو ان کوششوں سے زیادہ متاثر نہ ہوئے لیکن ان کے شاگرد بڑی حد تک حکومت کا حصّہ بن گئے۔

اِدھر حجاز اور مصر وغیرہ میں حضرت امام مالک کا اثر تھا ان کا تعاون حاصل کرنے کی بھی پوری پوری کوشش کی گئی۔پہلے ابوجعفر منصور نے پیشکش کی کہ وہ موَطا کو حکومت کا دستاویزی دستورالعمل بنانا چاہتا ہے لیکن آپ نے اسے پسند نہ فرمایا اور کہا کہ دوسرے امصار کے علماء اس کا خیر مقدم نہیں کریں گے اور دین میں زبردستی نہیں ہونی چاہیے پھر ہارون الرشید نے بھی اسی خواہش کا اظہار کیا لیکن آپ کا جواب وہی تھا کہ یہ بات مصلحت کے خلاف ہے۔[2]

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیں مالک بن انس صفحہ ۱۴۴،۴۵، ۲۳۸، ۲۴۵، ۲۵۶، ۲۸۳ ۔ محاضرات صفحہ ۲۲۰

[2] مالک بن انس صفحہ ۱۹۷، ۱۹۸

امام مالکؒ کی عظمت

امام مالکؒ طویل القامہ، عظیم الہامہ، سفید رنگ، بڑی پُر رُعب، پُر کشش اور خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ داڑھی بڑی اور آنکھیں موٹی تھیں۔خوش اطوار اور رہن سہن بڑا صاف ستھرا تھا۔

اثر ورسوخ اور دینی قیادت کے لحاظ سے آپ نے بڑی کامیاب زندگی بسر کی۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو عمر بھی بڑی لمبی دی اور اس کے بہتر استعمال کی توفیق بھی ملی۔آخری عمر میں سَلَسُ الْبَوْل کی تکلیف ہوگئی تھی اور اس وجہ سے آپ ایک لمبا عرصہ تک مسجد نبوی میں بھی نہ جا سکے[1]۔گھر پر ہی درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔آپ نے اپنی اس تکلیف کا کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ مسجد میں نہ جانے پر لوگوں نے اعتراض بھی کئے لیکن آپ خاموش رہے۔جب آخری وقت آیا تو آپ نے اپنے اس عذر کا ذکر اپنے خاص شاگردوں سے کیا اور کہا یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک کے سامنے اپنی تکلیف کا رونا رویا جائے۔سب نے خدا کے حضور جانا ہے۔اور ہر ایک اُسی کے سامنے جواب دِہ ہے۔آخر عوارضِ طبعی نے کمزور کر دیا بیماری آخری گھڑی کو قریب لے آئی اور علم وعمل کا یہ آفتاب اپنے زمانہ کا عظیم دینی قائد ۱۷۹ھ میں چھیاسی سال کی عمر میں اپنے مولیٰ کے حضور حاضر ہوگیا فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔آپ کے جنازہ میں شامل ہونے کے لئے سارا مدینہ اُمڈ پڑا۔ ایسا ایک عرصہ کے بعد ہوا۔کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے بعد ایسا ماتمی اجتماع کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔جنت البقیع میں تدفین عمل میں آئی۔کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّ یَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَ الْاِکْرَامِ۔

---

[1] قیل مدتہ خمسٌ و عشرون سنۃ. مالک بن انس صفحہ ۲۸۳،۲۸۴

۳۔ حضرت امام شافعیؒ

محمد بن ادریس اَلشَّافِعِی اَلْمُطَّلِبِیْ غزّہ فلسطین میں ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی سال ہے جس میں حضرت امام ابوحنیفہؒ فوت ہوئے تھے گویا جس سال ایک امام فقہ اس دنیا سے رخصت ہوئے اسی سال ایک ایسے بچے نے جنم لیا جس کے مقدّر میں کچھ سال بعد امام فقہ بننا لکھا تھا۔[1]

آپ کے والد ایک ایسے فوجی دستہ میں ملازم تھے جو غزہ کی فوجی چھاؤنی میں مقیم تھا۔ والد کا گزارا معمولی تھا۔ ان کا اصل وطن مکہ تھا جبکہ آپ کی والدہ یمن کے اذدی قبیلہ کی خاتون تھیں۔[2] شافعی ابھی بچہ ہی تھے کہ والد کا غزہ میں انتقال ہوگیا اور آپ کی والدہ بعض مصالح کے پیش نظر آپ کو مکہ مکرمہ لے آئیں تا کہ بچہ اپنے قبیلہ کے لوگوں میں بہتر نشو ونما پا سکے۔ اس وقت آپ کی عمر دس سال کے قریب تھی[3] اور قرآن کریم حفظ کرلیا تھا۔ آپ کا خاندانی تعلق قریش کے مشہور قبیلہ بنو مطلب سے تھا[4] اور شافع آپ کے اجداد میں سے ایک بزرگ کا نام تھا جس کی طرف یہ خاندان منسوب تھا اور شافعی کہلاتا تھا۔

مکہ مکرمہ میں آنے کے بعد شافعی نے وہاں اساتذہ سے پڑھنا شروع کیا اور جب کچھ پڑھ لکھ گئے تو مکہ کے مشہور محدث سفیان بن عُیینہ اور مسلم بن خالد زنجی سے علم حدیث پڑھا۔ اسی دوران میں آپ مکہ کے قرب وجوار میں بسنے والے ہذیل قبیلہ کے ہاں جانے لگے تا کہ فصیح عربی میں مہارت حاصل کرسکیں۔ بنو ہذیل پہاڑوں میں رہتے تھے۔ فصاحتِ زبان اور شعر گوئی کے لحاظ سے

---

[1] قیل توفی اما م وَوُلِدَ امامٌ لئلا یخلو وجه الارض من امام (الامام الشافعی صفحه ۲۷)

[2] ایک روایت کے مطابق آپ کی والدہ قرشیہ ہاشمیہ تھیں۔

[3] ایک روایت کے مطابق عمر دو سال تھی۔

[4] عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ مُطلب، ہاشم، عبدالشمس اور نوفل، ہاشم کی اولاد میں سے آنحضرت ﷺ ہیں اور مطلب کی اولاد میں سے امام شافعی تھے۔ عبدالشمس بنو اُمیہ کے جدّ امجد ہیں اور نوفل جبیر بن مطعم کے۔ ہاشم کے بیٹے شیبہ (جد حضورؐ) ابھی چھوٹے ہی تھے کہ ہاشم کا انتقال ہوگیا اور شیبہ کو مطلب نے پالا جس کی وجہ سے ''شیبہ'' عبدالمطلب کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ بنو مطلب ہمیشہ بنو ہاشم کے ساتھ رہے جب اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو عروج بخشا تو آپ نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کو ذوی القربیٰ قرار دیا بنو اُمیہ اور بنو نوفل نے بھی ذوی القربیٰ میں شمار کئے جانے کا مطالبہ کیا کیونکہ رشتہ برابر کا تھا لیکن آپ نے فرمایا انهم لم یفارقونا فی جاهلیة ولا فی اسلام، انما بنو هاشم و بنو مطلب شیءٌ واحدٌ (محاضرات صفحه ۲۴۶)

سارے عرب میں سند مانے جاتے تھے۔ آپ نے ہذیل سے اعلیٰ عربی بھی سیکھی اور تیراندازی کا سبق بھی حاصل کیا۔ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ تیراندازی میں میرا مقابلہ کوئی مشکل سے ہی کر سکتا ہے اگر دس تیر نشانے پر لگانا چاہوں تو ایک بھی خطا نہ جائے۔ آپ نے اس دوران علم نجوم اور علم طب سے بھی واقفیت بہم پہنچائی۔ آپ بہت اچھے شعر کہہ لیتے تھے اور اعلیٰ پایہ کے ادیب مانے جاتے تھے۔ زبان کی اس مہارت کا اثر آپ کی تحریر میں بھی تھا اسی لئے آپ کی کتب عربی ادب کا ایک نمونہ سمجھی جاتی ہیں حالانکہ وہ بجائے خود فنی کتب ہیں فقہ کے مباحث اور اُصول کی تشریحات سے تعلق رکھتی ہیں۔

امام شافعی بڑے خوش الحان بھی تھے آواز میں بڑا سوز تھا۔ جب قرآن کریم کی تلاوت کرتے تو رقّت سے لوگوں کے آنسو رواں ہو جاتے۔ سلیس عربی بولتے اور بڑی روانی کے ساتھ تقریر کر سکتے تھے۔ تقریر میں ضرب الامثال سے خوب کام لیتے۔ مشہور محدّث ابن راہویہ نے آپ کو خطیب العلماء کا خطاب دیا تھا۔[1]

جب آپ کی عمر بیس سال کی ہوئی اور علماء مکہ سے علم پڑھ لیا تو آپ کی خواہش ہوئی کہ مدینہ جا کر عالم مدینہ حضرت امام مالکؒ سے مؤطا پڑھیں اور علم حدیث میں مہارت حاصل کریں۔ یہ زمانہ امام مالک کے عروج کا تھا اور بڑی مشکل سے آپ کے مدرسہ میں کسی کو داخلہ مل سکتا تھا۔ آپ نے اپنے آپ کو امام مالک کے درس میں شمولیت کے قابل بنانے کے لئے خوب محنت کی۔ کسی سے مؤطا کا ایک نسخہ لے کر اُس میں درج احادیث کو یاد کیا۔ والیٔ مکہ سے والیٔ مدینہ کے نام سفارشی چٹھی لکھوائی اور اس تیاری کے ساتھ مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوئے۔ مدینہ پہنچے تو والیٔ مدینہ کی سفارش کچھ کام نہ آئی لیکن اپنی قوت بیانیہ کے زور سے مالک کے درس میں بیٹھنے کی اجازت حاصل کر لی اور پھر اپنی قابلیت اور شوقِ حدیث کی وجہ سے مالک کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ قریباً دس سال آپ کی خدمت میں رہے۔ مدینہ کے دوسرے علماء سے بھی استفادہ کیا اور ماہر عالم حدیث اور ایک بے مثل فقیہ کی حیثیت سے علوم مدنیہ کے حامل بنے۔

---

[1] كان الشافعي فصيح العبارة واضح التعبير قوى التاثير بارزًا فى البلاغة و البيان و القدرة على المناظرة حتىٰ قيل فى حقه خطيب العلماء (الامام الشافعى صفحه ۴۳، ۵۰، ۵۵، ۶۰، ۱۴۳، ۱۸۷) محاضرات صفحه ۲۶۹ ملخصاً

امام شافعی کا ابتلا

حضرت امام مالکؒ کی وفات کے بعد آپ مکہ واپس آ گئے۔ روزگار کی تلاش میں یمن گئے وہاں آپ کا ننہال بھی تھا۔ والی کی سفارش پر آپ کو نجران میں ایک معقول عہدہ مل گیا جو مالی سہولت کا باعث تھا لیکن پبلک تعلق کے سلسلہ میں آپ کو کئی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ لوگ دھاندلی سفارش اور مفاد پرستی کے عادی تھے۔ خصوصاً علاقہ کے امراء مَن مانی کرنا جانتے تھے۔ اِدھر آپ کسی کی سفارش کی پرواہ نہ کرتے اور عدل وانصاف کے تقاضوں کے مطابق معاملات طے کرنا جانتے تھے۔ اس وجہ سے آپ کے خلاف شکایتوں کا زور بڑھا۔ نجران کا نیا والی ظالم طبع اور جور پسند تھا، وہ بھی آپ کا مخالف ہو گیا۔ اِدھر عباسی علویوں کے بارہ میں بڑے حساس تھے اور انہیں ڈر لگا رہتا تھا کہ علویوں کی حمایت کہیں زور نہ پکڑ جائے۔ نجران کے والی نے عباسیوں کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھایا اور ایک سازش کے تحت ہارون الرشید کے پاس شکایت کی کہ نجران میں چند علوی شورش بپا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جن میں محمد بن ادریس الشافعی بھی شامل ہے۔

ہارون الرشید نے فوراً اس شکایت کا نوٹس لیا اور حکم دیا کہ ان باغیوں کو فوراً گرفتار کر کے بغداد لایا جائے۔ چنانچہ سب ملزم جن میں محمد بن ادریس الشافعی بھی تھے پابہ زنجیر بڑی صعوبتوں کے بعد بغداد پہنچے اور ہارون الرشید کے سامنے پیش کئے گئے۔ رشید نے ایک ایک کر کے سب کا بیان لیا۔ بالکل سرسری سماعت تھی۔ وہ سب کی گردنیں اُڑاتا گیا۔ ایک ملزم نے کہا میں بے قصور ہوں لیکن اگر آپ مجھے قتل ہی کرنا چاہتے ہیں تو اتنی اجازت دیں کہ اپنی بیمار اور بوڑھی والدہ کو خط لکھ سکوں جو مدینہ منورہ میں لاچار میری واپسی کے انتظار میں بیٹھی ہوگی لیکن رشید نے اُس کی ایک نہ سنی اور فوراً گردن اُڑا دینے کا حکم دیا۔ جب امام شافعی کی باری آئی اور رشید نے آپ کی طرف غصہ سے دیکھتے ہوئے کہا آپ لوگ خلافت کے خواب دیکھ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم خلافت کے اہل نہیں۔ شافعی کے سامنے تو آدمی خاک وخون میں غلطاں تڑپ رہے تھے اور بڑا بھیانک منظر تھا لیکن آپ نے حوصلہ قائم رکھا۔ جواب کا موقع ملنے پر خداداد ذہانت سے کام لیتے ہوئے جچے تلے الفاظ میں کہا۔ دشمنی اور حسد کا شکار ہوا ہوں، مخالفین نے ناحق مجھے ملوث کیا ہے

امیر المؤمنین غور فرماویں کہ میں ان لوگوں کے ساتھ کیسے شریک ہوسکتا ہوں جو مجھے اپنا غلام سمجھتے ہیں اور آپ کے خاندان کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں جو مجھے اپنا بھائی قرار دیتا ہے۔[۱] امام محمد بن حسن دربار میں موجود تھے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شافعی نے کہا۔ میں ایک علمی آدمی ہوں علم سے شغف رکھتا ہوں بغاوتوں سے مجھے کیا سروکار اور یہ قاضی سب کچھ جانتے ہیں۔ رشید نے امام محمد بن حسن کی طرف دیکھا کہ یہ کیا کہتا ہے امام محمد نے جواب دیا۔ شافعی ٹھیک کہتے ہیں مَیں ان کو جانتا ہوں یہ شورش پسند طبیعت کے نہیں بلکہ بڑے عالم ہیں اور درس و تدریس ان کا شغل ہے۔

شافعی کی فصاحت اور امام محمد کی سفارش کام کر گئی اور رشید نے امام محمد سے کہا اچھا اسے اپنی نگرانی میں رکھیے اس کے بارہ میں بعد میں فیصلہ کروں گا[۲]۔ اس طرح امام شافعی امام محمد کی سرپرستی میں آگئے اور آپ کے گھر رہنے لگے۔ آپ سے حنفی فقہ کی تفصیلات پڑھیں اور آپ کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس طرح آپ کا یہ ابتلاء علمی ترقی کا باعث بن گیا گویا آپ کو مدنی اور عراقی دونوں فقہوں کے جامع امام ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ امام محمد کے اس احسان کی ہمیشہ آپ کے دل میں قدر رہی اور آپ ان کا ذکر بڑے احترام سے کرتے تھے۔

امام شافعیؒ اور درس و تدریس

بغداد میں دو سال کے قریب رہنے کے بعد آپ واپس مکہ آئے اور مسجد الحرام میں اپنا حلقۂ درس قائم کیا جس نے آہستہ آہستہ خاص ترقی حاصل کی۔ امام احمد بیان کرتے ہیں کہ ایک بار مَیں مکہ گیا تو میں نے محمد بن ادریس کو مسجد الحرام میں درس حدیث و فقہ دیتے سُنا۔ آپ نے اپنے دوست اسحاق بن رَاہویہ سے کہا میں نے ایک نوجوان کو دیکھا ہے اُس کی باتیں جوں جوں

---

[۱] قال الشافعي يا امير المؤ منين ماتقولُ في رجلان احدهما يراني اخاه و الاٰخر يراني عبده ايهُما احب الي قال الرشيد الذي يراک اخاهُ قال الشافعي فذاک انت يا امير المومنين انتم ولد العباس وهم ولد عليّ (يرون كل الناس عبيدهم) ونحن بنو المطلب فانتم ولد العباس ترونا اخوتكم وان لي حظًا من العلم و ان القا ضي محمد بن الحسن يعرف ذالک (محاضرات صفحه ۲۵۳)

[۲] تفصیل کے لئے دیکھئے (الامام الشافعي صفحه ۱۸۲،۷۹تا۸۳) و مالک بن انس صفحه ۲۷۷، محاضرات صفحه ۲۵۳

سنتا گیا حیرت میں ڈوبتا گیا۔ آئیں آپ کو بھی دکھاتا ہوں۔ چنانچہ اسحاق بن راہویہ نے بھی آپ کو درس دیتے سنا اور حیرت زدہ رہ گئے۔[1]

مکہ میں آپ نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تالیف و تصنیف کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ اپنے نئے فقہی مسلک کی وضاحت کے لئے قواعد استنباط مرتب کئے اور نئے فقہی مذہب کی بنیاد رکھی۔ یہیں پہ آپ نے دو رسالے بھی لکھے جن میں سے ایک کا نام ''خلاف مالک'' ہے جس میں اپنے استاد امام مالک کے بعض فقہی نظریات پر تنقید کی اور اہل مدینہ کے عمل کے بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا دوسرے اَخذ حدیث کے متعلق امام مالک کی احتیاط کو بلاوجہ تشدد قرار دیا۔ دوسرے رسالے کا نام آپ نے ''خَلَافُ الْعِرَاقِیِّیْنَ'' رکھا اور امام ابوحنیفہؒ کے نظریات پر تنقید کی ...... اس طرح تدریس و تصنیف میں آپ نے قریباً بارہ سال مکہ میں گزارے ۱۹۵ھ میں جبکہ آپ کی عمر پینتالیس سال تھی آپ دوبارہ بغداد گئے۔ وہاں پہنچ کر امام ابوحنیفہؒ کے مزار پر دُعا کی، ساتھ کی مسجد میں دو نفل پڑھے اور صرف شروع میں رفع یدین کیا جب پوچھا گیا تو فرمایا امام ابوحنیفہؒ کی عظمت کے اعتراف اور پاسِ ادب کی خاطر انہوں نے ایسا کیا ہے۔[2]

بغداد میں رہ کر آپ نے دو اور کتابیں لکھیں ان میں سے ایک کا نام ''الرّسالہ'' ہے جو دراصل اصول فقہ کے بارہ میں آپ کا منفرد کارنامہ ہے اس سے پہلے اس موضوع پر کوئی تحریری کام نہیں ہوا تھا۔ دوسری کتاب کا نام آپ نے ''اَلْمَبْسُوْط'' رکھا اس میں بھی اپنے فقہی منہاج کی تفصیل پیش کی یہ دونوں کتب ''اَلْکُتُبُ الْبَغْدَادِیَّہ'' کے نام سے مشہور ہیں اور آپ کے لائق شاگرد الحسین بن محمد الصباح الزّعفرانی (متوفی ۲۶۰ھ) کے ذریعہ مروی ہیں۔ یہ کتابیں چند اور رسائل کو ملا کر ''اَلْاُمّ'' کے نام سے طبع شدہ اور درسًا متداول ہیں۔[3]

۱۹۹ھ میں جب آپ مصر گئے اور وہاں مالکی علماء سے واسطہ پڑا تو آپ نے اپنی کتابوں میں کچھ ترامیم کیں جو آپ کے دوسرے لائق شاگرد الرّبیع بن سلیمان المرادی (متوفی ۲۷۰ھ) کی

۱؎ الامام الشافعی صفحہ ۱۱۵ ۲؎ الامام الشافعی صفحہ ۱۳۵

۳؎ الامام الشافعی صفحہ ۱۹۶ حاشیہ نیز مزید تفصیل کے لئے دیکھیے الامام الشافعی صفحہ ۱۳۹، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۲۱۵۔ محاضرات صفحہ ۲۹۴

روایت ہیں اور ''اقوالِ جدیدہ'' کے نام سے مشہور ہیں۔

یہ دَور جس میں امام شافعی اپنے مسلک کی تبیین وو ضاحت کر رہے تھے تدوین علوم کا دَور تھا اگر ایک طرف اَبُو الْاَسْوَد دُؤَلِیْ کے شاگرد عربی زبان کے قواعد وضوابط کی تدوین میں مصروف تھے تو دوسری طرف اَلْاَصْمَعِی اوران کے شاگرد ادب ولغت کے ذخائر اور اشعار عرب کے دیوان جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ خلیل علمِ عروض ایجاد کر چکا تھا۔ جاحظ ادب عربی کی تقید وتنقیح کے اصول بیان کر رہا تھا امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن شیبانی حنفی فقہ کی تدوین میں مصروف تھے۔ مدینہ میں امام مالک کے علوم کا غلغلہ تھا۔ احادیث کی روایت کو ایک فن کی حیثیت حاصل ہو رہی تھی۔ مختلف فرقے علمی طور پر منظم ہو رہے تھے۔ خوارج، شیعہ اور معتزلہ دست وگریبان تھے اور مناظرات ومجادلات کا ہر طرف شور تھا۔ اس علمی فضا میں امام شافعی بھی راہ حق کی تلاش میں مصروف تھے۔ آپ نے اخبارِ آحاد کی حجیت کے بارے میں زبردست دلائل مہیا کئے اور اُمّت کی طرف سے ''ناصرِ سنّت'' کا خطاب پایا۔

عِلَلِ قیاس کے استخراج میں اگر چہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مقابلہ کوئی نہ کر پایا لیکن امام شافعیؒ نے قیاس کے اُصول وضوابط کے سلسلہ میں جو منفرد کام کیا اُس کا اپنی جگہ الگ مقام ہے۔[1]

آپ نے اس بات کو واضح کیا کہ اگر چہ اخبارِ آحاد اور قیاس علمِ ظنّی کے ماخذ ہیں لیکن اس سے ان کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ ہم اتنے ہی ان کے مکلّف ہیں اور تمام انسانی زندگی اسی علمِ ظنّی کے گرد گھومتی ہے۔ پس جب ہم اپنے اکثر مسائل زندگی اسی علم کے بنا پر حل کرتے ہیں تو شرعی امور میں ان سے کام لینا کیوں تردّد کا باعث ہو[2]۔ آپ کا کہنا تھا کہ اوّل تو قرآن واحادیث سے اکثر مسائل کا حل مل سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی مسئلہ کے بارہ میں اُن میں تصریح نہ ملے تو مسئلہ زیر بحث کو اُن عِلل پر قیاس کیا جا سکتا ہے جو نصوص میں موجود ہوتی ہیں اور ایک ذہین مجتہد بآسانی اُن تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

احادیث کے بارہ میں آپ کا علم بڑا وسیع تھا۔ ایک دفعہ آپ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور

---

[1] الامام الشافعی صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۴، ۱۶۷، ۲۱۴

[2] مزید تفصیل کے لئے دیکھیں الامام الشافعی صفحہ ۹۲، ۱۲۳ تا ۱۲۸، ۱۹۸، ۲۳۸۔ محاضرات ۲۸۵

کہا میں نے سنا ہے کہ آپ ہر سوال کا جواب قرآن وحدیث سے دیتے ہیں۔ بتایئے اگر ایک محرم زنبور مار دے تو کیا کفّارہ ہے؟ آپ نے سوال سُن کر فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ رسول جو بات تم کو بتائے اس پر عمل کرو اور حضورؐ نے فرمایا کہ میری اور میرے خلفاء کی پیروی کرو۔ طارق بن شہاب کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک محرم کو کہا کہ زنبور کو مار دو۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ زنبور مار دینے کا کوئی کفّارہ نہیں ہے۔

جیسا کہ گزر چکا ہے امام شافعیؒ قیاس کے علاوہ رائے کے دوسرے مآخذ مثلاً استحسان، مصالح مرسلہ وغیرہ کو درست تسلیم نہیں کرتے تھے اور اس طرز فکر کو نقصان دہ قرار دیتے تھے۔

امام شافعیؒ اختلاف مسلک کے باوجود دوسرے مکتب ہائے فکر کا احترام کرتے تھے اور بڑے غیر متعصب تھے۔ ایک دفعہ کسی نے آپ سے سوال کیا کہ ابوحنیفہ کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ نے جواب دیا وہ اہل عراق کے سردار تھے۔ جب ابویوسف کے بارہ میں پوچھا گیا تو فرمایا وہ حدیث کا اتباع اور احترام کرتے تھے۔ امام محمد فقہی تفریعات کے ماہر تھے قیاس میں زُفر کی مہارت مُسلّم تھی۔[2] غرض حنفیوں کے ائمہ کے بارہ میں جو آپ کی رائے تھی اُسے بڑی صفائی اور عقیدت کے ساتھ بیان کر دیا۔

امام شافعیؒ علم کلام اور جدل و مناظرہ کو پسند نہیں کرتے تھے آپ کا کہنا تھا کہ ان مباحث کا کوئی فائدہ نہیں صرف زبان کا چٹخارہ یا ذہنی عیاشی کا سامان ہے۔ بڑی بیکار بحثیں ہیں۔ قرآن وسنت کی اتباع میں ہی نجات ہے آپ اپنے شاگردوں کو کہا کرتے تھے **اِیَّاکُمْ وَالنَّظَرَ فِی الْکَلَامِ** کلامی مسائل کو کوئی اہمیت نہ دو۔ ان میں انہماک سے بچو۔

امام شافعیؒ اور سفرِ مصر

امام شافعیؒ تین سال کے قریب بغداد رہے۔ کچھ زیادہ دل نہ لگا۔ یہاں معتزلہ کا زور بڑھ رہا تھا۔ مامون الرشید ان کی طرف جُھک گیا تھا۔ علاوہ ازیں الاَمین کی شکست کے بعد عربی عنصر کا

---

[1] الامام الشافعی صفحہ ۱۱۷

[2] الامام الشافعی صفحہ ۱۸۴

اثر ورسوخ کم ہوگیا تھا مامون الرشید کی مدد فارسی اور خراسانی عنصر نے کی تھی اور وہ انہی کے زیر اثر تھا اس لئے قرآن وسنت کے حاملین کے لئے مشکلات بڑھ رہی تھیں۔ ایسے حالات میں امام شافعیؒ نے بغداد میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور احباب کے مشورہ کے بعد آپ نے مصر چلے جانے کا ارادہ کیا کیونکہ ایک تو وہ مرکز یعنی بغداد سے دور تھا۔ دوسرے وہاں آپ کے ہم سبق یعنی امام مالک کے شاگرد رہتے تھے جن سے تعاون کی اُمید تھی۔ مصر میں ابھی عربی عنصر کا غلبہ بھی قائم تھا۔ ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ مصر کا والی عباس بن عبداللہ عباسی آپ سے عقیدت رکھتا تھا ان حالات میں آپ ۱۹۹ھ میں بغداد سے مصر کے لئے روانہ ہوئے سفر بڑا کٹھن اور لمبا تھا۔ مصر میں کیا حالات پیش آئیں اس میں بھی الجھنیں تھیں۔ خاصی بے چینی تھی۔ سفر کے دوران میں ہی آپ نے اپنے ان جذبات اور سوچوں کا اظہار ایک قصیدہ میں کیا جس کے دو شعر یہ ہیں۔

لَقَدْ اَصْبَحَتْ نَفْسِیْ تَتُوْقُ اِلٰی مِصْرِ ۔۔۔ وَ مِنْ دُوْنِهَا قَطْعُ الْمَهَامِهِ وَالْقَفْرِ

فَوَ اللّٰهِ مَا اَدْرِیْ أَلِلْفَوْزِ وَالْغِنٰی ۔۔۔ اُسَاقُ اِلَیْهَا اَمْ اُسَاقُ اِلَی الْقَبْرِ [1]

مصر جانے کا شوق ہے۔ راستہ خطرناک اور صحرائی ہے۔ وہاں جا کر اطمینان اور آرام نصیب ہوگا یا تقدیر میں کچھ اور لکھا ہے کچھ معلوم نہیں۔ کوئی اندازہ نہیں۔ جب آپ مصر پہنچے تو کامیابی نے آپ کے قدم چومے۔ والیٔ مصر نے بیت المال کے شعبہ "سَهْمِ ذَوِی الْقُرْبٰی" سے آپ کا معقول وظیفہ مقرر کر دیا اور امام مالک کے ایک شاگرد جو خاصے خوشحال اور حکومت کے بااثر افسر تھے یعنی عبداللہ بن عبدالحکم نے ہر طرح کی مدد کی اور آرام بہم پہنچایا۔ یہاں آپ کو اپنی کتب پر نظر ثانی کرنے کا موقع ملا۔ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری ہوگیا، لیکن قضاء وقدر نے زیادہ کام کرنے کی مہلت نہ دی۔ وقت قریب آچکا تھا بواسیر کے شدید عارضہ کی وجہ سے سخت کمزور ہوگئے۔ کچھ مصر کی شورشوں اور بعض مالکیوں کی طرف سے شدید مخالفت کا اثر بھی تھا۔ ان حالات کا مقابلہ کرتا ہوا یہ آفتاب علم ۲۰۴ھ میں جبکہ عمر صرف چون سال تھی افق دار الآخرت میں غروب ہوگیا۔

فَاِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔ [2]

---

[1] دیوان الامام الشافعی صفحہ ۶۳ مطبوعہ مؤسسة الأعلمي للمطبوعات بیروت طبع اولیٰ ۲۰۰۰ء

[2] تفصیل کے لئے دیکھیں الامام الشافعی صفحہ ۱۶۷، ۱۷۸، ۱۸۱، ۱۹۰، ۲۸۹، ۲۹۲، ۲۹۵، ۳۰۲، ۳۰۴۔ محاضرات صفحہ ۲۶۰

اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑے لائق شاگرد اور مخلص دوست عطا کئے تھے بغداد میں بھی اور مصر میں بھی۔ بغداد کے شاگردوں نے فارس، خراسان اور ماوراء النہر میں آپ کے مسلک کی اشاعت کی۔ یہاں **حنفیت** کا زور تھا جس سے سخت مقابلہ رہا۔ سلطان محمود غزنوی فقہ میں آپ کا پیرو تھا۔ آج بھی ایران کے سُنّی کردوں کی اکثریت آپ کے فقہی مذہب کو مانتی ہے۔

امام شافعیؒ کے شاگرد اور پیرو

مشرق میں آپ کے شاگردوں نے بڑا نام پایا اور ان کو علمی خدمات کا موقع ملا۔ خاص کر امام احمد بن حنبلؒ تو مستقل مسلک کے امام بنے۔ **اَلزَّعْفَرانی** کے ذریعہ آپ کی ''کتب بغدادیہ'' ان علاقوں میں عام ہوئیں علاوہ ازیں سینکڑوں عالمی شہرت کے علماء آپ کے فقہی مسلک سے وابستہ تھے مثلاً امام الحرمین عبدالملک بن عبداللہ **الجوینی**، حجۃ الاسلام امام محمد الغزالی، علامہ فخر الدین الرازی، ابو حامد **اَلاَسْفَرَائِینِی**، تقی الدین السبکی، علاّمہ الماوردی صاحب الاحکام السلطانیہ، سلطان العلماء علاّمہ عزّ الدین بن عبدالسلام، ابن دقیق العید، نظام الملک طوسی اور علامہ نووی شارح صحیح مسلم سبھی شافعی المذہب تھے اور ان کی وجہ سے آپ کے فقہی مسلک کو بہت فروغ ملا[1]۔

امام شافعیؒ کا ایک مناظرہ

امام شافعیؒ قوتِ استدلال و مناظرہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ایک دفعہ امام محمد بن حسن شَیبانی نے آپ کو چھیڑا اور کہا سنا ہے آپ غَصَب کے مسئلہ میں ہمیں غلط سمجھتے ہیں۔ پہلے تو شافعی نے معذرت کی اور ٹالنا چاہا کیونکہ امام محمد کا آپ کے دل میں بڑا احترام تھا یوں بھی آپ بحث سے بچنا چاہتے تھے لیکن حنفی ایسے بحث و مباحثہ کو پسند کرتے تھے ان کا نظریہ تھا کہ بحث سے علم بڑھتا ہے اور مسئلہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ بہرحال جب امام محمد نے اصرار کیا تو جوابی بحث کے لئے تیار ہو گئے۔

غَصَب کے بارہ میں حنفیوں کا مسلک یہ ہے کہ:

۱۔ اگر تو غَصَب شدہ چیز جوں کی توں ہے تو وہ غاصب سے واپس لے کر مالک کو دلائی جائے گی۔
۲۔ اگر وہ چیز ضائع ہو گئی ہے تو اس کی قیمت دلائی جائے گی۔

---

[1] الامام الشافعی صفحہ ۲۰۲، ۲۹۸، ۲۹۹

۳۔ اگر اس میں ایسی زیادتی ہوئی ہے جو **مَغۡصُوۡبَہ** چیز کے ساتھ متصل ہے مثلاً زمین پر مکان بنالیا ہے۔ کاغذ غصب کیا تھا اس پر مضمون لکھا اور کتاب کی شکل میں جلد بنالی۔ سونا چھینا تھا اس کو زیور بنالیا۔ کپڑا چھینا تھا اس کا کُرتا یا پاجامہ بنوالیا تو اس صورت میں بھی مالک کو قیمت ہی دلائی جائے گی۔ البتہ اگر زیادتی منفصل ہے اور اس کا الگ وجود ہے مثلاً گائے چھینی تھی اس نے بچہ جنا تو مغصوبہ گائے مع بچہ کے مالک کو واپس جائے گی۔

شافعی تیسری شق کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں بھی مالک کا حق ہے کہ وہ اپنی مملوکہ چیز واپس لے۔ البتہ غاصب اگر چاہے تو بنے ہوئے مکان کو گرا کر اُس کا ملبہ لے جا سکتا ہے۔ بہر حال بحث کا آغاز یوں ہوا۔

امام محمد: ایک شخص نے کسی کی زمین پر قبضہ کر کے اس پر لاکھوں روپیہ کا خوبصورت مکان بنالیا۔ زمین بڑی معمولی قیمت کی تھی بتایئے ایسی صورت میں آپ کا موقف کیا ہے؟

امام شافعی: زمین مالک کو واپس دلائی جائے گی البتہ اگر غاصب چاہے تو اپنا ملبہ اُٹھا کر لے جا سکتا ہے۔ بہر حال مالک کو مکان خریدنے یا زمین بیچنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

امام محمد: اچھا ایک شخص نے لکڑی کے تختے چھینے اور اُن سے کشتی کی مرمت کی اور کشتی سواریاں لے کر سفر پر روانہ ہوگئی عین سمندر میں تختوں کے مالک نے مطالبہ کیا کہ ابھی میرے تختے واپس کرو۔ آپ کا فیصلہ کیا ہوگا؟

امام شافعی: مالک کا فوری واپسی کا مطالبہ درست نہیں ہوگا البتہ جب کشتی واپس کنارے پر لگے گی تو وہ تختوں کو واپس لینے کا حقدار ہوگا۔ خواہ ان کے اُکھیڑنے سے کشتی کے مالک کو نقصان ہی پہنچے۔

اسی طرح کے کچھ اور سوال ہوئے جن کی تفصیل باعث تطویل ہے۔ امام محمد کی آخری دلیل یہ تھی کہ مکان بنانے والے کو مکان گرانے اور مکان کا ملبہ اُٹھانے کے لئے کہنا اصول...... ''**لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ**'' کے خلاف ہے۔ اتنا قیمتی مکان گرانا دولت کا ضیاع ہے اور جُرم کے مقابلہ میں سزا بہت زیادہ ہے خصوصاً جبکہ وہ زمین کی مُنہ مانگی قیمت دینے کے لئے تیار ہے اور مالک کا بظاہر اس میں کوئی نقصان بھی نہیں۔

امام شافعی: اچھا یہ بتایئے کہ ایک بڑا خاندانی، عوام میں عزت دار امیر کسی کی معمولی لونڈی کو ورغلا کر اُس سے نکاح کر لیتا ہے جبکہ لونڈی کا مالک راضی نہیں۔ نکاح کے بعد اُس سے دس لڑکے پیدا ہوتے ہیں جو سب کے سب بڑے لائق عالم فاضل حکومتِ وقت کے عہدہ دار ہیں۔ لونڈی کا مالک دعویٰ کرتا ہے کہ یہ لونڈی تو اس کی تھی جسے اس امیر نے مجھ سے چھین لیا تھا مجھے واپس دلائی جائے۔ آپ کا فیصلہ کیا ہوگا؟

امام محمد: لونڈی اور اُس کے سارے بچے مالک کو واپس دلائے جائیں گے اور یہ سب کے سب اس کے غلام ہوں گے...... لونڈی کی ساری اولاد مالک کی غلام ہوتی ہے۔

امام شافعی: آپ کا **لَاضَـرَرَ وَلَا ضِـرَارَ** کا اصول کہاں گیا۔ کیا مکان گرانے کا حکم دینا زیادہ ضرر رساں ہے یا اتنے بڑے لائق اور قابل عاقل بالغ دس افراد کو غلامی کے چکر میں ڈالنا اور اس ذلّت سے ان کو دوچار کرنا۔

امام محمد اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکے اور خاموش ہو گئے۔[1]

امام شافعیؒ اور علمِ فراست

امام شافعیؒ بڑے قیافہ شناس بھی تھے اور علمِ فراست کا آپ نے مطالعہ بھی کیا تھا۔ ایک دفعہ اس علم کے آزمانے کا آپ کو موقع ملا۔ آپ یمن کے کسی شہر میں اپنے کام سے گئے۔ شام کے وقت پہنچے۔ بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک شخص کو دیکھا نیلی آنکھیں عجیب سا چہرہ اپنے مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ امام صاحب کے دل میں خیال آیا کہ یہ شخص خبیث الفطرت اور بدطینت لگتا ہے۔ بہر حال چونکہ شام پڑ رہی تھی آپ نے کہیں ٹھہرنا بھی تھا۔ آپ نے اُس شخص سے پوچھا کوئی رہائش کی جگہ ملے گی۔ وہ شخص کہنے لگا۔ بسم اللہ خاکسار کا گھر حاضر ہے۔ اُس شخص نے آپ کی بڑی آؤ بھگت کی۔ صاف ستھرا بستر، عمدہ لذیذ کھانا، سواری کے جانور کے لئے چارہ۔ غرض رات بڑے آرام سے گزری۔ آپ دل میں افسوس کرنے لگے کہ اتنے اچھے نیک انسان کے بارہ میں خواہ مخواہ بدگمانی کو راہ دی۔ یہ علمِ فراست تو بالکل فضول لگتا ہے۔

---

[1] قال الشافعی انشدک اللہ ای ھذین اشد ضررًا ان تقلع الساحة و تردّ مالکھا او تحکم برق ھولاء الاولاد ...... (الامام الشافعی صفحہ ۸۱ تا ۸۳)

صبح جب ناشتہ وغیرہ کے بعد آپ روانہ ہونے لگے تو آپ نے اُس شخص کا دلی شکریہ ادا کیا کہ اُس کی وجہ سے انہیں بہت آرام ملا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ وہ شخص کہنے لگا شکریہ تو رہنے دیجئے۔ جزائے خیر بھی اپنی جگہ ہے لیکن میرے اخراجات جو مَیں نے آپ کو آرام پہنچانے کے سلسلہ میں کئے ہیں وہ اتنے ہیں۔ رات مَیں نے اور میری بیوی نے بڑی تنگی سے گزاری ہے اور اپنا آرام دِہ کمرہ آپ کو دیا ہے اس کا کرایہ اتنا ہے، کھانے کے اخراجات یہ ہیں، آپ کی سواری کے چارہ کے اتنے دام ہیں غرض عام اندازہ سے کئی گناہ زیادہ رقم کا اُس نے مطالبہ کیا۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ مجھے علم فراست کے درست ہونے کا یقین ہوگیا اور اپنے غلام کو کہا کہ جو کچھ یہ مانگتا ہے اسے دے دو اور یہاں سے جلدی نکلو۔[1]

امام شافعیؒ پر اعتراضات

امام شافعیؒ پر جو اعتراض کئے گئے ان میں سے بعض کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے۔ آپ پر ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ آپ شیعہ ہیں کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور آپ کی اولاد سے تعلقِ محبت کا اظہار کرتے ہیں، لیکن تاریخ میں آپ کے جو حالات لکھے ہیں وہ شیعیت کے الزام کی تردید کرتے ہیں۔ آپ خلفاء راشدین کی جلالت شان ان کی ترتیب اقدمیت اور افضلیت کے قائل تھے البتہ دوسرے سُنّی مسلمانوں کی طرح حضرت علیؓ کے مقابلہ میں امیر معاویہؓ کو ناحق اور نافرمانی کا مرتکب قرار دیتے تھے۔ علاوہ ازیں باغیوں کے بارہ میں اسلام کے جو احکام ہیں ان کی تشریح اور تفصیل کے سلسلہ میں جو کتاب ''السِیَر'' کے نام سے لکھی تھی اس میں حضرت علیؓ کے طرزِ عمل کو سند کے طور پر پیش کیا تھا کیونکہ آپ کو ہی پہلی مرتبہ مسلم باغیوں سے سابقہ پڑا تھا۔ اس صورتِ حال کو بعض لوگوں نے غلط سمجھا اور الزام لگایا کہ گویا آپ شیعیت سے متاثر ہیں۔ اسی قسم کے الزامات سن کر آپ نے ایک دفعہ تمثیل کی غرض سے یہ شعر پڑھا۔

اِنْ کَانَ رَفْضًا حُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ ۔۔۔ فَلْيَشْهَدِ الثَّقَلَانِ اَنِّیْ رَافِضِیْ[2]

---

[1] الامام الشافعی صفحہ ۷۸

[2] الامام الشافعی صفحہ ۱۱۴، ۱۳۷۔ ابوحنیفہ صفحہ ۱۴۳۔ محاضرات صفحہ ۲۵۳

حضرت امام شافعیؒ نے مدینہ منورہ سے واپس آنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک پوتی حمیدہ نامی خاتون سے شادی کی جس سے آپ کو اللہ تعالیٰ نے لڑکا عطا کیا آپ نے اُس لڑکے کا نام محمد رکھا اور کنیت ابوعثمان تجویز کی جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو حضرت عثمانؓ سے بڑی عقیدت تھی۔

امام شافعیؒ متوسط القامہ بارُعب شخصیت کے مالک تھے۔غنی النفس اور سخاوت پسند طبیعت پائی تھی۔ جب بھی کسی خلیفہ یا دوست کی طرف سے بطور نذرانہ کوئی رقم آئی طلباء اور مستحقین میں تقسیم کر دی[1] یا خرید کتب میں صرف کی۔

آپ کے فقہی مسلک کے بارہ میں ضروری تفصیلات سطور بالا میں گزر چکی ہیں۔

امام شافعیؒ کا کام

امام شافعیؒ کا بنیادی مسلک یہ تھا کہ احکام شرعیہ کی بنیاد یا تو نصوص ہیں یا پھر قیاس جو اُن علل اور وجوہات پر مبنی ہو جو نصوص میں مدنظر رکھی گئی ہیں اور ایک مجتہد کے لئے اُن تک رسائی مشکل نہیں ہونی چاہئے۔

آپ کا ایک کارنامہ اُصول فقہ کی تدوین اور ایسے ضوابط کی تعیین ہے جن پر احکام شریعت مبنی ہونے چاہئیں۔علماء نے لکھا ہے کہ حضرت امام شافعی علمِ اُصولِ فقہ کے بانی ہیں۔دوسرے مکتب ہائے فکر نے آپ کے بعد اس علم کی تدوین کی طرف توجہ مبذول کی۔وَالْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّم۔

حکومت کے بارہ میں آپ کا نظریہ وہی تھا جو دوسرے ائمہ فقہ کا تھا جس کی تفصیل اپنی جگہ گزر چکی ہے۔[2]

---

[1] الامام الشافعیؒ صفحہ ۱۸۳،۴۱

[2] الامام الشافعیؒ صفحہ ۱۱۳

۳۔حضرت امام احمد بن حنبلؒ

امام احمد ۱۶۴ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے والد کا نام محمد تھا اور دادا کا حنبل۔آپ اپنے دادا کی نسبت سے ابن حنبل کہلائے۔امام محمد بن حسن الشیبانیؒ کی طرح آپ کا تعلق بھی عدنانی قبیلہ شیبان سے تھا۔دادا سرخس کے والی تھے لیکن والد فوج میں ایک معمولی عہدہ پر کام کرتے تھے تاہم وہ بڑے سخی اور مہمان نواز تھے۔خراسان کی طرف آنے والے عرب وفود کی خوب خاطر تواضع کرتے۔جب وہ خراسان سے بغداد آئے تو ان کی مالی حالت اچھی نہ رہی۔وہ امام احمد کی ولادت کے کچھ عرصہ بعد فوت ہوگئے اور احمد کو ان کے چچا نے پالا۔احمد جب کچھ بڑے ہوئے تو قرآن کریم حفظ کیا اس کے بعد عربی زبان سیکھنی شروع کی۔پھر حدیث اور صحابہؓ و تابعین کے آثار سے واقفیت بہم پہنچائی۔شروع سے ہی بڑے ذہین، پُروقار، سنجیدہ طبع اور عبادت سے شغف رکھنے والے نوجوان تھے۔[1] حدیث رسولؐ اور آثار صحابہؓ آپ کا پسندیدہ موضوع تھا اور اس میں آپ نے مہارت حاصل کی۔

ابتداءً امام ابو یوسفؒ سے پڑھا۔اس کے بعد ۱۸۶ھ میں جبکہ آپ کی عمر بائیس سال کے قریب تھی آپ نے بصرہ، کوفہ اور حجاز کے مختلف شہروں میں جاکر مشہور زمانہ محدّثین سے حدیث پڑھی۔انہی سفروں کے دوران آپ مکہ میں امام شافعی سے بھی ملے اور اُن سے بڑے متاثر ہوئے پھر جب وہ بغداد آئے تو ان کی شاگردی اختیار کی۔[2] مکہ میں سفیان بن عیینہ سے بھی حدیث پڑھی۔یمن جاکر وہاں کے مشہور محدث عبدالرزاق بن ہمام سے ان کی مرویات کا علم حاصل کیا اور سند لی۔عبدالرزاق صنعاء میں رہتے تھے۔امام احمد بن حنبلؒ کثیرالحج تھے۔بعض حج بغداد سے مکہ تک پیدل چل کر ادا کیے اور علم بھی حاصل کیا۔طالب علمی کے ان سفروں میں بڑی بڑی مشکلات بھی پیش آئیں۔مالی تنگی بھی دیکھی، لیکن علم کی دولت کے مقابلہ میں ان ساری مشکلات کو ہیچ جانا۔بعض اوقات مزدوری کرکے گزارا چلاتے۔

---

[1] مشہور محدث الہیثم بن جمیل نے آپ کو دیکھ کر کہا ان عاش هذا الفتى فيكون حجة اهل زمانه (محاضرات صفحہ ۳۰۵)

[2] الامام الشافعی صفحہ ۱۴۶، الامام احمد بن حنبل صفحہ ۴۳

ایک دفعہ جبکہ آپ یمن میں مقیم تھے اور مالی حالات اچھے نہ تھے آپ کے استاد محدّث عبدالرزاق نے آپ کی مدد کرنا چاہی لیکن آپ کسی قسم کی امداد لینے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ آپ ٹوپیاں بُن کر بیچتے اور اس آمدن سے گزارا چلاتے۔ ایک دفعہ آپ کے کپڑے چوری ہو گئے۔ کئی روز باہر نہ جا سکے آپ کے ایک طالب علم دوست کو پتہ چلا تو کچھ رقم دینی چاہی لیکن آپ نے قبول نہ کی اُس نے اصرار کیا کہ کب تک اس طرح گھر دبکے بیٹھے رہیں گے۔ اُدھار لے لیں اور جب آپ کے پاس رقم آ جائے تو واپس کر دیں لیکن آپ پھر بھی راضی نہ ہوئے۔ آخر یہ شرط رکھی کہ میں اُن کے نوٹس صاف کر کے لکھ دیتا ہوں اس کا معاوضہ آپ دیدیں غرض اس رقم سے کپڑے بنوائے اور گھر سے باہر آنے جانے لگے۔ آپ بڑے قوی الحافظہ تھے۔ ہزاروں حدیثیں یاد تھیں اس کے باوجود جو حدیث سُنتے لکھ لیتے اور پھر اُن لکھے ہوئے نوٹس کو دیکھ کر حدیث روایت کرتے حالانکہ حدیث آپ کو یاد ہوتی۔ یہ احتیاط صرف اس وجہ سے تھی کہ حدیثِ رسول میں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔

آپ نے فقہاءِ عصر سے فقہ بھی پڑھی۔ صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ کا بھی مطالعہ کیا لیکن زیادہ رجحان حدیث و آثار کی طرف تھا اسی کے سیکھنے اور سکھانے میں اپنی زندگی وقف کئے رکھی۔

امام احمد فارسی زبان بھی جانتے تھے۔ آپ کا خاندان فارس میں رہا تھا اس وجہ سے گھر میں فارسی بولی، سمجھی جاتی تھی۔

امام احمد اور درس و تدریس

چالیس سال کی عمر ہوئی تو آپ نے اپنا حلقۂ درس قائم کیا۔ یہ ۲۰۴ھ کے بعد کا واقعہ ہے جبکہ آپ کے استاد حضرت امام شافعیؒ کا انتقال ہو چکا تھا۔ آپ کے قائم کردہ مدرسہ حدیث کو بہت شہرت ملی کیونکہ حدیث کی تدریس کے ساتھ ساتھ آپ تقویٰ، پرہیز گاری اور اعمال صالحہ کے لحاظ سے بھی بڑی امتیازی شان رکھتے تھے۔ طلبۂ حدیث کی بہت بڑی تعداد آپ کے مدرسہ سے متعلق تھی۔ سینکڑوں قلم دوات لئے ہر وقت لکھنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

آپ کا گزارا مختصر سی آمدن پر تھا جو مکانوں کے کرایہ سے ہوتی تھی۔ بعض نے اس کی مقدار سترہ درہم ماہوار لکھی ہے۔ جیسا کہ سابقہ سطور میں گزر چکا ہے کہ آپ مزدوری بھی کر لیتے تھے

یہاں تک کہ کھیتوں میں فصل کی کٹائی کے بعد گری پڑی بالیں بھی چُن لاتے تھے لیکن خلفاء اورامراء کے کسی قسم کے نذرانے قبول کرنے کے لئے کبھی تیار نہ ہوئے۔[1]

امام احمدؒ احادیث کے علاوہ فقہی آراء اور فتاویٰ لکھنے کے روادار نہ تھے اور کسی کو اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ایک دفعہ آپ کے سامنے ذکر ہوا کہ عبداللہ بن مبارک تو حنفی فقہ کے مسائل لکھ لیا کرتے تھے یہ سن کرآپ نے فرمایا: اِبْنُ الْمُبَارک لَمْ یَنْزِلْ مِنَ السَّمَآءِ ۔ابن مبارک آسمان سے نہیں اُترے،وہی کچھ لکھنا چاہیے جوآسمان سے نازل ہوا ہے[2] تاہم امام احمد کی اس سختی کے باوجود آپ کے شاگردوں نے آپ کی فقہی آراء کو مدوّن کیا جو کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔

امام احمدؒ کا ابتلا اور آپ کی استقامت

یہ دَور مذہبی کلامی اور فلسفیانہ مباحث ومناظرات کا دَور تھا۔معتزلہ جوعلم کلام کے بانی تھے غالب آرہے تھے ان کی وجہ سے مختلف قسم کے مسائل مثلاً انسان مجبور ہے یا مختار،اللہ تعالیٰ کی صفات عینِ ذات ہیں یا غیر ذات ،کلام اللہ تعالیٰ کی صفت ہے یا نہیں،قرآن کریم قدیم ہے یا مخلوق زیر بحث رہتے تھے اور مناظرات کا ایک شور مچا ہوا تھا خود مامون الرشید اس قسم کے مباحث سے دلچسپی رکھتا تھا اور معتزلہ اُسے اُکساتے تھے کہ اس قسم کے عقائد کی ترویج میں سختی سے کام لیا جائے۔[3] اس وجہ سے سلف پرست علماء کو سخت ابتلا کا سامنا تھا۔

امام احمد بھی اسی سلسلہ میں زیر عتاب آئے آپ کا موقف یہ تھا کہ اس قسم کے عقائدی مباحث نہ صحابہؓ نے اُٹھائے اور نہ اُن کے اُن شاگردوں نے جو اُمت میں تابعین کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔ان کی پیروی میں ہمیں بھی ان میں نہیں اُلجھنا چاہیے جو کچھ وہ مانتے تھے اُسی پر اکتفا کرنی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیں۔ الامام احمد صفحہ ۲۷۲، مالک بن انس صفحہ ۱۱۷۔ محاضرات صفحہ ۳۲۷ تا ۳۳۵

[2] اُمرنا ان نا خُذَ العلم من فوقٍ (محاضرات صفحہ ۳۱۵)

[3] قیل قد عمل علٰی اثارۃ ھذا المسئلۃ النصاری فانھم یقولون قد جاء فی القرآن ان عیسٰی کلمۃ اللہ القاھا الی مریم و کلمۃ اللہ قدیمۃ فعیسٰی قدیم فقال الجعد بن جھم والجھم بن صفوان جوابًا للنصارٰی ان الکلام و القران مخلوق لیس بقدیم و اعتنق المعتزلۃ و المامون ذالک الرأی (محاضرات صفحہ ۳۱۷) (الامام احمد صفحہ ۱۶۵)

چاہئے اور اگر اصرار ہی ہے تو کَلَامُ اللّٰہِ قَدِیْمٌ کہنے میں نجات ہے۔ اُسے مخلوق قرار دینا بدعت ہے لیکن آخر عمر میں مامون الرشید کا یہ اصرار بڑھ گیا کہ لوگوں سے زبردستی منوایا جائے کہ قرآن کریم جو کلام اللہ ہے مخلوق ہے۔[1] اس دار و گیر میں امام احمد اور محمد بن نوح کو گرفتار کیا گیا ان کو مامون الرشید کے سامنے پیش کرنے کے لئے الرقہ یا طَرَسُوس لے جایا جا رہا تھا کہ مامون کی وفات ہو گئی لیکن مرنے سے پہلے وہ اپنے جانشین المعتصم کو وصیت کر گیا کہ زبردستی کی اس پالیسی کو جاری رکھا جائے۔[2]

محمد بن نوح تو راستہ میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے امام احمد بن حنبل کو پابجولاں واپس بغداد لایا گیا کچھ دن قید خانے میں رکھنے کے بعد ان کو نئے خلیفہ ابو اسحاق المعتصم کے سامنے پیش کیا گیا۔ معتصم نے ہر طرح کوشش کی اور سمجھایا کہ امام احمد اُس کی بات مان لیں آپ نے اپنے موقف پر اصرار کیا۔ اس پر المعتصم غصہ میں آ گیا اور حکم دیا کہ آپ کو کوڑے لگائے جائیں۔ کوڑوں کی تکلیف کی وجہ سے آپ کئی بار بے ہوش ہو جاتے تھے لیکن استقامت میں ذرا بھی فرق نہ آنے دیا۔ اس طرح آپ نے اٹھائیس ماہ کے قریب قید و بند اور کوڑوں کی سختیاں جھیلیں۔ آخر تنگ آ کر حکومت نے آپ کو رہا کر دیا۔ ان سختیوں کی وجہ سے امام احمدؒ بہت کمزور ہو گئے تھے ایک عرصہ تک چلنا پھرنا بھی مشکل رہا۔ جب آپ تندرست ہوئے تو پھر سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ابتلاء کے زمانہ میں صبر و استقامت دکھانے کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں آپ کی قدر و منزلت بہت بڑھ گئی اور ہر طرف سے عقیدت کے پھول برسنے لگے تھے۔

المعتصم کی وفات کے بعد الواثق جانشین ہوا۔ شروع شروع میں اس نے بھی یہ سختی جاری رکھی۔ امام احمدؒ کے بارہ میں اُس نے حکم دیا کہ وہ نہ کوئی فتویٰ دے سکتے ہیں اور نہ پڑھا سکتے ہیں کوئی ان کے پاس جا بھی نہیں سکتا۔ وہ اس شہر میں بھی نہیں رہ سکتے اس وجہ سے آپ نے کچھ عرصہ چھپ کر وقت گزارا۔ آخری عمر میں واثق سختی کی اس پالیسی سے تنگ آ گیا تھا بلکہ قرآن مخلوق ہونے کا

---

[1] الامام احمد بن حنبل صفحہ ۱۲۳

[2] قیل کتب ھذہ الوصیۃ احمد بن ابی داؤد شیخ من شیوخ المعتزلۃ الخصم العنید للفقھاء والمحدثین (محاضرات صفحہ ۳۱۸)

نظر یہ مذاق بن گیا تھا۔ایک دفعہ ایک مسخرہ واثق کے دربار میں آیا اور کہا میں امیر المؤمنین کی خدمت میں تعزیّت کرنے آیا ہوں کیونکہ جو مخلوق ہے اُس نے ایک نہ ایک دن فوت بھی ہونا ہے قرآن کریم فوت ہوگیا تو لوگ تراویح کی نماز کیسے پڑھیں گے۔واثق چیخ اُٹھا اور کہا کمبخت قرآن بھی فوت ہوسکتا ہے۔[1]

ایک دفعہ ایک عالم کو گرفتار کرکے واثق کے سامنے لایا گیا وہاں معتزلہ کا سردار احمد بن ابی داؤد بھی بیٹھا تھا اس عالم نے ابن ابی داؤد سے پوچھا کہ:

خلقِ قرآن کا مسئلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء جانتے تھے یا نہیں۔اگر وہ جانتے تھے اور اس کے باوجود خاموش رہے تو ہمیں بھی خاموش رہنا چاہیے اور اگر نعوذ باللہ یہ لوگ جاہل تھے اور اس مسئلہ کے بارہ میں کچھ نہیں جانتے تھے تو پھر اے کمینے (یَالُکَعُ) تم کہاں سے عالم آگئے ہو۔واثق یہ بات سُن کر اُچھل پڑا وہ بار بار اس جملہ کو دہراتا اور ابن ابی داؤد کو ملامت کرتا۔ واثق نے اس گرفتارِ بلا عالم کو رہا کر دیا اور اُسے شاباش دی۔[2]

غرض امام احمدؒ اور دوسرے علماء کی استقامت اور ان کے صبر نے مسئلہ خلقِ قرآن کی شورش کو اپنی موت آپ مار دیا اور قریباً چودہ سال کی ہنگامہ آرائی کے بعد حالات پُرسکون ہوگئے۔ خلقِ قرآن کا مسئلہ دراصل ایک لفظی نزاع تھا جس نے تعصب اور ضدّ کا رنگ اختیار کر لیا تھا لیکن ایک مدّت کی سر پھٹول کے بعد اس کا مآل صرف یہ نکلا کہ علم الٰہی کے لحاظ سے قرآنِ کریم کے معانی قدیم ہیں لیکن اس کے الفاظ جن سے مراد آواز اور حروف ہیں حادث ہیں کیونکہ یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریلؑ سے سنے اور آپؐ سے آپ کے صحابہؓ نے اور اس کے بعد ساری اُمت نے سُنے اور ان کی تلاوت کی۔[3]

الواثق کے بعد المتوکل خلیفہ مقرر ہوا تو اس نے سختی کی پالیسی بالکل ترک کر دی۔معتزلہ کو دربار سے نکال دیا اور فقہاء اور محدّثین کی رضا جوئی کا خواہشمند ہوا اور اس طرح ملک کا امن وامان بحال ہوگیا۔

---

[1] محاضرات صفحہ ۳۲۱

[2] محاضرات صفحہ ۳۲۲

[3] محاضرات صفحہ ۳۲۳ تا ۳۲۷

امام احمدؒ حدیث اور فقہ کے ماہر تھے ۔صبر و استقامت کا پہاڑ، بلند ہمت، کَرِیْمُ السَّجِیَّة، طَلْقُ الْوَجْهِ، شَدِیْدُ الْحَیَاءِ، بڑے متقی، عابد اور زاہد تھے۔[1] آپ کا درس لائق شاگردوں کے دل موہ لیا کرتا تھا ۔جب آپ ۲۴۱ھ میں اٹھتر سال کی عمر میں فوت ہوئے تو سارا بغداد ماتم کدہ بن گیا ۔لاکھوں آدمی آپ کے جنازہ میں شریک ہوئے اور لوگوں نے محسوس کیا کہ آج ان کا ایک بہت بڑا امام اُن سے رُخصت ہو گیا ہے ۔

امام احمدؒ کی فقہی آراء

عقائد اور سیاست کے بارہ میں آپ کا نظریہ سلف صالحین کی آراء کے تابع تھا ۔آپ کا کہنا تھا کہ عقائد میں سیدھا مسلک یہی ہے کہ قرآنی تصریحات کی پابندی کی جائے ۔احادیث سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے اسی پر اکتفا کی جائے ۔[2] سیاسی لحاظ سے حکّامِ وقت کی اطاعت واجب ہے اُن کے خلاف تلوار اُٹھانا منع ہے کیونکہ تلوار نظم ونسق، امن وامان کو تباہ کر دیتی ہے ۔البتہ حسب موقع ومحل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وعظ وتلقین اور کلمۃ الحق کہنے میں کوئی کمی نہیں آنے دینا چاہیے یہ ہر حال میں واجب ہے ۔[3]

امام احمدؒ امام الحدیث اور فقیہ السنہ تھے تاہم بعض علماء نے ان کے فقیہ ہونے کا انکار کیا ہے امام ابن جریر طبریؒ نے اختلاف الفقہاء کے موضوع پر ایک کتاب لکھی اس میں امام احمدؒ کا ذکر نہ کیا تو لوگوں نے اعتراض کیا ۔آپ نے کہا ۔امام احمد محدّث تھے فقیہ نہ تھے اس لئے ان کا ذکر فقہاء کے ضمن میں نہیں کیا گیا ۔اس پر لوگ مشتعل ہو گئے، ابن جریر کے مکان پر پتھراؤ کیا، بڑی مشکل سے جان بچی ۔[4] اس سب کچھ کے باوجود امام احمد کی فقہی آراء اور آپ کے فتاویٰ کا ایک بڑا مجموعہ

---

1. جمع الامام احمد بن الفقر والجود والعفة والعزة والاباء والعفو. تفصیل کیلئے دیکھیں الامام احمد صفحہ ۱۱۴، ۱۱۷، ۱۱۹ ۔ محاضرات صفحہ ۳۳۷ تا ۳۴۱
2. کان یقول رحمة الله علیه "القرآن لیس بمخلوق ولیس معنی ذالک انه قدیم. وقال النبیؐ لا تماروا فی القرآن فان مراء فیه کفر" ۔ محاضرات صفحہ ۳۲۶
3. محاضرات صفحہ ۳۴۳
4. الامام احمد بن حنبل صفحہ ۲۱۲

حنبلیوں کے ہاں مقبول ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اُس کی صحت کا انکار کیا جائے۔البتہ یہ درست ہے کہ آپ کی فقہ پر حدیث وآثار کا رنگ غالب تھا۔[۱]

مسند امام احمد

حدیث میں آپ کا کارنامہ "**المسند**" کی شکل میں موجود اور مشہور ہے۔اس کتاب میں تیس اور چالیس ہزار کے درمیان احادیث اور آثار صحابہؓ ہیں۔[۲] آپ کی یہ کتاب بعد میں آنے والے محدثین کے لئے بطور بنیاد کے سمجھی گئی امام بخاری، امام مسلم اور دوسرے بزرگ محدثین نے اپنے اپنے مجموعے مرتّب کرتے وقت اس کتاب کو بھی سامنے رکھا اور صحیح احادیث کے انتخاب میں اس سے قابل قدر مدد لی۔

مسند میں مضامین کی ترتیب کی بجائے راویوں کی ترتیب سے احادیث جمع کی گئی ہیں۔ مثلاً پہلے حضرت ابوبکرؓ سے مروی احادیث، اس کے بعد حضرت عمرؓ کی مرویات، اس کے بعد حضرت عثمانؓ کی۔علیٰ ھٰذا القیاس ترتیب وار تمام صحابہؓ کی مرویات درج کتاب ہیں۔

مضامین کے لحاظ سے ترتیب کی بعد میں کئی کوششیں ہوئیں لیکن ابھی تک مکمل شکل میں یہ مقصد زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوسکا۔[۳]

اس میں شک نہیں کہ مسند میں مروی بعض احادیث ضعیف ہیں[۴] لیکن علماء نے تصریح کی ہے کہ مسند میں کوئی موضوع روایت نہیں ہے۔امام احمد کا مسلک یہ تھا کہ قرآن وسنت کے بعد احادیث اَحادماَ خذ شریعت ہیں خواہ وہ صحیح ہوں یا ضعیف، متصل ہوں یا مرسل، اقوالِ صحابہ کو بھی

---

۱ محاضرات صفحہ ۳۵۰۔ الامام احمد بن حنبل صفحہ ۲۱۷۔

۲ الامام الشافعی صفحہ ۲۱۳۔ الامام احمد بن حنبل صفحہ ۲۲۳ تا ۲۲۷۔ جمع ابن القیم فتاواہ الفقھیۃ فی ثلاثین مجلداً (ابن القیم الجوزیہ صفحہ ۳۸)

۳ مات الامام احمد قبل تنقیح المسند و تھذیبہ فبقی علی حالہ ثم جاء ابنہ عبد اللہ فالحق بہ من مسموعاتہ ما یُشابھہ و یماثلہ (محاضرات صفحہ ۳۵۱)

۴ الضعیف الذی یکون فی بعض رجالہ من لم یبلغ مبلغ الثقۃ او کان فی سلسۃ سندہ انقطاع ولم یثبت عن الثقات مخالفتہ والموضوع فھو ما قام الدلیل علی بطلانہ (المحاضرات صفحہ ۳۵۴)

مزید تفصیل کے لئے دیکھیں۔ الامام احمد صفحہ ۲۳۰ تا ۲۳۶۔ محاضرات صفحہ ۳۵۸ و ۳۶۱

آپ حجت مانتے تھے تابعین کی آراء کا بھی لحاظ رکھتے تھے۔اس کے بعد بامر مجبوری شاذ طور پر قیاس۔مصالح مرسلہ اور استصحاب وغیرہ سے بھی کام لے لیتے تھے۔صحابہ کے اجماع کے علاوہ وہ کسی اور اجماع کی شرعی حیثیت کے قائل نہ تھے کیونکہ اُن کی رائے میں اجماع کا دعویٰ درست نہیں کیونکہ بہت ممکن ہے کہ کوئی مخالف ہو جس کا ہمیں علم نہ ہوسکا ہو۔[1]

حنبلیوں کے نزدیک نص کی عدم موجودگی کی صورت میں قیاس سے کام لینا ضروری ہے لیکن ان کے ہاں حنفیوں اور شافعیوں کے مقابلہ میں قیاس کا مفہوم زیادہ وسیع ہے اس میں استحسان، مصالح مرسلہ، ذرائع اور استصحاب سبھی وجوہِ استنباط شامل ہیں مثلاً حنفیوں کے نزدیک بیع سلم کا جواز غیر قیاسی ہے کیونکہ یہ نص **لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ** کے خلاف ہے اور **بَيْعِ مَعْدُوم** کے حکم میں ہے لیکن حنبلیوں کے نزدیک اس بیع کا جواز قیاسی ہے کیونکہ پبلک مصلحت اور ضرورت اور عُرف کی بنا پر اُس کی اجازت دی گئی ہے۔[2]

مصالح اُمّت کی بنا پر ہی امام احمد اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ شر پسند اور فسادی عناصر کو شہر بدر کیا جاسکتا ہے یا ضرورت مندوں کو لوگوں کے گھروں میں زبردستی ٹھہرایا جاسکتا ہے جبکہ کوئی اور صورت ممکن نہ ہو۔یہی حکم اس صورت میں ہے جبکہ کسی ضروری پیشہ کا آدمی نہ مل رہا ہو تو کسی کو یہ پیشہ سیکھنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔سَدِّ ذرائع سے کام لینے میں بھی حنبلی کسی سے پیچھے نہیں وہ اُن تمام ذرائع کے ممنوع ہونے کے قائل ہیں جو **مُفضي اِلى الفَساد** ہوسکتے ہیں۔ متعدّی بیماری کے مریضوں کو پبلک مقامات میں جانے سے روکا جاسکتا ہے۔فساد کے دنوں میں پبلک کے پاس اسلحہ فروخت کرنے کو منع کیا جاسکتا ہے۔ **تَلَقِّي رُکْبَان** بھی اسی اصول کی بنا پر منع ہے اس سلسلہ میں نیت اور نتیجہ دونوں اپنی اپنی جگہ کام کرتے ہیں۔ایک شخص کسی دوسرے کو قتل کرنے کی نیت سے بندوق چلاتا ہے لیکن گولی اُس شخص کو لگنے کی بجائے سانپ کو جالگتی ہے

---

[1] من ادعى الاجماع فهو كاذب لعل الناس اختلفوا و لم ينبه اليه فليقل لانعلم مخالفًا له (محاضرات صفحه ۳۵۹)

[2] لان الحكمة في وجود المبيع ثابتة فيه و هو منع الجهالة والغرر و عرف الناس ۔(محاضرات صفحه ۳۶۱ ملخصًا)

اور وہ مر جاتا ہے تو نتیجہ اگرچہ خیر ہے لیکن نیت بد ہے اس لئے بندوق چلانے والا اللہ تعالیٰ کے ہاں گنہگار ہوگا اور دُنیا میں بھی مناسب گرفت ہوسکتی ہے۔

ایک شخص کسی دوسرے کو مکان میں بند کر دیتا ہے۔ وہاں وہ بُھوکا پیاسا مر جاتا ہے تو امام احمدؒ کے نزدیک بندش کے مرتکب کو دیّت ادا کرنی ہوگی۔ رقص و سرود کے لئے کسی کو مکان کرایہ پر دینا بھی اسی اُصول کے تحت ممنوع ہے۔

حنبلیوں نے استصحاب[1] کے اصول سے بھی بہت کام لیا ہے۔ اسی اُصول کے تحت اُن کا مسلک یہ ہے کہ شک یقین کو زائل نہیں کرسکتا۔ اصلاً پانی طاہر ہے جب تک نجاست کے پڑنے کا یقین نہ ہو پانی پاک سمجھا جائے گا اور شبہ کا امکان قابلِ ردّ ہوگا۔

امام احمد کے مسلک کا فروغ

امام احمدؒ کے مسلک کو ان کی کتابوں کے علاوہ اُن کے لائق شاگردوں نے مقبول بنایا۔ امام صاحب کے لڑکے علامہ عبداللہ نے ان کی مشہور زمانہ کتاب ''المسند'' کو متعارف کرایا۔ اسی طرح ان کے لائق شاگرد ابوبکر الاثرم، عبدالملک المیمونی، ابوبکر المروزی، ابراہیم بن اسحاق الحربی اور ابوبکر الخلال اور دوسرے قابل شاگردوں نے ان کے مذہب کی اشاعت کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے رکھا۔

امام ابن تیمیہ اور امام ابن القیّم جیسے فضلائے زمانہ اسی مسلک سے وابستہ تھے۔

حنبلی ہر زمانہ میں اجتہاد کو ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے دروازہ کو کُھلا مانتے ہیں۔ اس وجہ سے فکر کی وسعت تو میسر آئی لیکن اختلافات کا انبار لگ گیا۔ ہر نئے مجتہد نے کسی نہ کسی مسئلہ میں اپنا الگ مسلک اختیار کیا اس پر بند لگانے کی کوئی صورت سامنے نہ آسکی۔

حنبلی مسلک کے علماء علمی میدان میں بڑے سربرآوردہ تھے لیکن اس کے باوجود وہ حنبلی مسلک کو مقبولِ عام نہ بنا سکے۔ اس کی کئی وجوہات تھیں مثلاً:

دوسرے فقہی مسالک کو استحکام کے لحاظ سے سبقت حاصل تھی۔ حنبلی مسلک قرون ماضیہ میں

---

[1] ان الحکم الثابت یستمرُّ حتی یوجد دلیل قطعی بغیرہ (محاضرات صفحہ ۳۶۵)

کہیں بھی حکومت کا مذہب نہ بن سکا۔ اب سعودیہ میں یہ سرکاری مذہب ہے۔
حنبلیوں میں بوجوہ تشدد و تعصب اور تقشُّف کے عنصر کو غلبہ حاصل رہا۔ حنبلی مسلک کے پیرو عوام پر بے حد سختی کرتے تھے، فساد سے گریز نہ کرتے تھے۔ تاتاری حملہ سے کچھ عرصہ پہلے تو حنبلیوں کے شور وشر نے بغداد اور ملحقہ علاقوں میں بغاوت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس وجہ سے عوام اس مسلک سے بالعموم متنفر رہے[1]۔

---

[1] الف: قال شیخ الاسلام ابو الوفاء بن عقیل الحنبلی ان الحنابلة قوم خشن تقلصت اخلاقهم عن المخالطة و غلظت طبائعهم عن المداخلة غلب علیهم الجدُّ و قل عندهم الهزل. (الامام احمد بن حنبل صفحه ۲۱۲)

ب: قال ابن الاثیر فی الکامل فی سنة ۳۲۲ھ عظم امر الحنابلة و قویت شوکتهم و صاروا یلبسون دور القواعد و العامة ...... و اعترضوا فی البیع و الشراء و مشی الرجال مع النساء و الصبیان ...... فازعجوا بغداد ...... و بهذا الاعمال و غیرها نفر الناس منهم و قل اتباعهم (محاضرات صفحه ۳۷۳)

حضرت امام ابن تیمیہؒ

امام تقی الدین ابوالعباس احمد بن شہاب الدین عبدالحلیم ۶۶۱ھ میں حرّان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد اپنے زمانہ کے مانے ہوئے عالم اور محدّث تھے اور حَرّانیؒ کہلاتے تھے۔

امام صاحب کی ایک دور کی جدّہ کا نام تیمیّہ تھا جس کی طرف نسبت کی وجہ سے ان کی کنیت ابن تیمیہ مشہور ہوئی اور اسی کنیت سے آپ معروف ہیں۔

امام ابن تیمیہ کا قد درمیانہ، رنگ سفید، کالی گھنی داڑھی، سینہ چوڑا، آنکھیں بڑی بڑی غرض آپ بڑی دلنواز، سنجیدہ اور بارُعب شخصیت کے مالک تھے۔آپ کا گھرانہ بڑی علمی عظمت رکھتا تھا اور اپنے علاقہ حران میں جو شام کا ایک حصہ تھا بڑا اثر ورسوخ اور دینی قیادت کا شرف رکھتا تھا۔

یہ دور سیاسی لحاظ سے مسلمانوں کے لئے بڑے اضطراب اور خلفشار کا باعث تھا کیونکہ تاتاریوں کے ہاتھوں مرکز خلافت بغداد تباہ ہو چکا تھا اور اب ان کا رُخ شام کی طرف تھا۔انہی تاتاری حملوں کے خوف سے ابن تیمیہ کا خاندان حران سے ہجرت کر کے دمشق میں آبسا تھا۔ اس وقت ابن تیمیہ کی عمر سات سال تھی۔

دمشق اس زمانہ میں مجمع العلماء تھا کیونکہ حُرُوْبِ صَلِیْبِیَّہ کے دوران فلسطین کے علماء بھاگ کر دمشق آگئے تھے۔اس کے کچھ عرصہ بعد تاتاری حملوں کی وجہ سے عراق اور مشرقی علاقوں کے کئی علماء بھی دمشق آگئے اور بعض مصر کی طرف نکل گئے۔بہر حال دمشق کے علمی ماحول میں ابن تیمیہ نے پرورش پائی۔والد دمشق کی جامع مسجد کے واعظ اور اُس کے ایک مدرسہ کے معلّم تھے۔ابن تیمیہ نے بھی اس علمی ماحول سے اثر لیا۔

آپ نے پہلے قرآن کریم حفظ کیا جو اُس زمانہ کا دستور علمی تھا۔اس کے بعد مروجہ علوم کی طرف توجہ مبذول کی۔قابل اساتذہ سے استفادہ کا موقع ملا۔حدیث آپ کا بڑا پسندیدہ موضوع تھا۔چنانچہ اُس زمانہ کے مشہور اساتذہ سے کتب حدیث پڑھیں۔صحاح ستہ کے علاوہ مسند احمد بن حنبل بھی سبقاً پڑھی اور اس مضمون کا وسیع مطالعہ کیا۔فقہ الحدیث میں بھی مہارت حاصل کی۔جب آپ کی عمر ۲۱ سال کی تھی کہ آپ کے والد ماجد فوت ہو گئے لیکن آپ کی والدہ نے

کافی لمبی عمر پائی اور اپنے لائق بیٹے کے عروج کے زمانہ کو بھی دیکھا۔

امام ابن تیمیہ کا حافظہ غضب کا تھا کہا جاتا ہے کہ **اَلْجَمْعُ بَیْنَ الصَّحِیْحَیْنِ لِلْحُمَیْدِی** آپ کو یاد تھی۔علوم عربیہ میں بھی آپ کو مہارت تامّہ حاصل تھی۔امام ابن تیمیہ میں متعدد وصف نمایاں تھے۔بچپن سے ہی آپ بڑے محنتی، سختیوں کے عادی اور سنجیدہ طبیعت تھے۔تیز ذہن، ملکۂ حفظ میں مستحکم اور حساس طبیعت رکھنے والے تھے۔علم کا ذوق ورثہ میں ملا تھا ان صفات کی وجہ سے بہت جلد اقران زمانہ سے آگے نکل گئے۔چونکہ گھرانہ حنبلی المسلک تھا اس لئے ابن تیمیہ پر بھی یہ رنگ نمایاں رہا۔اس زمانہ میں صلاح الدین ایوبی کی کوششوں کی وجہ سے عقائد میں امام ابوالحسن اشعری اور فقہ میں امام شافعی کا مسلک غالب تھا اس وجہ سے امام ابن تیمیہ کو جو حنبلی اور سلفی تھے شافعیوں اور اشعریوں کے مقابلہ میں بڑے معرکے سر کرنے پڑے۔مخالفتوں کا ایک زور تھا جس سے امام ابن تیمیہ دوچار رہتے۔[1]

امام ابن تیمیہؒ اور درس وتدریس

ابن تیمیہ قریباً اکیس سال کی عمر میں اپنے والد کی وفات کے بعد مسند تدریس پر متمکن ہوئے۔ آہستہ آہستہ آپ کے درس کا غلغلہ بلند ہوتا گیا۔آپ بڑے فصیح اللسان اور واضح البیان اُستاد تھے باتوں میں بڑی مٹھاس اور بیان میں بڑا اثر تھا۔ہر قسم کے خیال کے لوگ موافق اور مخالف سُنّی اور بدعتی شیعہ اور معتزلہ بھی شامل درس ہوتے اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق استفادہ کرتے۔[2]

امام ابن تیمیہؒ اور ابتلا

امام ابن تیمیہؒ تفوّق علمی کے ساتھ ساتھ بڑے تیز طبیعت بھی تھے۔مخالف پر بڑی شدت کے ساتھ حملہ آور ہوتے اُس زمانہ میں توہمات اور بدعات کا زور تھا۔پیر پرستی اور قبر پرستی نے مسلم معاشرہ کی جڑیں کھوکھلی کردی تھیں۔امام ابن تیمیہؒ معاشرہ کی ان سب بیماریوں کے خلاف

---

[1] کانت منا ضلات له فی هذا السبیل و نزلت به محن و کادت نفسه تذهب فی هذا الامر۔ (محاضرات صفحه ۴۴۷)

[2] اُس زمانہ کے ایک بہت بڑے فقیہ ابن دقیق العید نے آپ کا درس سن کر کہا رأیت رجلاً جمع العلوم کلها بین عینیه یاخذ منها مایرید و یدع مایرید۔ (محاضرات صفحه ۴۴۸)

سینہ سپر ہو گئے۔ خصوصاً اُس زمانہ کے صوفیوں کو جن کا بڑا اثر تھا آپ نے ہدف تنقید بنایا جس کی وجہ سے وہ آپ کے سخت خلاف ہو گئے۔

ان حالات میں ضروری تھا کہ جہاں اُن کے کچھ حامی دوست اور عقیدت مند ہوں وہاں مخالفوں کی بھی کثرت ہو[1] چنانچہ حاکم مصر الناصر بن قلا دون کے پاس آپ کی شکایت کی گئی۔ اس وقت شام کا علاقہ مصر کی عملداری میں تھا اُس نے آپ کو بلا بھجوایا تو الناصر کو اگر چہ ابن تیمیہ سے عقیدت تھی لیکن علماء کے شور وشر سے مجبور تھا۔ وہاں کے قاضی نے الزام لگایا کہ یہ **تَجْسِیْمِ اِلٰہ** کے قائل ہیں۔ آپ نے قاضی کو حَکَم ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ اس سے پہلے اُس کے حکم سے ایک عالم کو جس کا کوئی قصور نہیں تھا قتل کیا جا چکا تھا چنانچہ اس قاضی نے آپ کو بھی قید کر دیا۔ اٹھارہ ماہ آپ قید رہے۔ پھر الناصر کی کوشش سے رہائی پائی۔ آپ نے پھر سے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا اور صوفیاء کے عقائد پر حملے برابر جاری رکھے۔

الناصر کا ایک پیر تھا جو وحدۃ الوجود کو مانتا تھا۔ امام ابن تیمیہؒ اس عقیدہ کے سخت خلاف تھے۔ اس نے الناصر پر دباؤ ڈالا کہ ابن تیمیہ کو تنقید سے روکا جائے لیکن آپ کا موقف یہ تھا کہ جو بات حق ہے اُس کے اظہار سے وہ نہیں رُک سکتے۔ چونکہ شور وشغب بڑھ گیا تھا اور عوام پر صوفیاء کا بڑا اثر تھا اس لئے امام ابن تیمیہ کے سامنے تین تجویزیں رکھی گئیں اوّل یہ کہ وہ قاہرہ سے الاسکندریہ چلے جائیں ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہاں ان کو کوئی جانتا نہیں اس لئے ان کی کوئی نہیں سُنے گا اور ساتھ یہ بھی شرط تھی کہ وہاں جا کر کوئی وعظ وغیرہ نہیں کرنا زبان بند رکھنی ہے اگر یہ منظور نہیں تو پھر زبان بندی کی اس شرط کے ساتھ وہ واپس دمشق چلے جائیں اور تیسری صورت یہ ہے کہ آپ کو دوبارہ قید کر دیا جائے۔ تاہم قید خانہ میں آپ کے شاگرد آپ سے پڑھ سکیں گے۔ آپ نے

---

[1] علامہ ذہبی جو آپ کے ہم عصر تھے وہ آپ کے بارہ میں لکھتے ہیں۔ من خالطه و عرفه ينسبني الى التقصير فيه و من خالفه ونابذه قد ينسبني الى التغافل فيه و قد اُوذيت من الفريقين من اصحابه و اضداده و لا اعتقدُ فيه عصمة...... فانه كان مع سعة علمه و فرط شُجاعته و سيلان ذهنه بشرا من البشر تعتريه حدة في البحث و غضب للخصوم تزرع له عداوة في النفوس و لولا ذالک لكان كلمة اجماع فان كبارهم تعترفون بانه بحرلا ساحل له و كنز ليس له نظير و لكنهم ياخذون عليه اخلاقا و افعالا. (محاضرات صفحه ۴۲۸)

اس تیسری صورت کو منظور کر لیا لیکن آپ زیادہ عرصہ قید خانہ میں نہ رہے۔ اپنے عقیدت مندوں کی وجہ سے جلد باہر آ گئے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا اور لوگ پہلے سے بھی زیادہ آپ کے گرویدہ ہو گئے۔ اس دوران کئی ابتلا بھی آئے جنہیں آپ نے صبر وشکر کے ساتھ برداشت کیا۔ الناصر نے ارادہ کیا کہ جن علماء نے آپ کو تکلیف دی ہے اور ایک لمبا عرصہ قید میں رہنے پر مجبور کیا ہے ان کو سزا دی جائے لیکن آپ نے کہا ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ مَیں نے ان سب کو معاف کر دیا ہے۔ چنانچہ الناصر نے آپ کی بات مان لی۔[1]

علماء تو خاموش ہو گئے لیکن صوفیاء کا شور کم نہ ہوا انہوں نے پبلک کو اُکسایا اور بعض جاہلوں نے آپ پر حملہ کیا اور آپ کی توہین کی۔ آپ کے حامی سخت مشتعل ہو گئے اور انتقام لینے کا عزم کیا لیکن آپ نے بڑی سختی سے ان کو منع کیا اور فرمایا اگر تم میرے لئے انتقام لینا چاہتے ہو تو مَیں نے تو ان کو معاف کر دیا ہے اور اگر اپنے لئے انتقام لیتے ہو اور میری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں تو پھر جو مرضی ہے کرو اور اگر خدا کے لئے انتقام لیتے ہو تو اللہ تعالیٰ اپنا حق لینے پر آپ ہی قادر ہے تمہاری مدد کی اُسے ضرورت نہیں۔ غرض لوگوں کو بڑی سختی سے آپ نے روکا اور کسی قسم کا فساد نہ ہونے دیا۔[2]

امام ابن تیمیہؒ اور جہاد بالسیف

امام بن تیمیہ عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ مرد میدان بھی تھے آپ نے تاتاریوں کے خلاف جہاد میں مؤثر حصّہ لیا۔ ۶۹۹ھ کے قریب دمشق کو تاتاریوں کے حملے کا بڑا خطرہ تھا بعض علماء تو مصر کی طرف بھاگ گئے لیکن امام ابن تیمیہ نے وعظ وتلقین کے ذریعہ لوگوں کے حوصلے بڑھائے۔ انہیں جرأت کے ساتھ حملہ کا مقابلہ کرنے پر اُکسایا۔ دوسری طرف آپ شہر کے عمائدین کا وفد لے کر تاتاری سالار غازان کے پاس گئے۔ غازان نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن تاتاری

[1] آپ نے الناصر کو کہا اذا قتلت ھولاء لا تجد بعدھم مثلھم ان میں مالکی قاضی ابن مخلوف بھی تھا جو آپ کی مخالفت میں سب سے آگے تھا اور آپ کو قتل کرانا چاہتا تھا اس نے جب امام صاحب کا یہ خلق دیکھا تو بے اختیار کہہ اُٹھا ما راینا مثل ابن تیمیہ حارضنا علیہ فلم نقدر وقدر علینا فصفح وحاج عنا۔ (محاضرات صفحہ ۳۶۱)

[2] محاضرات صفحہ ۳۶۲

وحشت اور بربریت علیٰ حَالِہٖ موجود تھی۔ یہ لوگ صرف نام کے مسلمان تھے۔ تمام عادات اور رسم و رواج ابھی کافرانہ تھے اور اپنے آپ کو چنگیز خاں کے قانون سا سا کے تابع سمجھتے تھے۔ بہر حال جب وفد غازان کے سامنے حاضر ہوا تو آپ نے وفد کی نمائندگی کرتے ہوئے غازان سے کہا۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ آپ کے لشکر میں قاضی، شیخ اور مؤذن سبھی ہیں لیکن اسلام کے آثار نہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد کافر تھے لیکن عہد کے پکّے تھے۔ آپ مسلمان ہو کر اُس عہد کو توڑ رہے ہیں جو آپ نے اس علاقہ کے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا۔ بات چیت کے بعد جب وفد کے سامنے کھانا چنا گیا تو آپ نے کھانے سے انکار کر دیا۔ غازان نے پوچھا کھانا نہ کھانے کی وجہ کیا ہے؟ آپ نے کہا میں وہ کھانا کیسے کھا سکتا ہوں جو لوگوں کا مال لوٹ کر تیار کیا گیا ہے۔ لوگوں کے درخت کاٹ کر پکایا گیا ہے غرض اسی طرح آپ نے بہت کچھ کہا اور ایسی فصیح و بلیغ تقریر کی کہ غازان آپ کی تکریم کرنے اور آپ کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا۔ آپ کا فوری مقصد یہ تھا کہ غازان فی الحال دمشق پر حملہ نہ کرے اور قیدی رہا کر دے۔ غازان نے آپ کے دونوں مطالبے مان لئے لیکن کہا مسلمان قیدی تو میں رہا کر دیتا ہوں لیکن عیسائی اور یہودی قیدی نہیں چھوڑوں گا لیکن آپ نے کہا واپس جاؤں گا تو سبھی کے ساتھ جاؤں گا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ ذمہ کے بارہ میں فرمایا ہے **لَهُمْ مَا لَنَا وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَيْنَا**۔ آخر غازان نے آپ کا یہ مطالبہ بھی مان لیا اور وفد کامیاب و کامران واپس دمشق آ گیا۔ اہل دمشق کو برابر یہ اطلاعیں مل رہی تھیں کہ تاتاری لشکر تاڑ میں ہے۔ موقع ملنے پر ضرور دمشق پر حملہ کرے گا۔ اس لئے امام ابن تیمیہ لوگوں کو جہاد کے لئے برابر تیار کرتے رہے۔ ضروریات جہاد کا جائزہ لیا گیا اِدھر دمشق کے لوگوں نے امام ابن تیمیہ پر زور دیا کہ وہ مصر جائیں اور وہاں کے امیر الناصر کو شام کی مدد کرنے پر آمادہ کریں۔ چنانچہ امام صاحب کی سفارت کامیاب رہی اور ایک بھاری لشکر کے ساتھ شام کی طرف کوچ کیا۔ تاتاری لشکر نے اس دفعہ حملہ نہ کیا لیکن ۷۰۲ھ میں پوری تیاری کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ اِدھر شام اور مصر کا لشکر بھی پوری طرح تیار تھا۔ دمشق کے علماء اور امراء نے تخت یا تختہ کے حلف اٹھائے عوام کے حوصلے بڑھائے۔ امام ابن تیمیہ نے علماء کی قیادت کی اور بذاتِ خود لڑائی میں عملی

حصّہ لیا آخر یہ متحدہ طاقت تاتاریوں کے ساتھ پوری قوت سے ٹکرائی اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے تاتاری لشکر کو شکست فاش دی اور پہلی دفعہ لوگوں کے دلوں سے یہ ڈر نکالا کہ تاتاری لشکر ناقابل شکست بلا ہے۔[1]

دمشق کے قریبی پہاڑوں میں ایک اور مسلمان دشمن طاقت بھی تھی۔حسن بن صباح کے بقیۃ السیف۔یہ لوگ نام کے مسلمان تھے۔اَلْحَشاشِیّین یا جَبَلِیّہ کے نام سے مشہور تشیع اور تصوف کا ملغوبہ تھے۔پہلے صلیبیوں کی انہوں نے مدد کی تھی اور اب تاتاریوں کے جاسوس بنے ہوئے تھے وہ موقع ملنے پر مسلمان دیہات پر حملہ آور بھی ہوتے،لوٹ مار کرتے اور پھر پہاڑوں میں جا چھپتے۔قبرص کے عیسائیوں کے ساتھ ان کا گٹھ جوڑ تھا خفیہ حملہ کر کے مسلمانوں کا اسلحہ اور ان کے گھوڑے ان کی عورتیں اور ان کے بچے پکڑ لیتے اور قبرص کے عیسائیوں کے پاس بیچ دیتے۔اس اندرونی دشمن کا قلع قمع بھی ضروری تھا۔چنانچہ امام ابن تیمیہ نے الناصر کی اجازت سے اَلْحَشاشِیّین پر حملہ کیا اور ان کی طاقت کو پوری طرح کچل دیا۔آپ نے وہاں کے پہاڑی جنگل بھی کٹوا دیئے جہاں یہ لوگ چھپ جایا کرتے تھے۔[2]

یہ زمانہ مسلمانوں کے مصائب کی انتہا کا زمانہ تھا۔اندلس میں مسلمانوں کی حکومت آخری دموں پر تھی۔مشرق میں تاتاری غالب آ گئے تھے۔مصر،شام اور فلسطین ابھی صلیبیوں کے تباہ کن حملوں سے سنبھل نہ پائے تھے۔مسلمانوں کا اندرونی انتشار بھی انتہا کو پہنچا ہوا تھا مختلف فرقوں کے باہمی تعصب نے بڑی خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔اس دردناک حالت کے کئی مؤرخوں نے مرثیے لکھے ہیں۔چنانچہ ابن الاثیر ایک نثری مرثیہ میں لکھتے ہیں کہ کاش مجھے ماں نہ جنتی یا اُمّت مسلمہ کے یہ دردناک حالات لکھنے کے لئے میں زندہ نہ ہوتا۔ایک مؤرخ کی حیثیت سے مجھے یہ دردناک قصّہ لکھنا پڑ رہا ہے ورنہ میرا دل خون کے آنسو بہا رہا ہے۔[3]

---

[1] محاضرات صفحہ ۴۸۰ [2] محاضرات صفحہ ۴۸۱

[3] یقول ابن الاثیر لیت امی لم تلدنی لیت مت قبل ھذا و کنت نسیا منسیا ...... فمن ذا الذی یسھل علیہ ان یکتب نعی الاسلام و المسلمین و من ذا الذی یھون علیہ ذکر ذالک ...... فلو قال قائل ان العالم مذخلق اللہ سبحانہ و تعالیٰ آدم الی الان لم یبتلوا بمثلھا لکان صادقاً. (محاضرات صفحہ ۴۸۵تا۴۸۷)

ان حالات میں امام بن تیمیہ نے دینی بگاڑ کو سنوارنے کی کوشش کی۔بدعات اور رسوم کے خلاف جہاد کیا۔باطنی توہمات کے ازالہ کی کوشش کی لیکن حالات اس قدر بگڑ چکے تھے کہ آپ کی کوششیں کما حقہ بارآور نہ ہوسکیں۔اس ناکامی کی ایک وجہ آپ کی طبیعت کی تیزی بھی تھی۔لوگوں کے بزرگوں پر آپ کی تنقید بڑی سخت ہوتی تھی۔اس شدّت کی وجہ سے آپ کی کوششوں کا اثر صرف اہل علم طبقہ تک محدود رہا تھا۔

امام ابن تیمیہؒ کا مسلک

عقائد میں آپ سلفی تھے تاویل اور مجاز کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔دینی مسائل میں آپ ظاہر مفہوم کو ترجیح دیتے تاویل سے دور بھاگتے مثلاً اِسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ کے بارہ میں کہتے اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھے ہیں بیٹھنے کی کیفیت نامعلوم ہے۔کرسی کا وجود ہے لیکن اس کی کیفیت مجہول ہے۔ اللہ تعالیٰ کا چہرہ اور ہاتھ ہیں، لیکن کیفیت سے ہم بے خبر ہیں۔اللہ تعالیٰ کی رُویت ممکن ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے اللہ تعالیٰ آسمان اول پر نزول اجلال فرماتے ہیں۔غرضیکہ اس قسم کے مسائل کے بارہ میں وہ کسی تاویل کے قائل نہ تھے۔

صوفیاء کے اکثر نظریات کو وہ توہمات، شطحیات اور خلافِ شریعت سمجھتے تھے۔صوفیاء کے نظریہ اتحاد واباحت اور ان کے خوارق یعنی شعبدہ بازی کو کفر قرار دیتے تھے۔قبر پرستی کے سخت خلاف تھے اس تشدد نے ان کو اس حد تک پہنچا دیا کہ زیارت قبور کے جواز کا بھی انکار کر دیا یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضۂ مبارک کی زیارت کے لئے جانے کو بھی جائز نہ سمجھتے تھے گویا حضورؐ کے فرمان کی محبت نے جذباتی محبت پر غلبہ پالیا تھا۔وہ اس حدیث سے استدلال کیا کرتے تھے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مساجد بنالیا ہے'' ایک اور حدیث بھی آپ کے پیش نظر تھی وہ یہ کہ حضرت عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب سے روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضۂ مبارک کی طرف ایک شخص کو آتے جاتے دیکھا تو فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری قبر کو عید اور خانقاہ نہ بناؤ جہاں کہیں بھی تم ہو

تمہارا دُرود مجھے پہنچ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں روضہ کے پاس کھڑا ہوا شخص اور اندلس میں رہائش پذیر شخص دونوں برابر ہیں۔[1]

بعض مسائل فقہیہ کے بارہ میں بھی آپ کا موقف مذاہب اربعہ کے موقف سے مختلف تھا جس کی وجہ سے مقلّد علماء آپ کے سخت مخالف ہو گئے مثلاً:

طلاق بِالْیَمِیْن یا طلاق معلّق کے جواز کے آپ قائل نہ تھے یعنی اگر کوئی یہ کہے کہ اگر مَیں نے فلاں کام کیا تو میری بیوی کو طلاق۔ آپ کے نزدیک اگر وہ یہ کام کر بھی لے تو اُس کی بیوی کو طلاق نہ ہوگی۔ اس کے لئے انہوں نے ائمہ اہل بیت کی روایات سے استدلال کیا جو کہ اس قسم کی طلاق کے قائل نہ تھے۔

اسی طرح بیک وقت دی ہوئی تین طلاق کو وہ ایک طلاق قرار دیتے تھے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اسے ایک طلاق سمجھا جاتا تھا اور یہ کہ قرآن کریم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ آپ حیض کی حالت میں دی ہوئی طلاق کو لغو اور بے اثر قرار دیتے تھے۔ آپ کے اس قسم کے نظریات کی وجہ سے شور بڑھ گیا۔ علماء نے آپ کے خلاف فتوے دیئے اور حکام نے علماء اور عوام کی شورش سے ڈر کر آپ کو قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ آپ کے جسم کو تو قید کیا گیا لیکن وہ آپ کے نظریات اور آپ کی تحریرات کو قید نہ کر سکے۔ آپ کے عقیدت مند برابر کسی نہ کسی طرح قلعہ میں پہنچتے اور آپ کے خیالات اور آپ کے رشحاتِ قلم کی اشاعت میں کوشاں رہتے۔ اس صورت حال سے چڑ کر علماء نے شور مچایا اور امیر شہر کو مجبور کیا کہ آپ کے پاس کسی کو نہ جانے دیا جائے اور آپ سے قلم دوات لے لی جائے کسی قسم کا کوئی کاغذ بھی اندر نہ جانے پائے۔

یہ پابندی آپ کے لئے ناقابل برداشت تھی لیکن سب کچھ خدا کی خاطر تھا اُس کی تقدیر پر آپ راضی تھے۔ آپ کی آخری تحریر کہیں سے حاصل کردہ کوئلہ سے لکھی ہوئی آپ کی وفات کے بعد ملی۔ یہی سختیاں جھیلتے جھیلتے آپ ۷۲۸ھ میں جبکہ آپ کی عمر ستاسٹھ سال تھی اپنے ربّ کے حضور حاضر ہو گئے۔ آپ کا جنازہ قلعہ سے باہر لایا گیا۔ ایک خلقِ کثیر نے آپ کی نماز جنازہ پڑھی اور

[1] محاضرات صفحہ ۴۶۸

اپنے آزاد منش امام کو آخری سلام پیش کیا۔[1] فَلِلّٰہِ الْاَمْرُ اَوَّلًا وَآخِرًا وَ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم۔

امام ابن تیمیہؒ کی کتب

امام ابن تیمیہ بہت لکھنے والے کثیر التصنیف بزرگ تھے۔ بلا مبالغہ ہزاروں صفحات لکھے۔ بعض نے آپ کی چھوٹی بڑی پانچ سو[2] کے قریب کتب شمار کی ہیں جن میں کئی طبع ہو چکی ہیں۔ آپ کی بعض کتب کے نام یہ ہیں۔

منہاج السُنّة ۔ رَفْعُ الْمَلَام عَنِ الْاَئمةِ الْاَعْلَام ۔ معارج الوصول الحسبة فی الاسلام۔ الجوامع فی السیاسة الالٰھیة ۔ السیاسة الشرعیة الواسطة وفصل المقال۔ الرسالة التدمیریة ۔ الجواب الصحیح لمن بدل المسیحَ رَدّ المنطقیِّین ۔ الحمویة الکبریٰ ۔ الوسیلة ۔ القواعد (یہ مختلف مسائل کے بارہ میں آپ کے نوٹ ہیں)۔ **الرسائل** (یہ مختلف آمدہ سوالوں کے جواب ہیں)۔

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد (متوفی ۷۴۴ھ) نے آپ کی سوانح عمری لکھی جس کا نام "**العقود الدُّرِیة**" ہے۔ اس میں آپ کی کتابوں کی جو فہرست دی ہے وہ اکتالیس صفحات پر مشتمل ہے اور ساتھ ہی لکھا ہے کہ یہ ایک مختصر فہرست ہے ورنہ آپ کی تحریرات اس سے زیادہ ہیں۔

آپ کے فتاویٰ جو فتاویٰ امام ابن تیمیہ کے نام سے مطبوعہ ہیں کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔

امام ابن تیمیہ کا درس بھی بڑا مشہور اور مقبول تھا۔ سینکڑوں لوگ آپ کے علم سے سیراب ہوئے۔ آپ کے شاگرد امام ابن القیم نے تو عالمگیر شہرت حاصل کی اور آپ کے صحیح جانشین اور نائب قرار پائے۔

---

[1] قیل شھد جنازتہ مِأَتَا الف رجل و خمسة عشر الف امراۃ۔ (ابن القیم الجوزیہ صفحہ ۳۶)

[2] ابن القیم الجوزیہ صفحہ ۱۲

حضرت امام ابن القیّم

شمس الدین محمد بن ابی بکر المعروف با بن القیّم الجوزیہ ۶۹۱ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد دمشق کے مشہور مدرسہ الجوزیہ کے قیّم اور نگران تھے جس کی وجہ سے آپ نے ابن القیم الجوزیہ کے نام سے شہرت پائی۔ آپ کی وفات ۷۵۱ھ میں ہوئی۔ اس لحاظ سے آپ کی عمر ساٹھ سال کے قریب بنتی ہے۔ یہ زمانہ مصر کے ممالیک کی حکومت کا تھا جو ۹۲۲ھ یعنی عثمانی ترکوں کی فتح مصر تک ممتد ہے۔ اسی زمانہ میں علامہ ابن حجر عسقلانی بھی ہوئے ہیں جو اپنی کثرت تصانیف کی وجہ سے مشہور زمانہ ہیں۔

حفظ قرآن کریم کے بعد ابن القیّم نے علومِ مروّجہ کی تحصیل متعدد اساتذہ سے کی جن میں سے سب سے زیادہ اثر آپ نے امام ابن تیمیہ سے لیا۔ ابن القیم اپنی مختلف کتابوں میں اپنے اس استاد کا ذکر بڑے احترام اور ادب سے کرتے ہیں۔ آپ نے اپنے استاد کے ساتھ قید و بند کی صعوبتیں بھی اُٹھائیں چنانچہ ان کی وفات کے وقت آپ بھی قلعۂ دمشق میں قید تھے۔

امام ابن القیّم حنبلی فقیہ تھے اس لئے علمی مہارت کے ساتھ ساتھ دینیات میں کتاب وسنت سے باہر جانا بالکل گوارا نہ تھا۔ فتویٰ دیتے وقت ہمیشہ اپنے استاد کی اس نصیحت کو مدنظر رکھتے کہ **اِیَّاکَ اَنْ تَتَکَلَّمَ فِیْ مَسْئَلَۃٍ لَیْسَ لَکَ فِیْھَا اِمَامٌ** یعنی نص کے بغیر کسی مسئلہ کے بارہ میں محض اپنی رائے کی بنا پر گفتگو کرنے سے ہمیشہ بچتے رہو۔ نص پر اعتماد حدیث کو مقدم کرنا۔ صرف مجبوری کی صورت میں قیاس سے کام لینا حنبلی مذہب کی خاص خصوصیت ہے اور امام ابن القیّم اس خصوصیت کا نمونہ تھے یہی وجہ ہے کہ ابن تیمیہ اور ابن القیّم اور ان کے لائق شاگردوں کی وجہ سے اس زمانہ یعنی آٹھویں صدی میں شام کے علاقہ میں حنبلیوں کا خاصہ زور تھا۔ دولت عثمانیہ ترکیہ کے زمانہ میں کہیں جا کر یہ زور ختم ہوا۔

ابتدائے جوانی میں ہی جبکہ آپ کے کئی اساتذہ ابھی زندہ تھے جن میں ابن تیمیہ بھی شامل تھے امام ابن القیّم نے درس وتدریس اور افتاء کا فریضہ سرانجام دینا شروع کر دیا تھا۔ آپ کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عربی زبان اور اُس کے قواعد میں بھی بڑے ماہر تھے

وہ جزالت عبارت کے ساتھ ساتھ مسائل کے استنباط میں بھی اس مہارت سے خوب کام لیتے۔[1]

امام ابن القیم صوفی مزاج، ٹھنڈی اور بڑی میٹھی طبیعت کے مالک تھے۔ تقریر و تحریر دونوں میں اس کا اثر ملتا ہے۔ اس کے برعکس آپ کے اُستاد امام ابن تیمیہ بہت تیز طبیعت تھے۔ مخالفین کے بارہ میں تنقید کرتے ہوئے سخت الفاظ استعمال کرنے میں بڑے جری تھے۔ یہی وجہ ہے کہ استاد کے مخالف شاگرد کی نسبت زیادہ تھے تاہم اپنی جگہ شاگرد کی بھی سخت مخالفت ہوئی لیکن آپ کسی قسم کی مخالفت کی پروا کئے بغیر راہِ حق پر رواں دواں رہے اور قید و بند کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔

آپ کے بے شمار شاگرد تھے جن میں سے ابن کثیر صاحب ''**البدایہ و النہایۃ**'' اور ابن رجب صاحب ''**طبقات الحنابلہ**'' بہت زیادہ مشہور ہیں۔

امام ابن قیِّم اور عبادت

امام ابن القیم کثرت مشاغل کے باوجود بڑے عبادت گزار تھے۔ کثرت کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کرتے۔ تہجد اور نوافل بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرتے۔[2]

امام ابن قیِّم کا مسلک

امام ابن القیم اگرچہ مسلکاً حنبلی تھے لیکن دلائل کی بنا پر اگر ضروری سمجھتے تو مخالفت بھی کرتے۔ کئی فقہی مسائل میں آپ نے اختلاف کیا۔ آپ کی رائے تھی کہ گواہ کا معتبر اور ثقہ ہونا اصل ہے اس لئے اگر یہ شرط موجود ہو تو والد بیٹے کے حق میں اور بیٹا والد کے حق میں گواہی دے سکتا ہے اور یہ گواہی مقبول ہونی چاہیے۔ جبکہ حنبلی ایسی گواہی کو درست تسلیم نہیں کرتے۔

بیک وقت دی ہوئی تین طلاق کو آپ ایک رَجعی طلاق قرار دیتے تھے۔ آپ کا مسلک تھا

---

[1] علامہ ابن الحجر اور علامہ شوکانی نے ان کے بارہ میں لکھا ہے۔ ما راینا اوسع منہ علمًا و لا اعرف بمعانی القرآن و الحدیث و السنۃ و حقائق الایمان منہ و قال معاصرہ برھان الدین الزرعی ما تحت ادیم السماء اوسع علمًا منہ۔ (ابن القیم الجوزیۃ صفحہ ۴۱، ۴۳ بحوالہ الدرر الکامنۃ جلد ۲ صفحہ ۲۱۔ البدر الطالع جلد ۲ صفحہ ۱۴۳۔ شذرات الذھب جلد ۶ صفحہ ۱۶۹)

[2] یقول تلمیذہ ابن کثیر۔ کان ملازمًا للاشتغال لیلًا و نھارًا کثیر الصلٰوۃ و التلاوۃ۔ حسن الخلق کثیر التودّد لا یحسد ولا یحقد (ابن القیم الجوزیۃ صفحہ ۴۹)

کہ سوائے دوصورتوں کے ہر طلاق رَجْعِی ہوتی ہے یعنی خاوند عدّت کے اندر رجوع کر سکتا ہے۔ ان دوصورتوں میں سے پہلی صورت یہ ہے کہ رخصتانہ سے پہلے طلاق دی جائے یہ طلاق بائن ہوگی اور خاوند کو رجوع کا حق نہ ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خاوند حسبِ شرائط تیسری طلاق دے اس کے بعد خاوند کو نہ رجوع کا حق ہوگا اور نہ نکاح کا۔ جب تک کہ حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ کی شرط پوری نہ ہو۔

حضرت عمرؓ کے فیصلہ کے بارہ میں آپ کا موقف یہ تھا کہ آپ کا یہ حکم صرف تعزیر اور سزا کے طور پر تھا اور صرف اس صورت میں تھا جبکہ خاوند نے رخصتانہ سے پہلے طلاق دی ہو اور تین بار کہا ہو کہ تجھے طلاق، تجھے طلاق، تجھے طلاق۔ یہ نکاح جیسے مقدس معاہدہ کے ساتھ کھیل تھا اور حضرت عمرؓ نے اس کھیل سے لوگوں کو باز رکھنے کے لئے یہ سزا تجویز کی تھی کہ ایسے شخص کو دوبارہ اس عورت سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی یہ موقف آپ نے اُس حدیث کی بنا پر اختیار کیا جو حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔[1]

آپ کا یہ موقف بھی حنبلی مذہب بلکہ باقی تینوں مذاہب کے خلاف تھا۔ طلاق معلّق کے بارہ میں بھی آپ کا موقف مذاہب اربعہ کے موقف کے خلاف تھا اور آپ کی رائے تھی کہ ایسی طلاق لغو اور غیر مؤثر ہے۔

حدیث کی بنا پر آپ کا یہ موقف بھی تھا کہ اگر ایک شخص اقرار کرے کہ اُس نے فلاں عورت کے ساتھ زنا کیا ہے جبکہ وہ عورت انکار کرتی ہو تو اس شخص کو صرف زنا کی سزا دی جائے گی قذف کی سزا نہ ملے گی۔

اس موقف میں آپ نے حنفیوں کی بھی مخالفت کی ہے کیونکہ ان کے نزدیک ایسے شخص پر زنا کی سزا جاری نہ ہوگی اور اُن فقہاء کی بھی مخالفت کی ہے جو کہتے ہیں کہ ایسے شخص کو زنا اور قذف دونوں جرموں کی سزا دی جائے گی۔

آپ کی رائے تھی کہ سوائے تین مساجد یعنی بیت الحرام۔ مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے کسی اور جگہ محض زیارت اور ثواب کی نیّت سے جانا جائز نہیں۔

---

[1] ابن القیم الجوزیۃ صفحہ ۱۵٦ (بحوالہ زاد المعاد جلد ۴ صفحہ ٦١)

امام ابن قیّم کی کتب

جیسا کہ ذکر آچکا ہے امام ابن القیّم کثیر التصنیف تھے۔ آپ نے بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھیں جن میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں۔

اعلام الموقعین عن رب العالمین ۔ التّبیان فی اقسام القرآن ۔ زادالمعاد فی ھدی خیر العباد (سیرت نبوی کی بہترین کتاب ہے واقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ فقہی مسائل اورنتائج کی طرف بھی اشارے کرتے جاتے ہیں اس لحاظ سے آپ کا یہ انداز سابقہ لکھی گئی سیرت کی کتابوں سے نرالا ہے)۔ **شفاء العلیل فی مسائل القضاء و القدر و الحکمۃ و التعلیل۔ الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ ۔ بدائع الفوائد۔ کتاب الفواعد المشرق الی علوم القرآن و علم البیان ۔ الرُّوح ۔ مدارج السالکین۔ الطِّبُّ النّبوی ۔ ھدایۃ الحیاریٰ من الیھود والنصاریٰ ۔مسائل ابن تیمیہ**

علاوہ ازیں اوربھی آپ کی تصنیف کردہ کتابیں ہیں جن میں سے بعض ابھی طبع نہیں ہوئیں ۔

ظاہری مذہب اور اس کے بانی

ظاہری مذہب سے مراد ''فقہ'' سے متعلق یہ نظریہ ہے کہ شرعی احکام کی بنیاد صرف نصوص ہیں۔[۱] اس کے لئے کسی قیاس، مصالح مرسلہ یا دوسرے ذرائع استنباط کی ضرورت نہیں۔ سارے مسائل زندگی نصوص سے حل ہوسکتے ہیں اور اگر کسی مسئلہ کے بارہ میں کوئی واضح نص نہ مل سکے تو پھر اس شرعی اصل سے کام لینا چاہیے کہ شرعاً ہر چیز مباح اور جائز ہے سوائے اس کے کہ نص نے اس سے منع کر دیا ہو۔ اس اصل کا شرعی نام **استصحاب** ہے اور اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان کی جاچکی ہے۔ **استصحاب** کے اصل کی بنیاد قرآن کریم کی جن آیات پر ہے ان میں سے دو یہ ہیں:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا [۲] کہ جو کچھ زمین میں ہے وہ سب اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ [۳] کہ تمہارے لئے اُس نے مقدّر کیا ہے کہ وفات تک تم اس زمین میں رہو گے اور اس سے اپنا سامانِ زندگی حاصل کرو گے۔

اس نظریہ کے بانی داؤد بن علی الاصبہانی تھے۔ ان کے بعد اس مسلک کے سب سے بڑے حامی اور شارح ابن حزم الاندلسی ہیں جو پانچویں صدی کے فقیہ اور مجتہد تھے۔

---

۱ لا علم فی الاسلام الا مِنْ نصٍّ (محاضرات صفحہ ۳۷۶)　۲ البقرۃ:۳۰　۳ البقرۃ:۳۷

حضرت امام داؤد بن علی الظّاہری الاصبہانی

امام داؤد بن علی ۲۰۲ھ میں اصبہان میں پیدا ہوئے۔ اصبہان فارس کا ایک مردم خیز اور مشہور شہر ہے۔ آپ نے امام شافعی کے شاگردوں سے تعلیم حاصل کی۔ پہلے شافعی المسلک تھے۔ پھر مستقل فقہی نظریہ کے بانی بنے جو بعد میں ''ظاہری مذہب'' کے نام سے مشہور ہوا اور اسی نسبت سے امام داؤد کو الظاہری کہا جاتا ہے۔[1]

امام داؤد الظاہری بہت بڑے محدّث تھے۔ ان کی فقہی کتب بھی احادیث کا مجموعہ لگتی ہیں۔ امام داؤد بوجوہ خلق قرآن کے نظریہ کے بھی قائل تھے وہ کہا کرتے تھے اِنَّ القُرآنَ الَّذِیْ بِاَیْدِیْنَا مَخْلُوْقٌ۔ اس نظریہ کے اظہار کی وجہ سے ان کی مقبولیت کم ہوگئی۔ عام علماء اور عوام انہیں ناپسند کرنے لگے اور اُن سے حدیث کا سماع ترک کر دیا۔

امام داؤد ظاہری نے بڑی کوشش کی کہ وہ امام احمد کے شاگرد بنیں اور اُن سے حدیث پڑھیں لیکن خلق قرآن کے اس عقیدہ کی وجہ سے امام احمد ان کو اپنا شاگرد بنانے پر راضی نہ ہوئے اور انہیں اپنے درس میں بیٹھنے کی اجازت نہ دی۔[2]

امام داؤد بڑے قوی الحافظہ، فصیح اللسان اور بڑی جرأت والے بزرگ تھے، دل کی بات کہنے میں کسی سے نہ ڈرتے، ہر مشکل اور مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے، عبادت اور قناعت آپ کا امتیازی وصف تھا۔ ۲۷۰ھ میں وفات پائی۔[3]

آپ کی کتب جو احادیث اور آثار سے پُر ہیں ایک زمانہ میں بڑی مقبول ہوئیں۔ آپ کے بیٹے ابوبکر محمد بن داؤد خود بڑے محدّث تھے اور اپنے والد کے مسلک کے فروغ اور اس کی اشاعت میں دن رات مصروف رہتے تھے۔ آپ کے دوسرے شاگرد بھی بڑے لائق اور مخلص تھے۔ وہ بھی ظاہری مسلک کی اشاعت کا باعث بنے اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ مشرق میں داؤد ظاہری کا مسلک حنفی، مالکی اور شافعی کے ساتھ چوتھا فقہی مذہب شمار ہونے لگا لیکن پانچویں صدی میں وہ حنبلی علماء کے

---

[1] قال الخطیب البغدادی ہو اول من نفی القیاس فی الاحکام قولاً واضطر الیہ فعلاً و سماہ الدلیل۔ تاریخ بغداد جلد ۸ صفحہ ۳۷۴

[2] محاضرات صفحہ ۲۷۷ [3] الامام الشافعی صفحہ ۲۰۱

مقابلہ میں شکست کھا گیا۔ امام احمد کے پیرو غالب آ گئے اور چوتھا فقہی مذہب حنبلی تسلیم کر لیا گیا۔

اُس زمانہ میں جبکہ مشرق میں ظاہری مذہب مٹ رہا تھا اندلس میں اس کے فروغ کے لئے امام ابن حزم انتھک کوشش کر رہے تھے اور اس کی تائید میں زبردست لٹریچر تیار کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ظاہری مذہب کو اگرچہ کہیں بھی عددی اکثریت و اہمیت حاصل نہ ہو سکی لیکن اُس کی علمی اہمیت اور طاقت کو سب نے تسلیم کیا اور اس کا سہرا امام ابن حزم کے سر ہے جنہوں نے اس مسلک کی تبیین اور توضیح کے لئے زبردست علمی لٹریچر مہیا کیا اور آپ کی کتابیں آج بھی حق پسند علماء کی طرف سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہیں اور جہاں تک **فقہِ نصوص** کا تعلق ہے امام ابن حزم کی تحریرات کا کوئی جواب نہیں۔

حضرت امام ابن حزم الظّاہریؒ

امام علی بن احمد بن سعید بن حزم ۳۸۴ھ میں قرطبہ (اندلس) میں پیدا ہوئے۔ آپ فارسی الاصل تھے[1]۔ آپ کے والد احمد اندلس کی اُموی حکومت میں وزارت کے عُہدہ پر فائز تھے اور خاندان بڑا مال دار اور فارغ البال تھا۔ لائق بیٹے نے حصولِ علم کے لئے خوب محنت کی، ذہن بھی بڑا رسا پایا تھا۔ سب سے پہلے گھر کی خادماؤں سے قرآن کریم حفظ کیا اور اُن سے لکھنا پڑھنا سیکھا اور انہی کی نگرانی میں پلے بڑھے۔ اس کے بعد علاّمہ ابوالحسن بن علی الفاسی سے پڑھنا شروع کیا۔ ابوالحسن بڑے پرہیز گار عالم باعمل اور ماہر تعلیم بزرگ تھے۔ ابن حزم اُن کی تعلیم وتربیت سے بہت متاثر ہوئے۔ پرہیز گاری اور قناعت کا سبق انہی سے سیکھا اور ان کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللسان رہے[2]۔ ابوالحسن کے علاوہ اندلس کے دوسرے سربرآوردہ علماء سے بھی پڑھا اور بہت جلد ماہر علوم اور یگانۂ روزگار بن گئے۔

چونکہ ابن حزم کا خاندان اموی الہوٰی اور امویوں کے اقتدار میں حصّہ دار تھا اس لئے سیاسی خلفشار اور اقتدار جلد جلد بدلنے کی وجہ سے آپ کے خاندان کو بھی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا اور اس سے ابن حزم کا متاثر ہونا بھی لازمی تھا۔ آپ اور آپ کا خاندان اُمویوں کے عروج وزوال میں برابر کے شریک رہے اور پرانے آبائی تعلقات کو ہمیشہ قائم رکھا۔ اگر اقتدار میں حصہ دار رہے تو زوال اور بدحالی میں بھی ساتھ نہ چھوڑا اور نہ اپنی وفاداری پر کبھی کوئی حرف آنے دیا۔

دوسری طرف مالکی علماء امام ابن حزم کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے آپ کو کہیں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ اگرچہ امام ابن حزم بڑے جری اور کسی سے دَبنے والے نہیں تھے اور برابر کا جواب دیتے تھے لیکن عددی اکثریت کی وجہ سے مالکی علماء ہی کی مانی جاتی تھی اور آپ کے حامی اُموی برسرِاقتدار بھی نہیں رہے تھے۔ اس لئے مالکی علماء کے اُکسانے پر اندلس کے امیر نے آپ کو

---

[1] كان جده الاعلى مولى ليزيد بن ابى سفيانؓ اخى معاويةؓ و على هذا هو قرشىٌّ بالولاء فارسىٌّ بالعنصر (محاضرات صفحه ۳۸۴)

[2] كان يقول مارأيت مثله علمًا و عملًا و دينًا و ورعًا فَنَفَعَنِيَ اللّٰه به كثيرا (محاضرات صفحه ۳۸۵)

بہت تنگ کیا۔آپ کی کتابوں کو جلا دیا اور صرف وہی بچیں جواُن کے شاگردوں کے پاس ملک کے مختلف حصوں میں محفوظ تھیں۔[1] اس کے ساتھ ہی اُن کو مجبور کیا گیا کہ وہ شہر کی رہائش چھوڑ دیں چنانچہ وہ اپنے پیدائشی گاؤں جہاں ان کی زرعی زمین تھی چلے گئے لیکن علم کے پیاسے نوجوان طلبہ وہاں بھی پہنچے اور آپ کے علمی فیضان کو روکا نہ جا سکا۔

امام ابن حزمؒ کی آراء، ان کے شاگرد اور ان کی کتب

امام بن حزم کا مزاج عقلی بھی تھا اور نقلی بھی۔اسی وجہ سے آپ نے اس زمانہ کے ہر مروّجہ علم کو پڑھا اور ہر موضوع پر لکھا۔آپ کا موقف تھا کہ دنیوی علوم میں عقل کا دخل ہے اور اس کو انہیں علوم تک محدود رکھنا چاہیے۔مذہب و دین کا معاملہ وحی والہام سے ہے اس لئے دین کے بارہ میں صرف نقل قابل اعتماد ہے۔قرآن وحدیث میں جو کچھ آیا ہے اُسے من وعن بغیر کسی تاویل کے ماننا چاہیے۔اس میں عقل کے پیچھے چلو گے تو وہ تمہیں گمراہ کر دے گی۔پس نقل یعنی وحی والہام کو **معقولة المعنیٰ** قرار دینا اور احکام کی وجہ اور مصلحت تلاش کرنا بے معنے اور فضول بات ہے کیونکہ دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اُس نے یہ احکام کیوں نازل کئے اور یہ کس مصلحت پر مبنی ہیں حالانکہ **فَعَّالٌ لِمَا يُرِيْدُ** ہے وہ جیسا چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے حکم دیتا ہے وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں۔اسی نظریہ کے تحت امام بن حزم قیاس یا مصالح مرسلہ کو بطور شرعی اُصول کے تسلیم نہیں کرتے تھے اور نص کو اُس کے مورد تک ہی محدود رکھتے تھے مثلاً:

حدیث میں آیا ہے کہ انسان اگر کھڑے پانی میں پیشاب کر دے جبکہ پانی زیادہ نہ ہو تو پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔یہ بات انسانی پیشاب تک ہی محدود ہوگی کسی اور جانور حتیٰ کہ کتے اور سؤر کے پیشاب سے بھی پانی ناپاک نہ ہوگا اور اگر کہا جائے کہ پیشاب اور سؤر یعنی جوٹھا تو جانور کے گوشت کے تابع ہے جن جانوروں کا گوشت حرام ہے ان کا پیشاب اور سؤر بھی نجس اور پلید ہوگا تو وہ

[1] قد احرق امير الاندلس كتب ابن حزم ...... ويظهران الاحراق لم يكن لكل الكتب لان تلاميذه يكتبونها و ينسخونها فى كل مكان (محاضرات صفحه ۳۹۵)

جواب میں کہتے یہ ایک رائے ہے اور رائے کا دینیات میں کوئی دخل نہیں۔[۱] اس قسم کے شُذوذ کے باوجود امام ابن حزم کی کتب بڑی وَسِیْعُ الْاَذْیَال ہیں اور ان کے اعلیٰ علمی پایہ کا تمام حق پرست علماء نے اعتراف کیا ہے اور انہیں مصادر اسلام کا بہترین مجموعہ قرار دیا ہے۔

آپ کی فقہی نظریات پر مشتمل کتب کا ایک نقص نمایاں ہے اور اس کا سب علماء نے نوٹس لیا ہے کہ آپ نے بعض ائمہ کے بارہ میں بڑی سخت زبان استعمال کی ہے جس کا کوئی سنجیدہ مزاج محقق روادار نہیں ہوسکتا اور نہ اس کا کوئی جواز پیش کیا جاسکتا ہے۔[۲] بعض محققین نے اس درشتی کی وجوہات کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس سخت کلامی کی ایک وجہ تو خود ابن حزم نے لکھی ہے کہ

بچپن میں ان کو طحال (تلی) کی خرابی کا عارضہ لاحق ہوا جس کی وجہ سے بعض اوقات وہ اپنے غصہ کو پی نہیں سکتے تھے۔ بڑے مشتعل المزاج، قلیل الصبر اور ضِیْقُ الْخُلُق بن گئے تھے اور اپنے پر کنٹرول نہیں رکھ سکتے تھے۔ دوسرے بڑی سخت سیاسی مشکلات سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔ بار بار سیاسی انقلابات سے گزرے جس کی وجہ سے ان کے مزاج میں تیزی آ گئی تھی۔ تیسرے علماء وقت کی حد سے بڑھی ہوئی سراسر ضد پر مشتمل دشمنی تھی۔ وہ بار بار آپ کی علمی مشکلات کا باعث بنتے۔ انہی کی شورش کی وجہ سے آپ کی علمی کتب جلائی گئیں۔ یہ تلخی اُن کو اُکساتی تھی کہ ان علماء کے بزرگوں کی ہتک کر کے ان کے دل کو جلائیں اور اپنے دل کو ٹھنڈا کریں۔[۳]

ابن حزم کے مندرجہ ذیل شاگردوں اور عقیدت مندوں نے آپ کے خیالات کو عام کیا اور ان کی کتب کو پھیلایا۔

علامہ محمد بن ابی نصر الحمیدی: انہوں نے مشرقی علاقوں میں آپ کے خیالات کو پھیلایا نیز اَلْجَمْعُ بَیْنَ الصَّحِیْحَیْن کے نام سے بخاری اور مسلم کی احادیث کا بہترین مجموعہ تیار کیا جسے علماء نے بہت پسند کیا۔

۱۔ ذالک رائیٌ ولا رائیَ فی الدِّینِ (محاضرات صفحہ ۳۲۸و۴۳۲)

۲۔ قیل لسانُ ابن حزم و سیفُ الحجّاج صِنْوَان (الامام الشافعی صفحہ ۱۸۴)

۳۔ قیل ان ابن حزم عَلِمَ الْعِلْمَ و لم یعلم سیاسة العلم (محاضرات صفحہ ۳۹۸و۴۰۰)

آپ کے دوسرے مشہور شاگرد مجد الدین بن عمر ہیں جو ابن دِحیہ کے نام سے مشہور ہیں اور بڑے پائے کے فقیہ اور محدّث شمار ہوتے ہیں۔ آپ مشہور صوفی محی الدین ابن عربیؒ کے ہم عصر تھے۔ ابن عربی بھی عبادات میں ظاہری المذہب تھے اور اعتقادات اور الٰہیات میں باطنی النظر اور صوفی المشرب تھے۔

ابن دِحیہ کے زمانہ میں اندلس کا اقتدار مؤحدین کے ہاتھ میں تھا جن کے ایک امیر یعقوب بن یوسف بن عبد المؤمن نے ظاہری مذہب قبول کر لیا تھا۔ اس کے زمانہ میں مالکیوں پر خاصی سختی ہوئی۔[1]

امام ابن حزم نے دنیوی علوم کے بارہ میں جو کتب لکھیں ان میں عقلی استدلال سے خوب خوب اور بکثرت کام لیا ہے۔ ان کتب میں سے مندرجہ ذیل کافی مشہور ہیں۔

اَلْفَصْلُ بَیْنَ الآرَاءِ وَالْاَھْوَآءِ وَالنّحل۔ اس میں مختلف فرقوں کے نظریات اور ان کی آراء کو بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ اپنی طرف سے تنقید بھی کی ہے۔

کِتاب الاِمامۃ والسیاسۃ ۔ کتاب اخلاق النفس ۔ طَوق الحمامۃ۔ تحلیل نفسی اور اخلاق سے متعلق بڑی عمدہ بحث پر مشتمل ہے۔

مداوۃُ النفوس ۔ نفوس کی بیماریوں اور اُن کے علاج کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اخلاق کی فلسفیانہ توجیہ پیش کی گئی ہے۔ بحث کی بنیاد استقراء اور تتبع پر رکھی ہے اور ساتھ ساتھ فلاسفہ یونان کے نظریات کو بھی پیش کرتے گئے ہیں۔

نَقْلِیّات یعنی فقہی نصوص و مذاہب سے متعلق آپ کی مشہور کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

اَلْاَحکام فی اُصول الْاَحکام ۔ اس میں مذاہب فقھیہ کے اُصول کو زیر بحث لایا گیا ہے اور موازنہ پیش کر کے مسلک ظاہری کی تائید کی گئی ہے۔ اَلنُّبَذ اسی کتاب کا خلاصہ ہے۔

---

[1] ذکر صاحب کتاب المعجب امر یعقوب باحراق کتب مذھب مالک مثل مدونہ سحنون و واضحہ ابن حبیب وغیرھما من کتب المالکیۃ بعد ان جرد ما فیھا من احادیث رسول اللہ ﷺ والقران (محاضرات صفحہ ۴۳۷ ملخصا)

المحلّٰی ۔یہ دراصل فقہ اسلامی کا دائرۃ المعارف اور انسائیکلوپیڈیا ہے جسے بجا طور پر **دیوان الفقهيه** کا نام دیا گیا ہے ۔اس میں احکام سے متعلق تمام احادیث درج کر کے ساتھ ساتھ جملہ مذاہب **فقهيه** کی تفصیلات درج کی گئی ہیں ۔بڑی عظیم الفائدہ کتاب ہے۔

امام ابن حزم کی وفات اندلس کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں جو لبلبہ کے قریب تھا ۴۵۶ھ میں ہوئی ۔ایک روایت کے مطابق آپ کی پیدائش ۳۸۴ھ میں ہوئی اور وفات ۴۵۷ھ میں۔ اس لحاظ سے آپ کی عمر چوہتر سال کے قریب بنتی ہے۔[1] **وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ** ۔

---

[1] الامام الشافعی صفحہ ۱۸۴

حضرت امام اَللّیث بن سعد مصریؒ

لیث بن سعد ۹۳ھ میں پیدا ہوئے اور وفات ۱۷۵ھ میں ہوئی۔ آپ اصفہانی الاصل تھے۔ آپ کے آباءواجداد حضرت عمرو بن العاصؓ کے اُس لشکر میں شامل تھے جس نے مصر فتح کیا تھا۔ یہ لوگ فتح کے بعد مصر میں ہی رہ گئے۔ وہاں کے ایک زرخیز علاقہ کے قصبہ قلقشندہ میں ان کی زرعی اراضی تھیں۔ یہ علاقہ لطیف آب وہوا اور پھلوں کی کثرت کے لئے مشہور تھا۔ لیث خاصے خوشحال خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔[1] آپ نے اس وقت کے مصر کے سربرآوردہ علماء سے تعلیم حاصل کی اس کے بعد حجاز آئے۔ امام مالک سے اور مکہ کے علماء سے بھی استفادہ کیا۔ امام ابوحنیفہ سے بھی تبادلہ خیال رہا۔ غرض کہ سارے عالم اسلامی کے علوم سے واقفیت بہم پہنچائی۔[2] بہت بڑے عالم مانے جاتے تھے۔ امام شافعی ان کے بارہ میں کہا کرتے تھے کہ **لَيْثٌ اَفْقَهُ مِنْ مَالِكٍ اِلَّا اَنَّ اَصْحَابَهُ لَمْ يَقُوْمُوا بِهٖ** کہ لیث مالک سے زیادہ فقیہ تھے لیکن ان کے شاگرد اپنا فرض ادا نہ کر سکے اور اُن کے نظریات کو عام کرنے میں ناکام رہے۔[3]

امام مالک سے ان کی خط وکتابت تاریخ فقہ کا ایک اہم باب ہے انہوں نے امام مالک کے اس نظریہ پر تنقید کی کہ عملِ اہل مدینہ عالَمِ اسلام کے لئے حجت ہے۔ آپ کا کہنا تھا کہ ہزاروں صحابہؓ مدینہ منورہ سے باہر جا کر رہے۔ کوئی شام رہائش رکھتا تھا کوئی مصر میں اور کوئی عراق میں اور یہ سب اُمّتِ مسلمہ کے لئے اُسوہ تھے۔ مدینہ میں رہ جانے والے صحابہؓ کو اُن پر کوئی خاص علمی فضیلت نہیں تھی۔ پھر خود اہل مدینہ ایک دوسرے سے کئی باتوں میں اختلاف رکھتے ہیں۔ اگر وہ آپس میں اختلاف کر سکتے ہیں تو دوسرے علاقہ کے علماء اُن سے اختلاف کا اظہار کیوں نہیں

---

[1] كان لليث قرية بتمامها يجيء اليه خراجها فيعطي الناس منها (الامام الشافعي صفحه ۱۷۴)۔ الليث بن سعد فقيه مصر صفحه ۶۱

[2] الليث بن سعد صفحه ۷۰

[3] كان ليث بن سعد في مصر يملأ الارض علمًا بالسُّنَن و بالفقه طوال حياة مالك (مالک بن انس صفحه ۲۸۱)۔ و يقول الشافعي العلم يدور على ثلاثة مالك والليث و سفيان بن عيينه. (الامام الشافعي صفحه ۱۷۳)

کر سکتے اس ساری خط و کتابت میں ایک دوسرے کا ادب و احترام ملحوظ رہا اور یہ فقہی مسائل پر تبصرہ کا ایک نادر نمونہ ہے۔[۱]

امام مالک کے شاگرد ابن وہب کہا کرتے تھے **لَوْلَا مَالِکٌ وَاللَّیْثُ لَضَلَّ النَّاسُ** کہ مالک اور لیث نہ ہوتے تو لوگ فقہ کی بھول بھلیوں میں اُلجھ کر رہ جاتے۔[۲]

امام لیث بڑے سخی اور غنی النفس بھی تھے۔ ایک بار ہارون الرشید نے آپ کے فتویٰ سے خوش ہو کر ہزاروں درہم بطور نذرانہ پیش کئے۔ آپ نے یہ کہتے ہوئے قبول نہ کئے کہ یہ کسی غریب مستحق کو عنایت کئے جائیں انہیں اس رقم کی ضرورت نہیں۔[۳] ابو جعفر منصور نے مصر کی قضاء کا عہدہ آپ کو پیش کیا لیکن آپ نے معذرت کر دی۔ آخر اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ وہ وہاں کے والیوں اور قضاۃ کی نگرانی کریں گے۔[۴]

دن بھر میں بالعموم آپ کی تین مصروفیات تھیں۔ دن کے پہلے حصہ میں والئ مصر کے پاس جاتے اور مشاورت کا فریضہ سرانجام دیتے، دوسرے حصہ میں حدیث پڑھاتے، تیسرا حصہ لوگوں کی ضرورتوں کے پورا کرنے اور ان کی مدد کرنے میں صرف ہوتا۔[۵]

امام لیث حضرت امام مالک کی خدمت میں بکثرت تحائف بھجوایا کرتے تھے جن میں نقد رقم بھی ہوتی تھی۔ مالک بخوشی یہ تحفے قبول کرتے۔ آپ کے دل میں امام لیث کے خلوص، پیار اور دوستی کی بڑی قدر تھی۔[۶] آپ کو اہل مصر نے امام مصر کا خطاب دیا تھا جس کے آپ بجا طور پر مستحق تھے۔

۱۔ اللیث بن سعد فقیہ مصر صفحہ ۷۸ و ۱۳۱ بحوالہ اعلام الموقعین لابن القیم جلد ۳ صفحہ ۹۵۔ مالک بن انس صفحہ ۱۱۹ تا ۱۲۱ مع حاشیہ

۲۔ الامام الشافعی صفحہ ۱۷۳ مع حاشیہ و صفحہ ۲۴۱

۳۔ الامام الشافعی صفحہ ۱۷۵

۴۔ اللیث بن سعد صفحہ ۷۵، ۷۶ بحوالہ تاریخ بغداد للخطیب جلد ۱۳ صفحہ ۵۰۴

۵۔ الامام الشافعی صفحہ ۱۷۳۔ اللیث بن سعد صفحہ ۸۵

۶۔ اللیث بن سعد صفحہ ۸۳، ۸۴

حضرت امام ابن جریر طبریؒ

امام ابوجعفر محمد بن جریر الطَّبری ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔ امام شافعی کے فکری شاگرد تھے۔ حصول علم کے لئے مصر بھی گئے۔ وہاں امام شافعی کے شاگرد امام مُزَنی اور وہاں کے دوسرے علماء سے بہت کچھ حاصل کیا۔ بڑے قوی الحافظہ ماہر علوم، محدّث، مفسر اور بڑے پایہ کے مؤرخ تھے۔ پہلے امام داؤد ظاہری کی طرح شافعی المذہب تھے۔ پھر اپنے نئے مسلک کی بنا پر خود صاحبِ مذہب بنے اور نئے فقہی مسلک کے امام کہلائے۔ آپ نے تفسیر میں بے نظیر کتاب لکھی جو ''تفسیر ابن جریر'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس تفسیر کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ اسے حاصل کرنے کے لئے چین بھی جانا پڑے تو مہنگا سودا نہیں ہے۔ اس تفسیر کا پورا نام ''**جامع البیان فی تفسیر القرآن**'' ہے اور تفسیر بالروایت والنصوص کا بڑا نادر مجموعہ ہے۔

امام ابن جریر بڑے لکھنے والے مصنف تھے۔ ان کی تحریرات کا اگر جائزہ لیا جائے تو اندازاً چالیس صفحے روز کے بنتے ہیں۔ تفسیر کے علاوہ آپ نے کئی اور کتب بھی لکھیں جن میں سب سے زیادہ مشہور تاریخ کی محیّر العقول کتاب ''**تاریخ الامم والملوک**'' ہے جو قبل از اسلام اور بعد از اسلام کے واقعات اور حوادث کا بہترین مجموعہ ہے۔ اور بعض حلقوں میں تاریخ عالم کی اصدق ترین کتاب مانی جاتی ہے۔[1]

امام ابن جریر بڑے غضب کے مناظر بھی تھے۔ امام شافعی کے شاگرد الزعفرانی کو کئی بار مناظرہ میں ہرایا۔ امام داؤد ظاہری پر غلبہ پایا۔ آپ نے اپنے فقہی مسلک کی وضاحت کے لئے ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام ''**لطیف القول فی احکام الشرائع الاسلام**'' ہے۔ دوسرے تمام فقہاء کے برخلاف آپ اس بات کے قائل تھے کہ عورت تمام معاملات میں جج اور قاضی بن سکتی ہے۔[2]

امام ابن جریر طبری کی یہ رائے بھی تھی کہ امام احمد بن حنبل محدّث ہیں فقیہ نہیں۔ آپ نے ایک

---

[1] هو من اصدق كتب التاريخ عن العالم القديم يتفق ما فى تواريخ الروما واليونان (الامام الشافعى صفحه ۲۰۲)

[2] الامام الشافعى صفحه ۲۰۲

کتاب ''اختلاف الفقهاء ''لکھی اُس میں امام احمد کا بطور فقیہ کے ذکر نہ کیا جس کی وجہ سے حنبلی آپ کے خلاف ہو گئے اور مشتعل ہو کر آپ کے مکان پر پتھراؤ کیا۔ یہاں تک کہ پولیس کو مداخلت کرنا پڑی اور جب آپ فوت ہوئے تو آپ کا جنازہ نہ اُٹھنے دیا۔ جو لوگ تعزیت کے لئے آتے ان کو وہ روکتے اور گھر میں داخل نہ ہونے دیتے۔ آخر آپ کے عقیدت مندوں نے رات کے وقت گھر میں ہی تدفین کا فریضہ سرانجام دیا۔[1]

امام ابن جریر بڑے خوددار، جرأت مند، حق بات کہنے میں جری، عابد و زاہد بزرگ تھے۔ نہ کبھی حکومت کی طرف سے آمدہ نذرانے اور تحائف قبول کئے اور نہ ہی عہدۂ قضاء کی پیشکش منظور کی۔ ساری عمر آزادرہ کر درس و تدریس اور تالیف و تصنیف میں صرف کر دی اور جب آپ اس دنیا سے رُخصت ہوئے تو علم کی بہت بڑی دولت دنیا والوں کو تحفے میں دے گئے۔ **فکان نعم الامام ابنُ جریر رحمة اللّٰه علیه و علٰی سابقیه و لاحقیه من الائمة رحمةً واسعةً یبلغ رضاه و یَرزُقُنَا تقْوَاهُ۔**

[1] وثبوا علیه ورموه بمحابرهم ثم قَذَفُوْا داره بالحجارة الی ان تدخّلت الشرطة .... و عِنْدَمَا مَاتَ الطبری مُنِعَ الاحتفال به و دُفِنَ فی دارِه لیْلاً۔ الامام احمد بن حنبل صفحه ۲۱۲

ایک ضروری وضاحت

مختلف فرقوں کے نظریات کا تاریخی جائزہ پیش کرنے سے پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ آئندہ صفحات میں جو کچھ کسی فرقہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہو اور کسی جگہ بھی تعصب یا شنید یا تساہل سے کام نہ لیا جائے۔ ہر فرقہ کے بارے میں وہی کچھ لکھا جائے جسے وہ فرقہ مانتا ہے لیکن تاریخی حقیقت کے لحاظ سے یہ حتمی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کوشش پوری طرح کامیاب بھی رہی ہے کیونکہ تاریخ مختلف ادوار میں سے گزرنے اور گرد و پیش سے متاثر ہونے کی وجہ سے بڑی حد تک حجاب اکبر بھی ثابت ہوتی ہے اس لئے کسی حقیقت کے کئی پہلوؤں کا تشنۂ وضاحت رہ جانا عین ممکن ہے اور کئی واقعات کی اصلیت سیاق و سباق سے کٹ جانے کی وجہ سے مشتبہ ہو سکتی ہے۔

بہر حال یہ نظریاتی جائزہ اس حسنِ ظن کی بنیاد پر پیش کیا جا رہا ہے کہ جن سابقہ بزرگوں نے اس موضوع پر لکھا ہے وہ اپنی جلالت شان اور عظمت علم کے لحاظ سے ہر قسم کے تعصب اور جانبداری سے پاک اور اظہار حقیقت کے لئے بڑے جری اور صادق القول مانے جاتے ہیں اور ان کی ثقاہت کا انکار مشکل ہے۔ تاہم اگر کسی فرد یا فرقہ کو اس بارہ میں کوئی اختلاف ہو اور وہ سمجھتا ہو کہ کسی جگہ بیان کردہ حقائق میں جھول یا غلطی ہے تو نشان دہی کرنے پر اصلاح میں کسی قسم کے بخل سے کام نہیں کیا جائے گا۔

وَ بِاللّٰہِ التَّوفِیق۔

اُمتِ مسلمہ کے دوسرے مختلف فرقے

اہل السنّت والجماعت کے علاوہ باقی فرقوں کو علی الاجمال دو قسموں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ سیاست کی بنیاد پر فرقے جیسے شیعہ اور خوارج وغیرہ۔

۲۔ عقائد اور نظریات کی بنیاد پر فرقے جیسے معتزلہ اور مرجئہ وغیرہ۔

تاریخی لحاظ سے شیعہ فرقہ سب سے پرانا ہے۔اس کے بعد خوارج کا نمبر آتا ہے۔اس کے بعد معتزلہ اور مرجئہ کا۔زنادقہ بحیثیت فرقہ کافی عرصہ بعد نمایاں ہوئے اور مذکورہ بالا فرقوں میں گڈمڈ ہوتے رہے۔ وہ صوفیہ جو حلول اور اباحت کے قائل ہیں ان کا شمار بھی بحیثیت فرقہ اہل السنّت سے الگ ہوتا ہے۔جیسے حلّاجیہ جو مشہور صوفی منصور حلاج کے پیرو تھے۔اس کے بعد ہر بڑا فرقہ کئی ضمنی فرقوں میں بٹ گیا لیکن ان میں سے اکثر کی حیثیت برائے نام تھی۔

فرقہ پرستی اور تحزب کا مضحکہ خیز انداز

بعض اوقات بڑے مضحکہ خیز طریقے سے فرقہ بندی کی مثالیں ملتی ہیں مثلاً۔دو شخص تھے ایک کا نام شعیب تھا اور دوسرے کا میمون۔میمون نے شعیب سے کچھ رقم قرض لی۔ایک مدت کے بعد شعیب نے قرض کی واپسی کا مطالبہ کیا تو میمون نے کہا اگر اللہ چاہے گا تو ادا کردوں گا۔شعیب نے کہا کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اور اُس کا حکم ہے کہ قرض حسب وعدہ ادا کیا جائے۔اس پر میمون نے جواب دیا کہ اگر اللہ چاہتا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں قرض ادا نہ کرچکا ہوتا۔اللہ کی مشیت تو پوری ہو کر رہتی ہے۔آخر یہ بحث اتنی بڑھی کہ دو فرقے پیدا ہوگئے جو شعیب کی حمایت کررہے تھے وہ شُعَیبِیَّہ کہلائے اور جو میمون کے طرف دار تھے وہ مَیمُونِیَّہ کے نام سے مشہور ہوئے۔یہ دونوں خوارج سے تعلق رکھنے والے فرقے ہیں۔اس طرح ایک فرقہ سے کئی نئے فرقے بنتے چلے گئے۔شیعہ خوارج اور معتزلہ کے کئی فرقے صرف

کتابوں میں رہ گئے ہیں اور اب بحیثیت فرقہ ان کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔ البتہ ان کے کئی نظریات و خیالات کم وبیش کسی نہ کسی موجودہ فرقہ میں دیکھے اور سونگھے جاسکتے ہیں۔[1]

---

[1] اعتذر الشیعة الامامیة انّ المنقّب فی التاریخ علیم بانّہا تتراوح بین شکوکٍ و اوہام عرت بعض البسطاء وانقرضت بِمَوْتِہم ...... و لم یبق فی القوم مطمعٌ فَاُخمِلُوْا و قُتِلوا تقتیلًا ...... و لم یقم المجتمع الدینی و البشری لہم و زنًا و عمَّ الجمیع ان طَوَتْہُمْ مَعَ غَیّہِمُ الایّام و طَحَنَتْہُمْ بِکلکلہ الجدیدانُ فَعَادُوْا کحدیث امس الدہر۔ تنبیہ بقلم محمد صادق آل بحرالعلوم صفحہ الف) فی ابتداء فرق الشیعة (الشیخ الحسن بن موسیٰ النوبختی من اعلام القرن الثالث منشورات دار الاضواء بیروت لبنان طبع ثانی ۱۹۸۴ء)

مختلف فرقوں کا تفصیلی جائزہ

اهل تَشَيُّع

سب سے پہلے ہم شیعہ اور اُس کے مختلف ضمنی فرقوں کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

شیعہ کے معنے: شیعہ کے معنے ساتھ دینے والے۔ مدد کرنے والے پیرو کے ہیں چنانچہ شِيْعَةُ الرَّجُلِ کے معنے ہوں گے اَتْبَاعُ الرَّجُلِ وَ اَنْصَارُهُ یعنی کسی شخص کے پیرو اور پیچھے چلنے والے مددگار۔ یہ لفظ مفرد، تثنیہ، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ دو جگہ مددگار اور ساتھی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ القصص میں ہے۔ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ[1] یعنی ایک دن موسیٰ شہر میں ایسے وقت آیا جبکہ شہر والے بے خبر پڑے آرام کر رہے تھے تو اُس نے وہاں دیکھا کہ دو آدمی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ایک اُس کے حامیوں کے گروہ میں سے تھا اور دوسرا اس کے دشمنوں میں سے۔ جو اُس کے حامیوں کے گروہ میں سے تھا اُس نے زیادتی کرنے والے دشمن کے خلاف موسیٰ سے مدد چاہی۔

دوسری جگہ سورۃ الصّافات کی آیت ۸۴ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ[2] کہ نوحؑ کی پیروی کرنے والی جماعت میں ابراہیمؑ بھی شامل تھے۔ اصطلاح میں شیعہ مسلمانوں کے اُس گروہ کو کہتے ہیں جس کی تعریف یہ ہے۔ كُلُّ مَنْ فَضَّلَ عَلِيًّا عَلَى الصَّحَابَةِ كُلِّهِمْ

---

1. القصص: ۱۶
2. الصّٰفّٰت: ۸۴

وَاعْتَقَدَ اَنَّهٗ اَحَقُّ بِاِمَامَةِ الْمُسْلِمِیْنَ وَ خِلَافَتِهِم [1] شیعہ وہ ہے جو حضرت علیؓ کو تمام صحابہ سے افضل مانتا ہے اور یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ امام المؤمنین اور خلیفۃ المسلمین بننے کے سب سے اوّل اور سب سے زیادہ حقدار علی ہیں تمام شیعہ بلحاظ مفہوم اس تعریف پر متفق ہیں۔ شیعہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا اور اہم فرقہ ہے اگر غلو پسند شیعہ فرقوں کو الگ رکھا جائے تو اعتدال پسند شیعوں کے اختلاف کی حیثیت قریباً قریباً وہی ہے جو اہل السنّت والجماعت کے آپس کے باہمی اختلاف کی ہے۔ حنفیہ اور مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ، قادریہ اور سہروردیہ، چشتیہ اور نقشبندیہ کا آپس میں جس طرح کا اختلاف ہے اسی طرح کا اختلاف اعتدال پسند شیعوں کا مذکورہ بالا فرقوں سے ہے۔ عقائد کے لحاظ سے بھی اور فقہی احکام کے اعتبار سے بھی کیونکہ ان سب فرقوں کی بنیاد ایک ہی ہے۔ یہ سب فرقے قرآن کریم اور سنت رسول ﷺ کو اپنے اپنے مسلک کی بنیاد اور ماخذ تسلیم کرتے ہیں اور سب کا دعویٰ یہی ہے کہ جو کچھ وہ مانتے ہیں وہ قرآن وسنت سے ماخوذ اور مستنبط ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کا مقام

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۶۰۱ عیسوی میں پیدا ہوئے۔ آپ آنحضرت ﷺ سے تیس ۳۰ سال چھوٹے تھے۔ جب حضور مبعوث ہوئے اور آپ نے ماموریّت کا دعویٰ کیا اُس وقت حضرت علیؓ کی عمر دس سال تھی۔ چونکہ حضرت ابو طالب کے مالی حالات اچھے نہ تھے عیالداری زیادہ تھی نیز حضرت ابو طالب

---

[1] فرق الشیعة صفحه ۲۰ مؤلفه الشیخ الحسن بن موسیٰ النوبختی من اعلام القرن الثالث الهجری مطبع دارالاضواء بیروت لبنان دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۴ء

الف۔ قال ابن حزم من قال اَنَّ علیًّا رضی الله عنه افضل الناس بعد رسول الله ﷺ فهو شیعیٌّ (الفصل فی الملل والاهواء والنحل. امام ابو محمد علی بن احمد بن حزم الظاهری المتوفی ۴۵۶ هجری مطبع الادبیة مصر طبع ۱۳۱۷ھ

ب۔ من تولّٰی علیًّا وبنیه علیهم السلام و اقر بامامتهم (تاریخ الشیعة. الشیخ محمد حسین المظفر. دارالزهراء بیروت لبنان ۱۹۸۵ء

ج. الفرق الشیعة کلهم تؤمن بحق علی فی الامامة وافضلیته علی زملا ئه من الصحابة (الصّلة بین التصوف و التشیّع صفحه ۱۷ مصنفه ڈاکٹر کامل مصطفیٰ الشیبی مطبوعه مطبع دار المعارف مصر دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۹ء

نے بچپن میں آنحضرت ﷺ کی پرورش بڑے پیار اور عمدہ طریق سے کی تھی اس لئے حضور ﷺ نے علیؓ کو اپنی تربیت میں لے لیا تا کہ اگر ایک طرف ابو طالب کا کچھ بوجھ ہلکا ہو تو دوسری طرف اُن کے احسان کا بدلہ بھی چکایا جا سکے۔ بہر حال علی آنحضرت ﷺ کی زیر نگرانی اور آپ کی شفقت اور محبت کے سایہ میں پھلے پھولے۔ حضور ﷺ مثل بیٹوں کے آپ سے پیار اور ہر طرح کی دلداری کرتے تھے۔

حضرت علیؓ بجائے خود بڑے بہادر، حوصلہ مند، ایثار مجسم، عابد و زاہد، قناعت پسند اور مسلّمہ رُوحانی بزرگ تھے۔ کوئی حرص، کوئی لالچ آپ کے دل میں نہ تھا۔ دینی علوم میں آپ کا مقام بہت بلند تھا۔ تمام صحابہؓ آپ کی دینی وجاہت اور علمی قابلیت کے معترف تھے اور سب دل سے آپ کا احترام کرتے اور آپ کی اس عظمت کے قائل تھے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی یہ وہ خوبیاں ہیں جن کو تمام مسلمان کیا سُنّی اور کیا شیعہ سب تسلیم کرتے ہیں۔ تاہم شیعہ حضرات کے نزدیک حضرت علی علیہ السلام کا مقام اس سے کہیں زیادہ بلند تھا اور اسی وجہ سے شیعہ آپ کو آنحضرت ﷺ کا خلیفہ بلافصل مانتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی اُن فضیلتوں کی تفصیل جو شیعہ حضرات کی طرف سے پیش کی جاتی ہے یہ ہے:۔

استحقاقِ خلافت و امامت بلافصل

اہل تشیع کے نزدیک حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اُن کے بعد ان کی اولاد خلافت بلافصل اور دینی قیادت کی زیادہ حقدار ہے اور اس کی مندرجہ ذیل وجوہات شیعہ حضرات کی طرف سے پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ كَانَ عَلِيٌّ اَوَّلَ الْاِسْلَامِ ۔ حضرت علیؓ اس لحاظ سے پہلے مسلمان ہیں کہ مردوں میں سے سب سے پہلے آپ نے اسلام قبول کیا جبکہ آپ کی عمر اس وقت دس سال تھی۔ عورتوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والی خاتون حضرت خدیجہؓ تھیں نیز علیؓ نے کبھی بتوں کی عبادت نہیں کی اور یہ امتیاز کسی اور صحابی کو حاصل نہیں۔

۲۔ كَانَ عَلِيٌّ اَقْرَبَ النَّاسِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ۔ حضرت علیؓ آنحضرت ﷺ سے رشتہ میں قریب تر اور آپ کے وارث تھے کیونکہ حضرت علی آپ کے چچا زاد بھائی تھے۔ حضور نے بچپن سے ہی اُنہیں اپنی نگرانی میں لے لیا تھا۔ بڑے پیار اور محبت سے ان کی تربیت کی۔ انہیں اپنا رہیب بنایا۔

اپنی پیاری بیٹی فاطمہؓ ان کو بیاہ دی اور اسی ذریعہ سے آپ کی نسل آگے چلی۔ گویا مسلمانوں میں حضور ﷺ کے سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار حضرت علیؓ تھے اس لئے وہ آپ ﷺ کی نیابت کے زیادہ حقدار ہیں۔

۳۔ کَانَ عَلِیٌّ اَخَا النَّبِیِّ ﷺ بِالْمُؤَاخَاةِ الدِّیْنِیَّةِ ۔ جب حضور ﷺ نے مدینہ منورہ میں مسلمانوں میں مؤاخات کی تحریک جاری کی تو حضورؐ نے حضرت علیؓ کو اپنا دینی بھائی بنایا۔[۱]

۴۔ کَانَ عَلِیٌّ خَلِیْفَتَهٗ عَلٰی وَدَائِعِهٖ ۔ ہجرت کے وقت آپؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے پیچھے اپنے نائب کے طور پر چھوڑا تا کہ علیؓ وہ امانتیں اُن کے مالکوں تک پہنچائیں جو انہوں نے حضورؐ کے پاس رکھوائی ہوئی تھیں۔

۵۔ کَانَ عَلِیٌّ خَلِیْفَتَهٗ فِیْ اَهْلِهٖ ۔ حضرت علیؓ حضورؐ کے گھریلو معاملات کے نگران اور ذمہ دار تھے اور اس لحاظ سے ایک گونہ آپؐ کے نائب تھے۔

۶۔ کَانَ عَلِیٌّ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی ۔ یعنی جو مقام حضرت موسیٰ کی نسبت سے ہارون کا تھا وہ مقام حضورؐ کی نسبت سے حضرت علیؓ کا تھا۔[۲]

۷۔ کَانَ عَلِیٌّ بَابَ مَدِیْنَةِ الْعِلْمِ یعنی آنحضرت ﷺ نے آپ کے حق میں فرمایا اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُهَا گویا حضورؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے روحانی علوم کا حامل قرار دیا جس میں یہ اشارہ تھا کہ آئندہ علومِ نبوت حضرت علیؓ کے واسطہ سے لوگوں تک پہنچیں گے اور یہ فیضان الٰہی اُن کے ذریعہ جاری ہوگا۔[۳]

۸۔ کَانَ عَلِیٌّ اَزْهَدَ الصَّحَابَةِ یعنی حضرت علیؓ بڑے عابد، زاہد، قناعت پسند اور عدل و انصاف کے دلدادہ تھے۔

۹۔ کَانَ عَلِیٌّ اَعْلَمَ الصَّحَابَةِ یعنی حضرت علیؓ روحانی علوم میں سب صحابہؓ سے آگے تھے اور قیادت دینی اور امامت کے لئے علمی فوقیت اصل معیار ہے۔

---

[۱] (تاریخ الشیعة صفحه ۱۸، تاریخ الفرق الاسلامیة صفحه ۳۳۔ جبکہ طبقات ابن سعد میں ہے کہ آپ نے علیؓ اور سہیل بن حنیف کے مابین مؤاخات کرائی تھی۔ طبقات جلد ۳ صفحه ۲۳)

[۲] (حضرت ہارون حضرت موسیٰ کی زندگی میں ہی وفات پا گئے تھے۔ فَفَکِّرْ)

[۳] (کیا شہر کا ایک ہی دروازہ ہوا کرتا ہے؟ نیز حدیث اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ بھی قابل غور ہے۔ (مشکوٰۃ کتاب المناقب باب مناقب صحابہؓ)

۱۰۔ کَانَ عَلِیٌّ صَاحِبَ لِوَاءِ النَّبِیِّ ﷺ یعنی خیبر کی جنگ میں آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنا جھنڈا دیا اور کہا علیؓ وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو پیارا ہے۔ چنانچہ آپ کی قیادت میں خیبر کا ایک بڑا مضبوط قلعہ سر ہوا۔

۱۱۔ کَانَ عَلِیٌّ مِنْ آلِ النَّبِیِّ ﷺ ۔ یعنی حضورؐ نے آیت تطہیر کے نزول کے وقت حضرت علیؓ کو اپنی آل میں شامل فرمایا تھا اور آپؐ کی آل میں سے ہونا ایک ایسا اعزاز ہے جو کسی اور صحابی کو نصیب نہیں ہوا۔[1]

۱۲۔ کَانَ عَلِیٌّ وَصِیَّ النَّبِیِّ ﷺ یعنی آنحضرت ﷺ نے اپنی وفات سے پہلے یہ وصیت فرمائی تھی کہ میرے بعد علیؓ خلیفہ اور نائب ہوں گے۔ نیز خم غدیر کے موقع پر حضرت علیؓ کے بارہ میں فرمایا مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ وَ عَادِ مَنْ عَادَاہُ کہ جس کا میں مولا اور دوست ہوں علیؓ بھی اُس کے مولا اور دوست ہیں۔ اے اللہ جو علیؓ سے محبت رکھے اور اُس کا بھلا چاہے تو بھی اُس سے محبت رکھ اور اُسے برکات عطا کر اور جو علیؓ سے دشمنی رکھے اور اُس کا بُرا چاہے تو بھی اس سے دشمنی رکھ اور اُسے ہر قسم کی برکات سے محروم کر دے۔[2]

۱۳۔ کَانَ عَلِیٌّ وَصِیَّ اللّٰہِ تعالیٰ شانہٗ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ وہ یہ اعلان کر دیں کہ ان کے بعد علی خَلِیْفَۃُ الْمُسْلِمِیْن اور امیر المومنین ہوں گے۔[3] یہ وصیت قرآن کریم کے ساتھ ایک صحیفہ کی شکل میں نازل ہوئی تھی اور آنحضرت ﷺ تو اللہ کے اس حکم کو لوگوں تک پہنچانے کے پابند تھے۔ چنانچہ آیت کریمہ یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ

---

[1] آیت تطہیر کا سیاق وسباق بتاتا ہے کہ اس میں ازواج مطہرات بدرجہ اول شامل ہیں اور اگر مذکورہ بالا روایت انہی الفاظ میں مستند اور صحیح ہے تو اس کے سوائے اس کے اور کوئی معنے نہیں کہ حضورؐ نے اس طرح خواہش کا اظہار کیا تھا اور دعا کی تھی کہ یہ لوگ بھی ان برکات کے حامل ہوں جو آیت تطہیر میں گنوائی گئی ہیں۔ نیز حدیث کُلُّ تَقِیٍّ فَھُوَ آلِیْ بھی قابل غور ہے۔

(اخرجہ الطبرانی ۔ نیل الاوطار جلد ۲ صفحہ ۲۸۵)

[2] تاریخ الشیعۃ صفحہ ۲۱

[3] اثبات الوصیۃ للمسعودی صفحہ ۱۲۱۔

اصول الکافی جلد اول صفحہ ۲۸۹۔ جلد اوّل صفحہ ۲۸۵

مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ [۱] میں اسی آسمانی وصیّت کی تبلیغ کی طرف اشارہ ہے۔ [۲]

حضرت علیؓ کے حق میں وصیّت والی روایتوں پر اہلسنت والجماعت کا تبصرہ

مذکورہ بالا وجوہات میں سے کوئی وجہ بھی حضرت علیؓ کے استحقاقِ خلافت بلافصل کو بالصراحت ثابت نہیں کرتی۔ [۳] سوائے آخری دو وجوہات کے کہ اگر یہ دونوں وجوہات ثابت ہوں تو یہ حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل کی زبردست دلیل ہیں لیکن ان دو وجوہات کا اور اس قسم کی کسی وصیّت کا نہ کوئی قطعی اور مستند تاریخی ثبوت ہے اور نہ کوئی دینیاتی بلکہ وصیت کا نظریہ بہت بعد کی پیداوار ہے اور اس کا موجد جیسا کہ تواریخ سے ثابت ہے عبداللہ بن السوداء یہودی الاصل ہے جس نے حضرت علیؓ کی خلافت کے آخری دور میں یہ چرچا کیا کہ اُس نے تورات میں یہ پڑھا ہے کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اس لئے آنحضرت کے وصی علیؓ ہیں اور جس طرح آنحضرت خاتم الانبیاء ہیں اسی طرح علیؓ بھی خاتم الاوصیاء ہیں۔ [۴]

بہر حال نظریہ وصیت کے غلط ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ کی حضرت علیؓ اور ان کی فاطمی اولاد کے حق میں وصیت ہوتی اور اُمت کو اپنا امام بذریعہ شوریٰ منتخب کرنے کا حق نہ

۱۔ المائدۃ : ۶۸

۲۔ تفصیل کے لئے دیکھیں تاریخ الفرق الاسلامیہ صفحہ ۳۳ و صفحہ ۱۰۹ مؤلفہ العلامہ الشیخ محمد خلیل الزین تشیع المسلک مطبوعہ مطبع مؤسّسة الأعلمي للمطبوعات بیروت لبنان طبع ثانی ۱۹۸۵ء۔ تاریخ الشیعۃ صفحہ ۱۹، ۲۰ مؤلفہ الشیخ محمد حسین المظفر تشیع المسلک مطبوعہ مطبع دارالزھرا بیروت۔ لبنان ۱۹۸۵ء۔ علی و بنوہ صفحہ ۱۵ و ۶۸، ۶۹ مؤلفہ طٰہٰ حسین مطبوعہ مطبع دارالمعارف قاھرہ مصر ایڈیشن دوم ۱۹۸۲ء۔ الکامل جلد ۲ صفحہ ۶۳ علامہ عزالدین علی بن ابی الکرم محمد المعروف بابن الاثیر مطبوعہ ادارہ الطباعۃ المیسریہ مصر ۱۳۴۹ھ

۳۔ زیادہ سے زیادہ ان مبینہ فضائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض دوسرے صحابہ کی طرح حضرت علی کرم اللہ وجھہ میں بھی خلیفہ راشد بننے کی صلاحیت موجود تھی لیکن خلیفہ تو کسی ایک نے منتخب ہونا تھا۔ صحابہ نے بعض مصالح کی بناء پر حضرت علیؓ کی بجائے حضرت ابوبکرؓ کو ترجیح دی۔ ولنعم ما قیل ان الصحابۃ عرفوا الاھل البیت مکاناتھم من النبی واستحقاقھم لکل کرامۃ و لکنھم مع ذلک صرفوا الخلافۃ الی من ھو اقدر علی النھوض بامر الخلافۃ واعباء السلطان کما شھد التاریخ بصدق ما قیل (علیّ و بنوہ صفحہ ۱۸۱)۔

۴۔ اَلْفرقُ بین الفرق ۱۷۸

ہوتا تو صحابہ کبھی بھی آنحضرت ﷺ کے اس صریح حکم کی خلاف ورزی نہ کرتے کیونکہ صحابہؓ کی اطاعت، ان کی آنحضرت ﷺ سے وفا اور محبت تاریخ کا ایسا واقعہ ہے جس کی تائید خود قرآن کریم کرتا ہے اور تاریخ کا کوئی منصف مزاج مؤرخ اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا۔ قرآن کریم نے صحابہ کو اس فرمانبرداری اور فدائیت کا سرٹیفکیٹ کئی جگہ دیا ہے اور وضاحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قربانیوں کو بنظر احسان دیکھا، ان کو قبول کیا اور اُن سے راضی ہوگیا۔ چنانچہ حدیبیہ کے مقام پر صحابہ کی بیعت رضوان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''اللہ اس وقت مومنوں سے بالکل خوش ہوگیا اور راضی ہوگیا جبکہ وہ درخت کے نیچے تیری بیعت کر رہے تھے اور اُس نے ان کے دلوں کے ایمان کو خوب جان لیا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس نے ان پر سکینت اور اطمینان نازل کیا اور قریب آنے والی انہیں فتح بخشی''۔[1]

پھر فرمایا۔

''اور مہاجرین اور انصار میں سے جو سبقت لے جانے والے ہیں اور جو کامل اطاعت اور پورے خلوص سے ان کے پیچھے چلے (جن کو تابعین کہا جاتا ہے) اللہ اُن سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ اُس نے ان کے لئے ایسی جنتیں تیار کی ہیں جن کے اندر نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔[2]''

پھر فرمایا۔

''محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو اُن کے ساتھ ہیں (یعنی صحابہؓ) وہ معاند منکروں کے خلاف بڑا جوش رکھتے ہیں، لیکن آپس میں ایک دوسرے سے بہت ملاطفت اور محبت کا سلوک کرتے ہیں۔ جب تو انہیں دیکھے گا تو رکوع کرنے والا اور سجدہ کرنے والا پائے گا (یعنی ہر قسم کے شرک سے پاک، صرف اللہ کی فرمانبرداری کرنے والا اور اسی کی عبادت کرنے والا پائے گا) وہ اللہ کے فضل اور اُس کی رضا کی جستجو میں رہتے ہیں۔ اُن کی شناخت اُن کے چہروں پر سجدوں کے نشان کے ذریعہ موجود ہے۔ اُن کی یہ حالت تورات اور انجیل میں بھی بیان ہوئی ہے۔ ...... اللہ نے مومنوں اور ایمان کے مطابق عمل کرنے والوں سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو مغفرت اور اجر سے نوازے گا۔[3]''

---

[1] الفتح : ۱۹ [2] التوبة : ۱۹ [3] الفتح : ۳۰

اللہ تعالیٰ جن لوگوں کا یہ وصف بیان کرتا ہے اور اُن سے راضی اور خوش ہونے کا بتاتا ہے کیا اُن سے یہ توقع ممکن ہے کہ وہ سب کے سب آنحضرت ﷺ کی وفات کے معاًبعد آپ کے نافرمان بن جائیں گے۔[1] آپ کے اس حکم کو بھول جائیں گے جو اللہ کے ارشاد کے مطابق صحابہؓ کو دیا تھا اور حضرت علیؓ کے حق میں آپ نے جو واضح وصیت فرمائی تھی اُسے نظر انداز کر دیں گے۔

جب آنحضرت ﷺ کے جانشین اور خلیفہ کے بارہ میں مشورہ ہو رہا تھا اُس وقت کسی صحابی کو یہ توفیق نہ ملی کہ وہ حضور کی اس وصیّت کا حوالہ دیتا کہ حضور تو حضرت علیؓ کے حق میں وصیت کر گئے ہیں۔ دوسرے دلائل تو بعض صحابہ نے دیئے مثلاً حضرت علیؓ یا عباسؓ آنحضرت ﷺ کے قریبی رشتہ دار ہیں اس لئے انہیں جانشین ہونا چاہیے لیکن کوئی بھی معتبر روایت نہیں کہ کسی نے اس موقع پر آپ کی وصیّت کو بطور دلیل پیش کیا ہو یہاں تک کہ حضرت علیؓ بھی اپنا حق جتانے کے لئے اُس وقت یہ دلیل پیش نہیں کرتے۔

پھر حضرت علیؓ نے بعض روایتوں کے مطابق دوسرے یا تیسرے روز حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی۔اس موقع پر آپ نے یہ شکایت تو کی کہ اتنے اہم معاملہ میں مجھ سے مشورہ نہیں کیا گیا (کَمَا رُوِیَ) لیکن یہ اظہار نہ کیا کہ میرے حق میں تو آنحضرت ﷺ کی وصیت تھی۔ آپ کا بیعت کر لینا یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ کے حق میں کوئی وصیت نہ تھی ورنہ آپ آنحضرتؐ کی صریح نافرمانی کرنے والے کی بیعت ہرگز نہ کرتے کیونکہ یہ جرم اُس جرم سے بڑا تھا جس کا یزید نے ارتکاب کیا تھا جس کی وجہ سے حضرت امام حسینؓ نے یزید کی بیعت نہ کی تھی بلکہ اس کے خلاف تلوار اُٹھائی۔

پھر اگر ہم اس واقعہ کو درست مان لیں کہ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کے حق میں وصیّت کی تھی جسے نعوذ باللہ صحابہؓ نے تسلیم نہیں کیا تو قرآن شریف کا اعتبار اُٹھ جاتا ہے اور اُس کی اُن متعدد تصریحات میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا جو صحابہ کی قربانیوں کی قبولیت کے بارہ میں وہ دہرا دہرا کر اور تکرار کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ لہٰذا کوئی روایت خواہ کوئی اس کا نام حدیث رکھ لے درست نہیں ہو سکتی جو قرآن کریم کے خلاف ہو اور اس کی تصریحات کی تردید کرتی ہو اور اس کے بیان کردہ واقعات کو جھٹلاتی ہو۔

---

[1] حضرت ابوبکرؓ آنحضرت ﷺ کے کتنے فرمانبردار اور آپ پر کتنے فدا تھے اس کا ثبوت جیش اسامہ کے واقعہ سے پتا چلتا ہے۔ بڑے بڑے صحابہ مشورہ دے رہے ہیں کہ لشکر کی روانگی ملتوی کر دی جائے لیکن آپ نے کہا کہ خلیفۃ الرسول بننے کے بعد پہلا کام میں یہ کروں کہ حضور کے فیصلہ کو بدل دوں۔ الکامل لابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۳۱۷

پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا وہ طرزِ عمل بھی کسی وصیّت کے واقعہ کی تردید کرتا ہے جو آپ نے اپنے سے پہلے تینوں خلفاء کے بارہ میں اختیار کئے رکھا۔ کیونکہ شیعہ حضرات بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ تینوں خلفاء کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتے رہے۔[1] ہر اہم مشورہ میں آپ شریک ہوتے جو وظائف حضرت عمرؓ کی طرف سے صحابہ کے مقرر ہوتے رہے وہ بڑی خوشدلی کے ساتھ حضرت علیؓ بھی قبول کرتے۔

اگر نعوذ باللہ یہ خلفاء اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کے نافرمان ہوتے اور حق خلافت انہوں نے غصب کیا ہوتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ علیؓ اُن سے کسی قسم کا تعاون کرتے۔ علاوہ ازیں حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کا جب باہمی اختلاف ہوا اور اس سلسلہ میں دونوں کی خط و کتابت ہوئی تو اس میں بھی حضرت علیؓ کی طرف سے یہ دلیل پیش نہیں کی گئی کہ میرے حق میں تو آنحضرت ﷺ کی وصیّت موجود ہے۔ تاریخ میں یہ خط و کتابت محفوظ ہے۔ اپنے خطوط میں حضرت علیؓ نے حق پر ہونے کے متعدد دلائل تحریر کئے ہیں لیکن کسی ایک خط میں بھی اپنے وصی ہونے کی دلیل پیش نہیں کی، بلکہ ایک خط میں حضرت علیؓ نے لکھا ہے کہ ان کے چچا عباسؓ اور امیر معاویہؓ کے والد ابو سفیانؓ نے آپ کو یہ پیشکش کی تھی کہ وہ آپ کی بیعت کرنے کے لئے تیار ہیں کیونکہ خلافت اور امارت بوجہ قرابت آپ کا حق ہے لیکن آپ نے فرمایا خلافت قائم ہو چکی ہے۔ لوگوں نے بیعت کر لی ہے۔ اب میں تفریق بین المسلمین کا باعث نہیں بننا چاہتا اس طرح آپ نے ان دونوں بزرگوں کی پیشکش کو مسترد کر دیا۔[2] اگر کوئی وصیّت آپ کے حق میں ہوتی تو آپ کو اِسترداد کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔

پھر جب آپ کی شہادت کا وقت قریب آیا اور لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ اپنے جانشین کے بارہ میں وصیّت کر جائیں تو آپ نے ایک روایت کے مطابق فرمایا۔ اَتْرُکُکُمْ کَمَا تَرَکَکُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ۔[3] زیدیہ شیعہ جو حضرت امام زین العابدینؓ کے صاحبزادہ امام زید کے پیرو ہیں وہ یہ

---

[1] چنانچہ مؤرخین نے لکھا ہے۔ کَانَ عَلِیٌّ مُوَفَّقًا اِذًا کُلَّ التَّوْفِیْقِ نَاصِحًا لِلّٰہِ وَلِلْاِسلام کُلَّ النُّصحِ حِیْنَ اِمْتَنَعَ عَلٰی ھٰذَیْنِ الشَّیْخَیْنِ فَلَمْ یَنْصَبْ نَفْسَہٗ لِلْخلافۃ ولم یُنَازِعْھَا اَبَا بَکْرٍ وانَّمَا بَایَعَہٗ کَمَا بَایَعَہُ النَّاس. (علی و بنوہ صفحہ ۱۸)۔ فَقَدْ کَانَ عَلِیٌّ مُؤْمِنًا بِالْخِلَافَۃِ کَمَا تَصَوَّرَھَا الْمُسْلِمُوْنَ اَیَّامَ اَبِیْ بَکْرٍؓ وَ عُمَرؓ. (علی و بنوہ صفحہ ۵۹)۔ و قال علیٌّ فی مکتوبہ لمعاویۃ و لَعَمْرِیْ اِنَّ مَکَانَھُمَا (ای مکان ابی بکرؓ و عمرؓ) من الاسلام لعظیمٌ وان المصاب بھما لَرُزْءٌ جلیل۔ (علی و بنوہ صفحہ ٦٧)۔

[2] علی و بنوہ صفحہ ٦٧ تا ٦٩

[3] طبقات ابن سعد جلد ۳ صفحہ ۳۴

مانتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کا نام لے کر کوئی وصیت نہیں کی تھی بلکہ اپنے بعد بننے والے خلیفہ کے اوصاف بیان کئے تھے جو حضرت علی پر منطبق ہوتے تھے۔

حضرت امام حسنؓ نے اپنی خلافت کے بارہ میں جو خط وکتابت امیر معاویہؓ سے کی اس میں بھی وصیّت کی دلیل کا کوئی ذکر نہیں بلکہ امیر معاویہؓ نے جب آپ کو یہ پیشکش کی کہ اگر آپ میرے حق میں دست بردار ہو جائیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اپنا ولی عہد مقرر کردوں گا اس پر آپ نے فرمایا:۔

اِنَّهُ لَيْسَ لِمَعَاوِيَةَ اَنْ يُّعْهَدَ لِاَحَدٍ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْ يَّكُوْنَ الْاَمْرُ شُوْرٰى وَ فِيْ رَوَايَةٍ كتب اَنْ يَّكُوْنَ الْاَمْرُ شُوْرٰى بَعْدَ مَوْتِ مَعَاوِيَةَ۔[1]

تحکیم کی تجویز کو قبول کرنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علیؓ بطور وصی حق خلافت کے دعویدار نہ تھے ورنہ تحکیم کی تجویز بے معنی ہوتی۔کم از کم تحکیم کے سلسلہ میں جو حکم نامہ لکھا گیا تھا اُس میں وصیت کی دلیل کا ذکر ہونا چاہیے تھا۔وصیت کے نظریہ کے متعلق یہی رویہ حضرت امام حسینؓ، حضرت امام زیدؓ اور حضرت امام محمد بن الحنفیہؓ کا بھی تھا۔ان میں سے ہر ایک نے (حسب بیان تاریخ) خلافت کے حقدار ہونے کا دعوی کیا اور قرابت داری کی دلیل پیش کی لیکن کسی نے بھی وصیت کی دلیل کو پیش نہیں کیا حالانکہ اگر حضرت علیؓ اور آپ کی اولاد کے بارہ میں وصیت ہوتی تو دعویٰ خلافت کے لئے وصیت کا واقعہ سب سے بڑی دلیل کی حیثیت رکھتا تھا۔پھر وصیت کے معین الفاظ بھی کسی معتبر تاریخ یا کسی مستند متفق علیہ حدیث میں محفوظ نہیں ہیں جن سے قطعی طور پر یہ ثابت ہو کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنا جانشین اور خلیفہ نامزد فرمایا تھا۔غدیر خم والا واقعہ اگر غور کیا جائے اور دوسرے واقعات کو مدّنظر رکھا جائے تو اس سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ چند ایک منافقوں نے حضرت علیؓ کے بارہ نازیبا رویہ اختیار کیا تھا جیسا کہ خاندان نبوت یا جس کو اللہ تعالیٰ نے قیادت کا شرف بخشا ہو اس کے بارہ میں منافقین کا بالعموم طرز عمل ہوا کرتا ہے جس سے اکثریت کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔آنحضرت ﷺ نے اس ناواجب نکتہ چینی کا ازالہ فرمایا، باقی سارا افسانہ ہے۔زوائد حاشیے ہیں جو بہت بعد کی پیداوار ہیں اور وضع حدیث کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

---

[1] علیّ و بنوہ لطٰہٰ حسین مصری صفحہ ۶۵، ۶۸، ۷۶، ۸۳، ۱۴۲، ۱۷۷-۱۷۸، ۱۸۳، ۱۸۵ بحوالہ بلاذری، طبری، مقاتل الطالبین

حضرت علی کے بارہ میں وصیّت کی جو روایات ہیں ان میں سے ایک روایت یوں ہے کہ جب آیت کریمہ وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ [1] اتری تو آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو (جن کی عمر اس وقت دس سال کے قریب تھی) بلا کر کہا کہ میں اپنے رشتہ داروں کی دعوت کرنا چاہتا ہوں اس کا انتظام کرو اور اس کے لئے بنو عبد المطلب کو بلاؤ۔ چنانچہ جب وہ سب آ گئے تو کھانا پیش کیا گیا جب سب کھا چکے تو آپ نے تبلیغ شروع کی اور فرمایا کہ میں ایک بہترین پیغام لایا ہوں اسے قبول کرو اور میری مدد کرو۔ جو سبقت کرے گا وہ میرا بھائی، میرا وصی اور خلیفہ ہوگا۔ سب نے انکار کیا صرف علیؓ نے کہا کہ میں قبول کرتا ہوں۔ اس پر آپ نے علیؓ کو گردن سے پکڑا اور کہا یہ میرا بھائی، میرا وصی اور خلیفہ ہوگا۔ اس پر لوگ ہنستے ہوئے اُٹھ کر چلے گئے۔

یہ روایت متعدد الفاظ میں مختصراً اور تفصیلاً مختلف کتب میں آئی ہے۔ اس وقت میرے سامنے تاریخ طبری ہے جس کے صفحہ ۲۱۶ جلد ۲ پر یہ حدیث مفصّل درج ہے لیکن اس کے راویوں میں کوئی ضعیف ہے تو کوئی کذاب مثلاً اس روایت کا پانچواں راوی اَلْمِنْھال بِنْ عَمرو ہے جس کو اسماء الرجال کے بعض ماہرین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اُسے سَیِّئُ الْمَذْھَب کہا ہے۔ ابن حزم نے بھی اس پر اعتراض کئے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ یہ دو درہموں کے لئے بھی گواہی دے تو قبول نہ کرو۔ پھر یہ عبداللہ بن الحارث سے یہ حدیث روایات کرتا ہے حالانکہ براہ راست اس نے یہ حدیث عبداللہ سے نہیں سنی اور درمیان میں راوی رہ گیا ہے۔ بعض روایات میں سعید بن جُبیر کا ذکر آتا ہے۔ بہر حال یہ روایت منقطع ہے۔ اس کا چوتھا راوی عبد الغفار بن القاسم ہے۔ علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ یہ غیر ثقہ اور رافضی ہے۔ علی مدینی کہتے ہیں کہ یہ حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ یحییٰ بن مُعین کہتے ہیں لَیْسَ بِشَیْءٍ یہ بے حیثیت انسان ہے۔ امام بخاری کہتے ہیں اہل حدیث اسے قوی نہیں مانتے۔ ابو داؤد کہتے ہیں یہ کذاب ہے۔ النسائی کہتے ہیں یہ متروک الحدیث ہے۔ ...... ابن حبان کہتے ہیں۔ یہ شراب پیا کرتا تھا۔ احادیث کو اُلٹ پلٹ کر دیا کرتا تھا۔ لَایَجُوْزُ الْاِحْتِجَاجُ بِہٖ اس کو بطور سند قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح باقی راویوں میں سے کسی پر کذاب ہونے کا الزام لگا ہے اور کسی کو ضعیف اور متروک الحدیث قرار دیا گیا ہے۔ غرض وصیّت سے

---

[1] الشعراء: ۲۱۵

متعلق تمام روایات کی اگر چھان بین کی جائے تو کوئی بھی روایت ایسی نہیں ملے گی جس کی سند کے سارے راوی ثقہ اور مقبول الحدیث ہوں۔ ایسے ہی راوی ملیں گے جن میں سے کوئی ضعیف ہے، کوئی متروک الحدیث ہے اور کوئی کذاب ہے۔

یاد رہے کہ ابن جریر طبری تیسری صدی کے ایک مؤرخ ہیں اور جیسا کہ اس زمانہ میں رواج تھا کہ ہر رطب و یابس جو سُنا تاریخ میں درج کر دیا جاتا تھا۔ یہ ناقدین کا کام ہے کہ وہ صحیح اور غلط کی چھان بین کریں اور درست اور نادرست میں امتیاز کی راہیں نکالیں۔

خود شیعہ مصادر میں یہ روایت موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ کا کوئی صریح اور مستند ارشاد موجود نہیں جس کا تعلق حضرت علیؓ کے حق میں وصیّت سے ہو۔ چنانچہ ایک شیعہ مؤرخ لکھتے ہیں۔ قَالَ صَاحِبُ كِتَابِ الْمَهْدِيَّةُ فِي الْإِسْلَامِ لَمَّا كَانَ الرَّسُوْلُ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِ قَدْ لَحِقَ بِالرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى دُوْنَ اَنْ يُدْلِيَ بِرَأْيٍ صَرِيْحٍ يَنْقُلُهُ اِلَيْنَا مَصْدَرٌ مُوَثَّقٌ بِهٖ (فِيْ اَمْرِ النِّيَابَةِ وَ الْخِلَافَةِ) فَقَدْ تَشَعَّبَتِ الْاٰرَآءُ وَ تَبَايَنَتِ الْاَهْوَآءُ [1] یعنی آنحضرت ﷺ نے وفات سے پہلے خلافت اور نیابت کے بارہ میں کسی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کوئی مستند قابل اعتبار روایت کسی ایسی رائے کے اظہار کے بارہ میں موجود نہیں ہے۔

نهج البلاغه

ایک بے سند مجموعہ ہے جو دوسری صدی کے آخر میں ترتیب کے مراحل سے گزرا۔ یہی حال اُن کتابوں کا ہے جو الوصیّت یا اثبات الوصیّت کے نام سے فروغ پائیں جن کے ذریعہ ایک یہودی نژاد منافق کے تصوّر کو پروان چڑھایا گیا۔ دراصل فتنہ کے دور میں بنو اُمیّہ کے مقابل میں اس دَوڑ کا آغاز ہوا۔ پھر اتنی روایات گھڑی گئیں کہ حضرت امام شافعی کو مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ مَا رَأَيْتُ فِيْ اَهْلِ الْاَهْوَاءِ قَوْمًا اَشَدَّ بِالزُّوْرِ مِنَ الرَّافِضَةِ وَضَعُوْا فِيْ فَضَائِلِ عَلِيٍّ وَ اَهْلِهٖ آلَافَ الْاَحَادِيْثِ [2] حالانکہ امام شافعی حُبِّ اہل بیت نبوی میں مشہور تھے اور آپ نے اس سلسلہ میں مشکلات اور اعتراضات کا سامنا بھی کیا۔

---

[1] تاریخ الفرق الاسلامیة صفحه ۱۱ [2] الامام الشافعی صفحه ۲۱۳

چنانچہ آپ نے بعض اوقات شعر کے ذریعہ اس قسم کی مشکلات کا ذکر فرمایا۔مشہور ہے کہ آپ بطور تمثیل یہ شعر بکثرت پڑھتے۔

اِنْ کَانَ رَفْضًا حُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ فَلْیَشْهَدِ الثَّقَلَانِ اَنِّیْ رَافِضِیْ

شیعہ روایات میں وصیت کی دلیل کا ذکر پہلی بار ۳۰۰ھ کے بعد حضرت امام جعفرؒ کی طرف منسوب چند روایتوں میں آیا ہے۔انہوں نے بھی کسی روایت میں یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ واقعہ کس ذریعہ سے اُن تک پہنچا ہے۔نیز ان سے بعض روایات میں یہ ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو یہ تاکید کر دی تھی کہ وہ کسی سے اس وصیّت کا ذکر نہ کریں۔اس راز کے انکشاف کے پہلے مجاز حضرت امام جعفر صادق بیان کئے گئے ہیں۔[1]

پس جو وصیت ایسی ہے جس کا دوسروں کو علم ہی نہیں اور جن قریبی لوگوں کو علم ہے ان کو انکشاف کی اجازت نہیں وہ وصیت دوسرے لوگوں کے لئے حجت کیسے ہو سکتی ہے؟

پھر جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے اور واقف حال لوگ جانتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؒ کی طرف اتنی متضاد روایات منسوب کی گئی ہیں کہ اعتبار کی کوئی بنیاد ہی باقی نہیں رہتی اور اس قسم کے تضاد کی بناء پر محققین نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ متعدد مفاد پرست عناصر آپ کے نام سے فائدہ اُٹھا کر آپ کی طرف منسوب کر کے ایسی غلط باتوں کو رواج دیتے رہے جن کی اسلام میں کوئی اصل نہیں بلکہ وہ باتیں اسلامی احکام کے صریح خلاف ہیں۔[2] خود شیعہ حضرات کی اکثریت بھی بالعموم صحیح معنوں میں وصیّت کے عقیدہ پر قائم نہیں رہی۔

کوئی پہلے امام کو ہی مہدی مانتا تھا، کوئی تیسرے امام پر بس ہو گیا۔کوئی چوتھے پانچویں وغیرہ کو آخری امام مانتا تھا اور شیعہ اثنا عشریہ بارہویں امام پر آ کر رہ گئے اور اُس کو زندہ، غائب اور مہدی منتظر

---

[1] اصول الکافی للکلینی جلد ۲ صفحہ ۲۷۸۔ مرتبہ ثقة الاسلام ابو جعفر محمد بن یعقوب الکلینی المتوفی ۳۲۹ھ ۔دار الکتب الاسلامیہ تہران طبع ثالث ۱۳۸۸ھ۔ اثبات الوصیة صفحہ ۱۲۱ علامہ ابو الحسن علی بن الحسین المسعودی المتوفی ۳۴۶ھ مکتبہ بصیر فی قم ایران طبع خامس.

[2] دعائم الاسلام صفحہ ۶۳، ۶۴۔ ابو حنیفہ النعمان بن محمد المغربی الشیعی الاسماعیلی دار المعارف مصر ۱۹۵۱ء.

[3] اصول الکافی جلد اوّل صفحہ ۲۸۸

ماننے پر مجبور ہوئے۔ جب غائب اور منتظر ہی ماننا ہے تو پھر اُن لوگوں کا مسلک کیوں نہ صحیح سمجھ لیا جائے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو زندہ، غائب اور مہدی منتظر مانتے ہیں۔ بارھویں امام تک سلسلہ چلانے کے تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ اس سے تو اسماعیلی شیعوں کا مسلک زیادہ معقول ہے جو امام حاضر کی بیعت کے قائل ہیں اور ایک امام کے فوت ہو جانے کے بعد دوسرے امام کو مان لیتے ہیں۔[۱]

---

[۱] تفصیلی حوالہ جات کے لئے دیکھیں۔ الطبقات ابن سعد جلد ۳ صفحہ ۱۴ دار صادر بیروت ۱۹۵۷ء۔ تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۸۳، لاحمد بن یعقوب دار صادر بیروت ۱۹۶۰ء۔ اصول الکافی جلد اول صفحہ ۲۴ و ۲۷۸۔ ثقة الاسلام ابو جعفر محمد بن یعقوب الکلینی المتوفی ۳۲۹ھ دار الکتب الاسلامیہ تہران طبع ثالث ۱۳۸۸ھ۔ نہج البلاغة جلد اوّل صفحہ ۲۴۔ الشریف ابو الحسن محمد الرضی ناشر دار البلاغة مطبعة الاستقامة بیروت لبنان طبع ۱۹۸۵ء۔ مقاتل الطالبین صفحہ ۳۸ تا ۴۳، ابو الفرج الاصفہانی المتوفی ۳۵۶ھ دار المعرفة بیروت لبنان۔ المہدیة فی الاسلام صفحہ ۱۸۲ سعد محمد حسن من علماء الازہر مطبع دار الکتب العربی مصر طبع ۱۹۵۳ء۔ تاریخ الامم و الملوک جلد ۲ صفحہ ۲۱۶ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری المتوفی ۳۱۰ھ مطبع الحسینیہ المصریہ طبع اول۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال جلد ۲ صفحہ ۱۹۲، جلد ۳ صفحہ ۳۶۸، و ۵۳۰، جلد ۴ صفحہ ۱۹۲۔ ابو عبد اللّٰہ محمد بن احمد الذہبی المتوفی ۷۴۸ھ مطبع عیسیٰ البابی الحلبی۔ تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۳۱۹۔ ابو الفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ مطبع دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد دکن طبع اوّل. کتاب المجروحین من المحدثین والضعفاء والمتروکین جلد ۲ صفحہ ۱۴۳ و ۳۰۳۔ امام محمد بن حبّان المتوفی ۳۵۴ھ ناشر دار الوعی حلب سوریہ ۱۹۷۵ء۔ الکشف الحثیث عمن روی بوضع الحدیث زیر لفظ محمد بن حُمَید۔ برہان الدین الحلبی المتوفی ۸۴۱ء ناشر احیاء التراث الاسلامی مطبع العانی بغداد)

شیعوں کے بڑے ضمنی فرقے

شیعوں کے مندرجہ ذیل بڑے بڑے ضمنی فرقے ہیں:۔

اَلْاِمَامِیَّہ. اَلزَّیْدِیَّہ. اَلْکَیْسَانِیَّہ.

اَلْاِمَامِیَّہ کے مزید ذیلی فرقے ہیں۔

اَلْمُحَمَّدِیَّہ. اَلْبَاقِرِیَّہ. اَلنَّاؤُوْسِیَّہ. اَلشَّمِیْطِیَّہ. اَلْعِمَارِیَّہ. اَلْمُوْسَوِیَّہ. اَلْقَطْعِیَّہ.

اَلْاِثْنَا عَشْرِیَّہ.

اَلاِمَامِیَّۃ کے غلو پسند فرقے یہ ہیں:۔

اَلْاِسْمَاعِیْلِیَّہ . اَلْھَشَّامِیَّہ . اَلزُّرَارِیَّہ . اَلْیُوْنُسِیَّہ . اَلشَّیْطَانِیَّہ . اَلْکَامِلِیَّہ

فرقہ زَیْدِیَّہ کے ذیلی فرقے تین ہیں۔

اَلْجَارُوْدِیَّہ . اَلسُّلَیْمَانِیَّہ . اَلْبُتْرِیَّہ

الکیسانیہ کے ذیلی فرقے دو ہیں۔ایک فرقہ کی رائے ہے کہ امام محمد بن الحنفیۃؒ زندہ ہیں وہ ''مہدی منتظر'' ہیں جبکہ دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ امام محمد بن الحنفیۃؒ فوت ہو چکے ہیں اور اُن کے بعد ان کے جانشین اور وصی اُن کے صاحبزادے ابو ہاشم عبداللہ ہیں۔الکیسانیہ فرقہ کا بانی مختار ثقفی تھا۔

شیعوں کے غلو پسند فرقے جو امامیہ میں شمار نہیں ہوتے مندرجہ ذیل ہیں:۔

اَلسَّبَئِیَّہ . اَلْمُغِیْرِیَّہ . اَلْمَنْصُوْرِیَّہ . اَلْجُنَاحِیَّہ . اَلْخَطَابِیَّہ . اَلْبَاطِنِیَّہ . اَلْحَلُوْلِیَّہ

ان سب فرقوں میں سے جو اہم ہیں اُن کا مختصر بیان آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

شیعوں کا بڑا ضمنی فرقہ اَلْاِمَامِیَّہ

''شیعہ امامیہ'' شیعوں کے اُن فرقوں کا نام ہے جو حضرت علیؓ اور اُن کی فاطمی اولاد میں امامت اور خلافت کو محدود مانتے ہیں نیز یہ امامت اور خلافت میں وراثت اور نص کے قائل ہیں اور ائمّت کے حقِ انتخاب کو تسلیم نہیں کرتے۔

شیعہ امامیہ کئی ذیلی فرقوں میں منقسم ہیں جن میں سے بعض کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔اَلْمُحَمَّدِیَّہ۔ یہ فرقہ حضرت علیؓ، امام حسنؓ، امام حسینؓ، امام حسن مثنیؒ اور امام عبداللہ کے بعد محمد النفس الزکیہ بن عبداللہ بن حسن المثنی بن حسن بن علیؓ کی امامت کا قائل تھا اور ان کو آخری امام اور مہدی منتظر مانتا تھا یعنی ایسا مہدی جو نظروں سے غائب ہو گیا ہے اور آئندہ کسی وقت ظاہر ہوگا۔ وہ ظلم و جور کو ختم کرے گا اور دُنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ یہ فرقہ امام محمدؒ کو اُس حدیث کا مصداق قرار دیتا تھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ مہدی کا نام وہی ہوگا جو میرا نام ہے یعنی **محمد** اور اس کے والد کا نام میرے والد کے نام کی طرح عبداللہ ہوگا۔ اس فرقہ کے نزدیک امام **محمد** نہ قتل ہوئے ہیں اور نہ طبعی موت مرے ہیں بلکہ نجد کے ایک پہاڑ میں پناہ گزیں ہیں، مناسب وقت میں ظاہر ہوں گے اور ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔

امام محمد بن عبداللہ اور ان کے دو بھائی ابراہیم اور ادریس بڑے پائے کے بزرگ گزرے ہیں۔ علم و زہد میں یکتا تھے۔ اس وقت کے قریباً سارے محدثین اور فقہاء اُن سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کے حامی تھے۔ امام محمد مدینہ منورہ میں عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کے خلاف اُٹھے کیونکہ منصور اُن کے قتل کے درپے تھا۔ یہ حجاز کے سارے علاقے پر قابض ہو گئے تھے اور ان کے بھائی امام ابراہیم نے بصرہ پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ دوسرے بھائی ادریس بلاد مغرب میں غالب آئے لیکن یہ ساری کامیابی عارضی ثابت ہوئی اور تینوں بھائی مارے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ ان ائمہ کی حمایت کی وجہ سے ہی امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ دونوں ابو جعفر منصور کے زیر عتاب آئے امام محمد کے والد امام عبداللہ کو مع خاندان ابو جعفر منصور نے قید کر لیا اور انہیں بڑی اذیتیں دیں اور وہ اور ان کے خاندان کے بعض افراد قید خانہ میں ہی سختیاں جھیلتے ہوئے فوت ہو گئے۔

امام محمد بن عبداللہ کی شہادت کے بعد ان کے ایک عقیدت مند اَلْمُغِیْرَۃ بِنْ سَعِیْد اَلْعَجَلِیْ نے یہ دعویٰ کیا کہ محمد قتل نہیں ہوئے بلکہ غائب ہو گئے ہیں مناسب وقت میں ظاہر ہوں گے۔ جابر بن یزید جعفی کا نظریہ بھی یہی تھا گویا ان کے نزدیک امام محمد مہدیٔ منتظر ہیں۔ جُعفی کہا کرتا تھا کہ قیامت سے پہلے دُنیا کے سب مُردے زندہ کر کے واپس لائے جائیں گے تا کہ مہدی کی شان و شوکت اور عظمت کو دیکھ سکیں۔[۱]

---

[۱] الفرق بین الفرق صفحہ ۳۹ ۔ فرق الشیعہ صفحہ ۶۲

۲۔اَلْبَــاقِرِیَّۃ۔ یہ فرقہ حضرت علیؓ، امام حسن، امام حسینؓ، امام زین العابدینؒ کے بعد اُن کے بڑے بیٹے امام محمد باقر کو آخری امام اور ''مہدی منتظر'' مانتا تھا۔اس فرقے کا عقیدہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کے امام ہونے کی تصریح فرمائی تھی۔اس کے بعد ہر امام نے اپنے جانشین کو نامزد کیا اور اس کو امام ماننے کی وصیت کی۔یہ فرقہ بھی مانتا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے کہا کہ تم میرے بیٹے ''محمد باقر'' سے ملو گے جب ملو تو ان کو میرا اسلام پہنچانا۔چنانچہ کہا جاتا ہے کہ حضرت جابرؓ نے بڑی لمبی عمر پائی۔عمر کے آخری حصہ میں آپ کی نظر جاتی رہی۔ایک دن وہ مدینہ کی گلی سے گزر رہے تھے کہ ایک لونڈی محمد باقر کو اٹھائے ہوئے گزری۔جابرؓ نے اس سے پوچھا یہ لڑکا کون ہے جس کو تم اٹھائے ہوئے ہو؟ اس نے بتایا کہ یہ امام علی زین العابدین کا بیٹا محمد ہے۔چنانچہ جابرؓ نے ان کو لے کر اپنے سینے سے لگایا پیار کیا اور کہا کہ میں تمہیں تمہارے نانا کا سلام پہنچاتا ہوں۔جابرؓ آنحضرت ﷺ کے اس حکم کی تعمیل کے بعد جلد فوت ہو گئے۔[۱]

۳۔اَلنَّاوُوْسِیَّہ۔ یہ فرقہ امام محمد باقرؒ کے بعد ان کے بیٹے امام جعفر صادق کو آخری امام اور ''مہدی منتظر'' مانتا تھا۔اِس فرقے کا نظریہ تھا کہ امام جعفرؒ تمام علوم کے جامع اور ماہر ہیں۔وہ علم دین کا ہو یا عقلیات سے تعلق رکھتا ہو وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ان کا یہ علم لدُنی ہے یعنی خدا کی طرف سے ان کو عطاء ہوا تھا اس میں اُن کے کسب یا کسی سے سیکھنے کا کوئی دخل نہیں تھا۔[۲]

۴۔اَلشُّمَیْطِیَّہ۔ یہ فرقہ امام جعفرؒ کی موت کا قائل تھا وہ البتہ امامت کو ان کی اولاد میں منحصر تسلیم کرتا تھا اور یہ کہ امام مہدی انہی کی اولاد میں سے ظاہر ہوگا، گویا یہ فرقہ امامیہ اثناعشریہ کا پیش رَو ہے لیکن یہ امام جعفر صادق کے بیٹے امام موسیٰ کاظم کی بجائے اُن کے دوسرے بیٹے محمد بن جعفر کی امامت کا قائل ہے۔[۳]

۵۔اَلْاِسْمَاعِیْلِیَّہ۔ یہ فرقہ حضرت امام جعفر کے بیٹے امام اسمٰعیل کو امام منصوص مانتا ہے یعنی امام جعفر نے اپنے بعد ان کے امام ہونے کا اعلان کیا تھا۔اگر چہ امام اسمٰعیل حضرت جعفر کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے تھے لیکن اس فرقے کا نظریہ ہے کہ جب امام وقت باعلام الٰہی ایک دفعہ کسی کو اپنا

۱؎ الفرق بین الفرق صفحہ ۴۰
۲؎ الفرق بین الفرق صفحہ ۴۱
۳؎ الفرق بین الفرق صفحہ ۴۱

جانشین مقرر کردے تو پھر یہ نص کسی حال میں بھی منسوخ نہیں ہو سکتی اور آئندہ امامت اس منصوص علیہ کی اولاد اور نسل کی طرف جاتی ہے اس لئے ان کی نزدیک امام جعفرؓ کی وفات کے بعد امام اسمٰعیل اور ان کی اولاد کو امام تسلیم کیا جانا چاہیے۔بہر حال اس اصولی نظریہ پر متفق ہونے کے بعد یہ فرقہ کئی ضمنی شاخوں میں بٹ گیا مثلاً۔

(الف) ایک گروہ کے نزدیک امام اسمٰعیل فوت نہیں ہوئے بلکہ وہ زندہ ہیں اور آخری امام اور ''مہدیٔ منتظر'' ہیں۔ان کی آگے کوئی اولاد یا نسل نہیں تھی۔وہی آخری زمانہ میں ظاہر ہوں گے اور امام مہدی کے فرائض سرانجام دیں گے۔

(ب) ایک فرقے کے نزدیک امام اسمٰعیل فوت ہو چکے ہیں اور اُن کے بعد اُن کے بیٹے محمد بن اسمٰعیل امام بنے۔وہ مہدیٔ منتظر اور القائم صاحب الزمان ہیں۔وہ روم کے علاقہ میں زندہ موجود ہیں آخری زمانہ میں ظاہر ہوں گے اور شریعت اسلامیہ کو منسوخ کر کے نئی شریعت جاری کریں گے۔

(ج)۔ ایک تیسرے گروہ کے نزدیک امام محمد بن اسمٰعیل کی اولاد میں امامت جاری ہے۔اِسی نسل کے ائمہ بعد میں حکومت عبیدیہ اور فاطمیہ کے بانی بنے۔اسماعیلیہ باطنیہ کی بھی یہی رائے ہے اور موجودہ آغاخانی شیعہ اور بوہرے بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں جیسا کہ آئندہ صفحات میں اس کی تفصیل اپنی جگہ پر آئے گی[1]۔

۶۔الموسویّہ۔ اس فرقہ کو العمّاریہ اور المَمْطُوریہ بھی کہا جاتا ہے۔یہ فرقہ امام جعفرؓ کے بعد اُن کے بیٹے امام موسیٰ کاظم کو آخری امام اور ''مہدی منتظر'' مانتا تھا[2]۔

۷۔القطعیّہ یا الاثناعشریّہ۔ اس فرقے کا ایک نام اَصْحَابُ الْاِنْتِظار بھی ہے۔اس فرقہ کا نام ''اَلْقَطْعِیَّہ'' اس وجہ سے ہے کہ یہ موسویہ فرقہ کے برخلاف امام موسیٰ کاظم کی وفات کا قائل ہے۔اَیْ اَنَّهُمْ قَطَعُوْا بِمَوْتِ مُوْسَى الْكَاظِمِ بِخَلَافِ الْمُوْسَوِيَّةِ

شیعہ اثناعشریہ ''ائمہ منصوصہ'' کی مندرجہ ذیل ترتیب مانتے ہیں۔

حضرت علیؓ، امام حسنؓ، امام حسین، امام علی زین العابدین، امام محمد باقر، امام جعفر صادق، امام موسیٰ کاظم، امام علی الرضا، امام محمد الجواد، امام علی الہادی، امام الحسن العسکری اور امام محمد بن الحسن العسکری۔

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۴۲ [2] الفرق بین الفرق صفحہ ۴۲

یہ آخری بارھویں امام اثناعشریہ کے نزدیک امام غائب یا مہدی منتظر تسلیم کئے گئے ہیں۔ یہ عباسی حکومت کی مشہور چھاؤنی سُـرَّ مَـنْ رَایٰ" .... میں اپنے باپ کے ایک تہ خانہ میں غائب ہوئے اور اب تک غائب ہیں۔ آخری زمانہ میں ظاہر ہوں گے اور دُنیا سے ظلم و جور کو مٹائیں گے اور اُسے عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔

امام غائب کی غیبوبت کے دو دور

محمد بن الحسن العسکری "المہدی المنتظر" جب غائب ہوئے تو ان کی عمر کیا تھی؟ اس بارہ میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک اڑھائی سال بعض کے نزدیک چار سال اور بعض کے نزدیک آٹھ سال تھی۔ ان کی غیوبت کا زمانہ دو حصوں میں منقسم مانا گیا ہے: "**غیبوبت صغریٰ**" جو ۲۶۰ھ تا ۳۲۹ھ تک کا زمانہ ہے۔ اس عرصہ میں امام غائب کے چار سفیر اُن کی قائم مقامی کرتے رہے وہ چار سفیر یہ ہیں:

۱۔ عثمان بن سعید ۲۔ محمد بن عثمان الشیخ الخلاّنی ۳۔ الحسین ابن روح اللہ النّوبختی اور آخری سفیر علی بن محمد السّمرہ المتوفیٰ ۳۲۹ھ۔ اس آخری سفیر نے اپنی وفات سے پہلے ایک "توقیع" (از قسم پروانہ) جاری کیا جس میں یہ اطلاع تھی کہ اب **غیبُوبت صُغریٰ** کا زمانہ ختم ہے اور **غیبُوبت کُبریٰ** کا دَور شروع ہو رہا ہے جو مہدی منتظر کے ظہور تک جاری رہے گا۔[1]

اس عرصہ میں شیعہ اثناعشریہ کے علماء اور مجتہد امام غائب کی قائم مقامی، عوام کی رہنمائی اور تنظیم اور دین کی اشاعت کا فریضہ سرانجام دیتے رہیں گے۔ یہی فرقہ امامیہ اثناعشریہ ان دنوں ایران میں برسرِ اقتدار ہے اور عراق، ہندوستان اور پاکستان وغیرہ علاقوں میں بکثرت پایا جاتا ہے اور انتہائی توسیعی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ شیعہ اثناعشریہ کی فقہ جو "فقہ جعفریہ" کے نام سے مشہور ہے ایک قابل مطالعہ علمی سرمایہ ہے۔[2]

---

[1] فرق الشیعۃ ص صفحہ ۱۰۳ حاشیہ۔ تاریخ الشیعہ صفحہ ۷۱ تا ۷۴۔
الدولۃ الفاطمیۃ صفحہ ۳۶

[2] الشیعۃ فی التاریخ صفحہ ۷۴ تا ۷۶ محمد حسین الزین العاملی. مطبع العرفان . صیداء طبع ۱۹۳۸ء۔
الفرق بین الفرق صفحہ ۴۳

شیعہ اثنا عشریہ کے بعض مخصوص مسائل

اَلْاِمَامة ۔ شیعہ حضرات کے نزدیک مسلمانوں کی دینی رہنمائی اور قیادت کے لئے امام کا ہونا ضروری ہے۔یہ امام بذریعہ نص اور وصیّت اہل بیت النبیؐ میں سے نامزد ہوگا۔پہلے تین امام حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ باعلام الٰہی آنحضرت ﷺ کی طرف سے منصوص ہیں یعنی حضور ﷺ نے ان کے حق میں وصیت فرمائی تھی کہ میرے بعد یہ تینوں یکے بعد دیگرے امام ہوں گے اور اُمت کی قیادت کا فریضہ سرانجام دیں گے۔اس کے بعد ہر امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے جانشین کے بارہ میں وصیّت کرے کہ میرے بعد اہل بیت یعنی حضرت علیؓ کی فاطمی اولاد میں سے فلاں امام ہوگا۔غرض شیعہ امامیہ اثنا عشریہ کے نزدیک امامت اور دینی قیادت نص وصیّت اور وراثت کی بنا پر قائم ہوتی ہے اس بارہ میں اُمت مسلمہ کو انتخاب یا شوریٰ کا کوئی حق حاصل نہیں ۔[1]

وصیّت ۔ شیعہ اثنا عشریہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو حکم تھا کہ وہ وفات سے پہلے اپنی جانشینی کے لئے علیؓ کے بارہ میں وصیّت کر جائیں ۔ چنانچہ آپ نے حسب الحکم یہ اعلان فرمایا کہ میرے بعد علیؓ امت مسلمہ اور قائد ہوں گے اس لئے علی وصی اللہ اور وصی الرسول اور خلیفہ بلافصل ہیں اور ان کے بعد ان کی فاطمی اولاد بطریق وصیّت ونص اس منصب پر فائز ہوتی چلی جائے گی کو بارھویں امام پر یہ وصیّت ختم ہے۔[2]

العلم ۔ قرآن کریم اور دین کا علم امام کو اللہ تعالیٰ اُس کے رسول یا امام سابق کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے گویا ان علوم کا وہ پیدائشی عالم ہوتا ہے ۔اُسے کسی اور سے پڑھنے اور دینی علم سیکھنے کی ضرورت نہیں ۔ایسے علم کا اصطلاحی نام عِلم لدُنی ہے جو آیت کریمہ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا [3] سے ماخوذ ہے ۔[4،5]

---

[1] اصول الکافی صفحہ ۳۹

[2] اصل الشیعة و اصولها صفحہ ۶۸،۷۴ ۔ طرائق الحقائق جلد ۲ صفحہ ۷ [3] الکهف:٦٦

[4] لیس یحتاج احد منهم ان یتعلم من احد منهم ولا من غیرهم . العلم ینبت فی صدورهم کما ینبت الزرع المطر فالله عز وجل علمهم بلطفه کیف شاء. فرق الشیعة صفحہ ۵۵،۵٦

[5] اصول الکافی صفحہ ٦١تا۵۲ . فرق الشیعة صفحہ ۵٦

اَلْعِصْمَۃ۔ انبیاء کی طرح امام بھی معصوم ہوتے ہیں۔ دینی رہنمائی میں وہ غلطی نہیں کر سکتے کیونکہ نبی کی طرح ان کی ذمہ واری بھی لوگوں کی رہنمائی ہوتی ہے اگر اس بارہ میں اُن سے غلطی کا امکان ہو تو امان اور اعتماد اُٹھ جائے گا۔[۱]

اَلْمَهْدَوِیَّة۔ قریباً سارے مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جب اُمّت محمدیہ بگڑ جائے گی تو اس کے بگاڑ کو دُور کرنے اور اس کی شوکتِ رفتہ کو بحال کرنے کے لئے ایک عظیم الشان وجود مبعوث ہوگا جس کا موعود نام **''مہدی''** بتایا گیا ہے۔ شیعہ اثنا عشریہ کے نزدیک یہی عظیم وجود ''مہدی منتظر'' ہے یعنی جب وہ پیدا ہوا تو بعض حالات کی بنا پر بالفاظ دیگر الٰہی تقدیر کے تحت غائب ہو گیا اور اس وقت اپنا مشن پورا نہ کر سکا لیکن کسی مناسب وقت میں جس کا علم خدا کو ہے وہ اس دنیا میں واپس آئے گا۔ عظیم الشان فتوحات حاصل کرے گا، ظلم و جور کا قلع قمع کرے گا۔ عدل و انصاف کی وجہ سے سب کے دل جیت لے گا۔ شیعہ اثنا عشریہ کے عقیدہ کے مطابق یہ ''مہدی منتظر'' محمد بن الحسن العسکری ہیں جو بچپن میں ہی غائب ہو گئے تھے اور دوبارہ آنے کے لئے اللہ کے حکم اور اس کی طرف سے اجازت کے منتظر ہیں۔[۲]

اَلرَّجْعَة۔ رَجْعَت کے معنے یہ ہیں کہ دُنیا سے جانے کے بعد دوبارہ اس دنیا میں واپس آنا خواہ فوت ہو جانے کے بعد خواہ زندہ آسمان کی طرف چلے جانے یا زمین کے کسی حصہ میں غائب ہو جانے کے بعد۔ رجعت کا عقیدہ دراصل ''مہدی منتظر'' کے عقیدہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہوا یوں کہ ایک امام کے ساتھ بہت سی اُمیدیں وابستہ کی گئیں کہ وہ یوں دشمنوں پر غالب آئے گا، اپنے پیرووں کے ساتھ سارے مصائب کا خاتمہ کر دے گا، ظالموں کو نیست و نابود کر دے گا، عدل و انصاف سے دنیا کو بھر دے گا لیکن ان سب امیدوں کے برعکس لوگوں کی بدقسمتی سے وہ اپنے مشن کی تکمیل سے پہلے فوت ہو گیا یا دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا تو اس کے پیرووں میں یہ خیال بطور عقیدہ عام ہو گیا کہ ان کے یہ امام فوت نہیں ہوئے بلکہ غائب ہو گئے ہیں اور کسی وقت دوبارہ آ کر اپنے مشن کو پورا کریں گے۔ اس طرح اس خیال نے ''مہدی منتظر'' کے عقیدہ کو جنم دیا۔ بعض کے نزدیک وہ امام فوت تو ہو گئے لیکن دوبارہ زندہ ہو کر وہ اپنے مشن کی تکمیل کریں گے۔ بہر حال شیعہ اثنا عشریہ

۱۔ تصحیح الاعتقاد صفحہ ۶۱ ۔ عقیدۃ الشیعۃ صفحہ ۲۲۴

۲۔ فرق الشیعۃ صفحہ ۳۸ تا ۴۲ ۔ البیان فی اخبار صاحب الزمان صفحہ ۳۰۵

مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے دوبارہ زندہ ہو کر اس دُنیا میں آنے کے عقیدہ کو درست تسلیم کرتے ہیں اور رجعت کے عقیدہ کو مانتے ہیں۔[1]

التقیہ۔ شیعہ اثنا عشریہ تقیہ کے بھی قائل ہیں۔تقیہ کے معنے یہ ہیں کہ اگر مصلحت کا تقاضا ہو، جان کا خطرہ ہو یا دشمن نقصان پہنچانا چاہتا ہو تو عقیدہ کو چھپالینا اور جو دل میں ہے اُس کے خلاف ظاہر کرنا درست ہے اور بعض اوقات تو ایسا کرنا واجب اور ضروری ہو جاتا ہے۔اس طرز عمل کا جواز حضرت عمار بن یاسرؓ کے ایک واقعہ سے مستنبط ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔وہ واقعہ یوں ہے کہ ایک دفعہ مکّہ کے کفار نے عمار کو پکڑ کر خوب مارا اور کہا کہ وہ اسلام سے انکار کرے، محمد ﷺ کو گالیاں دے ورنہ اُسے قتل کر دیا جائے گا۔اس سے پہلے وہ عمارؓ کے والد اور والدہ کو قتل کر چکے تھے۔عمار ڈر گئے اور انہوں نے کفار کا کہنا مان لیا لیکن بہت پچھتائے اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر خوب روئے اور معذرت کی آپ نے دریافت فرمایا ’’تمہارے دل کی کیا حالت ہے؟‘‘ عمار نے عرض کیا دل میں تو پورا پورا ایمان ہے۔ آپ نے فرمایا تو پھر فکر کی کوئی بات نہیں اگر وہ دوبارہ پکڑیں تو پھر ایسا ہی کرو اِنْ عَادُوْا فَعُدْ آیت کریمہ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىٕنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ[2] میں اسی اجازت کی طرف اشارہ ہے۔[3]

البَداء۔ شیعہ اثنا عشریہ بَداء کے نظریہ کو بھی مانتے ہیں۔بَداء کے نظریہ کی تشریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک فیصلہ فرماتا ہے اور نبی یا امام وقت کو اطلاع دیتا ہے کہ اس فیصلہ کا اعلان کر دو اور وہ اعلان کر دیتا ہے لیکن کسی مصلحت کے تحت اللہ تعالیٰ اپنے پہلے فیصلہ اور ارادہ کو بدل دیتا ہے اور اُسے منسوخ کر دیتا ہے اور کوئی دوسرا فیصلہ کر لیتا ہے، گویا اللہ تعالیٰ کے سامنے پہلے فیصلہ کی بجائے ایک نیا فیصلہ آیا اور ایک نئی صورتِ حال ظاہر ہوئی۔مثلاً حضرت امام جعفر صادق نے باعلام الٰہی اپنے بڑے بیٹے اسمٰعیل کے حق میں وصیّت کی تھی اور کہا تھا کہ میری وفات کے بعد یہ میرا جانشین ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی لیکن بقضائے الٰہی اسمٰعیل امام جعفر صادق کی زندگی میں فوت ہو گیا۔گویا خدا نے اپنے پہلے فیصلے کو بدل دیا اور اس کے سامنے یہ آیا کہ اسمٰعیل کی بجائے امام جعفر صادق کا دوسرا

---

[1] اعتقادات الصدوق صفحہ ۲۰ ۔ المھلیۃ فی الاسلام صفحہ ۱۰۵ ۔ فرق الشیعۃ صفحہ ۲۹

[2] النحل:۱۰۷

[3] اعتقادات الصدوق صفحہ ۴۴ ۔ تصحیح الاعتقاد صفحہ ۲۲۹ ۔ اصل الشیعۃ و اصولھا صفحہ ۱۹۳ ۔ دعائم الاسلام صفحہ ۷۴

بیٹا امام موسیٰ الکاظم امام ہونا چاہیے۔ چنانچہ شیعہ اثنا عشریہ نظریہ بداء کے تحت ہی اسمٰعیل کی بجائے موسیٰ الکاظم کو ساتواں امام مانتے ہیں۔

اثنا عشری شیعوں نے بداء کے اس نظریہ سے متعدد بار کام لیا۔ اس نظریہ کا اصل مُوجد مختار ثقفی تھا وہ اپنے پیروؤں کے سامنے کوئی پیشگوئی کرتا اور اگر وہ پوری نہ ہوتی تو کہتا خدا نے ''اُصول بداء'' کے تحت اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد آیت کریمہ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ [1] اور يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ [2] پر قائم کی گئی ہے۔ جہاں تک وعید اور تقدیر شر کا تعلق ہے ایسی تبدیلی کو قریبًا سارے مسلمان تسلیم کرتے ہیں اور مانتے ہیں کہ دعا اور صدقات سے تقدیر شر ٹل سکتی ہے۔ خوشخبری اور تقدیر خیر کے بدل جانے کے نظریہ کو صرف شیعہ حضرات مانتے ہیں۔ [3]

المتعة۔ شیعہ کے نزدیک متعہ جائز ہے۔ متعہ کے معنے یہ ہیں کہ جنسی تسکین کے لئے کچھ معاوضہ دے کر ایک معین مدت کے لئے مرد اور عورت کا جنسی تعلقات کے لئے معاہدہ کر لینا۔ اسلام سے پہلے اس قسم کے وقتی نکاح کا عرب میں رواج تھا۔ اکثر اہل اسلام کے نزدیک اسلام نے اس قسم کے نکاح کی ممانعت کر دی تھی لیکن شیعہ مسلک یہ ہے کہ اسلام میں اس کی ممانعت نہیں ہے۔ تفصیل شیعہ فقہ کی کتب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ [4]

مجالس عزاء۔ یوم عاشورہ کی تقاریب منانا شیعہ اثنا عشریہ کے مذہبی دستور العمل اور پالیسی کا ایک حصہ ہے اس کا مقصد اُن مظالم کی یاد کو تازہ رکھنا ہے جو ائمہ اہل بیت پر روا رکھے گئے۔ تشیع کے فروغ اور عوام میں اس کو مقبول بنانے کے لئے اسے بڑا مفید حربہ سمجھا گیا ہے۔ مجالس عزاء کے انعقاد کی بڑی لمبی تاریخ ہے۔ ایک خاص قسم کی ادبی نہج یعنی مرثیہ گوئی کے فن کو بھی اس سے بہت فروغ ملا ہے۔ [5]

---

[1] الزمر: ۴۸ [2] الرعد: ۴۰

[3] اصل الشیعة واصولها صفحه ۱۹۲۔ فرق الشیعه صفحه ۶۴، ۶۵

[4] اصل الشیعة واصولها صفحه ۹۴ و ۱۱۵

[5] الشیعة فی التاریخ صفحه ۱۲۶۔ امثال المیدانی صفحه ۳۲۹

شیعہ اثنا عشریہ کے بعض غلو پسند ذیلی فرقے

۸۔الھشامیّہ۔اس فرقہ کے دو گروہ ہیں ۔ایک گروہ کے قائد ہشام بن الحکم اور دوسرے کے ہشام بن اَلسَّالِم اَلْجَوَالِیقِی ہیں ۔یہ دونوں گروہ شیعہ اثنا عشریہ کی طرح ائمہ اہل بیت اور ان کی مذکورہ بالا ترتیب کو تسلیم کرتے ہیں لیکن بعض خاص نظریات کی وجہ سے یہ اثنا عشریہ سے الگ فرقہ شمار کئے جاتے ہیں ۔ہشام بن الحکم کے خاص نظریات جن سے اثنا عشریہ متفق نہیں درج ذیل ہیں ۔

1۔ہشام کے نزدیک انبیاء معصوم نہیں ۔ان سے معصیت اور غلطی سرزد ہوسکتی ہے لیکن ان کے عصیان کا تدارک وحی کے ذریعہ ہوجاتا ہے یعنی خدا بذریعہ وحی ان کو متنبہ کردیتا ہے کہ اُن سے غلطی سرزد ہوئی ہے اور اُس کا تدارک کیا ہے ۔اس کے برخلاف ہشام کے نزدیک ائمہ معصوم ہوتے ہیں وہ غلطی کر ہی نہیں سکتے ۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کی طرح ائمہ بھی اُمّت کی قیادت اور رہنمائی کے ذمہ دار ہیں اور اس رہنمائی میں غلطی نہیں ہونی چاہیے ورنہ ان کا اعتماد جاتا رہے گا اور چونکہ ائمہ پر وحی نازل نہیں ہوتی جو غلطی پر متنبہ کرے اس وجہ سے ان کا معصوم عن الخطا ہونا ضروری ہے تا کہ وہ غلط رہنمائی سے بچے رہیں اور اُمّت کا اعتماد بحال رہے ۔

ہشام کا ایک نظریہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا جسم ہے اور وہ ذُو حد و نہایہ ہے ۔ایک روایت کے مطابق ہشام کا اندازہ تھا کہ خدا کا قد اپنی بالشت کے لحاظ سے سات بالشت ہے جس طرح انسان کا قد اُس کی اپنی سات بالشت کے برابر ہوتا ہے ۔ایک دفعہ اَبُو الْھُذَیْل مُعْتَزِلِی نے مکہّ کے ایک پہاڑ جبل ابوقبیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہشام سے پوچھا کہ یہ پہاڑ بڑا ہے یا تیرا معبود ۔تو ہشام نے جواب دیا قد کے لحاظ سے پہاڑ بڑا ہے ۔اِنَّ الْجَبَلَ اَعْظَمُ مِنْہُ ہشام کہا کرتا تھا کہ خدا عرش پر متمکن ہے اور عرش اس کی سیٹ کے بالکل برابر ہے یعنی جتنا اُس کے بیٹھنے کا گھیر ہے اتنا ہی چوڑا اس کا عرش ہے ۔الغرض ہشام کا کہنا تھا کہ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی طَوِیْلٌ عَرِیْضٌ عَمِیْقٌ (اَیْ جِسْمٌ) وَّلٰکِنْ جِسْمَہٗ لَیْسَ مَادِیًا بَلْ ھُوَ نُوْرٌ سَاطِعٌ یَتَلَاْلَأُ ۔

ہشام کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا علم ایک لحاظ سے حادث ہے یعنی اُسے اُس وقت کسی چیز کا علم ہوتا ہے جب وہ چیز وجود میں آجاتی ہے ۔اگر یہ نہ مانا جائے تو اشیاء قدیم کو ماننا پڑے گا جو غلط ہے ۔وہ یہ

بھی کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے ایک شعاع (کرن) پھوٹتی ہے جو چیز موجود سے ٹکراتی ہے یا اس کے اندر تک چلی جاتی ہے۔اس طرح اس شعاع کی تنویر سے اُسے اس چیز کا علم حاصل ہوتا ہے۔

ہشام کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا ارادہ اُس کی حرکت کا نام ہے یعنی جب وہ حرکت کرتا ہے تو تخلیق کا عمل شروع ہوتا ہے۔

ہشام کا یہ نظریہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات علم، قدرت، سمع وغیرہ کو نہ قدیم کہا جا سکتا ہے اور نہ حادث۔ لِاَنَّ الصِّفَاتَ لا تُوْصَفُ (صفت کی صفت بے معنے بات ہے۔) فَالْقُرْآنُ (اَیْ کَلامُ اللّٰہِ) لا مَخْلُوْقٌ وَلَا حَادِثٌ

ہشام بن الحکم بڑی متنازعہ فیہ شخصیت رہا ہے۔بعض اُسے بڑا پارسا، صحیح العقیدہ، نکتہ رس اور عالم باعمل مانتے ہیں اور اس کے اظہارات اور نظریات کی تاویل اور توجیہ کرتے ہیں۔حد یہ ہے کہ اُس کی طرف سے دفاع میں بعض علماء اہل السنّت پیش پیش رہے ہیں جبکہ بعض دوسرے علماء خاص طور پر شیعہ اثنا عشریہ اُسے خبیث العقیدہ اور کافر سمجھتے ہیں۔[1]

ہشامیہ فرقہ کا دوسرا گروہ ہشام بن السالم الجوالیقی کا پیرو ہے۔اس کا خاص نظریہ جس سے دوسرے اثنا عشریہ متفق نہیں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی شکل ایک انتہائی حسین و جمیل انسان کی طرح ہے لیکن یہ شکل نوری ہے مادی نہیں۔اَیْ اَنَّہٗ لَیْسَ بِلَحْمٍ وَ لَا دَمٍ بَلْ ھُوَ نُوْرٌ سَاطِعٌ لَہٗ یَدٌ وَ رِجْلٌ وَ عَیْنٌ وَ اُذُنٌ وَ اَنْفٌ وَ فَمٌ وَ اَنَّ نِصْفَہُ الْاَعْلٰی مُجَوَّفٌ وَ نِصْفُہُ الْاَسْفَلُ مُصَمَّتٌ وَ لَہٗ ذَفْرَۃٌ (شَعْرٌ) سَوْدَاءُ مِنْ نُوْرٍ اَسْوَدَ وَ بَاقِیْہِ نُوْرٌ اَبْیَض

اسی نظریہ کے تحت اس فرقہ کے لوگ جب کسی حسین عورت یا مرد کو دیکھتے تو یہ خیال کرتے ہوئے اس کے سامنے سجدہ میں گر جاتے کہ اس میں انہیں خدا کا جلوہ نظر آیا ہے۔[2]

۹۔الزُّرَارِیَّہ۔ زُرارہ بن اَعْین کے پیرو تھے۔اس فرقہ کے لوگ حضرت امام جعفرؒ کے بڑے بیٹے عبداللہ کو مانتے تھے لیکن ان کی وفات کے بعد شیعہ اثنا عشریہ کی طرح یہ بھی امام جعفر کے دوسرے بیٹے امام موسیٰ الکاظم کو امام ماننے لگے۔ان کا خاص نظریہ جو ان کو اثنا عشریہ سے الگ کرتا ہے یہ ہے کہ۔

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۴۶   [2] الفرق بین الفرق صفحہ ۴۶

اللہ تعالیٰ بے وصف تھا اُس کے لئے کوئی صفت ثابت نہ تھی بعد میں اُس نے اپنی صفات کو پیدا کیا اور اُن سے متصف ہوا۔ اَیْ اَنَّہٗ لَمْ یَکُنْ حَیًّا وَلَا قَادِرًا وَلَا سَمِیْعًا وَلَا بَصِیْرًا وَلَا عَالِمًا وَلَا مُرِیْدًا حَتّٰی خَلَقَ لِنَفْسِہٖ حَیٰوۃً وَقُدْرَۃً وَ سَائِرَ الصِّفَاتِ الْمَذْکُوْرَۃِ فَصَارَ بَعْدَ ذٰلِکَ حَیًّا قَادِرًا الخ۔ معتزلہ میں سے قدریہ، بصریہ اور کرامیہ کا نظریہ بھی قریبًا قریبًا یہی تھا۔ کما سیجیئ[۱]۔

۱۰۔ الیُوْنُسِیَّہ۔ یہ فرقہ یونس بن عبدالرحمٰن القمی کا پیرو تھا۔ یہ فرقہ بھی اثنا عشریہ کی ہی ایک شاخ ہے لیکن خدا تعالیٰ کے بارہ میں ایک خاص نظریہ رکھنے کی وجہ سے اسے الگ فرقہ شمار کیا گیا ہے۔

اس فرقہ کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر متمکن ہے اور اس کے عرش کو آٹھ فرشتے اُٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ فرشتے عرش کے لحاظ سے کو کمزور ہیں لیکن جس طرح کُرْکِیْ نامی پرندہ ہوتا ہے جس کا جسم بہت بڑا ہوتا ہے اور ٹانگیں انتہائی پتلی اور کمزور ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ کمزور ٹانگیں اس کے بھاری جسم کو اُٹھائے رکھتی ہیں اسی طرح یہ فرشتے کمزور ہونے کے باوجود عرش کو اُٹھائے ہوئے ہیں۔[۲]

۱۱۔ الشَّیْطَانِیَّہ۔ یہ فرقہ محمد بن النعمان شیطانُ الطّاق کا پیرو ہے۔ بعض شیعہ اس سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور اسے شیطان الطاق کی بجائے مُؤْمِنُ الطَّاق کہتے تھے۔ حضرت امام ثوریؒ کو بھی اس سے بڑی عقیدت تھی وہ کہا کرتے تھے کہ محمد بن النعمان کو دیکھ کر مجھے سمجھ آئی کہ صوفی کسے کہتے ہیں بہر حال یہ اپنے زمانے میں معروف و مشہور صوفیاء میں شمار ہوتا تھا اور امام جعفر کا ہمعصر تھا۔ خدا تعالیٰ کے بارہ میں اس کے نظریات بھی مذکورہ بالا ہشامیہ فرقے کے نظریات سے ملتے جلتے تھے۔ محمد بن النعمان بھی بڑی متنازع فیہ شخصیت کا حامل تھا۔ بعض اُسے ولی اللہ مانتے تھے اور بعض اُسے کُھلا کُھلا شیطان کہتے تھے۔[۳]

۱۲۔ الکَامِلِیَّہ۔ یہ فرقہ ابو کامل کا پیرو تھا۔ اس فرقہ کا نظریہ تھا کہ تمام صحابہؓ (وَالْعِیَاذُ بِاللّٰہ) کافر ہیں۔ عام صحابہ اس لئے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کی اور علیؓ کو خلیفہ ماننے کی بجائے ابو بکرؓ کو خلیفہ چن لیا اور علیؓ اس لئے کافر ہیں کہ انہوں نے اپنا حق حاصل کرنے کے لئے جنگ نہیں کی بلکہ چپ کر کے بیٹھ گئے۔ علاوہ ازیں اس فرقہ کا یہ بھی نظریہ ہے کہ علیؓ اپنی

۱۔۲ الفرق بین الفرق صفحہ ۴۹

۳ الفرق بین الفرق صفحہ ۴۸

غلطی کے تدارک کے لئے دوبارہ دُنیا میں واپس آئیں گے اور دوسرے صحابہؓ کو بھی زندہ کیا جائے گا تا کہ علیؓ اُن سے اپنا حق واپس لے سکیں۔ یہ گروہ اس بات کا بھی قائل تھا کہ ابلیس حضرت آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے میں حق بجانب تھا کیونکہ آگ زمین سے افضل ہے۔ اس فرقہ کا ایک شاعر کہتا ہے:

اَلْاَرْضُ مُظْلِمَةٌ وَالنَّارُ مُشْرِقَةٌ وَالنَّارُ مَعْبُوْدَةٌ مُذْ کَانَتِ النَّارُ

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس فرقہ کے عقائد مجوسیت سے متاثر تھے۔

شیعوں کا دوسرا بڑا ضمنی فرقہ اَلزَّیْدِیَّہ

شیعہ زیدیہ دوسرے امامیہ فرقوں سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ یہ حضرت امام زین العابدین کے بیٹے محمد باقر کی بجائے اُن کے دوسرے بیٹے زید بن زین العابدین کو اپنا امام مانتے ہیں اور حضرت زید کی شہادت کے بعد اُن کے بیٹے یحییٰ کی امامت کے قائل ہیں۔

زیدیہ کے نزدیک امامت کے اہل ہونے کے لئے مندرجہ ذیل شرطیں ہیں:۔

الف: امام وہ بن سکتا ہے جو حضرت فاطمہؓ کی نسل میں سے ہو۔

ب: وہ صاحبُ السیف ہو یعنی اقتدار کا مالک ہو یا اقتدار حاصل کرنے کے لئے مسلح جدوجہد میں مصروف رہتا ہو۔

ج: امامت کے لئے نص اور وصیّت ضروری نہیں بلکہ اُمت کو امام منتخب کرنے کا حق ہے جبکہ منتخب میں مندرجہ بالا دونوں شرطیں پائی جاتی ہوں۔ یہ فرقہ اُصولی طور پر امام غائب یا ''مہدی منتظر'' کا بھی قائل نہیں بلکہ ضروری سمجھتا ہے کہ اُمت میں ہر وقت واجب الاطاعت امام موجود ہو جو اُمت کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت زید بنو اُمیہ کے خلاف نہ تھے بلکہ مُسالم تھے لیکن ایک بار وہ اُموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے دربار میں گئے تو اُس نے بلاوجہ آپ کی توہین کی اور آپ کو لونڈی زادہ کہا۔ آپ وہاں سے کبیدہ خاطر واپس آئے اور ہشام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ کوفہ اور گردونواح کے ہزاروں باشندوں نے آپ کی بیعت کی اور بنو اُمیہ سے جنگ میں آپ کے ساتھ شامل ہو گئے۔

جنگ کے دوران حضرت زید کے بعض سرداروں نے اُن سے سوال کیا کہ وہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کے بارہ

میں کیا نظریہ رکھتے ہیں۔حضرت زید نے جواب دیا میں ان کو اپنا بزرگ مانتا ہوں وَ اِنِّیْ لَا اَقُوْلُ اِلَّا خَیْرًا وَ مَا سَمِعْتُ اَبِیْ یَقُوْلُ فِیْهِمَا اِلَّا خَیْرًا ۔اس پر یہ معترضین اور اُن کے پیرو سب آپ سے الگ ہو گئے صرف دو سو آدمی آپ کے ساتھ رہ گئے اس پر آپ نے فرمایا۔یہ لوگ جنھوں نے عین میدان جنگ میں غداری کی ہے رافضی ہیں۔اس طرح پہلی دفعہ شیعوں کا نام رافضی پڑا۔بہرحال زید اور اُن کے دو سو ساتھی لڑتے ہوئے سب کے سب شہید ہو گئے۔حضرت زید کی تدفین ہوئی لیکن عراق کے اُموی والی نے آپ کی نعش کو قبر سے نکال کر سُولی پر لٹکا دیا۔یہ ننگی نعش کئی دنوں تک لٹکتی رہی۔اس کے بعد اُسے اُتار کر جلا دیا گیا۔حضرت امام زید کے بیٹے یحیٰ خراسان کی طرف بھاگ گئے لیکن وہاں کے والی سے جنگ کرتے ہوئے وہ بھی شہید ہو گئے۔خراسان کے شہر جوزجان میں اُن کا مزار اب تک مرجع عوام ہے۔

کوفیوں کی اس قسم کی غداریوں کی وجہ سے جو انہوں نے مسلسل ائمہ اہل بیت سے روا رکھیں یہ محاورہ مشہور ہو گیا کہ هُوَ اَغْدَرُ مِنْ کُوْفِیٍّ کیونکہ کوفیوں نے سب سے پہلے حضرت علیؓ سے غدّاری کی جو بالآخر حضرت علیؓ کی شہادت پر منتج ہوئی۔اس کے بعد انہوں نے حضرت حسنؓ کی بیعت کی لیکن اس پر وہ قائم نہ رہے اور ایک موقع پر آپ کو نیزہ مار کر گھوڑے سے گرا دیا۔حضرت امام حسنؓ نے ان کی یہ حالت دیکھ کر امیر معاویہؓ سے مصالحت کر لی۔اس کے بعد اہلِ کوفہ نے امام حسینؓ کو مکہ سے بلوایا لیکن بعد میں آپ کو بے یارومددگار چھوڑ دیا اور ان کی اس غدّاری کی وجہ سے امام حسینؓ اور ان کا سارا خاندان میدان کربلا میں شہید ہو گیا۔صرف امام زین العابدین بوجہ بیماری اور امام حسن مثنّٰی بوجہ صغر سنی بچ سکے۔امام حسینؓ کو شہید کرنے والے بھی سب کے سب کوفی تھے اُن میں ایک بھی شامی نہیں تھا۔اس کے بعد امام حسینؓ کے پوتے حضرت زیدؓ سے غدّاری کے یہ مرتکب ہوئے۔غرض اہلِ کوفہ کی غدّاریوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ائمہ اہل بیت کی وفاداری کا عہد کرتے،اُن کی بیعت کرتے لیکن جلد ہی اپنے عہد سے پھر جاتے اور بعض اوقات عین میدانِ جنگ میں اپنے امام کو تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے۔

حضرت زید کی شہادت کے بعد زیدیہ مندرجہ ذیل تین فرقوں میں بٹ گئے۔

الزیدیّہ کے ذیلی فرقے ۔ اَلْجَارُوْدِیّہ ۔اَلسُّلَیْمَانِیَّہ ۔اَلْبُتْرِیَّہ

اَلْجَارُوْدِیَّہ ۔یہ فرقہ اَبُو الْجَارُوْد کا پیرو تھا ۔اس فرقے کانظریہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نام لے کر حضرت علیؓ کو جانشین مقرر نہیں کیا تھا بلکہ آپؐ نے بعض ایسے اوصاف بیان کئے تھے جو حضرت علیؓ میں پائے جاتے تھے اور جس کا مفہوم یہ تھا کہ میرے بعد علی کو میرا جانشین مانا جائے ۔اَیْ اَنَّ النَّبِیَّ نَصَّ عَلٰی اِمَامَۃِ عَلِیٍّ بِالْوَصْفِ دُوْنِ الْاِسْمِ مگر صحابہؓ اس ہدایت کی پابندی نہ کر کے کفر کے مرتکب ہوئے ۔

جارودیہ کا یہ نظریہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ ،حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی امامت ''وَصْفًا منصوص'' ہے اور اس کے بعد حضرت علیؓ کی فاطمی اولاد میں سے شوریٰ یعنی انتخاب کے ذریعہ امام منتخب ہوگا بشرطیکہ وہ صاحب السیف ہو ۔جارودیہ کی ایک شاخ کا یہ نظریہ ہے کہ امام محمد بن عبداللہ ''مہدیٔ منتظر'' ہیں ۔گویا جو نظریہ امامیہ میں سے فرقہ المحمّدیّہ کا ہے وہی نظریہ ان کا بھی ہے لیکن زیدیہ کے دوسرے فرقے امام حاضر کے قائل ہیں یعنی اُن کے نزدیک جب امام فوت ہو جائے تو اُس کی وفات کے بعد بذریعہ انتخاب دوسرا امام مقرر کرنا ضروری ہے ۔

اَلسُّلَیْمَانِیَّہ ۔ یہ فرقہ سلیمان بن جریر کا پیرو ہے ۔اس فرقہ کا نظریہ یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کو امام ماننے کی وصفاً تاکید کی تھی نہ یہ کہ آپ کا نام لے کر آپ کو خلیفہ ماننے کا حکم دیا تھا لیکن صحابہؓ نے اس ہدایت کے مطابق حضرت علیؓ کو اپنا امام نہ مانا بلکہ ابوبکرؓ کو امام منتخب کر لیا مگر صحابہؓ کی یہ غلطی اجتہادی تھی یعنی انہوں نے ترکِ اولیٰ کیا اس لئے اس غلطی کی وجہ سے نہ وہ کافر ہیں اور نہ مستوجب سزا۔[1] غرض یہ فرقہ افضل کی موجودگی میں مَفْضُول کو امام مان لینے کو جائز سمجھتا ہے ،اس لئے اس فرقہ کے نزدیک ابوبکرؓ اور عمرؓ امام برحق اور خلیفہ راشد تھے تاہم یہ فرقہ حضرت عثمانؓ کی تکفیر کرتا ہے ۔

اَلْبُتْرِیَّہ ۔ یہ فرقہ صالح بن حیّ اور کَثِیْرُ النَّوَاءِ الاَبْتَر کا پیرو ہے ۔ان کا نظریہ بھی خلافت کے بارہ میں وہی ہے جو سلیمانیہ کا ہے لیکن یہ حضرت عثمانؓ کی تکفیر نہیں کرتے ۔فَھٰٓؤُلَآءِ اَحْسَنُ حَالًا

---

[1] العقیدۃ و الشریعۃ فی الاسلام صفحہ ۲۱۱

عِنْدَ اَهْلِ السُّنَّةِ۔

زیدیہ کے تینوں گروہ خوارج کی طرح کبیرہ گناہ کے مرتکب کو دائمی جہنمی مانتے ہیں۔

فرقہ زیدیہ یمن میں برسراقتدار ہے اور دوسرے شیعہ فرقوں کی نسبت اہل سنت کے زیادہ قریب ہے۔ فقہ زَیْدِیَه بھی ایک قابل قدر علمی سرمایہ اور مطالعہ کے لائق فقہ ہے۔

شیعوں کا تیسرا بڑا ضمنی فرقہ اَلْکَیْسَانِیَّة

شیعوں کا یہ فرقہ مختار بن عبید ثقفی المقتول ۶۷ھ کی طرف منسوب تھا۔ مختار حضرت امام حسینؓ کے قاتلین سے انتقام لینے کا دعویٰ لے کر اُٹھا اور اُن کو چن چن کر قتل کیا یہاں تک کہ ایک جنگ میں امام حسینؓ کے قتل میں ملوث آخری آدمی محمد بن اَلْاَشْعَث کِنْدِیْ کو بھی قتل کیا اور کہا وَاللّٰهِ لَا اُبَالِیْ بِالْمَوْتِ بَعْدَ هٰذَا۔ چنانچہ اسی جنگ کے تسلسل میں مختار مارا گیا۔ مختار کے اس کارنامہ کی وجہ سے عام شیعہ کے دل میں اُس کی بہت زیادہ قدر رہی۔

مختار نے حضرت علیؓ کے ایک غیر فاطمی بیٹے محمد بن الحنفیةؒ کو امام ماننے کی دعوت دی اور انہیں مہدی قرار دیا۔ کیسان مختار کا خفیہ نام تھا۔ بعض روایات کے مطابق کیسان امام محمد بن الحنفیةؒ کا ایک مقرب شاگرد تھا۔ جس نے مختار کو قاتلینِ حسینؓ سے انتقام لینے پر اُکسایا تھا اور فرقہ کیسانیہ اسی کیسان کی طرف منسوب ہے۔

بہرحال مختار کو اس دعوت میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ کوفہ اور اُس کے گردونواح میں سترہ ہزار کے قریب لوگ اُس کے پیرو بن گئے ان دنوں عراق کا علاقہ عبداللہ بن زبیرؓ کے قبضہ میں تھا اور خاصے انتشار کا شکار رہا ہوا تھا۔ مختار نے آغاز میں زبیریوں کو اس علاقہ میں بے اثر کر دیا۔ مختار وحی والہام کا بھی مدعی تھا اُس نے کئی پیشگوئیاں کیں جو پیشگوئی پوری ہو جاتی اسے وہ اپنی صداقت کے طور پر پیش کرتا اور جو پوری نہ ہوتی اس کے بارہ میں کہتا کہ خدا نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ اس تبدیلیٔ ارادہ کا اُس نے اصطلاحی نام "بداء" رکھا۔ نظریہ بداء پہلی دفعہ مختار نے ہی پیش کیا تھا اس کے بعد بعض اور شیعہ فرقوں نے اس سے متعدد بار کام لیا۔ جیسا کہ شیعہ اثناعشریہ کے بیان میں ذکر آ چکا ہے۔[1]

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۲۶ تا ۳۵ ۔ تاریخ الشیعة صفحہ ۴۳ ۔ فرق الشیعة صفحہ ۲۳

کیسانیہ فرقہ کے خصوصی نظریات

کیسانیہ کا ایک گروہ کہتا تھا کہ محمد بن الحنفیہ "مہدی منتظر" ہیں وہ فوت نہیں ہوئے بلکہ رَضْوٰی پہاڑ میں پناہ گزیں ہیں۔ وہاں شہد اور پانی کے چشمہ سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں اور ایک شیر اُن کی حفاظت پر مامور ہے وہ اپنے وقت پر ظاہر ہوں گے اور دشمنوں کو ہلاک کریں گے۔ ایک کیسانی شاعر کُثَیِّر عزّہ اس بارہ میں کہتا ہے۔

تَغَیَّبَ لَا یُرٰی فِیْھِمْ زَمَانًا بِرَضْوٰی عِنْدَہٗ عَسَلٌ وَّمَآءٌ[1]

یہ بھی کہا گیا ہے کہ محمد بن الحنفیہؒ کو رَضْوٰی پہاڑ میں ان کی بعض غلطیوں کی وجہ سے قید کیا گیا تھا یعنی اللہ کی طرف سے اُن کو یہ سزا دی گئی کیونکہ انہوں نے امام حسینؓ کی شہادت کے بعد یزید کے پاس جا کر معذرت کی تھی اور اُس سے مال (عطا) قبول کیا تھا۔ اُن کی دوسری غلطی یہ تھی کہ انہوں نے ابن زبیر کا مقابلہ نہ کیا بلکہ مکہ سے بھاگ کر عبدالملک بن مروان کی پناہ میں آنے کی کوشش کی۔

کیسانیہ کا دوسرا گروہ کہتا تھا کہ محمد بن الحنفیہؒ فوت ہو گئے ہیں اور اُن کے بعد ان کے لڑکے ابو ہاشم عبداللہ بطور وصی امام مقرر ہوئے اور پھر انہوں نے اپنی وفات کے وقت محمد بن علی بن عبداللہ بن عباسؓ کے حق میں وصیّت کی اور ان کو اپنا جانشین بنایا۔ یہاں سے ہی بنواُمیّہ کے خلاف چلائی گئی خفیہ تحریک علویوں کے ہاتھ سے نکل کر عباسیوں کے ہاتھ میں آگئی اور بالآخر دولتِ عباسیہ کے قیام پر منتج ہوئی۔ چنانچہ یہ تحریک جو بنواُمیّہ کے خلاف شروع کی گئی تھی جب کامیاب ہوئی تو محمد بن علی کے بھائی[2] ابوالعباس سفاح اور اُس کی وفات کے بعد ابو جعفر منصور مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور دولت عباسیہ میں بھی علوی بدستور زیر عتاب رہے اور اُن پر بڑی سختیاں ہوئیں۔

کیسانیہ کے ایک اور گروہ کا دعویٰ تھا کہ امام ابو ہاشم نے اپنے بعد حضرت جعفر بن ابی طالب کے پڑپوتے عبداللہ بن معاویہ کو اپنا جانشین بنایا تھا۔ چنانچہ عباسیوں کی خفیہ تحریک کے فروغ سے کچھ پہلے

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ 28

[2] الفرق بین الفرق صفحہ194

عبداللہ بن معاویہ کے گروہ کو خاصی کامیابی نصیب ہوئی اور یہ گروہ عراق اور خراسان کے علاقوں پر قابض بھی ہو گیا لیکن یہ قبضہ عارضی ثابت ہوا۔ ابو مسلم خراسانی جو عباسیوں کا حامی تھا اُس نے عبداللہ بن معاویہ کی تحریک کو کچل دیا اور عبداللہ کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا اور وہ قید کی حالت میں ہی فوت ہوئے۔ عبداللہ کے پیرو عبداللہ کی الوہیت کے قائل ہیں اور تناسخ کے نظریہ کو بھی مانتے ہیں کَمَا سَیَجِیْءُ۔[1]

اعتدال پسند فرقوں کے بارہ میں اہل سنت کا مسلک

علامہ بغدادی صاحبِ کتاب ''اَلفَرْق بَیْنَ الفِرَق'' اعتدال پسند فرقوں کے بارہ میں کہتے ہیں کہ امامیہ، زیدیہ، خوارج اور معتزلہ وغیرہ فرقے جو غُلو میں حد سے نہیں بڑھے وہ اپنی بدعات کے باوجود بعض احکام میں اُمت اسلامیہ کا حصّہ ہیں اور اُس میں داخل سمجھے جاتے ہیں۔[2]

شیعوں کے بعض غُلو پسند فرقے جو اُمّت مسلمہ میں شامل نہیں سمجھے جاتے

۱۔ **اَلسَّبَئِیَّہ**۔ یہ فرقہ عبداللہ بن سبا کا پیرو تھا۔ اس فرقہ کے بعض لوگ حضرت علیؓ کو نبی مانتے تھے اور بعض انہیں خدا کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت علیؓ کو اُن کی اس قسم کی گمراہیوں کا علم ہوا تو آپ نے حضرت ابن عباسؓ کے مشورہ سے اس گروہ کے سرغنہ عبداللہ بن سبا کو مدائن کی طرف جلاوطن کر دیا لیکن وہاں بھی وہ شرارت سے باز نہ آیا۔ خفیہ طور پر عقائد باطلہ پھیلاتا رہا کیونکہ اس کا اصل مقصد اُمتِ مسلمہ میں انتشار پھیلانا تھا جس کے لئے اُس نے اہلِ بیت سے محبت اور موالات کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد عبداللہ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ علیؓ قتل نہیں ہوئے بلکہ شیطان قتل ہوا ہے جس نے علیؓ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس کا قول تھا کہ **اِنَّ عَلِیًّا صَعِدَ اِلَی السَّمَآءِ کَمَا صَعِدَ عِیْسٰی وَ اِنَّہٗ سَیَنْزِلُ اِلَی الدُّنْیَا وَ یَنْتَقِمُ مِنْ اَعْدَائِہٖ**۔

عبداللہ بن سبا حضرت علیؓ کو ''مہدیٔ منتظر'' قرار دیتا تھا اور کہتا تھا کہ بادلوں میں جو بجلی کوندتی ہے وہ علی کا کوڑا ہے اور گرج علی کی آواز ہے۔ اسی طرح بعض کے نزدیک عبداللہ بن سبا یہ بھی کہتا تھا کہ

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۲۶ [2] چنانچہ علامہ لکھتے ہیں۔ هُوَ مِنْ جُمْلَةِ اُمَّةِ الْاِسْلَامِ فِیْ بَعْضِ الْاَحْکَامِ وَ هُوَ اَنْ یُّدْفَنَ فِیْ مَقَابِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَلَا یُمْنَعُ مِنْ دُخُوْلِ مَسَاجِدِ الْمُسْلِمِیْنَ وَمِنَ الصَّلٰوةِ فِیْهَا وَ یَخْرُجُ فِیْ بَعْضِ الْاَحْکَامِ عَنْ اُمَّةِ الْاِسْلَامِ وَ ذٰلِکَ اَنَّهٗ لَا تَجُوْزُ الصَّلٰوةُ عَلَیْهِ وَلَا الصَّلٰوةُ خَلْفَهٗ وَلَا تَحِلُّ ذَبِیْحَتُهٗ وَلَا تَحِلُّ الْمَرْاَةُ مِنْهُمْ لِلسُّنِّیِّ وَلَا یَصِحُّ نِکَاحُ السُّنِّیَّةِ مِنْ اَحَدٍ مِّنْهُمْ (الفرق بین الفرق صفحہ ۱۶۷)

ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اور علی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصی ہیں ۔أَیْ اَنَّـهٗ وَجَدَ فِي التَّوْرَاةِ اَنَّ لِكُـلِّ نَبِيٍّ وَصِيًّا وَاَنَّ عَلِيًّا وَصِيُّ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَّهٗ خَيْرُ الْاَوْصِيَآءِ ۔گویا علیؓ کے وصی ہونے کے نظریہ کا موجد عبداللہ بن سبا ہے۔[۱،۲]

۲۔اَلْبَیَانِیَّہ۔ یہ فرقہ بیان بن سمعان کا پیرو تھا۔ان کا دعویٰ تھا کہ امام محمد بن الحنفیہؒ کے بیٹے امام ابو ہاشم مہدی منتظر ہیں اور انہوں نے نہ تو محمد بن علی عباسی کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا اور نہ عبداللہ بن معاویہ جعفری کو بلکہ انہوں نے اپنے مقرب شاگرد بیان بن سمعان کو اپنا جانشین بنایا تھا۔اس گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ رُوحِ الٰہ حضرت علیؓ سے منتقل ہو کر اُن کے بیٹے محمد بن الحنفیہ میں اور اس کے بعد اُن کے بیٹے ابو ہاشم میں حلول کئے رہی اور اُن کے بعد بیان بن سمعان میں آ بسی ۔چنانچہ وہ کہتے ہیں۔ اِنَّ رُوْحَ الْاِلٰـهِ تَـنَـاسَـخَتْ فِي الْاَنْبِيَاءِ وَالْاَئِمَّةِ حَتّٰى اِنْتَقَلَتْ اِلٰى بَيَانِ ابْنِ سَمْعَانَ التَّيْمِيِّ بیان اس بات کا بھی مدعی تھا کہ آیت کریمہ هـٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ میں اُس کا ذکر ہے ۔وہ کہا کرتا تھا کہ اَنَا الْبَيَانُ وَاَنَـا الْهُـدٰى وَالْـمَوعِظَة ۔بیان کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ وہ ''اسم اعظم'' جانتا ہے جس کی طاقت سے وہ دُنیا میں انقلاب بپا کر سکتا ہے ۔بیان کا نظریہ تھا کہ چہرہ کے سوا خدا کا سب وجود فنا ہو جائے گا (العیاذ باللہ) کیونکہ قرآن کریم میں وارد ہے ۔كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ[۳] اور سورہ قصص میں فرمایا ۔كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۔[۴] بیانیہ کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ بیان اللہ کا نبی ہے اور اُس نے مبعوث ہو کر شریعت محمدیہ کو منسوخ کر دیا ہے۔

عراق کے اُموی حاکم خالد بن عبداللہ اَلْقَسْرِی نے بیان کو اُس کی شرارتوں کی وجہ سے گرفتار کر لیا اور اُسے سُولی دینے سے پہلے اُس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اِنْ كُنْتَ تَهْزِمُ الْجُيُوْشَ بِالْاِسْمِ الْاَعْظَمِ الَّذِيْ تَعْرِفُهٗ فَاهْزِمْ بِهٖ اَعْوَانِيْ ۔[۵]

---

۱ الفرق بین الفرق صفحہ ۱۷۸،۱۷۷ ۔فرق الشیعہ صفحہ ۲۲ ۔علیّ و بنوہ لطٰہ حسین مصری صفحہ ۹۳،۱۱۲،۱۷۱

۲ بعض کے نزدیک یہ نظریہ عبداللہ بن السوداء الیہودی نے پیش کیا تھا اور بعض کی رائے ہے کہ عبداللہ بن سبا اور عبداللہ بن السوداء یہودی دراصل ایک ہی شخص کے دو نام ہیں ۔ علیّ و بنوہ صفحہ ۴۳

۳ الرحمٰن : ۲۸،۲۷ ۔ ۴ القصص : ۸۹ ۵ الفرق بین الفرق صفحہ ۸۰ ۔ فرق الشیعہ صفحہ ۳۴ ۔

۲۔ الـمُغِیـرِیَّـه۔ یہ فرقہ مُغیرہ بن سعید العجلی کا پیرو تھا۔ مغیرہ پہلے امام محمد باقر کا عقیدت مند تھا۔ پھر ان کی امامت کے بارہ میں شک کرنے لگا اور اُن کی وفات کے بعد امام جعفر صادق کی امامت قبول کی پھر امام محمد اَلنَّفْسُ الزَّكِيَّه بن عبد اللہ کا عقیدت مند بن گیا۔ اس کا نظریہ تھا کہ یہ محمد ہی ''مہدیٔ منتظر'' ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مغیرہ نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا۔[1] وہ اس بات کا بھی مدعی تھا کہ وہ اسم اعظم جانتا ہے اور وہ اس کی طاقت سے مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے اور بھاری لشکروں کو شکست دے سکتا ہے۔

اُس کا یہ نظریہ بھی تھا کہ خدا ایک نورانی انسانی شکل رکھتا ہے اور اُس کے اعضا حروفِ ہجاء کی صورت پر ہیں وہ یہ بھی مانتا تھا کہ خدا جب کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسم اعظم بولتا ہے۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى میں اسی اسم اعظم کی طرف اشارہ ہے۔ وہ نظریہ تخلیق کی یوں تشریح کیا کرتا تھا کہ خدا نے جب اسم اعظم بولا تو وہ اسم اعظم اُس کے سر کا تاج بن گیا پھر اُس نے اپنی اُنگلی سے ہتھیلی پر اپنے بندوں کے اعمال اور ان کی تقدیریں لکھیں۔ جب اُسے اپنے بندوں کے گناہ نظر آئے تو اُسے سخت غصہ آیا اور غصہ سے پسینہ پسینہ ہو گیا یہ پسینہ دو سمندر بن گیا ایک شیریں اور ایک نمکین اور تلخ۔ شیریں سمندر سے شیعہ پیدا ہوئے اور کڑوے سمندر سے شیعوں کے دشمن کافر۔ سمندر کے پانی میں خدا کو اپنا سایہ نظر آیا تو خدا اُسے پکڑنے کے لئے دوڑا کہ اُسے فنا کر دے تا کہ وہ سایہ اور ظل دوسرا خدا نہ بن سکے چنانچہ اُس نے اپنے سایہ کو پکڑ کر فنا کر دیا لیکن اس کی دو آنکھیں بچ گئیں۔ چنانچہ ایک آنکھ سے سورج پیدا ہوا اور دوسری سے چاند۔ دوسری اشیاء کی تخلیق کا آغاز پانی سے ہوا۔ سب سے پہلے ظلِ محمدؐ پیدا ہوا اور آیت کریمہ قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ[2] میں ظلِ محمدؐ کی طرف ہی اشارہ ہے پھر ظلِ محمدؐ سے دوسرے اظلال الناس پیدا ہوئے۔ مُغیرہ نے آیت کریمہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ[3] کی تفسیر اس طرح بیان کی ہے کہ امانت سے مراد حضرت علی ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی حمایت اور حفاظت کی ذمہ داری آسمان و زمین اور پہاڑوں کو سونپنی چاہی لیکن انہوں نے معذرت کی کہ وہ یہ ذمہ داری نہیں اُٹھا سکتے۔ اس موقع پر عمرؓ نے ابو بکرؓ سے کہا

---

[1] دعائم الاسلام جلد ۱ صفحہ ۱۱۔ العقیدة و الشریعة فی الاسلام صفحہ ۱۸۵

[2] الزخرف: ۸۲ [3] الاحزاب: ۷۳

کہ تم یہ ذمہ داری قبول کرلو اور اگر تم اپنے بعد مجھے اپنا جانشین بنانا منظور کرلو تو میں اس معاملہ میں تمہاری مدد کروں گا اور دنیا میں جا کر اس ذمہ داری سے مکر جائیں گے اور علیؓ کی حمایت وحفاظت نہیں کریں گے۔ چنانچہ آیت کریمہ میں الفاظ ''اَلْاِنْسَانُ'' اور ''ظَلُوْمٌ جَھُوْلٌ'' سے مراد ابوبکر ہیں اور آیت کریمہ کَمَثَلِ الشَّیْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اکْفُرْ فَلَمَّا کَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکَ [1] میں الشیطان سے مراد (العیاذ باللّٰہ) عمر ہیں اور ''اَلْاِنْسَانُ'' سے ابوبکر۔

مغیرہ اور اس کے گروہ کے دوسرے سرغنوں کو بھی خالد بن عبداللّٰہ القسری نے ہی گرفتار کرکے سب کو نارکول سے جلا دیا۔[2]

۴۔ اَلْاَزْلِیَّـــہ۔ یہ فرقہ علیؓ اور عمرؓ دونوں کے ازلی ہونے کا قائل تھا البتہ وہ علی کو ''نور'' اور نمائندۂ خیر مانتا تھا اور عمر کو ظلمت اور نمائندۂ شر۔ جو علی کو پریشان کرنے کے لئے مقرر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فرقہ نے یہ خیال مجوس اور ثنویہ سے مستعار لیا ہے۔[3]

۵۔ اَلْـمَنْصُوْرِیَّہ۔ یہ فرقہ ابومنصور العجلی کا پیرو تھا۔ ابومنصور امام محمد باقرؒ کا مقرب شاگرد تھا اُن کی وفات کے بعد اُس نے دعویٰ کیا کہ وہ امام محمد باقرؒ کا نائب اور وصی ہے اس کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ آیت کریمہ وَاِنْ یَّرَوْا کِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا [4] میں ''کِسف'' سے مراد وہ خود ہے۔ اُس نے آسمان پر جا کر اللہ سے اپنے سر پر ہاتھ پھروایا اور پھر وہاں سے نازل ہوکر دُنیا کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوا۔ اُس کا یہ نظریہ بھی تھا کہ سات نبی قریش سے مبعوث ہوئے ہیں اور سات ہی اس کے قبیلہ بنو عجل سے مبعوث ہوں گے۔[5] اس فرقہ کا یہ بھی نظریہ ہے کہ قیامت سے مراد اسی دُنیا کے انقلاب ہیں۔ نعماء دنیا جنت ہیں اور مصائب الدنیا دوزخ۔ ابومنصور اپنے پیرؤوں کو یہ تلقین کرتا تھا کہ جب بھی موقع ملے اپنے مخالفین کا گلا گھونٹ دیا کرو۔ والی عراق یوسف ثقفی نے جو حجاج ثقفی کا بھتیجا تھا ابومنصور کو گرفتار کرکے سُولی دے دیا اور اُس کے اتباع کو مختلف علاقوں میں تتربتر کردیا۔[6]

---

[1] الحشر : ۱۷ [2] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۸۱ حاشیہ ۔ فرق الشیعۃ صفحہ ۶۳

[3] اعتقادات فرق المسلمین و المشرکین صفحہ ۶۱ [4] الطور : ۴۵

[5] یاد رہے کہ بنو عجل کا تعلق بھی بنو ربیعہ سے تھا جسے بنو مضر خصوصاً قریش سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ مسیلمہ کذاب کے قبیلہ بنو حنیفہ کا تعلق بھی بنو ربیعہ سے تھا۔ کما مرّ

[6] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۸۶ ۔ فرق الشیعۃ صفحہ ۳۸

۶۔ اَلْجُنَاحِیَّہ۔ یہ فرقہ عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب کا پیرو تھا۔ اس سے پہلے یہ گزر چکا ہے کہ امام محمد بن الحنفیہ کے بیٹے ابو ہاشم کے وصی ہونے کا امام عبداللہ مذکور کو دعویٰ تھا۔ یہ بڑے خطیب اور فصیح البیان بزرگ تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان کی بیعتِ اطاعت کی اور یہ فارس اور اصفہان کے وسیع علاقوں پر قابض ہو گئے لیکن یہ غلبہ عارضی ثابت ہوا۔ ابو مسلم خراسانی کے ہاتھوں ان کے اتباع شکست کھا گئے اور خود عبداللہ اس کے قید خانہ میں بحالتِ قید فوت ہوئے۔ امام عبداللہ کی وفات کے بعد بعض زندیق طبع لوگوں نے ان کے پیروؤں کو گمراہ کیا۔ بہر حال ان کے اتباع کا نظریہ تھا کہ خدا کی روح مختلف انبیاء اور ائمہ میں حلول کرتی اور منتقل ہوتی ہوئی امام عبداللہ میں آبسی تھی۔

جُناحیہ اباحت کے بھی قائل تھے چنانچہ شراب، زنا، لواطت اور دوسرے محرمات کو جائز سمجھتے تھے اور ہر قسم کی عبادت سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ یہ اپنے ان نظریات کے درست ہونے کا استدلال اس آیت کریمہ سے پیش کرتے تھے۔ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا الآية۔[1] اس آیت میں چونکہ جناح کا لفظ آیا ہے اس لئے اس فرقہ کو اس آیت سے استدلال کرنے کی وجہ سے جُناحیہ کہا گیا ہے۔

یہ فرقہ احکامِ شریعت کی تاویل کرتا تھا مثلاً کہتا تھا کہ صلٰوۃ سے مراد ائمہ اہل بیت کی محبت، موالات اور ان کی اطاعت ہے اور محرمات سے مراد اُن کے دشمنوں سے بُغض اور نفرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فرقہ صحابہ کرامؓ سے شدید بُغض رکھتا تھا۔ یہ فرقہ تناسخ کا بھی قائل تھا۔[2]

۷۔ الْخِطَابِیَّہ۔ یہ فرقہ ابو الخطاب محمد بن ابی زینب کا پیرو تھا۔ ابو الخطاب امام جعفر صادقؒ کا مقرب شاگرد رہا تھا۔ ان کی وفات کے بعد اس نے دعویٰ کیا کہ وہ امام جعفر کا نائب ہے۔ امام جعفر کی زندگی میں ہی ابو الخطاب یہ عقیدہ ظاہر کرنے لگا کہ ائمہ اہلِ بیت نبی ہیں پھر کہا کہ وہ اِلٰہ ہیں۔ حسنؓ، حسینؓ اور ان کی اولاد اَبْنَاءُ اللّٰہ ہے۔ ابو الخطاب کے اس قسم کے باطل عقائد کا جب امام جعفرؒ کو علم ہوا تو انہوں نے اُسے ملعون قرار دیا اور اپنی مجلس سے نکال دیا۔

---

[1] المائدۃ : ۹۴

[2] الفرق بين الفرق صفحه ۱۸۸ ۔ فرق الشيعة صفحه ۳۹

ابوالخطاب نے امام جعفرؒ کی وفات کے بعد خود الٰہ ہونے کا دعویٰ کیا اُس کے پیرو کہا کرتے تھے کہ
اِنَّ جَعْفِرًا اِلٰـهٌ وَلٰـكِنَّ اَبَا الْخِطَابَ اَفْضَلُ مِنْهُ بَلْ هُوَ اَفْضَلُ مِنْ عَلِيٍّ ۔[1]

ابوالخطاب کو عباسی والی عیسیٰ بن موسیٰ نے گرفتار کر کے سُولی دے دیا۔

خطابیہ کا یہ نظریہ بھی تھا کہ اگر ان کے ہم عقیدہ کو فائدہ پہنچ سکتا ہو تو اُس کے حق میں اور اس کے مخالف کے خلاف جھوٹی گواہی دینا کار ثواب ہے۔

خطابیہ کا یہ نظریہ ہے کہ ہر زمانہ میں ایک امام ناطق ہوتا ہے اور دوسرا امام صامت۔ ناطق کی وفات کے بعد صامت ناطق بن جاتا ہے اور کوئی دوسرا صامت کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امام ناطق تھے اور علی امام صامت اور حضورؐ کی وفات کے بعد علی امام ناطق بن گئے۔ اسی طرح امام جعفرؒ اپنے عہد میں امامِ ناطق تھے اور ابوالخطاب امام صامت۔ پھر امام جعفر کی وفات کے بعد وہ امام ناطق بن گیا۔

خطابیہ تناسخ کے قائل اور قیامت کے منکر تھے۔ صحابہ کرام کی تکفیر کرتے اور اباحت کے نظریہ پر عمل پیرا تھے۔[2]

۸۔ اَلْغُرَابِيَّه۔ اس فرقے کا عقیدہ تھا کہ اصل میں جبرائیل حضرت علی کی طرف وحی لائے تھے لیکن اُن کی شکل چونکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بہت ملتی تھی[3]۔ اس لئے جبرائیل کو دھوکہ لگ گیا اور انہوں نے علی کی بجائے محمدؐ پر وحی اتار دی اس لئے اصل رسول علی اور اُن کی اولاد ہے چونکہ یہ لوگ علی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل کی مشابہت کے لئے کَالْغرابِ بالْغراب والذباب بالذباب کی تمثیل استعمال کیا کرتے تھے اس لئے ان کا نام غرابیہ پڑ گیا۔ یہ فرقہ اس مزعومہ غلط وحی کی وجہ سے حضرت جبرائیل سے نفرت کا اظہار کرتا تھا۔[4]

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۸۸ ۔ دعائم الاسلام صفحہ ۶۲

[2] دعائم الاسلام صفحہ ۶۲ ۔ الفرق بین الفرق صفحہ ۱۸۸ تا ۱۹۰ ۔ فرق الشیعہ صفحہ ۴۲، ۴۳

[3] یہ بھی یاد رہے کہ آنحضرت ﷺ جب مبعوث ہوئے تو اس وقت علی کی عمر دس سال تھی اور آنحضرت ﷺ کی عمر چالیس سال۔

[4] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۹۰

۹۔ اَلْمُوَفِّضَہ۔ اس فرقہ کا عقیدہ تھا کہ تدبیر عالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد ہے اس لئے وہ مدبر اوّل اور خالقِ کائنات ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے یہ فریضہ حضرت علیؓ کے سپرد کر دیا اس لئے وہ مدبر ثانی ہیں۔ اس طرح گویا یہ دونوں کائنات کی تخلیق اور تدبیر میں شریک ہیں۔[1]

۱۰۔ اَلذِّمِّیَّہ۔ یہ فرقہ اس بات کا قائل ہے کہ علی خدا ہے۔ اُس نے محمدؐ کو اس لئے رسول بنا کر بھیجا کہ وہ علی کے اقتدار کی منادی کریں لیکن انہوں نے علی کے اقتدار کی منادی کرنے کی بجائے اپنی عظمت کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ اسی لئے یہ فرقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہے اور کہتا ہے اِنَّهُ ادَّعَى الْاَمْرَ لِنَفْسِهٖ۔[2]

۱۱۔ اَلشَّرِيْعِيَّہ۔ یہ فرقہ شریعی نامی ایک زندیق کا پیرو تھا۔[3] اس فرقے کا نظریہ تھا کہ اللہ تعالیٰ پنجتن پاک یعنی پانچ ائمہ میں حلول کئے ہوئے ہے اس لئے یہ پانچوں کے پانچوں اِلٰہ ہیں۔[4]

روافض میں سے مندرجہ ذیل فرقے کسی نہ کسی رنگ میں حلول[5] اور ائمہ کے الٰہ ہونے کے قائل ہیں۔ السبیه، البیانیه، الجناحیه، الخطابیه، الشریعیه۔ یہ سب فرقے اگرچہ نابود ہو چکے ہیں تاہم ان کے نظریات فاسدہ کسی نہ کسی صورت میں موجودہ فرقوں میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً آغاخانی حلول کے قائل ہیں۔ امام ناطق، تناسخ اور اباحت کے نظریہ کو بھی مانتے ہیں اور یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ شریعت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ اور باطن کو صرف امام الزمان اور اس کے داعی جانتے ہیں۔

---

[1] الفرق بین الفرق صفحه ۱۹۱۔ [2] الفرق بین الفرق صفحه ۱۹۱

[3] الزنديقيّة هم الذين افضوا تعاليم الاديان الالٰهيّة بحجة تحرير الفكر۔ (فرق الشيعة صفحه ۴۶ حاشیه)

[4] فرق بین الفرق صفحه ۱۹۲

[5] الف ۔ قال فخر الدین رازیؒ اول من اظهرَ مَقَالَةَ الْحُلُوْلِ فِي الْاِسْلَامِ الروافض فانهم ادعوا الحلول في حق الائمة ۔ (اعتقادات فرق المسلمين والمشركين صفحه ۷۳)

ب ۔ ان الفرس قد بدء وا القداسة الى البيت النبوى باعتبارها اساسًا مَوَازِيًا لِاُسُسِهِمُ السِّيَاسِيَّةِ وَالدِّيْنِيَّةِ السَّابِقَةِ مِنْ تَاْلِيْهِمُ الْمُلُوْكَ وقولهم بِالنُّوْرِ الَّذِيْ يَنْتَقِلُ مِنْ مَلِكٍ اِلٰى اٰخَرَ۔ (الفصل لابن حزم جلد ۳ صفحه ۱۱۵)

گمراہ فرقوں کے قائدین کی اصلیت

مذکورہ تصریحات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان فرقوں کے قائدین زیادہ تر موالی اور فارسی عناصر تھے جن میں مجوسی، یہودی اور عیسائی اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مل جُل گئے تھے اور ائمہ اہلِ بیت کی آڑ لے کر یہ اپنے فاسد عقائد کا بیج نومسلموں کے دلوں میں بوتے رہتے تھے۔ بعض اوقات تو ائمہ اہل بیت کو اُن کے اس قسم کے عقائد اور ان کی سرگرمیوں کی خبر تک نہ ہوتی تھی جو اُن کی طرف منسوب کر کے یہ باطل پرست پھیلا رہے ہوتے تھے کیونکہ دُور رہنے والے عوام کی پہنچ ان ائمہ اہل بیت تک نہ تھی اور اگر کبھی ائمہ اہلِ بیت کے علم میں ایسی باتیں آجاتیں اور وہ اُن کی تردید کرتے تو یہ ابلیس کے نمائندے عوام کالانعام کو یہ کہہ دیتے کہ دراصل ائمہ تقیہ کرتے ہیں، اُن کے اصل خیالات وہی ہیں جو ہم بیان کرتے ہیں لیکن فتنہ سے بچنے کے لئے انہوں نے کچھ اور ظاہر کیا ہے یا یہ لوگ عوام تک ائمہ کی بات پہنچنے نہ دیتے تھے اور امام کی وفات کے بعد اُس کے خود ساختہ وصی بن کر اقتدار پر قابض ہو جاتے اور اس طرح عوام کو لوٹتے اور انہیں گمراہ کرتے۔ جیسا کہ امام جعفر صادق کی سوانح حیات سے ظاہر ہے کہ اُن کی طرف متضاد قسم کے ایسے خیالات اور نظریات منسوب[۱] کئے گئے ہیں جو اس اِمَامِ ھُدٰی کی شان کے بالکل خلاف ہیں۔ غرض یہ سب کچھ انہی تلبیسی عناصر کی کارستانی تھی۔[۲]

---

[۱] ایک شاعر کہتا ہے ؎

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الرَّافِضِيْنَ تَفَرَّقُوْا   وَكُلُّهُمْ فِيْ جَعْفَرٍ قَالَ مُنْكَرً

الفرق بين الفرق صفحه ۱۹۲

[۲] الفرق بين الفرق صفحه ۱۹۳

بنوعباس اور باطنی تحریکات

بنواُمیہ کے خلاف جو خفیہ تحریک علویوں اور عباسیوں کی طرف سے چلائی گئی تھی وہ بنواُمیہ کی حکومت کے خاتمہ اور بنوعباسؓ کے اقتدار پر منتج ہوئی ۔اس خفیہ تحریک میں بالعموم عربوں سے دشمنی کا عنصر غالب تھا۔اس تحریک کے ذریعہ مصری اور یمنی عربوں میں پھوٹ ڈلوائی گئی اور پرانی عصبیت کو زندہ کیا گیا۔ خراسانی عناصر کو آگے کیا گیا جس کی وجہ سے بنواُمیہ یا بالفاظ دیگر عرب شکست کھا گئے اور عجمی عناصر کا اثر ورسوخ بڑھ گیا[1]۔ بہر حال اس کامیابی سے نہ علوی خوش تھے اور نہ وہ عناصر جن کی توقعات پوری نہ ہوئی تھیں۔اس لئے خفیہ تحریکات کا خاتمہ نہ ہوا بلکہ ان کا رخ بنوعباس کی طرف پھر گیا۔چنانچہ ان عناصر میں سب سے زیادہ مؤثر فوجی انداز کی مخالفت ابومسلم خراسانی[2] کی تھی جس کے حامیوں کا بنوعباسؓ کی کامیابی میں بڑا مؤثر کردار تھا۔ابومسلم کا خیال تھا کہ اس کی حمایت کی وجہ سے بنوعباسؓ اس کے زیر اثر رہیں گے اور اس طرح خراسانی عناصر بڑی آسانی سے اقتدار میں اپنا حصہ حاصل کر سکیں گے۔ ابومسلم خراسانی کا اسلام بھی پختہ نہ تھا۔بہت سے پرانے آبائی عقائد کا اس پر گہرا اثر تھا۔وہ تناسخ کا قائل تھا۔اور بھی بہت سے خلاف اسلام عقائد وہ رکھتا تھا۔اس نے اپنے حامیوں میں اس تصور کا بھی اظہار کیا تھا کہ اَلْحَقُّ الْاِلٰھِیْ یعنی خلافت الٰہیہ کے زیادہ حقدار عباسؓ تھے۔یہ الٰہی قوت عباسؓ سے ان کی اولاد میں منتقل ہوئی اور چلتے چلتے بنوعباس کے پہلے خلیفہ ابوالعباس عبداللہ السفّاح میں جاگزیں ہوگئی۔اُن کے بعد خلافت کا یہ منصب الٰہی اشارہ کے تحت ابومسلم خراسانی کے سپرد ہوا۔

بنوعباس کے دوسرے خلیفہ ابوجعفر منصور نے جب دیکھا کہ ابومسلم خراسانی اقتدار کے خواب دیکھ رہا ہے اور اس کے حامیوں کے تیور بدلے ہوئے ہیں تو اس نے ایک سازش کے تحت ابومسلم خراسانی کو قتل کرادیا۔یہ ۱۳۷ھ کا واقعہ ہے[3]۔اس قتل کی وجہ سے ابومسلم کے بعض حامی بپھر گئے اور خراسان کے

---

[1] وَالمنصور اوّل خليفة استعمل مواليه وغِلْمَانَهُ فى اعماله وقدّمهم على العرب(الاسلام وَالحَضارة العربية جلد ۲ صفحه ۴۱۹و۴۲۳)

[2] هو عبدالرحمٰن بن مسلم المشهور بابى مسلم الخراسانى(فرق الشيعة صفحه ۴۷ حاشيه)

[3] فرق الشيعه صفحه ۴۷

بعض علاقوں میں بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہی بغاوتوں میں سے ایک بغاوت سنباذ کی تھی جو منصور کے مقابلہ میں آیا لیکن بری طرح شکست کھائی۔ اس لڑائی میں سنباذ کے قریباً ساٹھ ستر ہزار حامی مارے گئے اور چودہ ہزار قید ہوئے جن کی بعد میں گردنیں اڑا دی گئیں[1] لیکن یہ شورش اندر ہی اندر پنپتی رہی۔

اَلرَّزَامِیَّه

چنانچہ ابو جعفر منصور کے بعد مہدی کے عہد خلافت یعنی ۱۵۸ھ کے قریب الــرزامیــہ کی شورش اٹھی جو رزام نامی ایک زندیق کے پیرو تھے اور ابو مسلم خراسانی سے شدید محبت کا اظہار کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ جب حق الٰہی یعنی امامت محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کو ملی تو ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے ابراہیم الامام کو عطا ہوئی۔ پھر اُن کے بھائی ابو العباس عبداللہ السفّاح کی طرف منتقل ہوئی اور السفّاح کے بعد ابو مسلم خراسانی اس کے وارث بنے۔ اَلْمُقَنَّعِیَّه[2] فرقہ اسی اَلرَّزامیّه کی ہی شاخ ہے جن کا لیڈر اُس زمانہ کے لحاظ سے ایک ماہر کیمیادان اور شعبدہ باز ہاشم[3] بن حکیم المروزی تھا جو المقنّع کے لقب سے مشہور ہے۔ یہ شخص اس بات کا مدّعی تھا کہ اللہ نے اُس میں حلول کیا ہے اس لئے وہ خدائی طاقتوں کا مالک اور عالم الغیب ہے۔ وہ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔

خراسانی ترکستان کے پہاڑی علاقوں میں اس نے چند مضبوط قلعے بنائے اور اس کے شعبدوں کے طفیل ہزاروں پہاڑی لوگ جن میں خلجی ترک بھی شامل تھے اس کے مرید بن گئے۔ اس نے قتل و غارت اور چھاپے مار جنگ کی وجہ سے ارد گرد کے مسلمانوں کی زندگی اجیرن بنا دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ المقنّع جس قدر ذہین، ہوشیار، کیمیادان اور شعبدہ باز تھا اسی قدر بدشکل اور کریہ المنظر بھی تھا۔ چیچک کے داغوں کی وجہ سے اس کا چہرہ بڑا خوفناک اور بھیانک بن گیا تھا۔ اس نے اپنے اس عیب کو چھپانے کے لئے ایک ریشمی نقاب تیار کیا جسے وہ پبلک کے سامنے آتے وقت اپنے چہرہ پر ڈالے رکھتا اور کہتا کہ میں اپنا چہرہ اس لئے ننگا نہیں کرتا کہ کہیں لوگ میرے نور اور جلال سے جل بھن نہ جائیں۔ اُس نے اپنے پہاڑی قلعہ پر ایسا انتظام بھی کیا تھا کہ چاند کی شکل کا ایک شعلہ پہاڑی قلعہ کی ایک طرف سے اُٹھتا اور آہستہ آہستہ

---

[1] الاسلام والحضارة العربية جلد ۲ صفحہ ۴۲۱، ۴۲۲

[2] الاسلام والدولة العربية جلد ۲ صفحہ ۶۴، ۶۵

[3] والاصح ان اسمہ عطاء بن حکیم (الفرق بین الفرق صفحہ ۱۹۵ حاشیہ)

چلتے چلتے دوسری طرف جا کر چھپ جاتا جسے قلعہ سے دور کے پہاڑی لوگ سمجھتے کہ چاند ہے جو ان کے الٰہ کے تصرف میں ہے۔ بعض اوقات رات کے وقت قلعہ کے اندر روشنیاں بھی پھوٹتیں جن کے بارہ میں اس نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ یہ اس کے جلال اور نور کا ظہور ہے۔ بہر حال اردگرد کے علاقوں کے اَن پڑھ لیکن بہادر اور فدائی قسم کے لوگ اس کی ان شعبدہ بازیوں کی وجہ سے اس کے گرویدہ ہو گئے۔ وہ سب اس پر فدا ہونے کے لئے ہر وقت تیار رہتے۔ یہ گویا کچھ عرصہ بعد اٹھنے والی حسن بن صباح کی دہشت پسند تحریک کا مقدّمۃُ الجیش تھا۔

المقنّع کی تحریک کو ختم کرنے کے لئے کئی لشکر بھیجے گئے۔ پہاڑی علاقہ تھا اور قلعوں کی وجہ سے مقنّع کا دفاع بڑا مضبوط تھا۔ بہر حال ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر سعید بن عمرو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے وہاں پہنچا۔ سعید نے المقنّع کے قلعہ کی دیوار پر چڑھنے کے لئے لوہے اور لکڑی کی دو سو سیڑھیاں بنوائیں اور قلعہ کے اردگرد کھودی گئی خندق کو پاٹنے کے لئے اُس نے ملتان کے علاقہ سے دس ہزار بھینسوں کی کھالیں منگوائیں جنہیں ریت سے بھر کر خندق میں پھینکوایا گیا تا کہ اُن کے اوپر سے فوجیں گزر سکیں۔ غرض چودہ سال کی مسلسل اور شدید جنگ کے بعد المقنّع کے زور کو توڑا جا سکا۔ المقنّع نے جب دیکھا کہ اب اس کا بچنا مشکل ہے تو وہ اپنے تیار کردہ ایک ''تیزابی محلول'' کے حوض میں ڈوب مرا جس میں اُس کا جسم تحلیل ہو کر نابود ہو گیا۔ جب مسلمان فوجیں قلعہ میں داخل ہوئیں تو المقنّع کا وہاں نام و نشان بھی نہ تھا۔ اس کے اس طرح غائب ہو جانے کو اُس کے متّبعین نے اس کا معجزہ سمجھا اور وہ یہ ماننے لگے کہ المقنّع آسمان پر چڑھ گیا ہے۔ شکست کے بعد اس کے حامیوں میں سے تیس ہزار نے امان طلب کی اور باقی ہزاروں مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔

المقنّع کا دعویٰ تھا کہ وہ ایسا اِلٰہ ہے جو آدم اور دوسرے انبیاء میں منتقل ہوتے ہوئے اب ابو مسلم خراسانی[1] میں آیا اور اب اس کی شکل میں دنیا پر جلوہ گر ہوا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اِنَّمَا اَنْتَقِلُ فِی الصُّوَرِ الْمُخْتَلِفَةِ لِاَنَّ عِبَادِیْ لَایُطِیْقُوْنَ رُؤْیَتِیْ وَمَنْ رَآنِیْ اِحْتَرَقَ بِنُوْرِیْ کہ میں مختلف صورتوں میں منتقل ہوتا رہا ہوں تا کہ لوگ مجھے دیکھ سکیں کیونکہ میرے بندے یہ طاقت نہیں رکھتے کہ وہ میری حقیقی شکل میں مجھے دیکھ سکیں۔ اگر کوئی میرا جلوہ دیکھ لے تو میرے نور کی وجہ سے جل جائے۔

---

[1] اِدَّعَوْا حُلُوْلَ الْاِلٰہِ فِیْ اَبِیْ مُسْلِمْ (فرق الشیعة صفحہ ۴۷)

اُس نے اپنے پیروؤں کو ہر قسم کی آزادی دے رکھی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میری اطاعت کے بعد نہ کسی نماز روزہ کی ضرورت ہے اور نہ محرمات سے بچنے کی۔

اس کے پیرو اباق اور خلجی ترک تھے۔ یہ لوگ اپنی آبادیوں میں مسجدیں بناتے۔ ان میں مؤذن رکھتے جو وقت پر اذان دیتے لیکن نماز پڑھنے کوئی نہ آتا اور اگر کوئی غیر مُقنّعی ان کی بستیوں میں آجاتا اور مؤذن اس کو نہ دیکھ پاتا یعنی اذان کا وقت نہ ہوتا تو وہ اسے قتل کر دیتے۔[1]

اَلْخُرَّمِیَّہ

۲۰۱ ھ میں جبکہ المعتصم عباسی خلیفہ تھا خراسان کے علاقہ آذربیجان اور طبرستان میں ایک اور بغاوت اُٹھی۔ اس بغاوت کا قائد بابک خرمی تھا وہ بڑے بھاری لشکر کے ساتھ مقابلہ کے لئے آیا۔ خلیفہ المعتصم نے اُس سے لڑنے کے لئے متعدد لشکر بھیجے۔ ہزاروں لوگ مارے گئے لیکن کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ عباسی لشکر شکست کھا کر پسپا ہوتے رہے۔ یہ لڑائیاں قریباً بیس سال تک جاری رہیں آخر عباسی حکومت کے قابل جرنیلوں افشین، محمد بن یوسف الثغری اور ابو دلف العجلی کی متحدہ کوششوں سے بڑے خون ریز معرکوں کے بعد ۲۲۳ھ میں کامیابی حاصل ہوئی۔ بابک خرمی اور اس کا بھائی اسحاق پکڑے گئے اور بنو عباس کی مشہور چھاؤنی سُرَّ مَنْ رَأی میں دونوں کو پھانسی دے دی گئی۔

بابک خرمی کے ماننے والے خرمیہ کہلاتے تھے۔ مجوسیوں کی طرح بہت سی محرمات کی اباحت کے قائل تھے۔ مثلاً بہنوں اور پوتیوں سے نکاح جائز سمجھتے تھے[2]۔ اسی طرح بیویوں کے تبادلہ کے بھی قائل تھے۔ المعتصم کا فوجی جرنیل افشین بھی خرمی تحریک سے متاثر تھا اور اسی کے تسامح کی وجہ سے جنگ نے اتنا طول کھینچا تھا۔ چنانچہ شکایت ہونے پر جب تحقیق کی گئی تو حقیقت کا پتہ چلا اور اس الزام میں المعتصم نے افشین کو قتل کرادیا۔[3]

البرامکہ اور باطنی تحریک

کہا جاتا ہے کہ البرامکہ بھی باطنی تحریک کی طرف مائل اور مجوسی نظریات سے متاثر تھے۔ انہوں نے

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۹۵، ۱۹۶۔ فرق الشیعۃ صفحہ ۴۷

[2] قدیم مصری اور سیریا نیز بابلی اور قدیم ایرانی تہذیب میں تحفظ نسل وخاندان کی خاطر بہن بھائی کی شادی کو عیب نہیں سمجھا جاتا تھا (ہسٹری آف سیریا (تاریخ شام) آف فلپ ہٹی۔ ترجمہ بنام تاریخ شام صفحہ ۳۰۳)

[3] فرق الشیعۃ صفحہ ۴۷ حاشیہ۔ الفرق بین الفرق صفحہ ۱۹۵

مختلف مساجد میں بخور جلانے کے لئے انگیٹھیاں بنانے کی تحریک چلائی اور ہارون الرشید کو ترغیب دی کہ وہ خانہ کعبہ میں بھی ایک بہت بڑی بھٹی تعمیر کرائیں جس میں ہر وقت بخور، عُود اور دوسری مختلف خوشبوئیں جلتی رہیں۔ چنانچہ علامہ بغدادی برامکہ کی ان خفیہ مساعی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔
كَانَتِ الْبَرَامِكَةُ قَدْ زَيَّنُوا لِلرَّشِيْدِ اَنْ يَّتَّخِذَ فِي جَوْفِ الْكَعْبَةِ مِجْمَرَةً يَتَبَخَّرُ عَلَيْهَا الْعُوْدُ اَبَدًا فَعَلِمَ الرَّشِيْدُ اَنَّهُمْ اَرَادُوْا مِنْ ذَالِكَ عِبَادَةَ النَّارِ فِي الْكَعْبَةِ وَاَنْ يَّصِيْرَ الْكَعْبَةُ بَيْتَ النَّارِ فَكَانَ ذَالِكَ اَحَدُ اَسْبَابِ قَبْضِ الرَّشِيْدِ عَلَى الْبَرَامِكَةِ [1] یعنی برامکہ نے کوشش کی کہ رشید اس بات پر آمادہ ہو جائے کہ خانہ کعبہ کے اندر خوشبو جلانے کی ایک بھٹی بنائی جائے جس میں بخور اور عُود ہمیشہ جلتی رہا کرے۔ ایک طرح سے ان کی یہ کوشش تھی کہ کعبہ میں آگ کی پوجا کی کوئی صورت نکل آئے۔ رشید نے برامکہ پر جو سختیاں کیں اُن کی وجوہات میں سے ایک وجہ برامکہ کی یہی خطرناک کوشش تھی جس کا رشید نے نوٹس لیا۔

اَلْاِسْمَاعِيْلِيَّه۔ اسماعیلی شیعہ

شیعہ فرقوں میں سے تین فرقوں نے تاریخ اسلام کے ادوار کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ شیعہ زیدیہ، شیعہ اثناعشریہ اور شیعہ اسماعیلیہ۔

شیعہ اسماعیلیہ کی بنیاد سِرّ اور خفاء پر تھی اس لئے اسے جَمِيْعَاتِ سِرِّيَّه میں شمار کیا جاتا ہے۔ خود اسماعیلیہ بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی دینیاتی اور نظریاتی تعلیم میں خفاء اور سِرّ ہے۔ وہ اپنے بنیادی عقائد نہ ہر ایک کو بتاتے ہیں اور نہ عوام میں ان کی اشاعت کرتے ہیں اس لئے ان تک پہنچنے کے لئے اُن کے اپنے ذرائع کی بجائے دوسرے ذرائع پر انحصار کرنا پڑتا ہے جن میں بعض غیر جانبدار ذرائع ہیں اور بعض جانبدار اور تعصب کا رنگ لئے ہوئے۔ بہر حال اس فرقہ کی تفصیلی تاریخ کے لئے دو نقطہ ہائے نظر ہیں ایک وہ جس کے ایک حد تک درست ہونے کو خود اسماعیلی بھی تسلیم کرتے ہیں۔ دوسرا نظریہ وہ ہے جو اسماعیلی شیعوں کے مخالف گروہ جن میں سنّی بھی ہیں اور دوسرے سربر آوردہ شیعہ فرقے بھی۔

پہلے نقطۂ نظر کا پس منظر یہ ہے کہ بنو ہاشم خاص طور پر علوی (یعنی اولادِ علیؓ) بنو اُمیّہ کی حکومت کو ایک غاصب اور ظالم حکومت سمجھتے تھے۔ پہلے پہلے انہوں نے بنو اُمیّہ کا مقابلہ میدانِ جنگ میں کرنا چاہا

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۲۱۶

لیکن نا قابل اعتبار حمایت کی وجہ سے نا کام رہے اور بری طرح شکست کھائی اور حکومت وقت کے زیر عتاب آ گئے خصوصاً زیاد اور حجاج کے زمانہ میں اُن پر بڑی سختیاں ہوئیں ۔ایسے حالات میں بنو اُمیہ کے ان مخالف عناصر نے اپنی تحریک کو خفیہ رنگ دے دیا۔کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ کے سر برآوردہ علویوں اور عباسیوں نے باہمی مشورہ سے ایک جارحیت پسند خفیہ تنظیم قائم کی جس کا سربراہ محمد النفس الزکیہ بن عبداللہ بن حسن کو منتخب کیا گیا اوران کی بیعت بطور امام مہدی کی گئی ۔اس تحریک میں بنوعباسؓ پیش پیش تھے۔اس تنظیم نے اپنے داعی اور مبلغ دور دراز کے علاقوں میں بھجوائے جنہوں نے خفیہ طور پر وہاں کے لوگوں کو حکومت بنو اُمیہ کے خلاف منظم کیا۔ چنانچہ خُراسان اور گردو پیش کے علاقے اس خفیہ تحریک کے گڑھ بن گئے۔[1] آخر یہ تحریک کھلم کھلا مقابلہ پر آ گئی اور بنو اُمیہ کی حکومت کے خاتمہ پر منتج ہوئی۔خُراسان کی فوجوں کا سربراہ ابومسلم خُراسانی تھا چونکہ اس کامیابی میں انہی خُراسانی فوجوں کا نمایاں کردار تھا اس لئے ابومسلم خُراسانی نے بوجوہ علویوں کی بجائے عباسیوں کے اقتدار کی حمایت کی اور بنوعباس خلیفہ بن گئے۔

شروع میں تحریک علویوں کے نام پر چلائی گئی تھی اور دوران تحریک بھی انہی کا نام زیادہ تر استعمال ہوا اور عوام سے کہا گیا کہ آل بیت الرسول کے حق کے لئے یہ سب کوششیں ہورہی ہیں اس لئے خلاف توقع اقتدار جب بنوعباس کو مل گیا تو علویوں نے اس کو اپنی حق تلفی سمجھا۔[2] اس طرح بنوعباسؓ اور بنوعلیؓ میں ٹھن گئی۔جو علوی پہلے بنواُمیہ کے ظلموں کا نشانہ بنے ہوئے تھے اب وہ بنوعباس کی زیادتیوں کی آماجگاہ بن گئے اور بہت سے علوی یعنی سادات مختلف لڑائیوں میں مارے گئے انہی میں امام محمد النفس الزکیہ بھی شامل تھے جن کی ابوجعفر منصور نے بطور امام مہدی بیعت بھی کی ہوئی تھی۔بہر حال بنوعلیؓ بدستور حکومتِ وقت کے زیر عتاب تھے اور ہر وقت عباسی حکام کے زیر نظر رہتے تھے۔اس پس منظر میں حضرت امام جعفر صادقؒ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے جس کا نام اسمٰعیل رکھا گیا یہ امام جعفر کا بڑا لڑکا تھا اور کہا جاتا

---

[1] الاسلام والحضارة العربية جلد ۲ صفحه ۳۱۸

[2] اَدْرَکَ الْعَلَوِيُّوْنَ اَنَّ الْعَبَّاسِيِّيْنَ قَدْخَدَعُوْهُمْ وَاسْتَاثَرُوْا بِالْخِلَافَةِ دُوْنَهُمْ مَعَ اَنَّهُمْ اَحَقُّ بِهَا مِنْهُمْ فَنَابَذُوْهُمُ الْعَدَاءَ وَ نَظَرُوْا اِلَيْهِمْ كَمَا كَانُوا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاُمَوِيِّيْنَ مِنْ قَبْلُ.
(تاريخ الدولة الفاطمية صفحه ۲۸)۔

ہے کہ امام جعفر نے اس کے حق میں وصیت کی تھی کہ میرے بعد یہ جانشین ہوگا لیکن امام جعفر صادق سے پہلے وہ فوت ہوگیا۔[1] اسمٰعیل نے جس شخص کی نگرانی میں پرورش پائی تھی اُس کا نام میمون بن دیصان القداح تھا۔[2] اُس نے اور اُس کے حامیوں نے امام جعفر صادق کی وفات کے بعد اس نظریہ کا اظہار کیا کہ جب ایک کے حق میں وصیت ہو جائے تو پھر وہ منسوخ نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ وصیت امام وقت کی طرف سے باعلامِ الٰہی ہوا کرتی ہے اس لئے امام جعفر صادق کی وفات کے بعد امامت کا منصب امام اسمٰعیل کی اولاد کے سپرد ہوگا۔[3] امام اسمٰعیل کے لڑکے کا نام محمد تھا چنانچہ ان لوگوں نے محمد بن اسمٰعیل کو اپنا امام تسلیم کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی دعویٰ کیا گیا کہ چونکہ حکومت کی طرف سے خطرہ ہے کہ وہ امامِ وقت کو کوئی نقصان پہنچائے اس لئے انہوں نے چھپ کر زندگی بسر کی۔[4] یہاں سے امام مستور یعنی خفیہ امامت کے نظریہ کا آغاز ہوا۔ اس "امام مستور" کے لڑکے کا نام احمد تھا جو دوسرا امام مستور تھا۔ امام احمد کے لڑکے کا نام محمد الحبیب تھا یہ تیسرا امام مستور تھا۔ اس تیسرے امام مستور کے لڑکے کا نام عبداللہ[5] تھا جو چوتھا امام قرار پایا یہ کچھ عرصہ مستور رہا اس کے بعد مغرب یعنی شمال مغربی افریقہ میں اس کے نام سے عبیدیہ حکومت قائم کی گئی اس طرح عبیداللہ نے المہدی کے نام سے اپنے آپ کو ظاہر کر دیا۔ ائمہ مستورین کا یہ دور کوئی دو سو سال تک ممتد ہے۔[6] اس عرصہ میں یہ ائمہ مختلف جگہوں میں خفیہ طور پر رہے اور بڑی

---

[1] قیل قد ترک الامامة لابنه محمد الذی اصبح امامًا سابعًا حقیقیًا (العقیدة والشریعة صفحه ۲۱۲، ۲۱۳)

[2] تاریخ الدولة الفاطمیة صفحه ۷۷

[3] شیعہ اثناعشریہ کے نزدیک بطریق بداء اسمٰعیل کی بجائے ان کے بھائی موسیٰ الکاظم کو امامت ملی لیکن اسماعیلی کہتے ہیں اِنَّ الْاِمَامَةَ لَا تَنْتَقِلُ مِنْ اَخٍ اِلٰی اَخٍ بَعْدَ الحسنِ والحسینِ وَ لَا تَكُوْنُ اِلَّا فِی الْاَعْقَابِ (تاریخ الفرق الاسلامیة صفحه ۱۸۳۔ فرق الشیعة صفحه ۵۷ تا ۹۰)

[4] الدولة الفاطمیة صفحه ۳۹ ۔ حسن ابراهیم حسن استاذ التاریخ الاسلامی جامعه قاهره۔ مکتبة النهضة المصریة القاهره طبع رابع ۱۹۸۱ء

[5] بعض کے نزدیک ائمہ مستورین کے نام یہ ہیں۔ عبیداللہ المہدی بن احمد بن اسماعیل بن محمد۔ جو کہ اسماعیل بن جعفر صادق کے لڑکے تھے۔ والاسماعیلیة الذین یؤیدون صحة نسب عبید اللّٰه یَكَادوْنَ یتفقون علی ان عبیداللّٰه المهدی هو ابن الحسین بن احمد بن عبداللّٰه بن محمد بن اسماعیل (الدولة الفاطمیة صفحه ٦٦ و ۷۷)۔

[6] ان الائمة المستورین لم یکونوا معروفین لغیر خاصتهم و ان الدعاة کانوا یختلفون فی ذکر اسمائهم لِلْخِفَاءِ (الدولة الفاطمیة صفحه ۷۸)۔

رازداری کے ساتھ اپنی دعوت کو پھیلاتے رہے۔[1]

اسماعیلی شیعوں کی خفیہ تحریک کا یہ ایک پہلو ہے۔[2] اس کا دوسرا پہلو جسے اکثر سُنّی اور کئی شیعہ اور خود اسماعیلیوں کا کچھ حصہ بیان کرتا ہے اور اس میں عباسیوں کی کوشش کا دخل بھی ہے وہ یہ ہے کہ دراصل[3] اسمٰعیل بن امام جعفر صادق نوجوانی میں لاولد فوت ہو گئے تھے۔ ان کا ایک مولیٰ تھا جس کا نام میمون بن دیصان القداح تھا۔ یہ شخص بڑا ذہین، صاحب علم اور انتہائی ہوشیار تھا۔ اَہواز فارس کا رہنے والا تھا۔ اوپر سے مسلمان تھا لیکن اندر سے ثنوی اور مجوسی تھا اور اسے یہ بڑا رنج تھا کہ عربوں نے ان کے ملک کو فتح کر کے اپنا تابع فرمان اور غلام بنالیا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ اس کے ملک یعنی فارس وخراسان کے لوگ کھلم کھلا عربوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسی زمانہ میں اُمویوں کے خلاف علویوں اور عبّاسیوں کی خفیہ تحریک بھی چلی تھی۔ اسی انداز پر اس نے بھی عربوں اور ان کے دین یعنی اسلام کے خلاف اپنی ایک خفیہ تحریک کو منظم کیا اور کامیابی کے لئے آل بیتِ رسولؐ کے نام کو استعمال کرنے کا پروگرام بنایا اور وہ یوں کہ اس نے امام اسمٰعیل کی نسل کے جن ائمہ مستورین کا ڈھونگ رچایا وہ دراصل اس کی اپنی نسل کے لوگ تھے چنانچہ اُس نے یہ ظاہر کیا کہ امام اسمٰعیل کا ایک بیٹا ہے جس کا نام محمد ہے لیکن لوگوں کے سامنے اسے اس لئے نہیں لایا جا سکتا کہ حکومت کی طرف سے گرفت کا خطرہ ہے۔ یہ درحقیقت اس کا اپنا بیٹا عبداللہ تھا۔ میمون کا بیٹا عبداللہ بھی بڑا عالم، ذہین اور بڑی تنظیمی قابلیتوں کا مالک تھا[4]۔ عبداللہ نے مختلف جگہوں میں پھرتے پھراتے اور اپنے حامیوں کو منظم کرتے۔ آخر کار سَلَمْیَۃ کو مرکز دعوۃ بنایا اور اسماعیلی مذہب کے اصول وعقائد کو مرتب کیا اور ان کو ترویج دی۔ اُس نے ان تعلیمات کے سات درجے مقرر کئے جو

---

[1] أنَّ محمد بن اسماعيل فرَّ إلى الرَّيّ ومنها الى دماوند وسار أبنائُهُ على مِنوَالِهِ فاختفوا في خراسان وفي اقليم قندهار و في السند واخذ دُعاتهم يجولون البلاد لجذب الاشياع اليهم (الدولة الفاطمية صفحه ۳۹ ۔ تاريخ الفرق الاسلامية صفحه ۱۷۵ بھی دیکھیں)

[2] تاريخ الدولة الفاطمية صفحه ۷۷

[3] تاريخ الدولة الفاطمية صفحه ۷۶، ۲۲۷، ۴۰۹

[4] قال المقريزى كان عبدالله عالمًا بجميع الشرائع و السنن و المذاهب ...... و دعوته إلى إمَامَةِ اسمٰعيل بن جعفر الصادق كانت لحيلةٍ إتَّخَذَهَا لِيَجْمَع حَوْلَهُ أنْصَارًا و وَسِيْلَةً لتنفيذ اغراضه و هي تكوين دولةٍ فارسيّةٍ (تاريخ الدولة الفاطمية صفحه ۴۰ ملخصًا)

فاطمی حکومت کے قیام کے بعد نو قرار پائے۔ ہر درجہ کے مرید کی عقل و سمجھ کو پرکھے بغیر نہ اُسے اگلے درجہ میں جانے دیا جاتا اور نہ اُسے اس درجہ کی خبر ہونے دی جاتی تھی کہ اس کا تعلیمی اور عملی نصاب کیا ہے۔[1]

عبد اللہ ۲۷۰ھ کے قریب فوت ہوا تو اس کا بیٹا احمد جانشین بنا جس کی کنیت اَبُو الشَّلَغْلَغْ تھی۔ احمد نے تحریک کو منظم کرنے اور اسے وسیع کرنے میں بڑی مہارت دکھائی۔ اُس نے اپنا جانشین یا ولی عہد اپنے بھتیجے سعید بن الحسین کو بنایا۔ یہی سعید بعد میں عبید اللہ المہدی کے نام سے شمال مغربی افریقہ میں دولت عبیدیہ کا بانی بنا۔[2]

بہر حال امام اسمٰعیل بن امام جعفر الصادق کی نسل سے ائمہ مستورین تھے یا دیصانیوں نے اپنے طور پر اس تحریک کو منظم کیا تھا۔ بنیادی طور پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصلا دیکھنا یہ ہے کہ اس تحریک کا بنیادی مقصد کیا تھا اور تحریک نے کن ذرائع سے کام لے کر اسے کامیابی سے ہمکنار کیا۔

اسماعیلی نظریات اور عقائد

اسماعیلی خود بڑی حد تک اپنے نظریات اور عقائد کو چھپاتے ہیں۔ پھر یہ مختلف ادوار سے گزرے ہیں اس وجہ سے بھی عقائد میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ دوسروں نے جو کچھ بیان کیا ہے اُس میں تعصب کی ملونی بھی ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ عقائد و نظریات کے بارہ میں جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے وہ سو فیصد درست اور مطابق واقعہ ہے تاہم کسی حد تک خود اسماعیلیوں کے اپنے بیان کے مطابق اور کچھ ان دستاویزات کے لحاظ سے جو مختلف ذرائع سے اہل علم کے سامنے آئی ہیں اور جو کچھ غیر جانبدار مؤرخین نے بیان کیا ہے اسماعیلیوں کے جن عقائد اور نظریات کا علم ہو سکا ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ ائمہ اہلِ بیت مقدس اور معصوم ہیں۔ دین کا علم اُن کو خدا کی طرف سے ملتا ہے اس لحاظ سے وہ کسی کے شاگرد نہیں ہوتے بلکہ دُنیا بھر کے وہ استاد اور دینی رہنما ہوتے ہیں۔ نیز ائمہ وصی ہوتے ہیں۔[3]

۲۔ پہلے چھ ائمہ یعنی حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت زین العابدینؓ، حضرت محمد باقرؓ اور حضرت جعفر صادقؓ کو شیعہ اثنا عشریہ بھی امام مانتے ہیں اور اسماعیلی شیعہ بھی امام مانتے

---

[1] تاریخ الدولة الفاطمية صفحه ۴۲، ۵۹، ۶۱

[2] تاریخ الدولة الفاطمية صفحه ۶۱

[3] دعائم الاسلام جلد ۱ صفحه ۵۴ ـ العقيدة والشريعة صفحه ۲۱۵

ہیں۔اس کے بعد اختلاف ہوجاتا ہے۔اسماعیلی شیعہ امام جعفر صادق کے بعد اُن کے بڑے لڑکے اسماعیل اوران کی اولادکواپنا امام مانتے ہیں[۱] اوراثنا عشری شیعہ ان کے دوسرے لڑکے موسیٰ الکاظم اور ان کی اولادکوامام تسلیم کرتے ہیں۔

۳۔ اسماعیلی شیعہ قرآن کریم کے بارہ میں کہتے ہیں کہ وہ امام صامت ہے اوران کے ائمہ امام ناطق ہیں اس لئے قرآن کریم کے جو معنے اور جو تفسیر وہ بیان کریں وہی درست ہے مثلاً اگر وہ کہیں کہ قرآن کریم میں اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کا جو حکم ہے اُس سے مراد ائمہ اہلِ بیت سے محبت، اخلاص اوران کی فرمانبرداری کا اظہار ہے،تو یہی معنے درست ہوں گے اوران کی تاویل ہی صحیح تسلیم کی جائے گی کیونکہ قرآن کریم کاایک ظاہر ہےاورایک باطن اور باطن کاعلم صرف امام کوہی ہوتا ہے۔[۲]

۴۔ امام کومان لینےاوراس کی فرمانبرداری کاعہد کرلینے کے بعد تمام شرائع اوردین کے تمام احکام سےانسان آزادہوجاتا ہے۔[۳]

۵۔ بعض اسماعیلیوں کےنزدیک امام اسماعیل کے بیٹے امام محمد خاتم النبیین[۴] القائم صاحب الزمان ہیں انہوں نے شریعتِ اسلامیہ کومنسوخ کردیا ہے کیونکہ ہرشریعت کے سات ائمہ ہوتے ہیں جب ان سات کادورختم ہوجائےتو نئی شریعت کا آنا ضروری ہے چنانچہ امام اسمٰعیل پر سابقہ ائمہ کا دَورختم ہوگیا اور امام محمد سے نیا دَورشروع ہوا۔[۵]

---

[۱] الامامة لا تنتقل من اخٍ الی اخٍ بعد الحسن والحسین علیهما السلام ولا تکون اِلاَّ فی الاعقاب ۔ تاریخ الفرق الاسلامیة صفحه ۱۸۳ ۔الدولة الفاطمیة صفحه ۳۸ ۔ دعائم الاسلام جلد ۱ صفحه ۴۷)

[۲] الف ۔ اَهَمُّ الفرق التی خرجت علی الجماعة واَضَرَّتْ بالاسلام فرق الباطنیة اِدَّعَوْا اَنَّ لِکُلِّ ظَاهِرٍ بَاطِنًا وَلِکُلِّ تَنْزِیْلٍ تَاْوِیْلًا(الاسلام والحضارة العربیة صفحه ۶۳ ۔ العقیدة والشریعة فی الاسلام صفحه ۲۱۸)

ب ۔ تاویل کی امثلہ کے لئے دیکھیں تاریخ الفرق الاسلامیة صفحه ۱۹۲

[۳] دعائم الاسلام جلد ۱ صفحه ۶۵ نیز یہ ایک فریق کا مسلک ہے جس کی نمائندگی زیادہ تر آغاخانی اسماعیلی کرتے ہیں یا دروز ۔دوسرے فریق کے لوگ جو بُہرہ اورخوجے کہلاتے ہیں اور مستعلیہ بھی وہ نماز، روزہ اورحلال وحرام کے احکام کے قائل اورپابند ہیں ۔ان کی فقہی تشریحات کے لئے کتاب دعائم الاسلام کا مطالعہ مفید رہے گا ۔(تاریخ الفرق الاسلامیة صفحه ۱۹۵،۱۹۶)

[۴] یہ گروہ المبارکیہ کہلاتا تھا ۔تاریخ الدولة الفاطمیة صفحه ۶۱

[۵] العقیدة والشریعة صفحه ۲۱۳،۲۱۴

۶۔اسماعیلی شیعہ حلول کے بھی قائل ہیں یعنی وہ یہ مانتے ہیں کہ خدا ائمہ میں داخل ہو جاتا ہے اُن میں سما جاتا ہے یا وہ ان معنوں میں خدا کے مظہر ہیں کہ خدائی طاقتیں اور خدائی قدرتیں ان کو عطا ہوتی ہیں۔وہ خدا کی طرح عالم الغیب ہوتے ہیں۔وہ زندہ بھی کر سکتے ہیں اور وہ مار بھی سکتے ہیں یہ رائے بھی دروز اور بعض آغا خانیوں کی ہے۔بُہرہ اس کے قائل نہیں۔

۷۔اسماعیلی شیعہ تناسخ کے بھی قائل ہیں اور مانتے ہیں کہ روحیں مختلف جونوں میں منتقل ہوتی رہتی ہیں اور یہی ان کے لئے قیامت ہے۔

۸۔اسماعیلی شیعہ فیثا غورثی فلاسفہ کی طرح سات اور بارہ کے عدد کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اُن کے کئی نظریات اور درجات میں ان اعداد کا عمل دخل ہے۔[۱] ان کا کہنا ہے کہ سیارے سات ہیں اور بُرج بارہ اسی لحاظ سے زمین پر بھی ان کی نیابت ہے۔اسی وجہ سے ان کے ہاں اتباع کے بھی سات درجے ہیں ہر درجہ کا متبع اپنے درجہ کے علمی اور عملی نصاب کو عبور کئے بغیر اگلے درجہ میں نہ جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ جان سکتا ہے کہ اُس درجہ کا علمی اور عملی نصاب کیا ہے۔اس طرح ایک اسماعیلی درجہ بدرجہ ترقی کرتے کرتے آخری درجہ تک پہنچ سکتا ہے جو داعی یا حجت کا درجہ ہے۔[۲]

اسماعیلیوں کا کہنا ہے کہ علم الٰہی نبی کے ذریعہ وصی کو ملتا ہے مثلاً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ حضرت علی علیہ السلام کو ملا پھر وصی سے امام کو ملتا ہے اور امام سے حجت کو ملتا ہے۔[۳]

حجج، نقباء اور دعاۃ[۴] مذہبی کارکن ہوتے ہیں جو مختلف علاقوں میں اسماعیلی مذہب کے پھیلانے اور اسماعیلیوں کی تہذیب و تربیت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

---

۱ إنّ داعي الدعاة اكبر الدرجات عند الاسماعيلية ...... و لا تباعهم سبع درجاتٍ ...... ان كلاً من هذه الدرجات له كتابٌ خاص و يلقي على الواصلين اليها و كل كتاب يسمى البلاغ (الجميعات السرية صفحه ۳۲۔ العقيدة و الشريعة صفحه ۲۱۴،۲۱۵

۲ الدولة الفاطمية صفحه ۳۲ صفحه ۶۱۔فاذا بلغ الانسان الدرجة السابعة ينحل من جميع الاديان (تاريخ الفرق الاسلامية صفحه ۱۸۲)

۳ ان ميراث النبيَ العلمى يتحوّلُ مِنَ النّبِيّ الى الوصيّ ومنه الى الامام ومن الامام الى الحجة...... والدعاةُ الذين يُسمّون الحجج يبثون الدعوة السِرّيّة فى غيبةِ الامام اوفى حضرته وهم مُقَنّعُون وعددهم ثابتٌ ابداً اثنا عشر رجُلا يشارك الحجج الائمة فى العلم والدعوة والسند الإلٰهيّ (الشيعة فى التاريخ صفحه ۶۲۔العقيدة والشريعة فى الاسلام صفحه ۲۱۶)

۴ اَلنُقَباء انصار الائمة (الحضارة الاسلامية جلد ۲ صفحه ۵۷)

اسماعیلی شیعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اکثر صحابہؓ کے بارہ میں اچھی رائے نہیں رکھتے معتدل اسماعیلی شیعہ زیادہ سے زیادہ اس رائے کا اظہار کرتا ہے کہ علیؓ کی بجائے ابوبکرؓ کو خلیفۃ الرسول منتخب کرنے میں انہوں نے غلطی کی تھی لیکن چونکہ حضرت علیؓ نے اپنا حق لینے کے لئے اُن سے لڑائی نہیں کی نیز وہ اُن سے تعاون کرتے رہے۔اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی بہتری کے لئے اُن کے ساتھ رہے اس لئے ہمیں بھی حضرت علیؓ کے نمونہ اور اُسوہ پر چلنا چاہیے۔غالی اسماعیلی صحابہؓ کو بُرا بھلا کہتے ہیں انہیں مسلمان نہیں سمجھتے اور پہلے خلفاء ثلاثہؓ کو غاصب اور ظالم قرار دیتے ہیں۔[1]

اسماعیلی نظریات

پس اسماعیلیوں کے نظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔ لوگوں کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے امام کا ہونا ضروری ہے یہ امام اگر ظاہر اور لوگوں کے سامنے ہو تو وہ خود لوگوں کی رہنمائی کرے گا اور اگر مستور اور لوگوں سے چھپا ہوا ہو تو اُس کے حجج اور دعاۃ اس کی نیابت کریں گے اور لوگوں تک اُس کے پیغام اور اُس کی ہدایتیں پہنچائیں گے۔[2]

۲۔ **الامام المقیم** جو رسول ناطق کو مقرر کرتا ہے اُسے **"رَبُّ الوقت"** بھی کہا جاتا ہے۔یہ امامت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔بعض کے نزدیک ابو طالب امام مقیم ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو **اَلرَّسُوْلُ النَّاطِق** مقرر کیا۔

۳۔ دوسرے درجہ پر **الامام الاساس** ہے جو **الامام النّاطق** کی مرافقت اور معاونت میں کام کرتا ہے۔اس کا دایاں ہاتھ ہوتا ہے۔رسالت کبریٰ کے کاموں کا قائم اور نگران ہوتا ہے۔[3] علیؓ الامام الاساس ہیں۔

---

[1] دعائم الاسلام جلد ۱ صفحہ ۱۰۳تا۱۰۶۔ العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام صفحہ ۱۸۲و۲۱۰

[2] الامام اما ظاهر مکشوف واما باطن مستورٌ ...... و اذا کان الامام مستورًا فلا بدّ ان تکون حجتهٗ و دعاته ظاهرین و ان الامام یساوی النبی فی العِصْمَةِ وَالْاِطِّلَاعِ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ (تاریخ الفرق الاسلامیة صفحہ ۱۸۹و۱۹۱)

[3] القائم باعمال الرسالة الکبریٰ والمنفذ لِلّاَ وَامِرِ العلیا (تاریخ الفرق الاسلامیة صفحہ ۱۷۲)

۴۔ اَلْاِمَامُ الْمُسْتَقِر ۔یہ بعد میں آنے والے امام کی تخصیص اور تعیین کا اختیار رکھتا ہے۔[1]

۵۔ اَلْاِمَـامُ الْـمُسْتَوْدَع ۔یہ امام مستقر کی نیابت میں کام کرتا ہے ۔اسے نائب الامام بھی کہتے ہیں اس لئے آئندہ کے امام کی تخصیص اور تعیین کے اختیارات اُسے حاصل نہیں ہوتے ۔

۶۔ امامت کے دور سات ہیں ۔اسلام کی صورت میں چھٹے دور کا آغاز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے جو النَّاطق ہیں آپ کے بعد علیؑ اس دور کے پہلے امام ہیں جو ''اِلْاِمَامُ الْاَسَاس'' ہیں ۔پھر ان کے بعد اَلْاَئِـمَّۃُ الْقَائِمِیْن ہیں جو حسن، حسین ، زین العابدین ،محمد باقر ،جعفر صادق اور اسمٰعیل ہیں ۔ یہاں پر سات کا دور ختم ہو جاتا ہے اور محمد بن اسمٰعیل سے اگلے یعنی ساتویں دور کا آغاز ہوتا ہے اس بناپر محمد بن اسماعیل ناسخ شریعت محمدیہ بھی ہیں ۔[2]

سات دور کے اس نظریہ کو اپنانے کی وجہ سے اسماعیلیہ کو سَبْعِیّہ بھی کہا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آسمان سات ہیں، کواکب سات ہیں، زمینیں سات ہیں، ہفتے کے دن سات ہیں ۔اسی منوال پر ائمہ کے دور بھی سات ہیں اور ہر دَور میں ائمہ بھی سات ہوتے ہیں ۔[3]

۷۔ ائمہ جس طینت یعنی مٹی سے پیدا ہوتے ہیں وہ بشری طینت اور مٹی سے اعلیٰ اور برتر ہے۔ اسی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے چنیدہ اور مخلوقات کے لیے حجت ہوتے ہیں ۔

۸۔ امام زمانہ کی مدد کے لیے حجج، مأذونون اور اَجنحہ ہوتے ہیں ۔حجج جن کو بعض اوقات دُعاۃ بھی کہا جاتا ہے ہمیشہ بارہ رہتے ہیں جن میں سے چار امام کے ساتھ رہتے ہیں ۔مـأذونون اور اجنحہ امام اور دُعاۃ کے درمیان پیغامبر اور رابطہ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں ۔[4]

---

[1] الامامة عندهم اما بالوراثة من الوَالِدِ الى الولد و اما بالنص عليه من الامام الذى سَبَقَهُ (نفس المصدر)

[2] ان محمد بن اسمٰعيل القائم اتى لِيُفَسِّرَ الْقُرآن باطنيًا اتى بالتأويل۔
(تاريخ الفرق الاسلامية بحواله نشأة الفكر الفلسفي صفحه ۲۰۳)

[3] النطقاء سبعةٌ هم آدم ونوح وابراهيم وموسىٰ وعيسىٰ ومحمد والقائم. هم من اصحاب الشرائع ثم ادخلوا بين الناطق السادس اى محمد صلى الله عليه وآلهٖ وسلم وبين القائم السابع اى محمد بن اسماعيل ائمةً ظاهرين هم على والحسن والحسين وعلى ومحمد وجعفر و اسماعيل۔
(تاريخ الفرق الاسلامية صفحه ۱۹۰)

[4] المعرفة عن النظريات السِّرِّيَّةِ الاسماعيلية مقتصرة على طبقةٍ خاصّة من الدعاةِ۔
(تاريخ الفرق الاسلامية صفحه ۱۹۴)

۹۔ اسماعیلیہ معروف معنوں میں قیامت اور حشر ونشر کو نہیں مانتے اور نہ جنت و دوزخ کے قائل ہیں ۔ان کا کہنا ہے کہ قیامت سے مراد خروج الامام قائم الزمان ہے جو ایک نئے دور کا آغاز کرتا ہے اور ساتویں درجہ پر ہوتا ہے اور معاد سے مراد یہ ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد اُس کی ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹا دی جاتی ہے مثلاً انسان رُوحانی اور جسمانی عناصر سے مرکب ہے اور جسمانی عناصر چار ہیں اَلصَّفْرَآء. اَلسَّوْدَآء. اَلْبَلْغَمْ اور اَلدَّم۔صفراء ناری عنصر ہے اس لیے آگ کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔سوداء ارضی عنصر ہے اس لیے وہ تراب یعنی مٹی بن جاتا ہے۔ بلغم مائی عنصر ہے اس لیے وہ پانی میں جا شامل ہوتا ہے اور اَلدَّم ہوائی عنصر ہے اس لیے وہ ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے ۔رہا انسان کا رُوحانی پہلو تو وہ روح یعنی النفس المدرکہ ہے ۔اگر وہ فضائل سے مزین ہے تو وہ عالم رُوحانی میں جا شامل ہو گا اور آیت کریمہ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً [۱] میں اسی روحانی عالم کی طرف رجوع اور صعود کا اشارہ ہے اور اگر روح یعنی نفس مدرکہ رذائل اور عیوب میں ملوث ہے تو پھر اسے مختلف جونوں کے چکر میں ڈال دیا جاتا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہتا ہے ۔[۲]

۱۰۔ بعض اسماعیلی انیس کے عدد کو بڑی اہمیت دیتے ہیں مثلاً ان کا کہنا ہے کہ ہر دور میں سات امام ہوتے ہیں اور بارہ داعی اور ان کا مجموعہ انیس ہے ۔اسی طرح ہر دعامہ کے سات فرائض ہیں اور بارہ سنتیں اور ان کا مجموعہ انیس ہے۔اس نظریہ نے فاطمی خلیفہ المستعصر کے زمانہ میں فروغ حاصل کیا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد المستعصر اسماعیلیہ کے نزدیک انیسواں امام تھا۔[۳]

غرض اسماعیلی قیادت نے بعض اسلامی ایمانیات کے ساتھ یونانی فلسفہ، مجوسی اور ہندی تصوّرات، یہودی اور عیسائی مسلّمات کی آمیزش کر کے اپنے عقائد ونظریات کو ترتیب دیا اور اُن کے لیے فلسفیانہ

۱۔ الفجر : ۲۸، ۲۹

۲۔ فانها تبقٰی ابد الدهرِ بتَناسُخِهَا بالابدان. وفی الحقیقة اِنَّ السِّرِّیَّة غمرت الدعوة الاسماعیلیة حتی التبس امرُها علی المؤرّخین فلم یستطیعوا علی حقیقة القائمین بها ۔(تاریخ الفرق الاسلامیة صفحہ ۱۹۲و۱۹۶)

۳۔ لم ینفرد فلاسفة الاسماعیلیة باتخاذ الاعداد اصولاً لدینهم فقد اتخذ الفیثا غوریون من کل عدد اصلًا لدراساتهم۔(تاریخ الدولة الفاطمیة صفحہ ۵۰۰)

دلائل مہیا کئے۔ یہ خفیہ تحریک علمی تصوّرات اور سرّی اقدامات کا مجموعہ تھی۔ اس تحریک کے قائدین نے بعض علوی اور خراسانی عناصر کی طرح کھلم کھلا حکومت کے مقابل آنے کی کوششوں کو ترک کر دیا اور خفیہ رہ کر مختلف قسم کی علمی اور تنظیمی سازشوں کے ذریعہ وہ اپنے مقاصد کی طرف بڑھے اور بڑی حد تک اپنے ہدف کے حاصل کرنے میں کامیاب رہے تاہم چونکہ اسلامی نقطہ نظر سے اس تحریک کی کوئی بنیاد نہ تھی اور نہ عدل وانصاف کے قیام اور ظلم وجور کے اختتام کے لحاظ سے اس کے قائدین اتنے مخلص تھے اس لئے جب عوام نے کامیابی کے بعد اس تحریک کے طور دیکھے تو ان کی ساری امیدیں ختم ہوگئیں اور مہدویت کے نظریہ کے تحت جس امن وامان، خوشحالی اور فارغ البالی کے اُن کو وعدے دیئے گئے تھے وہ سب بڑی حد تک فریب ثابت ہوئے۔ اس طرح عوام کی تائید سے محروم ہو جانے کی وجہ سے کچھ عرصہ بعد ہی اس تحریک کا جوش وخروش ختم ہوگیا اور پھر آہستہ آہستہ چند نشانات چھوڑنے اور اُمّتِ مسلمہ کے بہت سے نقصانات کا باعث بننے کے بعد یہ تحریک اپنی موت آپ مرگئی۔[1]

دعوت اَسْمَاعِیْلِیّہ کا فروغ

رہی الاسماعیلی تحریک کے فروغ اور عروج کی داستان تو اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ اس تحریک کے قائدین نے سَلَمْیَہ کو مرکز بنانے کے بعد مختلف اطراف میں اپنے داعی روانہ کئے۔ یہ داعی بڑے قابل اور اپنے نظریہ کے بارہ میں بڑے مخلص تھے۔ عراق میں اس تحریک کا داعی محمد بن الحسن بن جہار نجار الملقب بدندان پہلے سے ہی کام کر رہا تھا اُس نے عبداللہ بن میمون کو بہت سی مالی امداد دی اور اس کے نظریات کو پھیلایا۔ عرب اور اسلام دشمنی میں دونوں برابر تھے۔[2]

عبداللہ نے سَلَمْیَہ کو اپنا مرکز بنانے کے بعد اپنے بیٹے الحسین کو رئیس الدعوت کا عہدہ دیا اور

---

[1] قد بدأ النزاع الديني بين السنيّين و الشِّيْعِيّين......في عصر متقدمٍ لكن ظهر بصورة اشدّ عداءٍ في الاجيال التَّالِيَةِ حِيْنَ اَخَذَ كُلُّ حزبٍ يلعن الحزب الأخر......حتى الشيعة ارغموا على دفع الجزية كما أرْغَمَ السنيون على دفعها حينًا آخر في عهد الفاطِمِيّيْنَ ۔(تاريخ الدولة الفاطمية صفحه۳۷٦۔ بحواله رسائل بديع الزمان الهمداني صفحه ۴۲۴۔ ورسائل الحاكم بامر الله دارالكتب المصريه بالقاهره مخطوطات الشيعة رقم صفحه ۲۰۔ ورقه نمبر ۱۱۱)

[2] تاريخ الدولة الفاطمية صفحه ۴۰،۴۱

اپنے دوسرے بیٹے احمد ابو الشَّلْغَلَع کو عراق کا علاقہ سپرد کیا اور اپنے ایک اور بیٹے کے سپرد فارس کا علاقہ کیا عبداللہ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا احمد ابو الشَّلْغَلَع اس کا جانشین بنا۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح بڑا منتظم اور ماہر علوم تھا، کئی زبانیں جانتا تھا۔ اس نے یمن کی طرف رستم بن الحسین بن فرج بن حوشب کو داعی الدُّعاۃ بنا کر بھیجا جو بڑا قابل اور مخلص داعی تھا۔[1] اس کے بعد اُس نے الحسن بن احمد ابوعبداللہ الشیعی الصعانی کو تیار کیا کہ وہ واپس یمن جائے اور ابن حوشب سے اسماعیلی دعوت کے طور طریق اور اس کے فرائض سیکھے۔ اس کے بعد مغرب (یعنی شمال مغربی افریقہ) میں جا کر بربری اقوام میں دعوت پھیلائے۔

ابوعبداللہ احمد کا زیادہ زور دولت عباسیہ کے مرکز بغداد سے دور کے علاقوں پر تھا کیونکہ ایک تو دور کے علاقوں میں حکومت کی گرفت کمزور تھی۔ دوسرے وہاں کے مقامی حکام کے ظلموں سے لوگ تنگ آئے ہوئے تھے۔ تیسرے ان کی تختیٔ دل صاف تھی اور دین کے مسائل کا ان کو بہت کم علم تھا اور چونکہ آلِ بیت نبویؐ سے ان کی عقیدت بوجوہ مشہور و معروف[2] تھی اور بربری لڑائی میں بھی بڑے بہادر تھے۔ بہرحال ابوعبداللہ الشیعی یمن سے ہو کر بمطابق مشورہ ابن حوشب پہلے مکہ مکرمہ آیا وہاں سے حاجیوں کے ایک قافلہ کے ساتھ مصر آ گیا۔ اس قافلہ میں کتامہ کے لوگ بھی تھے جو مغرب میں بربر کا ایک محفوظ قبیلہ تھا اور پہلے سے شیعہ اثرات سے متاثر تھا۔ کتامہ کے حاجی ابوعبداللہ الشیعی کی فصیح اللسانی اور شیریں بیانی سے خاصے متاثر ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ انہی کی درخواست پر ابوعبداللہ الشیعی نے کتامہ[3] کے علاقہ میں قیام کیا اور حالات سازگار دیکھ کر وہاں ایک محفوظ جگہ فَجُّ الاخیار کو اپنی دعوت اور تبلیغ کا مرکز اور دارالہجرت قرار دیا۔ اس نے مہدیٔ منتظر کے ظہور کے بارہ میں بڑے سہانے خواب وہاں کے لوگوں کو دکھائے۔ یہ لوگ پہلے ہی وہاں کے مقامی عرب حکام سے تنگ آئے ہوئے تھے وہ ابوعبداللہ الشیعی کی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیں تاریخ الدولۃ الفاطمیۃ صفحہ ۴۸ حاشیہ

[2] ذکر ابن الاثیر ان جعفر الصادق بعث دَاعِیَیْن وقال لھما ان المغرب ارض بُوَرٍ فاذھبا فاحرثا حتی یجیٔ صاحبُ البذر۔ الخ۔ تفصیل کے لئے دیکھیں تاریخ الدولۃ الفاطمیۃ صفحہ ۴۴ تا ۴۷

[3] سَلَمْیَہ کے قائدین نے اپنے داعیوں کے ذریعہ مختلف علاقوں میں دارالہجرت قائم کروائے انہی میں فَجُّ الاخیار بھی ایک دارالہجرت تھا۔ (تاریخ الدولۃ الفاطمیۃ صفحہ ۴۹)

باتوں سے بہت متاثر ہوئے اور اُس کی تنظیم کے سرگرم رکن بن گئے۔ابوعبداللہ الشیعی کی مغرب میں آمد ۲۸۸ھ کے قریب تھی۔[1]

ابوعبداللہ الشیعی نے تصوّف کا جامہ اوڑھ رکھا تھا اور بڑے صوفی کے رنگ میں لوگوں کے سامنے آتا۔ بہرحال اس نے ذہانت، عزم اور احتیاط کے ساتھ بڑے خفیہ انداز میں اپنی دعوت کو آگے بڑھایا۔اُس نے اس بات کا بھی اظہار کیا کہ حضرت امام جعفرؒ نے اپنے دو داعیوں کو ان علاقوں کی طرف بھیج کر جو یہ ارشاد فرمایا تھا کہ حَتّٰی یَجِیْءَ صَاحِبُ الْبِذْرِ تو وہ صاحب البذر یعنی بیج بونے والا میں ہوں۔ بہرحال ابوعبداللہ الشیعی کی دعوت کی وجہ سے اردگرد کے علاقہ کے لوگ بکثرت اس کی تنظیم میں شامل ہونے لگے۔ان دنوں ان علاقوں میں اَغَالِبَہ کی حکومت تھی جو بنوعباس کی طرف سے ان علاقوں کے والی تھے۔ابوعبداللہ الشیعی کے جتھوں کی اغالبہ کی فوجوں سے کئی جھڑپیں بھی ہوئیں اور غلبہ ابوعبداللہ الشیعی کے حامیوں کے ہاتھ رہا۔

ابوعبداللہ الشِّیْعِیْ نے یہ پراپیگنڈا بڑے زور وشور سے کیا کہ بس اب امام مہدی ظاہر ہونے والے ہیں اس کا اثر بھی بہت اچھا پڑا[2] اور ابوعبداللہ کی طاقت بڑھتی رہی آخر اغالبہ شکست کھا گئے اور ابوعبداللہ الشیعی نے بہت سے علاقوں پر قبضہ کرلیا اور بڑے عدل وانصاف کا مظاہرہ کیا۔اس کا اثر بھی لوگوں پر بہت اچھا پڑا۔اس کے بعد ابوعبداللہ الشیعی نے سَلْمِیَّہ میں اپنے قائد کو پیغام بھجوایا کہ میدان تیار ہے آیئے اور تختِ حکومت سنبھالئے۔

چنانچہ سعید بن الحسین جو احمد ابو الشَّلَغْلَغْ کا بھتیجا تھا اور احمد ابوالشلعلع کی وفات کے بعد تحریک کا قائد بنا تھا عبیداللہ المہدی کے نام سے ۲۹۶ھ میں مغرب کے ان علاقوں کا حکمران بنا اور حکومت عبیدیہ کی بنیاد رکھی گئی۔قیروان دارالحکومت قرار پایا۔یہ عجیب بات ہے کہ مغرب میں فاطمیوں کی حکومت کے لئے ابوعبداللہ الشیعی نے میدان ہموار کیا تھا اور اسی کی کوششوں سے حکومت عُبَیْدِیَّہ قائم ہوئی تھی لیکن عبیداللہ المہدی نے جب استحکام حاصل کرلیا تو اس نے ۲۹۸ھ میں ابوعبداللہ الشیعی اور اس کے بھائی ابوالعباس دونوں کو مروا دیا[3] اور اس طرح اس نے اُس تاریخ کو دہرایا جو دولت

---

[1] سهلت كراهة البربر للعرب انضمامهم لابى عبدالله الشيعى (تاريخ الدولة العربية صفحه ۴۵، ۴۶)

[2] تاريخ الدولة الفاطمية صفحه ۵۱ [3] تاريخ الدولة الفاطمية صفحه ۵۶

عباسیہ کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور نے مؤسس دولتِ عباسیہ ابو مسلم خراسانی کو قتل کر کے اوراق تاریخ میں ثبت کی تھی اور دونوں کے حامیوں کا ردِ عمل بھی ایک جیسا تھا۔

بہر حال عبید اللہ المہدی نے بڑی حد تک اپنی حکومت کو سنبھال لیا۔ اُس کی وفات کے بعد ابوالقاسم محمد القائم دولت عبیدیہ کا خلیفہ بنا اُس کے بعد المنصور اور اُس کے بعد اَلْمُعِز دولت فاطمیہ کے سربراہ مقرر ہوئے۔ اَلْمُعِز کے عہد حکومت میں اُس کے قابل جرنیل جوہر کے ہاتھوں مصر فتح ہوا۔ یہ ۳۵۸ھ کا واقعہ ہے۔ اَلْمُعِز جب فتح مصر کی تیاریوں میں تھا تو ایک روز جبکہ شدید سردی پڑ رہی تھی اور سخت طوفان کا سماں تھا اس نے اپنے ارکانِ دولت اور شُیُوْخِ کُتَامَہ کو اپنے محل میں بلوایا اور اُن کے سامنے تقریر کی کہ آپ لوگ شاید یہ سمجھتے ہوں کہ ایسے سرد اور طوفانی دن میں مَیں عیش و عشرت، شراب و کباب اور رقص و سرود میں اپنا وقت گزار رہا ہوں گا حالانکہ تم دیکھ رہے ہو کہ میرے گرد کتابوں اور خطوں کا ڈھیر ہے، قلم اور دوات رکھی ہے اور خط و کتابت اور علم کے سمندر میں گویا غرق ہوں۔ بڑی سادہ زندگی بسر کرتا ہوں تم بھی وہی کرو جو مَیں کرتا ہوں۔ تکبر اور تبختر کو ترک کر دو۔ دوسروں پر رحم کرو تا اللہ تعالیٰ بھی تم پر رحم کرے۔ عیش میں نہ پڑو۔ ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو تا کہ تمہارے قویٰ مضبوط رہیں، تمہاری قوت قائم رہے۔ میری مدد کرو تا کہ ہم مشرق یعنی مصر میں بھی اُسی طرح غالب آئیں جس طرح ہم مغرب میں غالب ہوئے ہیں تا کہ ہر طرف سلامتی، امن و امان اور عدل و انصاف کا دور دورہ ہو کیونکہ عدل و انصاف حکومت کی بنیاد ہے۔[1] غرض اس طرح کی وعظ و تلقین اور امنگ و یقین کے ساتھ المعز نے مصر کی طرف فوجیں روانہ کیں مصر کے حالات یوں بھی دِگرگوں تھے اس لئے بہت معمولی مقابلوں کے بعد المعز کی فوجوں نے مصر فتح کر لیا۔

۳۶۱ھ میں اَلْمُعِز نے فاطمی خلیفہ المنصور کے بسائے صدر مقام المنصوریہ سے کوچ کیا جو شمال مغربی افریقہ کے مشہور شہر قیروان کے نواح میں تھا۔ اور القاہرہ میں آ کر قیام کیا جو اُس کے جرنیل جوہر نے دارالحکومت کے طور پر بسایا تھا۔ مصر کے حالات کو درست کرنے کے بعد المعز نے آہستہ آہستہ اپنا اثر و رسوخ شام، یمن اور حجاز کی طرف بڑھایا یہ علاقے پہلے سے ہی مصر کی نگرانی میں تھے اور ان دنوں رومیوں کی نظریں ان علاقوں خصوصاً شام پر لگی ہوئی تھیں اور وہ چاہتے تھے کہ وہ دولت عباسیہ کی جگہ لیں

---

[1] العدل اساس الملک (تاریخ الدولۃ الفاطمیۃ صفحہ ۱۳۶)

اس بنا پر رومی بازنطینیوں کی روک تھام ضروری تھی۔ پھر اس علاقہ میں قرامطہ کا بھی زور تھا جس کا توڑنا فاطمیوں کی پالیسی کا ایک حصہ تھا۔

۳۶۵ھ میں المعز جب فوت ہوا تو العزیز اس کا قائمقام مقرر رہوا۔ اسی کے زمانہ میں جامع الازہر کی بنیاد وسیع المقاصد تعلیمی ادارہ کے طور پر رکھی گئی۔[1] العزیز بڑا وسیع المعلومات دوربین خلیفہ تھا بہت سی زبانیں جانتا تھا۔ اُس کے زمانہ میں ایشیائے کوچک سے لے کر بحرِ اوقیانوس کے مغربی کنارے تک دولت فاطمیہ کا جھنڈا لہراتا تھا۔ ۳۸۶ھ میں العزیز نے وفات پائی۔ اُس نے قاضی محمد بن النعمان المغربی اور کتامہ کے سردار ابوالحسن بن عمّار کے مشورہ سے اپنے بیٹے کو اپنا جانشین مقرر کیا جو الحاکم بامر اللہ کے لقب سے مشہور ہے۔ الحاکم بامر اللہ سے پہلے فاطمی خلفاء عام شرعی احکام میں قریباً اثنا عشری شیعوں سے مطابقت رکھتے تھے۔ جمعہ اور عیدین اور عبادت کی دوسری تقریبات میں خلفاء برابر شریک ہوتے۔ البتہ صحابہؓ کو بُرا بھلا کہتے اور سَبِّ صحابہؓ کے طریق کو فروغ دینے میں دوسرے غلو پسند شیعہ فرقوں سے کسی طرح کم نہ تھے۔

الحاکم بامر اللہ کو کتامہ کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا ان کا مطالبہ تھا کہ ان کے سردار الحسن بن عمّار کو وزیر مقرر کیا جائے چنانچہ الحاکم کو جھکنا پڑا اور کتامہ کا مطالبہ تسلیم کر لیا لیکن بدنظمی بڑھ گئی۔ آخر ابن عمار نے وزارت چھوڑ دی۔ اُس کی جگہ برجوان آیا لیکن کچھ مدت کے بعد حاکم نے اسے بھی قتل کرا دیا۔

حاکم متلون مزاج، غلو پسند دیوانی ذہنیت کا خلیفہ تھا۔ پہلے اس نے سُنیوں اور ذِمّیوں کو سخت تنگ کیا اور شیعیّت کے فروغ کی کوشش کی۔ اس کا یہ دور ۳۹۰ھ سے ۳۹۸ھ تک ہے۔ اُس نے یہود اور نصاریٰ کے بارہ میں حکم دیا کہ وہ الگ طرز کا لباس پہنیں جس سے پتہ چلے کہ وہ غیر مسلم ہیں۔ گرجے گرا دیئے اور ان کے اندر کے قیمتی سامان کو فروخت کرا دیا۔ ایک طرف اس کا یہ تشدد تھا تو دوسری طرف اس نے کئی عیسائیوں کو بڑے اہم عہدے دے رکھے تھے جنہوں نے عام مسلمانوں کو بڑا تنگ کئے رکھا۔[2]

۳۹۸ھ سے ۴۰۱ھ تک عام مسلمانوں کے بارہ میں اُس کا رویہ نرم تھا لیکن اس دور میں اُس کے

---

[1] شروع میں جامع الازہر کی بنیاد ۳۵۹ھ میں فاطمی قائد جوہر کے ہاتھوں رکھی گئی لیکن اس وقت یہ صرف شیعہ علوم کی تدریس کے لئے مختص تھی۔ (تاریخ الدولة الفاطمية صفحه ۳۷۷)

[2] قد اَوغَر كثرة تقليد النصارى للوزارة صدور المسلمين عليهم (تاريخ الدولة الفاطميه صفحه ۱۶۶)

مذہبی دعاوی نے بڑا عجیب رنگ اختیار کرلیا تھا۔ ایک طرح سے اُس نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ اسی زمانہ میں دروز کا فرقہ ظاہر ہوا جس کی تفصیل آئندہ آرہی ہے۔

الغرض حاکم کے یہی دعاوی اُس کے قتل کا باعث بنے۔ اسی زمانہ میں اُس نے دارالحکمت بھی قائم کیا جس میں اسماعیلی مذہب کی باطنی تعلیم دی جاتی تھی اور باطنی نظریات پھیلانے کے لئے داعی تیار کئے جاتے تھے۔[1]

سُنیوں کے بارہ میں فاطمیوں کی پالیسی خاصی سخت تھی۔ خلفاء ثلاثہ اور صحابہؓ کو برملا گالیاں دی جاتی تھیں جس سے سُنیوں کے سینے جلتے۔ جمعہ کے خطبوں میں سب وشتم کا رواج بڑھ گیا تھا۔ مساجد کی دیواروں پر اور عام شاہراہوں پر یہ گالیاں لکھی جاتیں۔ گلیوں میں لوگوں کو پھرایا جاتا اور مارا پیٹا جاتا اور منادی کی جاتی کہ هٰذَا جَزَاءُ مَنْ يُحِبُّ اَبَابَكْرٍ وَ عُمَرَ۔ ۴۰۱ھ کے قریب حاکم نے ارادہ کیا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی قبریں اکھیڑ دی جائیں اور روضہ میں صرف آنحضرتؐ کی قبر رہنے دی جائے لیکن وہ اپنے اس مذموم ارادہ میں کامیاب نہ ہوسکا۔[2]

حکومت کے عہدوں میں سنیوں سے سخت تعصب برتا جاتا تھا۔ کوئی اہم عہدہ سنیوں کے ہاتھ میں نہ رہا تھا حالانکہ ملک میں اکثریت سنیوں کی تھی۔

خلیفہ العزیز نے سنیوں کو نماز تراویح اور نماز ضحیٰ پڑھنے سے منع کردیا تھا۔ جب ایک سُنّی عالم نے اس کے خلاف احتجاج کیا تو اُسے گرفتار کرلیا گیا پھر اُس کی زبان کاٹ دی گئی اور آخر اُسے سُولی دے دی گئی۔ بعض مؤرخین نے اس واقعہ کا انکار کیا ہے۔[3]

مؤطا امام مالکؒ پڑھنے کی ممانعت کردی گئی۔ خصوصاً حاکم کے زمانہ میں اس قسم کا تشدد بڑھ گیا تھا۔ کچھ عرصہ ایسا بھی آیا کہ حاکم بامر اللہ نے تعصب کی اس پالیسی میں نرمی کردی لیکن یہ عرصہ تین سال سے آگے نہ بڑھا اور پھر سے تشدد شروع ہوگیا۔[4]

---

[1] تاریخ الدولة الفاطمية صفحه ۱۶۶، ۱۶۷و۲۲۳

[2] عمل الفاطميون على لعن الخلفاء الثلاثة الاوّل وغيرهم من الصحابة (تاريخ الدولة الفاطميه صفحه ۲۱۸و۲۲۳)

[3] تاريخ الدولة الفاطمية صفحه ۲۱۹ مع حاشيه صفحه ۲۲۰، ۲۲۱

[4] تاريخ الدولة العربيه صفحه ۲۲۱، ۲۲۳

اس تعصب کا ہی نتیجہ تھا کہ سُنّی فاطمی حکومت سے بد دل اور متنفر تھے۔[۱] ۴۱۱ھ میں الحاکم بامر اللہ فوت ہو گیا بعض روایات کے مطابق اُسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا الظاہر والی بنا۔ اس کی پالیسی نرم تھی۔ اس نے بڑی عقل مندی اور بُردباری کا ثبوت دیا۔ اپنے والد کے زمانہ کے بہت سے احکام جن سے تعصب اور تشدد کا رنگ جھلکتا تھا منسوخ کر دیئے اور رعایا بڑی حد تک مطمئن ہو گئی لیکن اُس کی وفات کے بعد اَلْمُسْتَنْصَر کے عہد میں تشدد کا عفریت پھر جاگ اُٹھا اور کافی عرصہ جاری رہا۔ آخر کار ۵۶۴ھ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں جب دولت فاطمیہ کا خاتمہ ہوا تو اس کے ساتھ ہی سُنیوں نے بھی اطمینان کا سانس لیا لیکن شیعوں کی شامت آ گئی اور ایوبی امراء نے بطور پالیسی چُن چُن کر اسماعیلی شیعوں کو ختم کیا۔ وہی بچے جو یمن یا ہند کی طرف بھاگ گئے اور کچھ شام اور لبنان کے پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپ گئے۔

فاطمی حکومت کے زمانہ میں ہی خلافت عباسیہ کے زوال کا آغاز ہوا۔ خلفاء عباسیہ کو بَنُوْبُوَیہ نے جو شیعہ تھے ایک کھلونا بنا رکھا تھا۔ اُن کی دلی ہمدردیاں فاطمی خلفاء کے ساتھ تھیں۔ اگر بعض سیاسی مفاد آڑے نہ آتے تو بنو بویہ نے خلافت عباسیہ کو ختم کر کے خلفاء فاطمیہ کی حکومت کا اعلان کر دینا تھا[۲] لیکن بنو بویہ کو مشورہ دیا گیا کہ بنو فاطمہؓ کی حکومت میں ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بنو عباس کو تو تم لوگ عقیدۃً غاصب سمجھتے ہو ان کے ساتھ تمہاری کوئی مذہبی عقیدت نہیں اس لئے جس طرح چاہتے ہو اُن سے سلوک کرتے ہو لیکن اگر بنو فاطمہؓ ادھر آ گئے تو تم ایسا نہ کر سکو گے کیونکہ عقیدۃً تم انہیں خلیفہ برحق مانتے ہو اگر تم اُن کی بے ادبی کرو گے یا ان میں سے کسی کو قتل کرو گے تو شیعہ پبلک تمہارے خلاف اُٹھ کھڑی ہوگی اور اس مخالفت کا سنبھالنا تمہارے لئے مشکل ہو جائے گا۔ بہر حال قریباً ایک سال تک بغداد میں خلفاء بنو فاطمہؓ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا لیکن آخر کار اس پالیسی کو بدل دیا گیا اور حسب سابق خلفاء عباسیہ کے نام کا خطبہ جاری ہو گیا۔[۳]

۱۔ حل انصار الفاطميين ...... محل السنيين في مناصبهم من ذالك نرىٰ ان السنيين كانوا من اوّل حكم الفاطميين ينظراليهم بعين السُخط و الكراهة (تاريخ الدولة الفاطميين صفحه ۲۲۴)

۲۔ ولولا خوف البويهيّين على نفوذهم السّياسى لحوّلوا الخلافة الى العلويين اذ كانوا يفضّلون الفاطميين على العباسيين من النّاحيةِ المذهبية (تاريخ الدولة الفاطمية صفحه ۲۰۶، ۲۰۷)

۳۔ تاريخ الدولة الفاطمية صفحه ۲۲۳

فلسطین، شام، یمن اور حجاز میں تو بنو فاطمہؓ کے نام کا خطبہ ایک لمبے عرصہ تک جاری رہا اور ایوبیوں کے عہد حکومت میں اس کا رواج ختم ہوا۔ اسی زمانہ میں تاتاریوں کے حملے بھی شروع ہوئے جو آخر سقوط بغداد اور خلافت عباسیہ کے خاتمہ پر منتج ہوئے۔

صلیبی لڑائیوں میں صلیبیوں کی کامیابی کا بھی یہی زمانہ ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو آپس میں لڑتے دیکھا تو ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ ارض فلسطین اور شام کے بعض حصے اُن کے قبضہ میں چلے گئے۔ یہ کامیابیاں انہوں نے بعض شیعہ فرقوں کی مدد سے حاصل کیں۔

فاطمی زُعماء نے اسماعیلی مذہب کی دعوت واشاعت کے لئے اسلامی ممالک میں چاروں طرف اپنے داعی پھیلائے ہوئے تھے جو حسب حالات کہیں ظاہر اور کہیں خفیہ اپنے نظریات اور خلافت فاطمیہ کی حقیقت کی برابر تبلیغ کرتے رہتے تھے۔ بعض داعی بڑے قابل علوم کے ماہر اور اصولِ تبلیغ سے پوری طرح واقف تھے اور اثر و رسوخ بڑھانے کے طریقوں کو اچھی طرح جانتے تھے چنانچہ ان کی کوششوں سے ہر ملک اور ہر علاقہ میں اُن کے بڑے مضبوط مرکز اور دارالہجرت قائم ہوگئے۔

موصل میں اسماعیلی مذہب کا داعی خود وہاں کا والی تھا۔ اس کے بعد قِـرْدَاش اَلْـعُـقَـيْـلِـي نے موصل آبنائے مدائن اور کوفہ میں بڑا کام کیا...... ایک اور داعی هِبَةُ اللّٰـه الشِّيـرَازِي نے عباسی حکام اور بعض سلجوقی ترکوں کو اسماعیلیت کی طرف مائل کرنے کا تاریخ ساز کارنامہ سرانجام دیا[1]۔

یمن کا پہلے ذکر آچکا ہے کہ سَـلْـمِيَّـه میں مستور ائمہ میں سے دوسرے امام احمد ابوالشلعلع نے یمن کے علاقوں میں اسماعیلی دعوت پھیلانے کی ذمہ داری ابن حوشب کے سپرد کی۔ ابن حوشب کا پورا نام ابوالقاسم الحسن بن ابی الفرج بن حوشب ہے۔ یہ کوفہ میں پیدا ہوا۔ خاندان علمی تھا اور اثناعشری عقائد رکھتا تھا لیکن ابن حوشب نے اسماعیلی عقائد کو اپنایا اور ائمہ مستورین کے مقربین میں شمار ہونے لگا۔ وہ اسماعیلیوں کے اس نظریہ سے بے حد متاثر تھا کہ امام مہدی عنقریب ظاہر ہونے والا ہے۔ احمد ابوالشلعلع نے ابن حوشب کو کہا اے ابوالقاسم یمن بڑی برکات کا حامل ہے[2] اس لئے یہ علاقہ میں آپ کے سپرد کرتا

---

[1] تاریخ الدولة الفاطمية صفحه ۲۳۳،۲۳۲

[2] قال يا أبا القاسم! ان الدين يمان والحكمة يمانية وكل امر يكون مبدؤه من قبل اليمن فانه يكون ثابتاً لثبوت نجم اليمن وذالك ان اقليم اليمن اعلى اقليم الدنيا ۔(تاريخ الدولة الفاطميه صفحه ۴۰۲ بحواله اخبار القرامطه صفحه ۲۳)

ہوں۔اس کے ساتھ ہی احمد نے ایک اور شخص کو ابن حوشب کا ساتھی بنایا اس شخص کا نام علی بن فضل الیمنی تھا اور حج کرنے کے بعد قبرِ حسینؓ کی زیارت کرنے کربلا آیا تھا اس کے بعد سَلَمْیَہ میں ملاقات کے لئے حاضر ہوا۔احمد نے اسے مخلص پا کر اس طرح مخاطب کیا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ رَزَقَنِیْ رَجُلًا نَحْرِیْرًا مِثْلَکَ اَسْتَعِیْنُ بِہٖ عَلٰی اَمْرِیْ وَ اَکْشِفُ لَہٗ مَکْنُوْنَ سِرِّیْ غرض اُسے خوب جوش دلایا اور ابن حوشب کے ساتھ مل کر کام کرنے کی تلقین کی۔ادھر ابن حوشب کو کہا کہ اس شخص کی دلداری کرنا، اس کے ساتھ مل کر کام کرنا۔ظاہری لحاظ سے نماز روزہ کی پابندی کرنا۔اپنا راز عام نہ کرنا۔لوگوں کو مرید بنانا اور جب وہ قربانی کے لئے تیار ہو جائیں تو مقررہ مالی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے اُن سے کہنا۔[1]

بہر حال ابن حوشب نے یمن پہنچ کر صنعاء سے جنوبی طرف ایک پہاڑی جگہ کو جس کا نام لاعہ تھا اپنا مرکز بنایا۔یہ بڑی محفوظ جگہ تھی وہاں پہلے سے ہی کچھ لوگ ہم خیال تھے۔مشہور کرایا گیا کہ ایک بڑا ولی اللہ عابد و زاہد اس علاقہ میں آیا ہے چنانچہ لوگ دھڑا دھڑ آنے لگے۔جب اچھی خاصی جمعیت اکٹھی ہو گئی تو ابن حوشب نے اردگرد کے علاقہ میں قلعہ بندی شروع کر دی اور یمن کے عباسی والی پر حملہ کرا دیا جو کامیاب رہا کیونکہ علاقہ میں پہلے ہی گڑبڑ تھی۔عباسی اثر و رسوخ برائے نام تھا۔خارجیوں اور زیدی اور اثنا عشری شیعوں نے ملک کا امن و امان ابتر کر رکھا تھا۔اس کے بعد ابن حوشب نے صنعاء کے جنوب میں دارالہجرت اور مرکز نشر و اشاعت قائم کیا اور تھوڑے عرصہ میں اتنی کامیابی حاصل کی کہ مَنْصُوْرُ الْیَمَن کے لقب سے مشہور ہو گیا۔اس نے اپنے مرکز اشاعت سے مختلف علاقوں میں اپنے داعی بھیجے خاص طور پر بحرین، یمامہ، سندھ اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں داعی پہنچے اور خاصی کامیابیاں حاصل کیں۔

دوسری طرف علی بن فضل نے یمن کے ایک علاقہ جَیْشَان اور یَافِع کو اپنا مرکز دعوت بنایا اور اردگرد کے امراء سے جنگیں لڑ کر خاصی کامیابی حاصل کی۔اس کامیابی سے اس کا دماغ پھر گیا۔اس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اسلام کو خیر باد کہہ دیا۔ایک قصیدہ میں وہ کہتا ہے۔

تَوَلّٰی نَبِیُّ بَنِیْ ھَاشِمٍ	وھٰذَا نَبِیُّ بَنِیْ یَعْرَبِ
لِکُلِّ نَبِیٍّ مَضٰی شِرْعَۃٌ	وَھٰذِہٖ شَرِیْعَۃُ ھٰذَا النَّبِیِّ

[1] قال اجمع المال والرجال ...... و عمل الظاهر و لا تظهر الباطن و قل لكل شيءٍ باطن ...... وليس هذا وقت ذكره۔(تاريخ الدولة الفاطمية صفحه ۲۰۳)

فَقَدْ حُطَّ عَنَّا فُرُوْضَ الصَّلٰوۃِ وَحُطَّ الصِّیَامُ فَلَمْ یَتْعَبِ[1]

اس ادّعا کی وجہ سے علی بن فضل اور ابن حوشب ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے اور لڑائی تک نوبت پہنچی۔

بہر حال ابن حوشب کی کوششوں سے یمن اسماعیلی دعوت کا گڑھ بن گیا اور اُسے اور اُس کے جانشینوں کو خاصی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ اسماعیلی خلیفہ المستنصر نے یمن کے ایک اسماعیلی سردار علی بن محمد اَلصَّلَیْحِی کی مدد سے حجاز میں عباسیوں کا اثر و رسوخ ختم کرایا جو کچھ عرصہ سے بڑھ رہا تھا۔ علی صَلَیْحِی قتل ہو گیا تو اُس کا لڑکا المکرّم اس کا جانشین بنا اس کے بعد اس کی بیوی اروی الحرہ نے اسماعیلی دعوت کی ذمہ داری سنبھالی۔ یہ بڑی مدبّر اور منتظم عورت تھی اُس کی دعوت کے نشان جنوبی ہند کے بُہرہ ہیں۔

فاطمی خلیفہ العزیز نے عباسی وزیر عَضُدُ الدَّوْلَۃ اَلْبُوِیْھِیْ شِیْعِی کے پاس سفارت بھیجی تا کہ اُسے متاثر کرے اور خلافتِ عباسیہ کے الٹنے میں اس کی مدد حاصل کی جائے اور یہ کوشش مسلسل جاری رہی لیکن بنو بویہ کے اپنے مقاصد تھے اس لئے یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ کَمَا مَرَّ۔

ایک اور عباسی سردار ابوالحارث اَلْبَسَاسِیْرِیْ پر جال ڈالنے کی کوشش کی گئی اور وہ غداری پر آمادہ بھی ہو گیا کیونکہ عراق کے داعی الدعاۃ ھبۃ اللّٰہ الشیرازی نے اس کی بڑی مؤثر مدد کی تھی لیکن سلاجقہ ترکوں کی مدد سے بویہیوں کی طاقت کو ختم کر دیا گیا۔ دراصل عباسی خلافت کی یہ ایک دائمی پالیسی تھی پہلے فارسیوں اور خراسانیوں کی مدد سے بنواُمیّہ بالفاظ دیگر عربوں کے تسلّط پر ہلّا بولا اس کے بعد ترکوں کی مدد سے فارسیوں اور خراسانیوں کے اثر و رسوخ کو ختم کیا پھر بنو بویہ کو آگے لائے تا کہ ترکوں سے ان کو چھٹکارا ملے۔ جب بنو بویہ وبال جان بن گئے تو سلاجقہ کے ذریعہ ان کا خاتمہ کیا۔ سلاجقہ کو عوام کی حمایت بھی حاصل تھی کیونکہ وہ سُنّی تھے۔

فارس میں عبداللہ بن میمون القداح نے کئی داعی بھیجے۔ اس سے پہلے خود اس نے اَہواز کو مرکز بنا کر اس علاقہ میں اپنے نظریات کی اشاعت کی تھی۔ اپنے داعی الحسین اَلْاَھْوَازِی کو سوادِ کوفہ کی طرف بطور داعی بھیجا تھا۔ فارس کے علاقوں میں داعی زیادہ تر کپڑے بُننے۔ روئی دُھننے کا پیشہ اختیار کئے ہوئے تھے اور ساتھ ساتھ لوگوں میں بڑی رازداری اور احتیاط کے ساتھ اپنے نظریات کی تبلیغ بھی

---

[1] تاریخ الدولۃ الفاطمیہ صفحہ ۲۰۵ بحوالہ تاریخ الیمن صفحہ ۱۴۵

کرتے رہتے تھے ان داعیوں سے کئی اہلِ علم بھی متاثر ہوئے چنانچہ انہی میں سے ایک صاحب علم عیاث بھی تھے جنہوں نے بعد میں اسماعیلی نظریات کے پھیلانے میں بہت سے کارنامے سرانجام دیئے فارس کے بڑے بڑے امراء کو اسماعیلیّت کی طرف مائل کیا۔ انہی میں سے ایک الحسین بن علی اَلْمَرُوْرُوْذِیْ بھی تھا جس کا ہرات اور غور میں بڑا اثر رسوخ تھا۔ چنانچہ اس کے ذریعہ ان علاقوں میں دعوت اسماعیلیہ کو خوب فروغ ملا۔ خراسان میں ایک اور داعی ابو حاتم النیساپوری الرازی نے بڑا کام کیا جو ایک مشہور شاعر بھی تھا۔ اسی نے طبرستان، الدیلم، اجیان اور رَری میں اسماعیلی شیعیت کے بیج بوئے۔[1] ان علاقوں میں دعوت کا انداز المغرب سے کچھ مختلف تھا چونکہ یہ علاقے مجوسیت، ہند کی برہمیّت اور یونان کے فلسفہ سے خاصے متاثر تھے۔ تناسخ اور حلول کے نظریات بھی عام تھے اس لئے ان علاقوں میں کام کرنے والے داعی علمی انداز میں ان نظریات کی تائید وحمایت سے بھی خاصہ کام لیتے تھے۔[2]

محمد بن احمد النّسفی خراسان میں اسماعیلیوں کا ایک اور بڑا داعی تھا۔ اس نے امیر خراسان نصر بن احمد السامانی کو بہت متاثر کیا۔ اور بخارا تک اسماعیلیت کا اثر بڑھایا۔ کہتے ہیں کہ نصر سامانی نے اسماعیلیوں کے ایک داعی الحسین بن علی اَلْمَرُوْرُوْذِیْ کو مروا دیا تھا۔ محمد النّسفی نے نصر سامانی پر زور دیا کہ یہ بڑا ظلم ہوا ہے اس لئے وہ الحسین کی ایک سوانیس دینار دیت ادا کرے جبکہ ہر دینار کے ساتھ ایک ہزار دینار کا اضافہ ہو اور یہ دیت جس کی کل مالیت ایک لاکھ انیس ہزار دینار تھی مغرب کے فاطمی امیر کو بھجوائی گئی جس کی ہدایت میں یہ داعی کام کر رہے تھے۔[3]

---

[1] بایعهٔ جماعة من کبار رجال الدولة مثل الاصفر بن شیرویه امیر قذوین و مروا دیج بن زیاد الدیلمی و یوسف بن ابی الساج امیر الرّیّ و انه فکر فی خلع طاعة الخلیفة المقتدر العباسی والدخول فی طاعة الامام العلوی۔ (التاریخ الدولة الفاطمیه صفحه ۴۱۹)

[2] الفرس یقولون انّ اَلْعَلَوِیّین وحدهم یملکون حق حمل التاج ...... لکونهم وارثی آل ساسان من جِهَةِ امهم و هی شهر بانو ابنة یزدجرد الثالث آخر ملوک الفُرس۔
(تاریخ الدولة الفاطمیة صفحه ۴۱۸)

[3] و قد کان نصر بن احمد السامانی من اکبر معارضی المذهب الاسماعیلی۔
(نفس المصدر صفحه ۴۶۹)

دعوت اسماعیلیہ کے سلسلہ میں علمی کوششیں

علمی لحاظ سے اسماعیلی داعیوں نے جس طرح مشرق کو متاثر کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسائل اخوان الصفاء اسماعیلی داعیوں سے متاثر فلسفیوں کا کارنامہ ہے۔[1] جس میں فلسفی اور ادبی انداز میں مسائل اسلام پر بحث کی گئی ہے۔[2] ان رسائل کے مرتبین بنوبویہ کے پروردہ تھے اور رچھپ کر اور پس پردہ رہ کر کام کرتے تھے ان رسائل سے اسماعیلیہ خاص طور پر درزیہ اور نزاریہ (آغاخانیہ) نے بہت زیادہ کام لیا۔ اَلشَّھْــزُوْرِی کا کہنا ہے کہ ان رسائل کے مصنفوں کے نام یہ ہیں ابوسلیمان محمد بن نصر البستی، ابوالحسن علی بن ہارون اَلزَّنْجَانِیْ، ابواحمد النہرجوری، زید بن رَفَاعَہ اَلْعَوْنِیْ اور ابن سینا یہ سب کے سب اپنے زمانہ کے مانے ہوئے فلسفی اور آزاد خیال مفکر تھے۔ یہ کام انہوں نے چوتھی صدی کے نصف ۳۳۴ھ سے لے کر پانچویں صدی کے آغاز ۴۲۸ھ تک سرانجام دیا۔ اسی طرح ابوحاتم الرازی[3] صاحب کتاب اَلزِّیْنَۃُ وَ اَعْلَامُ النُّبُوَّۃِ بڑا عالم اور مصنف مانا گیا ہے۔

ابوعبداللہ النسفی بڑا قابل اسماعیلی داعی، ماہر ادیب اور فلسفی اور کئی کتابوں کا مصنف تھا۔[4]

ابویعقوب اَلسِّـنْجِرِی الملقب بہ بندان، اسماعیلیوں کا مشہور داعی، مانا ہوا مناظر اور قابل مصنف تھا۔ اس نے مشہور فلسفی اور طبیب محمد بن ذکریا الرازی سے اَعْلَامُ النُّبُوَّۃِ کے بارہ میں مناظرہ کیا اور برابر کی چوٹ رہی۔ کتاب اِثْبَاتُ النُّبُوَّۃِ۔ کتاب الشَّرَائِع اور کتاب کشف الاسرار۔ کتاب ینابیع اور کتاب اَلْمَوَازِیْن[5] بڑی عمدہ اور قابل مطالعہ تصانیف ہیں۔ بُہرہ خوجے اس کی بعض کتابوں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔

۱۔ أن آراء جماعۃ اخوان الصفاء تتفق مع آراء الکرمانی الداعی لِلاسماعیلیہ صاحب کتاب "راحۃ العقل"۔(التاریخ الدولۃ الفاطمی صفحہ ۴۹۰)

۲۔ تدل (ھذہ الرسائل) علی ان مؤلفیھا نَالُوا حَظًّا موفورًا من الرقی العقلی وتتألف ھذہ الرسائل من احدی وخمسین رسالۃً۔(تاریخ الدولۃ الفاطمیۃ صفحہ ۴۶۵)

۳۔ کان علمًا من علوم النَّھْضَۃِ العِلْمِیَّۃِ الاسلامیّۃ فی فارس فی القرن الرابع وان کان السُّنِّیُّوْنَ یتھمونہ بالزَّنْدَقَۃِ وَالْمُھْرِیَّۃِ۔ (تاریخ الدولۃ الفاطمیۃ صفحہ ۴۶۷، ۴۶۸)

۴۔ اس کا نظریہ تھا کہ مبدعِ اوّل نے نفس کو پیدا کیا۔ اب یہ دونوں مدبّر عالم ہیں۔ علامہ بغدادی اَلْفَرْقُ بَیْنَ الْفِرَقِ میں کہتے ہیں کہ یہی عقیدہ فارس کے مجوسیوں کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یزدان نے اہرمن کو پیدا کیا اب یہ دونوں مدبّر عالم ہیں۔ یزدان فاعل الخیرات ہے اور اہرمن فاعل الشرور ہے۔ کَمَا مَرَّ۔

۵۔ قد بحث فی کتاب الینابیع ماھیۃ المبدع وعالم العقل والنفس وسبب الخلق ومعانی الجنۃ والنار ومعنٰی صلیب عیسیٰ وغیر ذالک من المواضیع وفی کتاب الموازین (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابوحنیفہ النعمان بن ابی عبد اللہ اَلْمَغْرَبِی اَلشِّیْعِی [1] بھی بڑا قابل اور مجتہد اور مانا ہوا مصنّف تھا۔ اس کی کتابوں کو بھی بُہرہ اسماعیلی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ابوحنیفہ النعمان پہلے مالکی المذہب تھا۔مصر میں جب فاطمی حکومت قائم ہوئی تو اُس نے اسماعیلی مذہب اختیار کرلیا اور ایک وقت میں آ کر اسماعیلی مذہب کا ذَاعِیُّ الدُّعَاۃ منتخب ہوا۔یہ عبید اللہ المہدی، القائم، المنصور تینوں فاطمی خلفاء کے زمانہ میں صاحب اثر و رسوخ رہا اور مختلف علاقوں کا قاضی بنا۔اسماعیلی فقہ، مناظرہ، تاویل، عقائد، تاریخ اور وعظ و تذکیر میں اس کی کئی کتابیں ہیں۔کہا جاتا ہے کہ چالیس سے زیادہ کتابوں کا مصنّف تھا۔اس کی کتاب ''دَعَائِمُ الْاِسْلَام'' اسماعیلی فقہ کا ایک عمدہ مجموعہ ہے اور بُہرہ اسماعیلی اسے اپنے فقہی مسلک کی اساس سمجھتے ہیں [2]۔اس میں ابوحنیفہ الشیعی نے ارکانِ اسلام سات گنوائے ہیں۔عام معروف ارکان پانچ ہیں اور ان میں ولایت ائمہ اہلِ بیت اور طہارت کا اضافہ کیا ہے۔بہرحال ابوحنیفہ النعمان الشیعی کی کتب ظاہر احکام پر مبنی ہیں باطن اور سِرّ سے متعلق کتب میں ان کا شمار نہیں ہوتا اسی وجہ سے جو اسماعیلی فرقے سِرّ اور باطنی علوم میں غلو رکھتے ہیں۔جیسے اَلنِّزَارِی یا الدرزی وہ ابوحنیفہ النعمان کی کتابوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔

اسماعیلی مصنفین میں سے ایک اہم مصنف جعفر بن منصور الیمنی ہے اسے بَابُ اَبْوَابُ الْمُعِز کا لقب دیا گیا جو قاضی القضاۃ کے مرتبہ سے بلند تھا۔زیادہ تر اسماعیلی اسرار۔باطنی نظریات اور تاویلات اسماعیلیہ سے متعلق کتب لکھی ہیں مثلاً ''تَأْوِیْلُ الزَّکَاۃ''۔''سِرَائِرُ النُّطَقَاء''۔''الشّواھد و البنیان''۔''تَارِیْخُ الْاَئِمَۃِ الْمَسْتُوْرِیْنَ'' اور ''کتاب الکشف'' اس نے آیات قرآنی کی جو تاویل کی ہے اس کی ایک مثال یہ ہے سورۃ التین میں تین سے مراد حسنؓ ہیں اور زیتون سے حسینؓ طور سینین سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ھٰذا البلد الامین سے علیؓ ہیں۔آخر الذکر کتاب الکشف کے

(بقیہ حاشیہ) معرفۃ الحقیقۃ معرفۃ المبدع ومن اھم ھذا الموازین ماوقفہ علی النطقاء وَالْاُسَس والائمۃ والحجج والدعاۃ الی غیر ذالک ...... الّتی تفید الباحث ۔(فی تاریخ التطور العقلی للمذھب الاسماعیلی صفحہ ۴۷۳)

[1] یعرف عند الاسماعیلیۃ بابی حنفیۃ الشیعۃ وسیّدنا الاوحد وسیّدنا القاضی النعمان ویُعَدُّ من اھم دعائم الدعوۃ الاسماعیلیّۃ۔ قیل ان الخلیفۃ المعز ھو الذی حثّ النعمان عَلٰی تألیفہٖ.

[2] (نفس المصدر ۴۷۵ ۔ تاریخ الدولۃ الفاطمیۃ صفحہ ۴۷۴)

بارہ میں اس کی وصیت یہ تھی کہ اس کے اسرار کو عام نہ کیا جائے۔[1]

حمید الدین احمد بن عبداللہ الکرمانی بھی اسماعیلی دُعاۃ میں بڑا نامور گزرا ہے۔ یہ بڑا فلسفی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ الحاکم بامر اللہ کے بارہ میں جو یہ مشہور ہے کہ اُس نے الوہیت کا دعویٰ کیا ہے یہ سراسر بہتان ہے اسماعیلی واحدانیتِ الٰہ کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ الکرمانی صفات وُجُوْدِیَّہ اور تَنْزِیَّہ کا منکر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اُس کی کوئی صفت نہیں البتہ مَبْدَع اَوَّل کے اَسْمَاءِ حُسْنٰی ہیں۔ اسماعیلی مَبْدَع اَوَّل کو السابق و القلم کہتے ہیں اور فلاسفہ کے ہاں اس کا نام العقل الکلی ہے۔ اسماعیلیوں کے نزدیک ائمہ بھی ''السابق'' کی صفات سے متصف ہوتے ہیں لِاَنَّ الْاِمَامَ فِیْ عَصْرِہٖ مَثَلٌ لِلسَّابِقِ وَ لِھٰذَا یُمْدَحُ بِھٰذِہِ الصِّفَات۔ فقہی مسائل میں ظاہر کے لحاظ سے اسماعیلی شیعہ اثنا عشری شیعوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ پاؤں پر مسح کیا جاتا لیکن جرابوں اور موزوں پر مسح کی اجازت نہ تھی۔ اذان میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کی بجائے حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَل. مُحَمَّدٌ وَعَلِیٌّ خَیْرُ الْبَشَر کا اضافہ کیا گیا۔ فاطمی حکومت میں دعائے قنوت پڑھنے نیز نماز تراویح اور صلوٰۃ الضحیٰ پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ نماز جنازہ میں چار کی بجائے پانچ تکبیریں کہی جاتی تھیں۔ جمعہ کے روز عباسی خلفاء کی بجائے فاطمی خلفاء کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا اور ائمہ کے فضائل بیان کئے جاتے اور ان کے لئے دُعا کی جاتی تھی۔ ایسے ہی کم و بیش مختلف اختلافات تھے۔ بعض سبزیاں یا کھانے منع تھے کیونکہ یہ صحابہ خاص طور پر ابوبکرؓ اور عائشہؓ کو پسند تھے یا ائمہ اہل بیت ان کو ناپسند کرتے تھے۔[2]

---

[1] کان جعفر بن منصور من اشهر رجال التأویل فی الدور المغربی کما یعتبر النعمان المتشرع الاوّل هذا الدور۔(تاریخ الدولة الفاطمیة صفحه ۴۸۷)

[2] تاریخ الدولة الفاطمیة صفحه ۶۴۳

اَلدُّرُوْزِیَّہ یا اَلدَّرْزِیَّہ[1]

فاطمی خلیفہ حاکم بامر اللہ نے خُدائی کا دعویٰ کیا یا نہیں کیا اس بارہ میں اختلاف ہے لیکن یہ مسلمہ بات ہے کہ الحاکم ایک متلوّن مزاج، دیوانہ ذہن، خود بین خلیفہ تھا اور اس بات کو پسند کرتا تھا کہ لوگ اُس کے سامنے سجدہ کریں۔[2] چنانچہ اُس کے انہیں حالات کی وجہ سے اسماعیلیوں کا ایک گروہ اس بات کا دعویدار ہوا کہ حاکم اِلٰہ ہے یا اِلٰہ نے اُس میں حلول کیا ہے۔ اس نظریہ کا سرگرم داعی حمزہ بن علی اَلزَّوْزَنی اور محمد بن اسماعیل البخاری اَلدُّرْزِی وغیرہ تھے یہ سب کے سب فارسی تھے اور ملوک فُرس کی تألیہ کے بارہ میں فارسیوں کے جو نظریات ہیں یہ اُن سے متاثر تھے۔[3] محمد بن اسماعیل الدرزی[4] نے اس دعوت کو عام کیا، کتابیں لکھیں، الحاکم کے مقرّبین میں شامل ہوا اور الحاکم کی چھاؤنی میں اس نظریہ کی خوب اشاعت کی اور مختلف داعیوں کو اپنا ہمنوا بنایا۔ بعد میں یہ شخص مصر سے بھاگ کر شام کے پہاڑی علاقہ میں پناہ گزین ہوا اور یہاں اپنا مرکز قائم کیا اور اردگرد کے علاقہ میں اس نظریہ کو پھیلایا چنانچہ اب تک لبنان اور حوران میں اُس کے پیرو موجود ہیں جو دروز یا درزیہ کہلاتے ہیں۔

دروز ظہور توحید کے طور پر اپنا سال ۴۰۸ھ سے شروع کرتے ہیں۔ یہی وہ سال ہے جس میں حمزہ بن علی الزوزنی نے تألیہ الحاکم کے نظریہ کا اظہار کیا۔ دروز کا فرقہ دو گروہوں میں منقسم ہوتا ہے۔ روحانیوں اور جثمانیوں۔ روحانی گروہ کے تین درجے ہیں۔

رؤسا، عقلاء اور اُجاوید۔ رؤسا اسرار الدرزیہ کے کلید بردار اور امین ہوتے ہیں۔ عقلاء کے پاس داخلی اسرار کی مفاتیح ہوتی ہیں جن کا تعلق دروز کی تنظیم اور مذہبی تربیت سے ہے۔ اُجاوید کے پاس اسرار

---

[1] الدرزیہ الخیاطون والحاکمۃ الغوغاء من الناس.

[2] اذا ظہر الحاکم فی الطرقات خرّوا لہ سجدًا و قبلوا الارض بین یدیہ ویقولون ان رُوحَ اَلْاِلٰہِ حلّت فی آدمؑ ثم انتقلت الی الانبیاء ثم الی الآئمۃ حتّی استقرّت فی الحاکم ۔ تاریخ الدولۃ الفاطمیۃ صفحہ ۳۵۵ تا ۳۵۸ ملخصًا.

[3] دعا الزّوزنی الی عبادۃ الحاکم وقال اِنَّ اَلْاِلٰہَ حَلَّ فیہ و کان یرسلہ الحاکم لاخذ البیعۃ علی الرؤساء علی اعتقادہ فی الحاکم وقد شجع الحاکم ھذا الداعی وانصارہ ۔ (تاریخ الدولۃ الفاطمیۃ صفحہ ۳۵۵)

[4] اَلدَّرزِی کا لفظ اُردو میں عام ہے۔ کپڑے سینے والے کو درزی کہتے ہیں۔

خارجیہ کی چابیاں ہوتی ہیں اور انہی کے ذریعہ دوسرے مذاہب کے ساتھ رابطہ قائم رکھا جاسکتا ہے۔

دروز کا دوسرا گروہ جثمانیّون کہلاتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک اَلْاُمَرَاءُ الْجِثْمَانِیُّوْن اور دوسرے اَلْعَامَّہ (الجُھَّال) اَلْاُمَـرَاءُ الْجِثْمَانِیُّوْن حرب وضرب اور زعامہ وطنیت کے انچارج ہوتے ہیں اور جُھَّال سے مراد وہ طبقہ ہے جو صرف مذہب کا نام جانتا ہے۔ اُس کے مسائل اور اُس کے فلسفہ سے ناواقف محض ہوتا ہے۔ یہ دونوں طبقات روحانی طبقات کا مقام کبھی حاصل نہیں کر پاتے۔[1]

رسائل الحاکم بامراللہ کے مباحث بحیثیت مجموعی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ حاکم خدائی طاقتوں کا مدعی تھا اور اس بارہ میں سنیوں کا التزام بے جا نہیں ہے۔ دروز قرآن کریم کے من جانب اللہ ہونے کے قائل ہیں لیکن اُس کی آیات کی تاویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آیات قرآنیہ کا ظاہر مراد نہیں بلکہ باطن مراد اور مطلوب ہے۔ ان کی تاویل کی ایک مثال یہ ہے کہ نماز سے مراد حفظ الاخوان اور روزہ سے صدق اللّسَان ہے اور روحیں تناسخ کے چکر میں سرگرداں رہتی ہیں۔ اسے وہ تقمّص کہتے ہیں یعنی وہ چولے بدلتی رہتی ہیں۔ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ یہ کائنات قدیم ہے اور ابدی بھی ہے کبھی نابود نہیں ہوگی۔[2]

---

[1] جثمانی طبقہ کا کوئی فرد بڑی مشکلوں اور آزمائشوں اور کٹھن راستوں سے گزرنے اور اعتماد کے معیار پر پورا اُترنے کے بعد رُوحانی طبقہ میں قدم رکھنے کی سعادت پاسکتا ہے اس مرحلہ پر اُسے حلف اُٹھانا ہوتا ہے کہ وہ تمام ادیان سے بری الذمہ ہو کر اس مقام میں داخل ہو رہا ہے وانہ لایعرف غیر طاعة مولانا الحاکم جلّ ذکرہ.
(تاریخ الدولة الفاطمیة صفحہ ۳۶۰)

[2] الشیعة فی التاریخ صفحہ ۶۲۔ اعتقادات فرق المسلمین والمشرکین صفحہ ۲۸۔ فرق الشیعة صفحہ ۷۵۔ تاریخ الجمعیات السِّرِّیَة فی الاسلام صفحہ ۴۳۔ تاریخ الدولة الفاطمیة صفحہ ۳۵۴ تا ۳۶۶۔ الاسلام والحضارة العربیة جلد ۲ صفحہ ۶۶۔

اَلنِّزَارِیَّه

الحسن بن الصباح کی تحریک اور آغا خانی اسماعیلی

آٹھویں فاطمی خلیفہ المستنصر کی وفات کے بعد اُس کے جانشین کے بارہ میں نزاع پیدا ہوگیا۔ خود المستنصر نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اس کا جانشین اس کا بڑا بیٹا ابومنصور نزار بنے لیکن وہ اپنی اس خواہش کو بوجوہ پورا نہ کرسکا اور اُس کی وفات کے بعد اس کے وزیر الافضل نے اکثر امراء اور حُکام کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ نزار کی بجائے اُس کے چھوٹے بھائی ابوالقاسم احمد اَلْمُسْتَعْلِیْ بِاللّٰه کی بیعت کی جائے چنانچہ مُسْتَعْلِیْ بِاللّٰه نواں خلیفہ منتخب ہوگیا۔ بعض امراء نے اس تبدیلی کا بُرا منایا اور انہوں نے نزار کی تائید کی لیکن کامیابی نہ ہوئی اور نزار کو گرفتار کرکے دیوار میں چنوا دیا گیا بہر حال نزار کے حامیوں میں الحسن بن صباح [۱] بھی تھا۔ اُس نے دعوت نزاریہ کے لئے تحریک چلائی اور ایران کے محفوظ پہاڑوں میں اپنا مرکز بنایا یہ ۴۸۳ھ کا واقعہ ہے۔ یہاں سے **دعوت مُسْتَعْلِیَه** کے مقابلہ میں **دعوتِ نِزَارِیه** کا آغاز ہوا۔ [۲] اس نظریہ میں امام مستور کی طرف دعوت ایک مرکزی نقطہ تھا۔ الحسن بڑا عالم اور فلسفہ کے عملی پہلوؤں کا ماہر اور اعلیٰ تنظیمی قابلیتوں کا مالک تھا۔ [۳] اس نے اس علاقہ میں رہنے والے اسماعیلیوں کو منظم کیا۔ دعاۃ کے ایک نئے سلسلہ کا آغاز کیا۔ اپنے حامیوں کی تربیّت کے محفوظ مراکز قائم کئے۔ رودبار، کوہستان اور طالقان جو خراسان کے پہاڑی علاقے تھے۔ ان میں سینکڑوں قلعے بنوائے اور عسکری انداز کی گروہ بندی کی۔ شام کی طرف بھی اپنے داعی بھیجے اور حسب حالات چُھپ کر یا کُھلے بندوں سلجوقیوں اور مستعلیوں پر چھاپے مارنے کی منصوبہ بندی کی۔

---

[۱] الحسن بن علی المعروف بالصباح هو فارسیٌ مِنْ خُرَاسَانَ تَعَلَّم مع الشاعر الفیلسوف عمر الخیام ونظام الملک وزیر السلطان ملک شاه وانقطع حیناً لدرسِ الکیمیاء......وسخط علیه نظام الملک بوجوه ففرَّ نَاجِیًا......ونزل بمصر فاحسن خلیفتها المستنصر الفاطمی وامره بدعاء الناس اِلی امامتِهٖ واتصل باساتذة دارالحکمة۔(تاریخ الجمیعات السِّریة صفحه ۴۵)

[۲] کُلُّ النِّزارِیّة یعتقدون ان نِزارًا هُوَ الامام الحق وان المستعلی اغتصب عنه العرش والامامةَ۔ (تاریخ الدولة الفاطمیةصفحه ۲۶۷)

[۳] کان الحسن دَاهیةً وافِرَ الذکاءِ والعزم عالمًا بِالهَنْدَسَةِ والریاضة والفلک خَبِیْرًا بِشئُون الحَربِ فی تدبیر المکایِدِ والدَّسَائِسِ (تاریخ الجمیعات السریة صفحه ۵۱)

علمی لحاظ سے الحسن اس بات کی دعوت دیتا تھا کہ حقیقت باطنیہ تک پہنچنے کے لئے امام کا ہونا ضروری ہے اور جب امام مستور ہو تو پھر اُس کا نائب مَصْدَرِ عِرْفَان ہوتا ہے اور اس وقت وہ خود نائب امام اور مصدرِ عرفان ہے۔

خلافتِ عباسیہ نے جب الحسن کی تحریک کا خطرہ محسوس کیا تو علمی میدان میں سُنی علماء کو آمادہ کیا کہ وہ اس تحریک کی مخالفت میں علمی دلائل مہیا کریں اور عمدہ کتابیں لکھیں چنانچہ جن علماء نے اس میدان میں کام کیا ان میں امام غزالیؒ سرفہرست ہیں۔ آپ نے الحسن صباح کی باطنی تحریک کے ردّ میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ''المستظهری'' رکھا اور ایک کتاب ''المنقذ من الضّلال'' میں بھی اس تحریک کے خلاف علمی دلائل مہیا کئے۔

الحسن الصباح نے اپنی جماعت کو کئی حصوں میں تقسیم کیا اور روابط کے لحاظ سے انہیں باہمی محبت، اخوت اور مرحمت کا نصب العین دیا۔ ایک گروہ کے ذمہ علمی میدان میں کام کرنا تھا دوسرے گروہ کو بطور فدائی اور خفیہ طور پر امراء اور علماء کو قتل کرنے کی تربیت دی گئی۔ یہ فدائی بڑی رازداری، انتہائی احتیاط اور بڑی جرأت کے ساتھ اپنے نشانہ پر وار کرتے تھے اور اس بات سے بالکل بے نیاز ہوتے تھے کہ اس راہ میں ان کی جان چلی جائے گی یا وہ بچ نکلیں گے۔ ان فدائیوں کو مختلف انداز میں تیار کیا جاتا تھا۔ ایک گروہ کو بھنگ کی عادت ڈالی جاتی تھی یا کسی اور طریق سے اُس کے ذہن پر قابو پایا جاتا تھا اور انہیں یہ تربیت دی جاتی تھی کہ جو فرض ان کے سپرد کیا جائے بہرحال انہوں نے اُسے سرانجام دینا ہے۔ بھنگ کے ذریعہ یا عمل تنویم کے ذریعہ ان کو مدہوش کر کے انتہائی خوبصورت باغوں میں لے جایا جاتا جو پہاڑی قلعوں کے اردگرد کے چشموں کے پانی سے سیراب ہوتے تھے۔ ان باغوں میں محل نما مکانوں میں ہر قسم کی نعماء نغمہ و سرود اور خوبصورت عورتوں اور حسین لڑکوں سے مزین رکھا جاتا[1] اور جن فدائیوں کو ان میں لایا جاتا ان کو کہا جاتا کہ یہ جنتیں اُن کو ملتی ہیں جو امام یا نائب امام کے حکم کی دل و جان سے اطاعت کرتے اور اپنی جان کی قربانی پیش کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں کچھ عرصہ ان باغوں اور محلات میں ان کو

---

[1] كانوا ينشأُوْن حول القلاع الحدائق الفيحاء وقد غرست فيها اطيب الفواكه وازكى الازهار ...... وغصت بالغيد الكواعب يطُفن بِأقْداحٍ ذَهَبِيَّةٍ من الخمر وَاَلْحَانِ الموسيقى الشَّجِيَّة ۔ (الجميعات البِسِّرِّية صفحه ۵۳ ملخصًا)

رکھ کر پھر سے بذریعہ عمل تنویم ان کو باہر لایا جاتا اور کہا جاتا یہ تو ایک عارضی نظارہ تھا جب تم امام کے حکم کی تعمیل میں اپنی جان قربان کرو گے تو پھر دائمی طور پر ان جنتوں میں تمہارا ٹھکانہ ہوگا۔ غرض اس طرح کے مختلف طریقوں سے کام لے کر الحسن نے جو دہشت گردی کی نفسیات کا ماہر تھا فدائیوں کے ایسے گروہ تیار کیے جنہوں نے اُس زمانہ کے بڑے بڑے علماء، قابل امراء اور عسکری قائدین کو موت کی نیند سلا دیا اور وہ خود بھی نِزَاری تحریک پر فدا ہو گئے۔[1]

ملک شاہ سلجوقی کے انتہائی قابل وزیر اور مدرسہ نظامیہ بغداد کے بانی نظام الملک طُوسی بھی اسی قسم کے ایک فدائی کے ہاتھوں شہید ہوئے کیونکہ انہوں نے الحسن کی تحریک کو کچل دینے کا عزم کیا تھا۔[2]

فدائیوں کے علاوہ چھاپہ مار جنگ میں مہارت رکھنے والوں کا بھی ایک گروہ تیار کیا اور بعض لڑاکا قبائل کے جوانوں کو جنگ کی تربیت دی گئی۔ ان تیاریوں کے بعد الحسن کھلے بندوں خلافت عباسیہ اور اُس کے امراء اور عسکری قائدین کے سامنے ڈٹ گیا۔

الحسن خود ایک مضبوط قلعہ میں رہائش پذیر تھا جس کا نام قلعة الموت تھا۔[3] اُس کے اردگرد اور دور ونزدیک اُس نے سینکڑوں قلعے بنوائے اور اُن کے ذریعہ جنگی کارروائیوں کا آغاز کیا۔

الحسن کا لقب شَیْخُ الْجَبَل، رَئِیْسُ الدَّعْوَة اور دَاعِیُّ الدُّعَاة تھا اُس کے احکام امام کے احکام کے طور پر ہر طرف جاتے اور اُن کی تعمیل ہوتی۔ نائب الامام اور شیخ الجبل کے بعد خاص کام کرنے والے گروہوں میں دوسرا درجہ کِبَارُ الدُّعَاة کا تھا۔ یہ تین ہوتے تھے جو تین اقلیموں میں تقسیم شدہ دنیا میں ہر اقلیم کے ذمہ دار قرار دیئے گئے تھے الحسن کے زمانہ میں کیا بزرگ امید، الحسین القَینی اور ابو طاہر بطور کبیر الدعاۃ کام کرتے تھے اور بڑی شہرت کے مالک اور الحسن کے بڑے معتمد تھے۔

تیسرا درجہ دُعاۃ کا تھا جو الحسن کی مقرر کردہ دُنیا کے تینوں اقلیموں میں شیخ الجبل اور کبار الدعاۃ کی

---

[1] ایک دفعہ سلجوقی سلطان نے الحسن کو پیغام بھجوایا کہ وہ ہتھیار ڈال دے اور اطاعت قبول کرے جو قاصد یہ پیغام لایا تھا اُس کے سامنے اُس نے دو فدائیوں کو بلوایا ایک سے کہا کہ وہ اپنے پیٹ میں خنجر گھونپ لے اور دوسرے کو کہا کہ وہ قلعہ پر سے نیچے کود جائے۔ دونوں نے حکم کی تعمیل کی اور اپنی جانیں قربان کر دیں۔ اس کے بعد اُس نے قاصد کو کہا اپنے آقا سے جا کر کہنا یُطِیعنی هکذا سَبْعُوْنَ اَلْفًا (الجمیعات السِّرّیة صفحه ۵۰)

[2] الجمیعات السِّرّیة صفحه ۴۸

[3] وَهِیَ من امنع القلاع فی شمال فارس۔ (الجمیعات السِّرّیة صفحه ۴۸)

ہدایت کے مطابق کام کرتے ۔ یہ داعی قاہرہ کے پڑھے ہوئے اور قلعۃ الموت کے تربیت یافتہ ہوتے تھے۔[۱] ان کی اس قابلیت کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ تشکیک اور تلبیس کے طریق میں ماہر ہوں اور مختلف لوگوں کی نفسیات سے واقفیت رکھتے ہوں چوتھا درجہ ''الرِّفاق'' کا تھا جن کے ذمہ داعی تیار کرنا تھا ان کی شرط یہ تھی کہ وہ فلسفہ منطق اور فقہ کے ماہر ہوں اور داعی کی علمی تربیت کر سکیں۔

پانچواں درجہ ''اَلْفَدَاوِيَه'' کا تھا جن کے ذمہ خفیہ طور پر دشمنوں کو قتل کرنے کا فریضہ تھا جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔[۲]

چھٹا درجہ ''اَللَّاصِقُوْن'' کا تھا۔ ان کے ذمہ صرف یہ فریضہ تھا کہ وہ عوام کو عمومی طور پر کسی گہرائی میں جائے بغیر دعوتِ نزاریہ سے مانوس کریں اور اُن سے عہد وفاداری لینے کی کوشش کریں۔

ساتواں درجہ ''اَلْمُسْتَجِيْبُوْن'' کا تھا یعنی عوام جو دعوتِ نِزَارِيَه سے مانوس ہیں یا نئے نئے ابتدائی مومن ہیں لیکن لوگوں کے عقائد میں تزلزل اور جستجو پیدا کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔

بہر حال باطنی تحریک کے یہ کارکن تفرُّس، تَأْنِيس، تشکیک، تعلیق، تدلیس، تاسیس اور تخلیع کے مختلف ذرائع سے کام لے کر اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرتے اور لوگوں کو شکار کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔

عباسی خلفاء اور اُن کے اُمراء نے الحسن الصباح کی دہشت پسند باطنی تحریک کو ختم کرنے کے لئے کئی مہمیں بھیجیں، خونریز لڑائیاں بھی ہوئیں لیکن اس تحریک کا استیصال نہ کیا جا سکا۔ الحسن قریباً پینتیس سال تک خلافت عباسیہ کے لئے خوف وہراس کا باعث بنا رہا اور رجب ۵۱۸ھ میں فوت ہوا[۳] تو اس

---

۱ یتلقون العلم فی مدارس القاهره ثم ینتقلون الی الموت لیتعلموا اسرار الدعوة واشترط الحسن الصباح فی الداعی ان یکون بارعًا فی التشکیک وماهرًا فی التلبیس لیخدعوا العامة ویدخلهم فی عقیدتهم۔ (تاریخ الدولة الفاطمیة صفحه ۳۶۹)

۲ یشترط فیه التفانی فی طاعة الرئیس ...... فاصبحوا آلات الانتقام فتاكة وخلفوا عصرًا مليًّا بالخوف والفريج وكانوا يتصفون بالشجاعة النادرة ...... والصبر و يشترطون ايضًا أن يجيدوا عدّة لغاتٍ ۔ (نفس المصدر صفحه ۳۶۹) ۔ ويؤتى بها اطفالًا الى منازل المقدمين والدعاة فَيُرَبُّوْنَ منذ الحداثة على مبادى المخاطرة والتَّضْحِيَة المطلقة۔ (الجميعات السرية صفحه ۵۳)

۳ وفی روایة صفحه ۵۲۰ ۔ و فی روایته قتله ابنه محمد (الجمیعات السِّرِّیة صفحه ۵۱ و ۵۴)

کی دہشت پسند باطنی تحریک پورے زور پر تھی جو اُس کے جانشینوں کے ذریعہ برابر جاری رہی۔

صلیبی لڑائیوں میں بھی بعض اوقات انہوں نے صلیبیوں کی مؤثر مدد کی۔آخر کار ہمدان کے امیر اَیْتَغْمَش جلال الدین بن خوارزم شاہ کی کوششوں اور فاتح بغداد ہلاکو خاں کے حملوں کی وجہ سے فارس کے علاقہ میں الحسن کی تحریک کا استیصال کر دیا گیا۔شام کے علاقہ میں ان کا زور صلاح الدین ایوبی کے ذریعہ ختم ہوا[1] اور ایک دہشت پسند تحریک اپنے کئے کی سزا بھگت کر اپنے انجام کو پہنچی۔

اب نِزَاری اور مُسْتَعْلِی اسماعیلیوں میں سے مختصر سے گروہ ہیں جو امن پسند شمار ہوتے ہیں اور اُن کے قائد بڑے سلجھے ہوئے امن پسند مشہور شہری ہیں۔اُن کی آبادیاں شام اور ہندوستان کے جنوبی ساحلوں پر ہیں۔ زیادہ[2] تر تجارت پیشہ یا صنعت وحرفت سے متعلق ہیں اور آغاخانی اسماعیلی یا بُہرہ اسماعیلی کے نام سے مشہور ہیں۔آغاخانی اسماعیلیوں کے سربراہ آغا کریم خان ہیں اور یہ نِزَاری مسلک کی نمائندگی کرتے ہیں اور بُہرہ اسماعیلیوں کے سربراہ مولانا سیف الدین طاہر ہیں جن کا مرکز بمبئی میں ہے یہ مُسْتَعْلِیَہ مسلک کی نمائندگی کرتے ہیں۔

بُہرہ عام طور پر ظاہری شریعت کے پابند ہیں اور فقہ جعفریہ کے قریب ہیں لیکن آغاخانی شیعہ ظاہری شریعت کی چنداں پرواہ نہیں کرتے اور اپنے امام کی باطنی اطاعت کو دین کے اغراض کے لحاظ سے کافی سمجھتے ہیں۔

آغاخانی شیعوں کا ظاہری شعار کچھ اس طرح کا ہے

۱۔ قرآن کریم کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ظاہر حجاب اکبر ہے۔حقیقت اور باطن تک نہیں پہنچنے دیتا اس لئے اس حجاب کو دُور کرنے اور نور ازلی تک پہنچنے کے لئے رُوحانی امام کا ہونا ضروری ہے جو علوم نبویہ کا وارث اور وصی ہوتا ہے۔یہ حاضر امام حق و باطل اور صحیح اور غلط میں تمیز کرتا ہے اور قرآن کریم کے باطنی معنوں کو بذریعہ تاویل کھولتا ہے کیونکہ وہ مجسم قرآن ناطق ہے اور دوسرے لوگوں کے پاس جو قرآن ہے وہ قرآن صامت ہے۔

---

[1] فلم تبق لهم اهميةٌ سياسِيّة۔(الجميعات السّرّية صفحه ۵۲)

[2] وهم اهل نشاطٍ وَكَرَمٍ وَحُسنٍ ونسائهم فائقات فی الجمال وحرفتهم التجارة والزراعة وصناعة الخزف ...... وانهم مازالوا يكتمون تعاليمهم ويحرصون على اجراءِ شعائرهم فى الخفاء۔ (الجميعات السّرّية صفحه ۵۴)

آغا خانی شیعہ بعض دوسرے اسماعیلی فرقوں کی طرح تَقَمُّص اور تناسخ کے بھی قائل ہیں۔ آغا خانی شیعوں کا کلمہ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَاَشْھَدُ اَنَّ عَلِیًّا وَصِیُّ اللّٰہِ ہے

۲۔ آغا خانی شیعوں کا باہمی سلام، یا علی مدد اور جواب سلام مولا علی مدد ہے۔

۳۔ آغا خانی شیعہ وضو کی ضرورت نہیں سمجھتے اُن کے دل کا وضو ہوتا ہے۔

۴۔ ہر آغا خانی شیعہ پر نماز کی جگہ تین وقت کی دُعا فرض ہے۔ اس دُعا میں امام حاضر کا تصور ضروری ہے۔ قیام، رکوع، سجدہ اور قبلہ رُخ ہونے کی ضرورت نہیں۔

۵۔ اصل روزہ زبان، کان اور آنکھ کا ہے اس لئے کھانے پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگر کوئی چاہے تو سوا پہر کا کھانے پینے کا روزہ بھی رکھ سکتا ہے۔

۶۔ زکوٰۃ سے مراد آمدنی میں سے فی روپیہ دو آنے کے حساب سے امام حاضر کی خدمت میں نذرانہ پیش کرنا ہے۔

۷۔ حج سے مراد ''امام حاضر کا دیدار'' ہے کیونکہ زمین پر صرف وہی خدا کا رُوپ ہوتا ہے۔

۸۔ جو آغا خانی شیعہ امام حاضر کی خدمت میں ایک مقررہ رقم[۱] پیش کرے اُسے امام حاضر کی طرف سے ''اسمِ اعظم'' عطا ہوتا ہے۔

۹۔ اگر کوئی آغا خانی عمر بھر کی عبادت معاف کرانا چاہے تو اُسے بھی امام حاضر کی خدمت میں ایک مقررہ رقم[۲] پیش کرنی پڑتی ہے۔

۱۰۔ حاضر امام کے نور کو حاصل کرنے کے لئے ایک مقررہ رقم[۳] پیش کرنا ہوتی ہے جو آغا خانی جماعت خانوں میں بطور ردّان دی جاتی ہے۔[۴]

---

۱ یہ رقم پاکستانی آغا خانی کے لئے 75 روپیہ کے قریب ہے

۲ یہ رقم پاکستانی آغا خانی کے لئے پانچ ہزار ہے

۳ یہ رقم پاکستانی آغا خانی کے لئے سات ہزار ہے

۴ یہ قواعد اور ہدایات پرنس آغا خان فیڈرل کونسل پاکستان کراچی کے ایک سرکلر سے ماخوذ ہیں جو آغا خانی برادری کی رہنمائی کے لئے جاری کیا گیا۔

اَلْقَرَامِطَه

عبداللہ بن میمون الاسماعیلی نے اپنے عارضی مرکز اَهْوَاز سے اپنے ایک داعی الحسین اَلْاَهْوَازِی کو دعوت اسماعیلیہ کے اشاعت کے سلسلہ میں سواد کوفہ کی طرف بھیجا جہاں وہ حَمْدَان بن اَلْاَشْعَث قَرْمَط سے ملا۔ حمدان قرمط اس کی تبلیغ سے متاثر ہو کر اسماعیلی تحریک میں شامل ہو گیا اور بعد میں اس علاقہ کا انچارج داعی بن گیا اور بغداد کے ایک نواحی علاقہ کو مرکز بنا کر اشاعت کے فرائض سرانجام دینے لگا۔ جب اس کی دعوت چمکی تو اُس نے اپنے متبعین کو ہتھیار خریدنے اور انہیں اپنے پاس رکھنے کی تلقین کی۔ یہ ۲۷۶ھ کا واقعہ ہے۔ اس نے اگلے ہی سال اس علاقہ میں اپنا دارالہجرت قائم کیا جسے پتھروں کی دیوار بنا کر بڑے محفوظ قلعہ کی شکل دی اور حسب موقع اردگرد کے علاقہ میں قتل و غارت اور لوٹ مار کو اپنا پیشہ بنایا اور لوگوں میں دہشت پھیلائی۔

حَمْدَان نے عربوں میں اپنی دعوت کو فروغ دیا اور اس میں خاصی کامیابی حاصل کی۔ اس نے خاص انداز کا مالی نظام بھی قائم کیا۔ وہ ہر چھوٹے بڑے مرد عورت سے "اَلْفِطْرَه" کے نام سے ایک درہم وصول کرتا اور ہر بالغ شخص سے "اَلْهِجْرَه" کے نام سے ایک دینار لیتا اور کہتا میں قرآن کریم کے حکم خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِم کی تعمیل میں یہ رقم لیتا ہوں اور اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ میں داخل کرنے کی فیس اُس نے سات دینار مقرر کی جس کا نام اُس نے اَلْبُلْغَه رکھا۔ جو شخص سات دینار ادا کرتا اُسے ایک بُندق (ریٹھہ کے برابر گولی) کی مقدار میں بڑا لذیذ حلوئی عنایت کرتا اور کہتا۔ یہ جنتیوں کا کھانا ہے جو حضرت علیؓ پر اُتارا گیا تھا۔ اپنے ہر داعی کو سات سو دینار کے بدلہ میں ایک سو گولی دیتا اور کہتا لوگوں میں تبلیغ کرو اور ان کو حلوئی کی یہ گولیاں خریدنے کی ترغیب دو۔ اس کے بعد اُس نے خُمس وصول کرنے کا آغاز کیا۔ اُس نے اَلْاُلْفَه کے نام سے ایک تحریک چلائی جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام لوگ اپنے اموال کو ایک مرکز میں جمع کریں وہ سب ان اموال میں برابر کے شریک ہوں گے[1]۔ اور اس میں سے قومی مقاصد میں بھی خرچ کیا جائے گا۔ ہر ایک گاؤں میں اس نے ایک نمبردار مقرر کیا جس

---

[1] ان مجتمع القرامطه قام علی الشیوع و الاباحة......بل ذهب الی اشنع حدٍ فی الشیوع ...... و امر الدعاة ان یَجْمَعُوا النساء فی لیلةٍ معیّنةٍ بحیث یمکن للرجال ان یَّسْتَمْتِعُوا بهنَّ فی اختلاطٍ وشیوع وکان یقول هذا اقصٰی درجات الصداقةِ والاخاء۔ (تاریخ الجمیعات السّرّیة صفحه ۳۴)

کے ذمہ یہ تھا کہ وہ لوگوں سے ہر قسم کا مال جمع کرے پھر ضرورت مندوں میں خرچ کیا جائے تا کہ اُس کے زیرِ نگیں علاقہ میں کوئی محتاج اور غریب نظر نہ آئے۔اس نے کہا کہ ہر جوان اور بوڑھا، عورت اور بچہ کمائی کرے اور رقم جمع کر کے ہتھیار خرید ے اس طرح ہر ایک کو اُس نے مُسلّح کر دیا۔

حمدان قرمط کا داماد عبدان بھی بڑا ذہین، ہر قسم کے فریب میں ماہر اور خبیث الفطرت اور اُس کا دست راست تھا۔اُس کے ذریعہ دعوت اسماعیلیہ کو خوب فروغ ملا۔ابوسعید الحسن بن بہرام القرمطی جو بلاد بحرین میں قرامطہ کی حکومت کا بانی بنا۔اسی کے ذریعہ اسماعیلی ہوا تھا اور ذکرویہ بن مہرویہ نے بھی اُسی کی تحریک پر اسماعیلی امام کی بیعت کی جو بعد میں شمال یعنی بَادِیَۃُ السَّمَاوَہ اور شام کے بعض علاقوں کے قرامطہ کا سردار بنا۔ایک عرصہ بعد حمدان اور عبدان اسماعیلی امام کی اطاعت سے پھر گئے لیکن جلد ہی ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور قرامطہ کی زِمامِ قیادت ابوسعید اور ذکرویہ کے ہاتھ میں آگئی۔ ذکرویہ کے بیٹے یحییٰ نے شمال میں اتنی طاقت حاصل کر لی کہ اس نے دمشق پر حملہ کیا۔یہ ۲۸۹ھ کا واقعہ ہے لیکن اس حملہ کے دوران وہ قتل ہو گیا اور زمام اقتدار اُس کے بھائی الحسین کے ہاتھ میں آگئی لیکن وہ بھی عباسی فوجوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ذکرویہ نے اپنے بیٹے کا انتقام لینے کے لئے عباسی فوجوں پر حملے شروع کر دیئے اور حاجیوں کے قافلوں پر چھاپے مارے اور انہیں لُوٹا۔

قطیف اور بحرین کے علاقوں میں ابوسعید الجنابی نے دعوت اسماعیلیہ کی خوب تبلیغ کی اور بڑی کامیابی حاصل کی اس نے ہجر پر بھی حملہ کیا۔آخر بحرین اور یمامہ کے علاقوں میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ عباسی خلیفہ اَلْـمُعْتَضِد نے صورت حال کو نازک دیکھ کر یہ علاقہ اپنے ایک قائد العباس بن عمر والغنوی کے سپرد کیا کہ وہ اس فتنہ کا استیصال کرے لیکن وہ ابوسعید سے شکست کھا گیا ابوسعید نے قیدیوں کو قتل کر کے جلا ڈالا اور ان کے اسلحہ پر قبضہ کر لیا اور اس طرح اطمینان سے وہ اپنے علاقہ کے حالات درست کرنے میں مصروف رہا۔اپنی فوجوں کو خوب مسلّح کیا، نوجوانوں اور بچوں کو فوجی ٹریننگ دی، زراعت کی طرف بھی توجہ دی، اراضی کی اصلاح کی، کھجوروں کے باغات لگوائے اور وہاں کے لوگوں کو خوشحال بنانے میں مقدور بھر کوشش کی اور اموال کی صحیح تقسیم کے لئے قابل اعتماد دیانتدار افسر مقرر کئے۔ غرض قرامطہ نے شام کے علاقہ اور بحرین اور یمامہ کے اطراف میں عباسیوں کی بنیادیں ہلا دیں۔

دمشق کے علاقہ کے والی قرامطہ کو تین لاکھ دینار سالانہ خراج ادا کرتے تھے۔

ابوسعید ۳۰۱ھ میں اپنے ایک خادم کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔[1] بعد میں اس کا بیٹا ابوطاہر برسر اقتدار آیا اُس نے دولت فاطمیہ کی حمایت کی اور عباسیوں کے خلاف پالیسی اختیار کی اور فارس کے سمندروں میں بحری حملوں کا آغاز کیا تا کہ فاطمی مصر پر بآسانی قبضہ کرسکیں اور عباسی مزاحمت کمزور رہے۔ بعد میں فاطمیوں اور قرامطہ میں بوجوہ اختلاف اُبھرے جن کی وجہ سے نوبت باہمی محاربت تک پہنچی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ دمشق کے علاقہ پر فاطمی اثر بڑھ جانے کی وجہ سے قرامطہ کا وہ خراج بند ہوگیا جو ہر سال قرامطہ کو ملا کرتا تھا۔ قرامطہ نے ان دنوں یہ کوشش بھی کی کہ ان کے تعلقات خلافت عباسیہ سے استوار ہو جائیں، لیکن عباسی خلیفہ المطیع قرامطہ کو سخت ناپسند کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ یہ لوگ دشمنِ اسلام ہیں اور کسی حمایت کے قابل نہیں۔[2]

تاہم الحسن القرمطی بنوبویہ کی امداد سے دمشق پر قابض ہوگیا۔ فاطمی والی کو قتل کردیا اور مسجد اُموی کے ممبر پر کھڑے ہوکر فاطمی خلیفہ المُعز پر لعنت بھیجی۔ فاطمی قائد جوہر کے ساتھ اُس کی سخت لڑائیاں ہوئیں اور بعض لڑائیوں میں جوہر بڑی مشکل سے بچا۔ ایک دفعہ تو قرامطہ قاہرہ کے دروازوں تک پہنچ گئے لیکن آخر کار شکست کھائی اور پسپا ہوگئے۔ ایک دفعہ المعز نے الحسن بن احمد قرمطی کو بڑا تہدید آمیز لمبا خط لکھا جس کا جواب الحسن نے ان مختصر الفاظ میں دیا۔ وَصَلَ کِتَابُکَ الَّذِیْ قَلَّ تَحْصِیْلُهٗ وَکَثُرَ تَفْصِیْلُهٗ وَنَحْنُ سَائِرُوْنَ اِلَیْکَ عَلٰی اَثَرِهٖ وَالسَّلَام۔[3] اس کے بعد الحسن مصر پر حملہ آور ہوا اور فاطمی خلیفہ جوڑ توڑ اور قرامطہ کے لشکر میں بعض اہم عناصر کو رشوت پیش کرنے کے ذریعہ بڑی مشکل سے غالب آسکا۔ بہرحال قرامطہ باہمی نزاعوں اور حربی دھچکوں کے ہاتھوں کمزور ہوکر آخر عباسی فوجوں کی جنگوں میں نابود ہوگئے لیکن اُن کے اقتدار کے ہاتھوں اُمّت مسلمہ نے قریباً ایک صدی

---

[1] قیل کان ذالک بتدبیر عبداللّٰہ المھدی الفاطمی لانہ انتقض طاعتہ و دعا لنفسہ۔
(تاریخ الدولۃ الفاطمیہ صفحہ ۳۹۲ ملخصًا)

[2] قال المطیع العباسی کلھم قرامطہ علی دین واحدٍ امّا المصریون یعنی بنی عبید فَاَمَاتُوا السُّنَنَ و قتلوا العلماء و اما القرامطہ فقتلوا الحاجّ و قطعوا الحجر الاسود۔
(تاریخ الدولۃ العباسیۃ صفحہ ۳۹۶)

[3] تاریخ الدولۃ الفاطمیۃ صفحہ ۳۹۹۔ بحوالہ ابن الاثیر جلد ۸ صفحہ ۳۲۹

تک بے حد نقصان اٹھایا۔قرامطہ ابن القاسم اور ابو طاہر کی قیادت میں حاجیوں کے قافلوں پر حملہ کرتے،
ان کے اموال لوٹ لیتے اور قتل و غارت سے باز نہ آتے۔

۳۱۷ھ میں ابو طاہر قرمطی نے حج کے ایام میں مکہ پر حملہ کیا اور حاجیوں کو بکثرت قتل کیا، ان کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا، سینکڑوں نعشیں چاہِ زمزم میں پھینکوا دیں، اموال لوٹ لئے اور حجر اسود کو اکھیڑ کر اپنے ساتھ اَلْاِحْسَاء لے گیا۔اس وجہ سے سارا عالم اسلامی ہل گیا، سخت شور پڑا۔فاطمی خلیفہ نے بھی اس حرکت کا بُرا منایا اور ابو طاہر کو حکم دیا کہ وہ حجر اسود واپس کردے اور اس کے لئے پچاس ہزار دینار بطور معاوضہ ادا کرنے کی پیشکش بھی کی لیکن قرامطہ حجر اسود کی واپسی پر راضی نہ ہوئے۔آخر ہر طرف سے زور پڑنے اور بعض صوفیائے وقت کی کوششوں کی وجہ سے قریباً بائیس سال کے بعد ۳۳۹ھ میں حجر اسود واپس کرنے پر قرامطہ مجبور ہو گئے۔[1]

باطنی تحریکات نے ملتان اور اس کے گردونواح میں بھی خاصہ فروغ پایا لیکن سلطان محمود غزنوی نے ملتان اور اس کے گردونواح پر جب حملے کئے تو ان تحریکات پر بھی زد پڑی۔کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے ہزاروں باطنیوں کو تہ تیغ کیا۔ایک ہزار کے قریب شورش پسندوں کے تو ہاتھ کٹوا دیئے۔اس صورت حال سے گھبرا کر جو بچے رہے وہ یا ہندوستان کے دور کے علاقوں مثلاً جنوبی ہند یا اس کے شمالی علاقوں کی طرف بھاگ گئے۔[2]

تَنَقُّلْ، تَقَمُّصْ اور تَنَاسُخْ کے بارہ میں چند نظریات

روافض اور معتزلہ کے بعض فرقے تناسخ کے قائل ہیں اور اس بارہ میں مختلف نظریات رکھتے ہیں۔

تَنَاسُخ کے بنیادی معنے یہ ہیں کہ مرنے کے بعد انسانی اور حیوانی روح فنا نہیں ہوتی بلکہ مختلف جونوں اور قالبوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے اور اس طرح مختلف حیوانی شکلیں اختیار کر کے دنیا میں ہمیشہ موجود رہتی ہے۔بہر حال بعض نے تناسخ کی یہ عمومی تعریف کی ہے۔تَنَقُّلُ الْاَرْوَاحِ فِی الْاَجْسَامِ اس قسم کے تناسخ کے قائل بعض شیعہ فرقوں کا ذکر گزشتہ صفحات میں بھی آچکا ہے۔آئندہ صفحات میں بعض ایسے فرقوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو نظریہ تناسخ کی ایک خاص انداز سے تشریح کرتے ہیں مثلاً:

---

[1] تاریخ الجمیعات السِّرِّیة صفحہ ۳۶، ۳۷۔الفرق بین الفرق صفحہ ۲۱۹

[2] الفرق بین الفرق صفحہ ۲۲۱

اَلْخَابِطِیَّہ اور ان کا نظریہ تناسخ

یہ فرقہ احمد بن خابط کا پیرو تھا۔ احمد کا شمار معتزلہ میں ہوتا ہے اور اس کے خاص نظریات میں سے ایک نظریہ یہ تھا کہ تمام حیوانات بشمول انسان ایک ہی جنس کی اور ایک جیسی روح رکھتے ہیں۔ اس جنس کی ارواح کو ایک اور عالم میں پیدا کیا گیا تھا۔ یہ روح ہی اَلحَیّ اَلْعَالِم اور القَادِر ہے اور یہی مکلّف ہے فَجَمِیْعُ اَنْوَاعِ الحَیَوَان مُحْتَمِلٌ لِلتَّکْلِیْفِ اس بنا پر ازل میں ہی سب حیوان احکام الٰہی یعنی امر اور نہی کے مخاطب تھے۔ چنانچہ ازل میں بعض روحوں نے ان اَحکام خداوندی کی پوری پوری اطاعت کی اور بعض نے کوئی حکم نہ مانا۔ جو روحیں فرمانبردار رہیں ان کو ہمیشہ کے لئے دَارُ النَّعِیْم میں رہائش ملی اور جن روحوں نے نافرمانی کی وہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں ڈال دی گئیں۔ مذکورہ روحوں میں کچھ ایسی بھی تھیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے بعض احکام کو مانا اور بعض کی تعمیل نہ کی، کچھ نیک کام کئے اور کچھ بُرے۔ ایسی روحوں کو اصلاح کا موقع دیا گیا اور انہیں اس غرض کے لئے دارالعمل یعنی اس دنیا میں بھیج دیا گیا اور ہر ایک کو اُس کے اچھے یا بُرے اعمال کی مقدار اور نوعیت کے مطابق مختلف شکلیں دی گئیں۔ کوئی انسان بنا، کوئی گھوڑا، کوئی گدھا، کوئی شیر، کوئی سؤر یا کتا اور کوئی پانی کا جانور مچھلی یا مگرمچھ۔ اعمال ہی کی نوعیت کے لحاظ سے کسی کو آرام و آسائش میسر آئی اور بعض مشکلات اور مصائب سے دوچار ہوئے جن کے اعمال کسی لحاظ سے اچھے تھے انہیں خوبصورت اور دیدہ زیب جسم ملے اور جن کی برائیاں زیادہ تھیں انہیں بُرے اور مکروہ قوالب دیئے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ہر شکل کے حیوانوں کی طرف ان کی جنس میں سے ہی رسول اور نبی مبعوث ہوتے رہتے ہیں جو اُن رسولوں کی مانتے ہیں اور اپنی پوری پوری اصلاح کر لیتے ہیں۔ انہیں واپس دائمی دارالنعیم میں بھجوا دیا جاتا ہے اور جو شریر اور نافرمان رہتے ہیں وہ دوزخ کی طرف دھکیل دیئے جاتے ہیں اور جن کے اعمال ملے جلے کچھ اچھے اور کچھ بُرے ہوتے ہیں وہ مختلف جونوں اور قوالب کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ علامہ بغدادی احمد بن خابط کے نظریہ تناسخ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اَلْاَرْوَاحُ الْمَشْوْبَۃُ تَنْتَقِلُ اِلٰی صُوَرٍ مُخْتَلِفَۃٍ مِنْ صُوَرِ النَّاسِ وَالْبَھَائِم وَالسِّبَاعِ وَالْحَشَرَاتِ وَغَیْرِھَا عَلٰی مَقَادِیْرِ الذُّنُوبِ وَالْمَعَاصِی فِی الدَّارِ الْاُوْلٰی الَّتِیْ خَلَقَھُمُ اللّٰہُ فِیْھَا...... وَ اَنَّ الرُّوْحَ لَا یَزَالُ فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا یَتَکَرَّرُ فِیْ قَوَالِبَ وَصُوَرٍ

مُخْتَلِفَةٍ مَا دَامَتْ طَاعَتُهٗ مَشُوْبَةٌ بِذُنُوبِهٖ وَعَلٰی قَدْرِ طَاعَاتِهٖ وَذُنُوبِهٖ یَکُوْنُ مَنَازِلُ قَوَالِبِهٖ فِی الْاِنْسَانِیَّةِ وَ الْبَهِیْمِیَّةِ ۔[1]

احمد بن خابط کا یہ نظریہ بھی تھا کہ خدا دو ہیں۔ایک ازلی اور قدیم جس کا نام اللہ ہے اور دوسرا مخلوق اور حادث جس کا نام مسیح ہے۔مسیح ان معنوں میں ابن اللہ ہے جو ولادت کے مفہوم سے مبرا ہیں اَیْ هُوَ اِبنُ اللّٰهِ عَلٰی مَعْنٰی دُوْنَ الوِلَادَةِ ۔یہ دوسرا خدا ہی قیامت کے روز مخلوقات کا محاسبہ کرے گا۔اسی نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔قرآن کریم کی آیت وَ جَآءَ رَبُّکَ وَ الْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا میں ربّ سے مراد یہی مسیح ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ" تَرَوْنَ رَبُّکُمْ کَمَا تَرَوْنَ الْقَمَرَ لَیْلَةَ الْبَدْرِ" اس سے اسی مسیح کی رُویت اور اس کا جلوہ مراد ہے۔علامہ بغدادی احمد بن خابط کے اسی قسم کے نظریات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں قَالَ اَحْمَدُ بْنُ خَابِطٍ اِنَّ الْمَسِیْحَ تَدَرَّعَ جَسَدًا وَ کَانَ قَبْلَ التَّدَرُّعِ عَقْلًا وَ هُوَ اَکْرَمُ الْخَلْقِ عِنْدَاللّٰهِ ۔[2]

احمد بن ایوب کا نظریہ تناسخ

ایک اور شخص جس کا نام احمد بن ایوب بن بانوش تھا اس کا تناسخ کے بارہ میں یہ نظریہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو بیک وقت بالکل ایک جیسا پیدا کیا۔یہ سب اللہ تعالیٰ کی "دارالنعیم" یعنی جنت میں مزے سے عیش و آرام سے رہتے تھے۔ایک لمبے عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو کہا کہ اگر تم میں سے کوئی دوسروں سے بڑھنا چاہتا ہے اور مساوات کی ایک جیسی زندگی سے تنگ آ گیا ہے تو وہ اس کے لئے ایک مقررہ امتحان دے سکتا ہے جس کی بنا پر یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ کس کو بلند تر اور افضل تر درجہ دیا جائے۔احمد بن ایوب کہا کرتا تھا اِنَّ مَنْزِلَةَ الْاِسْتِحْقَاقِ اَشْرَفُ مِنْ مَّنْزِلَةِ التَّفْضِیْلِ۔بہرحال خدا کی اس پیش کش کے موقع پر مخلوقات میں سے بعض نے کہا۔ہم اسی حال میں اچھے ہیں اور تیرے فضل کے شکر گزار ہیں اور بعض دوسرے امتحان دینے کے لئے تیار ہو گئے تا کہ وہ استحقاق کی بنا پر اور امتحان میں کامیابی حاصل کر کے دوسروں سے بڑھ جائیں ایسے سب افراد کو اللہ تعالیٰ نے دارالامتحان یعنی دُنیا میں

---

[1] اَلْفَرق بین الفرق صفحہ ۲۰۶

[2] اَلْفَرق بین الفرق صفحہ ۲۰۶ تا ۲۰۹

بھیج دیا یہاں آ کر بعض نے پوری پوری اطاعت کی اور امتحان میں کامیاب رہے اور بعض نافرمانی کی وجہ سے امتحان میں فیل ہوگئے۔ جو کامیاب ہوئے انہیں اعلیٰ اور برتر رُتبہ عطا ہوا اور جنہوں نے نافرمانی کی اور فیل ہوگئے وہ اپنے پہلے مقام سے بھی گر گئے اور تناسخ کے چکر میں ڈال دیئے گئے۔ کسی کو انسانی جسم ملا اور کسی کو حیوانی قالب جن کو حیوانی قالب ملا یعنی وہ امتحان میں بُری طرح فیل ہوئے وہ مرفوع القلم قرار پائے۔ اَیْ صَارُوْا بَھَائِمَ اَوْ سِبَاعًا بِذُنُوْبِھِمْ وَارْتَفَعَ عَنْھُمَا التَّکْلِیْفُ. بہرحال یہ حیوان ایک لمبے عرصہ تک تناسخ کے چکر میں پھنسے رہیں گے یہاں تک کہ اُن کے گناہوں اور نافرمانیوں کی سزا پوری ہو جائے تب انہیں پھر اُس پہلی حالت کی طرف لوٹا دیا جائے گا جس میں وہ سب برابر تھے اس کے بعد پھر انہیں حسب سابق امتحان کا اور اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ غرض یہ چکر اسی طرح چلتا رہتا ہے اور چلتا رہے گا۔ ابن ایوب کے اس نظریہ تناسخ کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ بغدادی لکھتے ہیں اِنَّ الْمُکَلَّفِیْنَ مَنْ یَّعْمَلُ الطَّاعَاتِ حَتّٰی یَسْتَحِقَّ اَنْ یَّکُوْنَ نَبِیًّا اَوْمَلِکًا فَیَفْعَلُ اللّٰہُ ذَالِکَ۔ بعض نے اس نظریہ تناسخ کی تشریح میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود امتحان کی پیش کش نہیں کرے گا بلکہ اس دُنیا کے لوگ تفاضل اور رفعِ درجات کا مطالبہ کریں گے اور کہیں گے لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ[1] اس پر اللہ تعالیٰ کہے گا کہ اگر تم تفاضل اور ایک دوسرے سے بڑھنا چاہتے ہو تو اس کے لئے امتحان اور آزمائش میں سے گزرنا ہوگا چنانچہ کچھ امتحان دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے اور اس طرح تناسخ کے چکر میں پھنس جائیں گے یا کامیاب ہو کر برتر درجہ حاصل کرلیں گے۔ آیت کریمہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ[2] میں اسی امتحان اور آزمائش کی طرف اشارہ ہے۔[3]

ابو مسلم خراسانی کا نظریہ تناسخ

تناسخ کے بارہ میں ابو مسلم خراسانی کا نظریہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بیک وقت تمام ارواح کو پیدا کیا اور اُن سب کو مکلف بنایا یعنی احکام شرعیہ کا اُن کو پابند کیا لیکن اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ ان ارواح میں سے کون اطاعت گزار رہوں گے اور کون نافرمانی کریں گے۔ اس طرح جن ارواح کی تقدیر میں نافرمانی لکھی

---

[1] البقرۃ: ۶۲ [2] الاحزاب: ۷۳ [3] الفرق بین الفرق صفحہ ۲۰۸

تھی ان کو اُن کے مقلدہ اورمفروضہ گناہوں کی نوعیت اور مقدار کے لحاظ سے مختلف جونوں اور قوالب میں ڈالا گیا۔[1]

غلو کے بارہ میں اعتدال پسند شیعہ علماء کی رائے

اعتدال پسند شیعہ علماء نے بھی غلو پسند باطنی تحریکات کے خلاف اظہار افسوس کیا۔ وہ سب کے سب ان غلو پسند فرقوں کی مذمت میں دوسرے معتدل المسلک مسلمانوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ چنانچہ مشہور شیعہ عالم الصدوق القمی جو مجتہد العصر الشیخ المفید کے اُستاد تھے اپنی مشہور کتاب ''اعتقاداتُ الصُّدُوق'' میں لکھتے ہیں۔

اِعْتِقَادُ نَا فِی الْغُلَاۃِ وَالْمُفَوِّضَۃِ اَنَّھُمْ کُفَّارٌ بِاللّٰہِ جَلَّ اسْمُہٗ وَاَنَّھُمْ شَرٌّ مِّنَ الْیَھُوْدِ وَالنَّصَارٰی وَالْمَجُوْسِ وَالْقَدَرِیَّۃِ وَالْحَرُوْرِیَّۃِ وَمِنْ جَمِیْعِ اَھْلِ الْبِدَعِ وَالْاَھْوَاءِ الْمُضِلَّۃِ وَاَنَّھُمْ مَاصَغَّرَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ جَلَالُہٗ تَصْغِیْرَ ھُمْ بِشَیْءٍ کَمَا قَالَ اللّٰہُ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَہُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ وَبِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ وَلَا یَاْمُرَکُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِکَۃَ وَالنَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا اَیَاْمُرُکُمْ بِالْکُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔[2]

اسی طرح حضرت امام جعفر صادقؑ فرمایا کرتے تھے لَا تُقَاعِدُوا الْغُلَاۃَ وَلَا تُشَارِبُوْھُمْ وَلَا تُصَافِحُوْھُمْ وَلَا تُنَاکِحُوھُمْ وَلَا تُوَارِثُوْھُمْ۔[3]

یعنی غلو پسند اور مفوضہ فرقوں کے بارہ میں ہمارا مسلک یہ ہے کہ یہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے منکر ہیں۔ یہود، نصاریٰ، مجوس، معتزلہ، قدریہ، خارجی، حروریہ اور دوسرے بدعتی اور نفس پرست گروہوں سے بھی بدتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بارہ میں ان کی پست ذہنی کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا وہ بالکل اس آیت کریمہ کے مصداق ہیں کہ ایک انسان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ اللہ تعالیٰ اُسے کتاب شریعت دے،

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۲۰۸

[2] آل عمران: ۸۰، ۸۱ ۔ اعتقادات الصدوق صفحہ ۳۹

[3] مَعْرِفَۃُ اَخْبَارِ الرِّجَال صفحہ ۱۹۱

حکومت بخشنے اور نبوت کے مقام پر فائز کرے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ ایسا مقرب انسان تو یہ اعلان کرتا ہے کہ اے لوگو! تم اللہ والے بن جاؤ کیونکہ تم کتاب شریعت کو جانتے ہو اور اُسے پڑھتے ہو وہ کبھی بھی تمہیں یہ حکم نہیں دے سکتا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو ربّ بنا لو کیا وہ تمہیں اس کفر کی تبلیغ کر سکتا ہے جبکہ تم سچے مسلمان ہو۔

حضرت امام جعفر صادق فرمایا کرتے تھے کہ غلو پسند لوگوں کے پاس بیٹھنا، اُن سے میل ملاپ رکھنا، ان کے ساتھ کھانا پینا، اُن سے مصافحہ کرنا سب قسم کے سوشل تعلقات چھوڑ دو۔ ان سے نکاح شادی کی اجازت نہیں اور نہ تم آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہو۔

باطنی تحریکات کے خطرناک اثرات

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد اہل بیت کی محبت وموالات کا دعویٰ لے کر جو شیعہ تحریک اُٹھی تھی وہ کئی مراحل میں سے گزرتی اور مختلف انداز کی باطنی تحریکات کی شکل اختیار کرتی ہوئی اقصائے مغرب سے لے کر ہندوستان اور ترکستان کے کناروں تک ایک لمبا عرصہ ذہنی انتشار اور سیاسی خلفشار کا باعث بنی رہی۔ خصوصاً چوتھی اور پانچویں صدی میں تو ان باطنی تحریکات نے ایک خوفناک فتنہ کی صورت اختیار کر لی تھی جس کی وجہ سے ممالکِ اسلامیہ میں سیاسی استحکام مفقود ہو کر رہ گیا اسی قسم کی تحریکات کا یہ نتیجہ تھا کہ فلسطین اور شام کے علاقوں میں صلیبیوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور مشرق میں خوارزم کی حکومت تاتاری یلغار کا شکار بنی اور بعد میں خلافتِ عباسیہ کے خاتمہ اور بغداد کی تباہی پر منتج ہوئی۔

مغلوں اور عثمانی ترکوں کے زمانہ میں یہ باطنی تحریکات کسی حد تک دب گئیں تھیں لیکن مغربی استعمار کے بعد پھر سے ان تحریکات میں جان پڑ گئی اور ان کے پھیلنے پھولنے کے خاصے اسباب سامنے آ گئے۔ بہائیت بھی باطنی تحریک کا ہی ایک شاخسانہ ہے۔ دوسری طرف ایران، شام اور لبنان اور ایک حد تک عراق اور پاکستان بھی انہی فتنوں کی زد میں ہے۔ عرب کے دوسرے علاقے بھی ان فتنوں کے مضرات سے محفوظ نہیں۔

باطنی تحریکات نے کیا کیا شکلیں اختیار کیں اور ان سے اُمتِ مسلمہ کو کس قسم کے دینی، تمدنی اور سیاسی نقصان پہنچے یہ ایک لمبی داستان ہے۔ علامہ بغدادی ان تحریکات کی تباہ کاریوں کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے لکھتے ہیں: اِنَّ ضَرَرَ الْبَاطِنِيَّةِ عَلٰى فِرَقِ الْمُسْلِمِيْنَ اَعْظَمُ مِنْ ضَرَرِ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى وَالْمَجُوْسِ عَلَيْهِمْ بَلْ اَعْظَمُ مِنْ ضَرَرِ الدَّهْرِيَّةِ وَسَائِرِ اَصْنَافِ الْكَفَرَةِ۔[1]

یعنی باطنی تحریک سے جو نقصان اُمّتِ مسلمہ کو پہنچا وہ یہود، نصاریٰ، مجوس اور دہریہ تحریکات سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ باطنی تحریکات سے جو کمزوری پیدا ہوئی اسی نے ان طاقتوں کے آگے بڑھنے کے لیے راہ ہموار کی۔

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۲۱۳

خوارج اور ان کے بڑے ضمنی فرقے

خوارج وہ لوگ ہیں جو جنگ جمل اور صفین کے بعد اس لئے حضرت علیؓ کے خلاف ہو گئے کہ حضرت علیؓ نے جنگ جمل میں انہیں غلام بنانے کی اجازت نہیں دی اور معاویہ کے مطالبہ پر ''حَکَم'' مقرر کرنے کی تجویز مان لی ۔اس طرح ان کے خیال میں علیؓ نے حق کی خلاف ورزی کی اور مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ یہ اختلاف اس قدر بڑھا کہ اس نے بغاوت کی شکل اختیار کر لی اور حضرت علیؓ کو ان باغیوں کے خلاف متعدد لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ یہ لوگ دراصل اُن عناصر کا حصہ تھے جنہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش برپا کر کے ان کو شہید کر دیا تھا۔ان لوگوں کو ڈر تھا کہ اگر مسلمانوں کے دونوں فریقوں کے درمیان صُلح ہو گئی تو پھر ان کی خیر نہیں ۔انہیں خلیفۂ وقت کو شہید کرنے کی ضرور سزا ملے گی ۔اسی خلاف کی بنا پر یہ لوگ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ دونوں کو کافر کہتے تھے ۔علامہ کعبی خوارج کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

اِنَّ الَّذِی یَجْمَعُ الخَوَارِجَ عَلٰی اِفْتِرَاقِ مَذَاهِبِهِمَا اِكْفَارُ عَلِیٍّ وَعُثْمَانَ وَالْحَكَمَیْنِ وَاَصْحَابِ الجَمَلِ وَ كُلِّ مَنْ رَّضِیَ بِالتَّحْكِیْمِ وَالْاِكْفَارُ بِارْتِكَابِ الذُّنُوبِ وَوُجُوْبِ الْخُرُوْجِ عَلٰی الْاِمَامِ الْجَائِرِ[1] یعنی خوارج باوجود باہمی اختلاف کے مندرجہ ذیل باتوں پر متفق ہیں ۔علی عثمان اور دونوں حکم اور جنگ جمل میں شامل ہو کر علی کے خلاف لڑنے والے اور وہ جو حَکَم مقرر کرنے کے فیصلہ کو درست مانتے ہیں یہ سب کافر ہیں ۔اسی طرح جو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ بھی کافر ہے۔ ظالم حاکم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا اور اس سے لڑنا بھی واجب ہے۔

یہ تھا خوارج کا آغاز بعد ازاں آہستہ آہستہ یہ باغی گروہ کئی ضمنی فرقوں میں بَٹ گیا جن میں سے چند بڑے بڑے فرقے مندرجہ ذیل تھے۔

اَلْمُحَكِّمَةُ الْاُوْلٰی، اَلْاَزَارِقَهْ، اَلنَّجْدَات، اَلصُّفْرِیَّهْ، اَلْعَجَارِدَهْ، اَلْاِبَاضِیَّه۔

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۵۰۔ خوارج اپنے آپ کو شُراۃ کہتے تھے یعنی آیہ کریمہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ : ۱۱۱) کے مطابق بک جانے والے لوگ۔

اَلْعَجَارِدَہ کے ذیلی فرقے یہ تھے۔

اَلْخَازِمِیَّۃ، اَلشُّعَیْبِیَّۃ، اَلْمَعْلُوْمِیَّۃ، اَلْمَجْھُوْلِیَّۃ، اَلْمَعْبَدِیَّۃ، اَلرَّشِیْدِیَّۃ، اَلْکَرَمِیَّۃ، اَلْحَمْزِیَّۃ، اَلشَّیْبَانِیَّۃ، اَلْاِبْرَاھِیْمِیَّۃ، اَلْوَاقِفِیَّۃ، اَلْمَیْمُوْنِیَّۃ۔

اَلْاِبَاضِیَّۃ کے ذیلی فرقے یہ ہیں۔

اَلشَّبِیْبِیَّۃ، اَلْخَصِیْصِیَّۃ، اَلْحَارِثِیَّۃ، اَلْیَزِیْدِیَّۃ، اَلْمَیْمُوْنِیَّۃ۔

ان مندرجہ بالا فرقوں میں سے بعض کا مختصر بیان آئندہ صفحات میں پیش کیا جارہا ہے۔

خوارج کے مختلف ضمنی فرقے

۱۔ اَلْمُحَکِّمَۃُ الْاُوْلٰی

خوارج کا یہ پہلا گروہ ہے جو بحیثیت فرقہ تاریخ کے صفحات میں ریکارڈ ہوا ہے۔قبیلہ رَبِیْعَہ کی ایک شاخ بَنُوْ یَشْکُرْ کے ایک آدمی نے تَحْکِیْم کے فیصلہ کے خلاف بطور احتجاج نعرہ لگایا کہ اِنّی قَدْ خَلَعْتُ عَلِیًّا وَّ مُعَاوِیَۃَ وَ بَرِئْتُ مِنْ حَکَمَیْھِمَا کہ میں علی ،معاویہ اور ان کے مقرر کردہ حکموں سے بیزار اور الگ ہوگیا ہوں۔اس قسم کے خیال کے بہت سے لوگ صفین کے مقام سے واپس آکر حَرُوْرَا نامی علاقہ میں جمع ہوگئے ان کی تعداد قریباً بارہ ہزار تھی۔حرورا مقام کی وجہ سے ہی خوارج کو حروریہ کہا جاتا ہے۔یہ لوگ حروراء سے نہروان کے علاقے میں پہنچے۔حضرت علیؓ کو جب ان کے اس اجتماع کی خبر ملی تو آپ چار ہزار کا لشکر لے کر ان کے استیصال کے لئے روانہ ہوئے۔آپ نے وہاں پہنچ کر ان سے پوچھا کہ وہ کیوں مخالفت پر آمادہ ہیں۔انہوں نے جواب دیا کہ جنگ جمل میں فتح حاصل کرنے کے بعد آپ نے شکست خوردہ لوگوں کو غلام بنانے کی کیوں اجازت نہ دی۔آپ نے اس کے جواب میں فرمایا۔یہ لوگ مسلمان تھے اور مسلمان کو غلام بنانا جائز نہیں۔آپ نے ان کو شرمندہ کرنے کے لئے فرمایا: اگر میں غلام بنانے کی اجازت دیتا تو عائشہؓ کو کس کے سپرد کرتا۔اَیْ لَوْ اَبَحْتُ لَکُمُ النِّسَآءَ اَیُّکُمْ یَاْخُذُ عَائِشَۃَؓ ۔[1]

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۵۳

ان خارجیوں نے اس موقع پر حضرت علیؓ سے اور بھی بہت سے سوال کئے ۔ تحکیم کے فیصلہ پر اعتراض کیا۔حضرت علیؓ نے سب کے تسلی بخش جواب دیئے جس کی وجہ سے آٹھ ہزار کے قریب خارجی واپس حضرت علیؓ کے لشکر میں شامل ہو گئے لیکن چار ہزار مقابلے کے لئے اڑے رہے اور آخر سارے کے سارے جنگ میں مارے گئے ۔صرف نو افراد بچ سکے ۔ دوسری طرف اس جنگ میں حضرت علیؓ کے لشکر کے بھی نو سپاہی شہید ہوئے ۔ جو نو خارجی بچ گئے تھے وہ بھاگ کر سجستان ، یمن،الجزیرہ اور تل موزن وغیرہ علاقوں کی طرف بکھر گئے اور وہاں جا کر خارجی فتنہ کے بیج بوئے ۔

۲۔ اَلْاَزَارِقَةُ

یہ نافع بن اَلْاَزْرَق کے پیرو تھے۔انہیں ایک وقت میں بڑی شان وشوکت حاصل ہوئی اور خاصے بڑے علاقے پر ایک لمبا عرصہ قابض رہے ۔ یہ فرقہ گناہ کے مرتکب کو مشرک قرار دیتا تھا۔مخالفین کی عورتوں اور بچوں کے قتل کو جائز سمجھتا تھا۔ یہ لوگ رجم کے بھی منکر تھے اور صرف عورت پر تہمت لگانے والے کو قذف کی سزا دینے کے قائل تھے ان کا یہ بھی نظریہ تھا کہ چور جیسا بھی ہو اس نے تھوڑا مال چرایا ہو یا زیادہ اس کے ہاتھ کاٹ دینے چاہئیں ۔ گویا یہ نصاب سرقہ کے قائل نہ تھے۔اس فرقہ کی فوج بیس ہزار سے زیادہ تھی ۔ یمامہ کے خارجی بھی ان میں شامل ہو گئے تھے ۔انہوں نے اہواز اور کرمان کے علاقوں میں غلبہ حاصل کیا۔عبداللہ بن زبیرؓ کے لشکروں کو انہوں نے کئی بار شکست دی۔ آخر کار عبداللہ بن زبیرؓ نے مُهَلَّبْ بِنْ اَبِیْ صُفْرَہْ کو ان کے مقابلہ کے لئے تیار کیا۔ وہ بیس ہزار کا لشکر لے کر حملہ آور ہوا۔ مہلب قریباً بیس سال تک ان سے برسر پیکار رہا ۔ انہی جنگوں میں نافع بن الازرق مارا گیا اور اس کا جانشین مشہور شاعر قُطْرِیْ بِنْ اَلْفُجَاءَۃ بھی کام آیا۔ اس طرح بڑی مشکلوں کے بعد ازارقہ کے فتنہ کا استیصال ہوا۔اس فرقہ کے بے اثر ہو جانے کی ایک وجہ ان کا باہمی انتشار بھی تھا۔

۳۔ اَلنَّجْدَات

خوارج کا یہ فرقہ نَجْدَۃْ بِنْ عَامِرْ اَلْحَنَفِی کا پیرو تھا۔اس فرقہ کی فوجیں ایک دفعہ مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئیں ۔ وہاں لوگوں کو قتل کیا اور عورتوں کو لونڈیاں بنا کر لے گئے ۔ ان عورتوں میں حضرت عثمانؓ کی ایک نواسی بھی تھی ۔ اُموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے مطالبہ پر ان کے لیڈر نجدہ نے اس لڑکی کو

واپس عبدالملک کے پاس بھجوادیا۔اس وجہ سے نجدہ کے پیرو اس سے ناراض ہو گئے اور کہا اِنَّکَ رَدَدْتَّ جَارِیۃً لَّنَا عَلٰی عَدُوِّنَا۔

ایک اور جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد انہوں نے مال غنیمت میں سے خمس نکالے بغیر کچھ خرچ کرلیا اور جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے مباشرت کی۔بعد میں یہ پریشان ہوئے کیونکہ اُن کا نظریہ یہ تھا کہ گناہ کا مرتکب دائمی جہنمی ہوتا ہے۔اس پر ان کے لیڈر نجدہ نے کہا تم سے گناہ تو ضرور سرزد ہوا ہے لیکن یہ ایک اجتہادی غلطی تھی اس لئے مغفرت کی امید ہے۔اس کے بعد خوارج کے اس فرقہ نے یہ اصول تسلیم کرلیا کہ خدا اور رسول کی معرفت اور خارجی مسلمانوں کے خون کی حرمت یہ ضروری احکام ہیں ان کی خلاف ورزی گناہ کبیرہ ہے جو کسی صورت معاف نہیں ہوسکتا۔ باقی امور میں اگر اجتہادی غلطی ہو جائے تو معذرت اور توبہ قبول ہوگی۔یہ فرقہ حد خمر کا قائل نہ تھا۔اس کا یہ بھی نظریہ تھا کہ جس جرم کی سزا حد ہو اور یہ سزا نافذ ہوگئی ہو تو ایسے سزا یافتہ مجرم کو دائمی عذاب نہیں ہوگا۔

یہ فرقہ بھی کئی مزید فرقوں میں بٹ گیا اور اس کا یہی باہمی اختلاف اس کی تباہی کا موجب بنا۔[1]

۴۔ اَلصُّفْرِیَّۃُ

خارجیوں کا یہ فرقہ زیاد بن اَلْاَصْفَر کا پیرو تھا۔اس فرقہ کے عقائد اَلْاَزَارِقَۃ سے ملتے جلتے تھے۔ البتہ یہ اپنے مخالفین کے بچوں کے قتل کا قائل نہ تھا۔اس کا یہ نظریہ بھی تھا کہ جس جرم کی سزا بصورت حد نہیں اس کا ارتکاب کفر ہے اور جن جرائم کے مرتکب کو حد کی سزا ملی ہو اسے کافر کہنے کی بجائے اس جرم کے نام کی مناسبت سے پکارا جائے گا مثلاً زنا کرنے والے کو زانی، چوری کرنے والے کو سارق کہا جائے گا اسے کافر یا مشرک کہنا درست نہیں ہوگا۔صُفْرِیَّہ کا ایک لیڈر عمران بن حطان بڑا عابد، زاہد اور مشہور شاعر تھا لیکن حضرت علیؓ سے اس کو شدید بغض تھا۔اس نے حضرت علیؓ کے قاتل عبدالرحمٰن بن ملجم کا مرثیہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے

یَا ضَرْبَۃً مِنْ مُّنِیبٍ مَّا اَرَادَ بِھَا　　　اِلَّا لِیَبْلُغَ مِنْ ذِی الْعَرْشِ رِضْوَانًا[2]

۵۔ اَلْعَجَارِدَۃُ

یہ فرقہ عبدالکریم بن عجرد کا پیرو تھا۔یہ دس ضمنی فرقوں میں بٹ گیا۔عقائد میں یہ ازارقہ سے متفق تھا

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۶۰　[2] الفرق بین الفرق صفحہ ۶۳

البتہ ان کا ایک نظریہ یہ تھا کہ بالغ ہونے کے بعد ہر انسان کو نئے سرے سے کلمہ پڑھنے کی دعوت دینی چاہیے خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر۔ اگر وہ یہ بات نہ مانے تو کافر ہوگا اور اگر مان لے تو مومن۔ اس فرقہ کے نزدیک مخالف مسلمانوں کے اموال بطور غنیمت لوٹ لینا جائز نہیں تھا۔

۶۔ اَلْخَازِمِیَّۃ

یہ فرقہ عام عقائد میں اہل السنّت والجماعت سے متفق تھا۔ البتہ عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ وغیرہ کی تکفیر کرتا تھا۔

۷۔ اَلْحَمْزِیَّۃ

یہ فرقہ حمزہ بن اکرک کا پیرو تھا۔ حمزہ کا اصل تعلق عجاردہ خازمیہ سے تھا لیکن بعد میں اس نے بعض معتزلی نظریات اپنا لئے۔ بایں ہمہ خوارج اور معتزلہ دونوں اس کو کافر کہتے تھے۔

ہارون الرشید کے زمانہ 179ھ میں حمزہ نے بغاوت کی اور مامون الرشید کے عہد میں اس کے فتنہ نے خطرناک صورت اختیار کرلی۔ اس نے خارجیوں کے دوسرے فرقوں کو بھی تہ تیغ کیا اور ہرات کے گردونواح میں تباہی مچائی۔ وہاں متعدد عباسی لشکروں سے اس کی مُٹھ بھیڑ ہوئی اور انہیں پے درپے شکستیں دیں۔ اسی دوران میں اس نے خراسان، کرمان، سجستان اور کوہستان کے علاقوں پر غلبہ حاصل کرلیا۔ مامون الرشید نے اس کے مقابلہ کے لئے اپنے فوجی سردار طاہر بن الحسین کو بھیجا۔ متعدد جنگوں میں طرفین کے قریباً تیس ہزار افراد مارے گئے۔ کرمان کے علاقہ میں بہت سخت جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں حمزہ کے ہزاروں مددگار کام آئے اور وہ خود بھی زخمی ہوگیا اور بھاگتے ہوئے راستہ میں ہی مرگیا۔ بہرحال ایک لمبے عرصہ تک حمزہ اور اس کا گروہ خلافت عباسیہ کے لئے دردسر بنا رہا۔[۱]

۸۔ اَلشَّیْبَانِیَّۃ

یہ فرقہ شیبان بن سلمہ الخارجی کا پیرو تھا۔ دوسرے خارجی فرقے شیبان کو اس لئے کافر کہتے تھے کہ اُس نے ابومسلم خراسانی کی مدد کی تھی۔ ابومسلم نے بنو اُمیہ اور کئی خارجی گروہوں کے ساتھ جنگیں لڑیں اور شیبان اس کے ساتھ ان جنگوں میں برابر شامل رہا۔[۲]

---

۱ الفرق بین الفرق صفحہ ٦٦ ۲ الفرق بین الفرق صفحہ ٦٩

۹۔ اَلْاِبَاضِیَّہ

یہ فرقہ عبداللہ بن اباض کا پیرو تھا۔اس فرقہ کا نظریہ یہ تھا کہ دوسرے مسلمان جو ان کے مخالف ہیں وہ نہ مومن ہیں نہ مشرک بلکہ کافر ہیں تاہم باوجود کافر ہونے کے ان کی شہادت مقبول ہے اور اُن کے خون حرام ہیں نیز ان سے نکاح جائز ہے اور باہمی توارث بھی درست ہے اور ان کے اموال لوٹنا جائز نہیں۔تاہم ان کے گھوڑے اور ہتھیار اپنے قبضہ میں لئے جاسکتے ہیں۔

''فقہ اِبَاضِیَّہ'' کو ایک قابل مطالعہ علمی سرمایہ تسلیم کیا گیا ہے۔

اباضیہ کئی ذیلی فرقوں میں بٹ گئے۔ان میں باہمی تکفیر اور تفرقہ بازی کا کس قدر زور اور شوق تھا اُس کی ایک دلچسپ مثال یہ ملتی ہے کہ ایک اباضی خارجی نے جس کا نام ابراہیم تھا کچھ لوگوں کو اپنے گھر دعوت پر بلایا اس دوران اُس نے کسی کام کے لئے اپنی لونڈی کو کہیں بھیجا لیکن اُس نے واپس آنے میں کچھ دیر کردی۔اس وجہ سے ابراہیم غصہ سے لال پیلا ہوگیا اور قسم کھائی کہ وہ اس لونڈیا کو اعراب یعنی بدوؤں کے پاس بیچ دے گا۔حاضرین میں سے ایک شخص نے جس کا نام میمون تھا اعتراض کیا کہ ایک مومن لڑکی کو کافروں کے ہاتھ بیچنا کیسے جائز ہوسکتا ہے۔ابراہیم نے اصرار کیا کہ یہ جائز ہے۔کچھ لوگ ابراہیم کے طرف دار بن گئے اور کچھ نے میمون کی حمایت کی اور بعض غیر جانبدار رہے۔

ابراہیم کے حمایتی ''ابراھیمیہ'' کہلائے۔میمون کے حمایتی ''میمونیہ''[1] اور غیر جانبدار ''واقفیہ'' کے نام سے مشہور ہوئے۔اس طرح اس معمولی سی بات کی وجہ سے تین فرقے بن گئے جو ایک دوسرے کو کافر کہتے تھے۔[2]

اباضیہ کا یہ نظریہ بھی تھا کہ اگر فرقے کا قائد گناہ کا مرتکب ہو اور لوگ اسے قیادت سے برطرف نہ کریں تو وہ قائد اور اس کے متبع سب کے سب کافر ہو جائیں گے۔[3]

۱۰۔ اَلشَّبِیْبِیَّہ

یہ بھی اباضی خوارج کا ایک ذیلی فرقہ ہے۔اس فرقہ کو بھی خاصی شان وشوکت حاصل ہوئی۔اس

---

[1] یہ میمونیہ فرقہ اُس میمونیہ فرقہ سے الگ ہے جس کا ذکر شُعَیْبِیَّہ کے بالمقابل گزر چکا ہے دیکھیں صفحہ ۱۹۶۔ اسی طرح باطنی تحریک کے بانی میمون بن دیصان سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں۔دیکھیں صفحہ ۱۹۶

[2] صفحہ ۵ حصہ دوم بھی دیکھیں [3] الفرق بین الفرق صفحہ ۷۴،۷۵

فرقہ کا قائد شُبَیب بِنْ یَزِیْد اَلشَّیْبَانِی تھا۔شبیب نے بنواُمیّہ کی کئی فوجوں کوشکست فاش دی اور حجاج بن یوسف کی بھیجی ہوئی بیس فوجی مہموں کو ناکام بنایا۔ایک دفعہ شبیب حجاج کے دارالحکومت کوفہ میں آگھسا اور جامع مسجد کے علاقہ پر قبضہ کرلیا اور اپنی ماں غزالہ کو ممبر پر کھڑا کر کے اُس سے تقریر کروائی۔یہ خاتون بڑی فصیح البیان مقررہ تھی۔اس کے متعلق ہی ایک شاعر نے کچھ شعر کہے جو عربی نظم کی مشہور کتاب الحماسه میں درج ہیں ان میں سے ایک شعر یہ ہے۔

اَقَامَتْ غَزَالَةُ سُوْقَ الضِّرَابِ　　لِاَهْلِ الْعِرَاقَيْنِ حَوْلًا قَمِيْطًا

شبیب نے اس رات کی صبح فجر کی نماز پڑھائی۔پہلی رکعت میں سورۃ بقرہ اور دوسری رکعت میں سورۃ آل عمران ختم کی۔حجاج رات بھر اپنے محل میں دبکا بیٹھا رہا اور فوجوں کے جمع ہونے کا انتظام کرتا رہا۔صبح چار ہزار کی نفری لے کر شبیب کے مقابلہ میں آیا۔سخت جنگ ہوئی اور شبیب انبار کی طرف نکل بھاگا اس کے تعاقب میں حجاج نے سُفیان ابن اَلْاَبْرَد کو تین ہزار کا لشکر دے کر بھیجا اُس نے شبیب کو دُجَیْل ندی کے کنارے جالیا۔شبیب اس وقت پل عبور کر رہا تھا سفیان نے پل کی رسّیاں کٹوا دیں اس وجہ سے شبیب گھوڑے سمیت ندی میں ڈوب مرا۔اس کے بعد اُس کے لشکر نے جو ندی کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکا تھا شبیب کی والدہ غزالہ کو اپنا لیڈر چن لیا اور اس کی بیعت کی۔دونوں فوجوں میں سخت جنگ ہوئی لیکن بالآخر شبیب کی والدہ اور اس کی بیوی میدانِ جنگ میں ہلاک ہوگئیں اور بھی بہت سے لوگ مارے گئے۔سفیان نے شبیب کی نعش کو دریا سے نکلوا کر اس کا سر حجاج کے پاس بھجوا دیا۔حجاج نے شبیب کی فوجوں کے اکثر افراد کو معاف کر دیا لیکن ایک شخص کے قتل کا حکم دیا۔اس شخص نے کہا کہ قتل سے پہلے میرے یہ شعر سن لیں۔

اَبْرَءُ اِلَى اللّٰهِ مِنْ عَمْرٍو وَشِيْعَتِهٖ　　وَمِنْ عَلِيٍّ وَمِنْ اَصْحَابِ صِفِّيْنَ

وَمِنْ مُعَاوِيَةَ الطَّاغِيْ وَشِيْعَتِهٖ　　لَا بَارَكَ اللّٰهُ فِي الْقَوْمِ الْمَلَاعِيْنَ

شبیبیہ فرقہ پر یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ حضرت عائشہؓ پر تو ان کا یہ اعتراض تھا کہ انہوں نے جنگِ جمل میں فوجوں کی قیادت کر کے قرآن کے احکام کی خلاف ورزی کی ہے لیکن خود اس فرقہ نے شبیب کی والدہ کو اپنا لیڈر چنا اور اُس کی قیادت میں لڑے۔[1]

---

[1] الفرق بین الفرق صفحه ۷۷

غلو پسند خارجی فرقے

۱۱۔ اَلْحَفصِیَّةُ

اباضی خوارج کا یہ ایک ذیلی فرقہ تھا۔حضرت علی کے بُغض میں دیوانگی کی حد تک بڑھا ہوا تھا اُس کا دعویٰ تھا وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِي قَلْبِهٖ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ [۱] کی آیت علیؓ کے بارہ میں نازل ہوئی تھی اور آیت وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ [۲] علیؓ کے قاتل ابن ملجم کی شان میں اُتری۔

اس فرقہ کا یہ نظریہ بھی تھا کہ جسے معرفت الٰہی حاصل نہیں وہ مشرک ہے اور جسے معرفت الٰہی تو حاصل ہے لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کو نہیں مانتا وہ کافر ہے۔ [۳]

۱۲۔ اَلْيَزِيْدِيَّةُ

یہ بھی اباضی خارجیوں کا ایک ضمنی فرقہ تھا۔بڑا غلو پسند اور فتنہ پرداز گروہ۔اس کا عقیدہ تھا کہ آخری زمانہ میں عجم سے ایک نبی مبعوث ہوگا جو نئی شریعت لائے گا اور شریعت محمدیہؐ کو منسوخ کردے گا۔ [۴]

اس فرقہ کا یہ نظریہ بھی تھا کہ اہل کتاب میں سے جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی مانتا ہے اگرچہ آپ کی لائی ہوئی شریعت کو نہ مانے وہ مومن اور مسلمان ہے۔

۱۳۔ اَلْمَيْمُوْنِيَّه

میمون خارجی کے پیرو۔یہ میمون اُس میمون اور اس کے فرقہ سے الگ ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جس کا ابراہیم خارجی کے ساتھ ایک لونڈی کے فروخت کے ضمن میں جھگڑا ہوا تھا اور جس کی وجہ سے اباضیوں کے تین فرقے ابراہیمیہ۔میمونیہ اور واقفیہ بن گئے تھے۔یہ میمون وہ ہے جس کا جھگڑا شعیب خارجی سے قرض کی ادائیگی کے سلسلہ میں ہوا تھا اور جس کی وجہ سے دو فرقے **شعیبیه** اور میمونیہ بن گئے۔ [۵]

بہرحال اس میمونیہ فرقہ کا نظریہ یہ ہے کہ پوتیوں اور نواسیوں وغیرہ سے نکاح جائز ہے کیونکہ

۱۔ البقرة: ۲۰۵ ۲۔ البقرة: ۲۰۸ ۳۔ الفرق بين الفرق صفحه ۷۱
۴۔ الفرق بين الفرق صفحه ۲۱۱ ۵۔ صفحہ ۱۹۶ بھی دیکھیں

ان سے نکاح کی حرمت کا ذکر قرآن کریم میں[1] نہیں ہے۔[2]

اس فرقہ کا ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ مشرکین کے بچے جنت میں جائیں گے نیز یہ فرقہ اس بات کا بھی قائل تھا کہ سورۂ یوسف قرآن کریم کا حصہ نہیں ہے کیونکہ یہ ایک عشقیہ داستان ہے جس کا قرآن کریم میں شامل ہونا اس کتاب الٰہی کی شان کے خلاف ہے۔[3]

خوارج اور قبائلی عصبیت

شیعہ اور خارجی فرقوں کے عربی عنصر کا زیادہ تر تعلق بنو ربیعہ سے تھا۔ بنو ربیعہ نے اسلام کو نقصان پہنچانے کی ایک کوشش مسیلمہ کذاب کی شورش کی صورت میں کی تھی جس کا خاتمہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھوں ہوا۔ اس کے بعد دوسری کوشش حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے خلاف بغاوتوں کی صورت میں ظاہر ہوئی جو تاریخ میں خوارج کے نام سے مشہور ہے اور جس کا مختصر ذکر صفحات بالا میں گزر چکا ہے۔

۱؎ صفحہ ۲۴۰ بھی دیکھیں جس میں خرمیہ کا ذکر ہے جو پوتیوں اور بہنوں سے نکاح جائز سمجھتے تھے۔

۲؎ الفرق بین الفرق صفحہ ۲۱۲

۳؎ الفرق بین الفرق صفحہ ٦٥ و ۲۱۲

معتزلہ اور ان کے فرقے

معتزلہ فرقہ کب اور کیسے وجود میں آیا اور اسلامی تاریخ میں اس کا کیا کردار رہا ہے؟ اس کا مختصر بیان یوں ہے کہ شروع میں یہ ایک خالص علمی گروہ تھا اور سیاسی خلفشار سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا کیونکہ شیعہ اور خوارج کی طرح اقتدار پر قبضہ کرنا اس کے مقاصد میں شامل نہ تھا اور نہ اس کے لئے اُس نے کبھی کوئی منظم عملی کوشش کی۔

دراصل ابتدائی معتزلہ[1] وہ لوگ تھے جو پہلے حضرت علیؓ کے حامی تھے لیکن جب حضرت علیؓ شہید ہوگئے اور اقتدار بنواُمیّہ کے قبضہ میں چلا گیا تو یہ لوگ سیاسی سرگرمیوں سے الگ ہوگئے چونکہ یہ لوگ علمی ذہن رکھتے تھے اور اُس زمانہ میں مخالف اسلام مختلف مذاہب کے پیروؤں نے اسلام کے خلاف علمی اعتراضات پھیلانے کی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا تھا اس لئے یہ لوگ زاویہ نشین ہوکر عقلی علوم اور دین کے علمی پہلوؤں کے فروغ کی طرف متوجہ ہوئے اور اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کے علمی جواب میں مصروف ہوگئے[2]۔ اس طرح، طرح طرح کی خیال آرائیاں اُن کی جولان گاہ بن گئیں۔ اسی زاویہ گزینی اور سیاسی سرگرمیوں سے علیحدہ ہوجانے کی وجہ سے ان کا نام "معتزلہ" مشہور ہوگیا یعنی یہ وہ گوشہ نشین لوگ ہیں جن کا دنیاوی سرگرمیوں سے کوئی سروکار نہ تھا صرف علم کا فروغ اور مسائل کلامیہ سے دلچسپی ان کی سرگرمیوں کے مرکز بن گئے تھے۔ ان لوگوں کے نام کی شہرت زیادہ تر اس وقت ہوئی جبکہ واصل بن عطاء معتزلی حسن بصری کے درس سے الگ ہوا اور اپنا حلقۂ درس قائم کیا۔

زیادہ تر معتزلہ قدریہ تھے یعنی اس بات کے قائل تھے کہ انسان اپنے اعمال میں خودمختار اور آزاد ہے وہ جس طرح چاہے کوئی سا طرزِ عمل اختیار کرے اُسے اختیار ہے تاہم جبریۃ اور مُرجئہ اپنے مرکزی طرزِ فکر کی وجہ سے معتزلہ کا ہی حصّہ شمار ہوتے ہیں۔

---

[1] بعض کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کے زمانہ میں جو فتنے اُٹھے ان سے الگ تھلگ رہنے والے صحابہ مثلاً سعد بن ابی وقاصؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن عمرؓ وغیرھم معتزلہ کے آباء ہیں۔

[2] اسی زمانہ میں سیاسی حالات اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ سے بددل ہوکر ایک اور گروہ بھی سامنے آیا جس نے زہد، خلوت گزینی اور عبادت کو اپنا دستور زندگی بنایا اور کچھ عرصہ بعد زُھّاد اور صُوفیاء کے نام سے مشہور ہوا۔

جبریہ وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک انسان اپنے تمام افعال میں مجبور محض ہے اور وہ خدا کے ہاتھ میں کھلونا ہے۔ وہ جس طرف چاہے اور جس طرح چاہے اُسے لے جائے۔

مرجئہ مسلمانوں کا وہ فرقہ ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ اعمال انسانی ایمان کا جزو نہیں۔ ایمان صرف یقین اور اقرار باللسان کا نام ہے۔ دوسرے اعمال زائد از ایمان امور ہیں اور نجات سے ان کا کوئی خاص تعلق نہیں۔

معتزلہ کے نظریے

تمام کے تمام معتزلہ مندرجہ ذیل مسائل میں ایک سا نظریہ رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفات اُس کی ذات کا عین ہیں اُن کا کوئی الگ وجود نہیں جبکہ دوسری اشیاء کی صفات ان کی ذات سے الگ اپنا علیحدہ وجود رکھتی ہیں اور زائد از ذات ہیں نیز اس عینیت کی وضاحت کے لئے یہ کہنا درست ہے کہ لَیْسَ لِلّٰہِ حَیَاۃٌ وَلَاعِلْمٌ وَ لَا قُدْرَۃٌ وَ لَا سَمْعٌ وَ لَا بَصَرٌ وَلَا کَلَامٌ وَلَا اِرَادَۃٌ [1]

رؤیت باری محال ہے یعنی مادی آنکھوں سے ہم خدا کو نہیں دیکھ سکتے نہ اس دُنیا میں اور نہ اگلے جہاں میں۔ زَعَمَ الْمُعْتَزِلَۃُ اَنَّ اللّٰہَ لَا یَرٰی نَفْسَہٗ وَلَا یَرَاہُ غَیْرُہٗ۔

معتزلہ کے نزدیک کلام الٰہی مخلوق اور حادث ہے۔ اسی نظریہ کے تحت یہ قرآن کریم کو بھی حادث اور مخلوق مانتے ہیں۔ بعض خلق اور حدوث میں فرق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کلام اللہ اور قرآن کو ہم حادث تو کہہ سکتے ہیں لیکن اسے مخلوق کہنا درست نہیں۔

معتزلہ قدریہ کے نزدیک انسان اپنے افعال کا خالق اور ان کے بجالانے میں پوری طرح مختار اور آزاد ہے اور یہ اختیار ہی ثواب وعقاب کی بنیاد ہے۔[2]

وہ مسلمان جو گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں وہ نہ مؤمن ہیں اور نہ کافر ان کا مقام بَین بَین ہے۔ نیز مرتکب گناہ کبیرہ دائمی جہنمی ہے بشرطیکہ وہ توبہ نہ کرے۔ بعض معتزلہ کے نزدیک خدا تعالیٰ کا جسم ہے لیکن وہ اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ اِنَّہٗ جِسْمٌ لَا کَالْاَجْسَامِ وَ اِنَّہٗ شَیْءٌ لَا کَالْاَشْیَآءِ۔ معتزلہ اگرچہ اپنے زمانہ کے مخالفین اسلام کے مقابلہ میں پیش پیش رہے۔ انہوں نے اسلام کی تائید میں علمی

[1,2] الفرق بین الفرق صفحہ ۷۹

دلائل مہیّا کرنے کی قابل قدر کوشش کی اور اسلام کے عقلی دفاع میں اپنے زمانہ کے لحاظ سے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے لیکن اپنے بعض مخصوص نظریات کی وجہ سے یہ فرقہ بھی اُمّت مسلمہ میں فکری انتشار اور ذہنی خلفشار کا باعث بنا رہا۔ معتزلہ خود باہمی نظریاتی اختلافات کی وجہ سے کوئی فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔

معتزلہ کے بڑے بڑے فرقے

جیسا کہ اُوپر گزر چکا ہے بنیاد کے لحاظ سے ان کے تین بڑے فرقے تھے۔

معتزلہ قدریّہ، معتزلہ جبریّہ، معتزلہ مرجئہ

چونکہ اکثریت قدریہ کی ہے اس لئے بالعموم قدریہ کو ہی معتزلہ سمجھا جاتا ہے۔ معتزلہ قدریہ کے مندرجہ ذیل ضمنی فرقے تھے۔

اَلْوَاصِلِیَّہ، اَلْعَمْرَوِیَّہ، اَلْھُذَلِیَّہ، اَلنَّظَامِیَّہ، اَلْمُرْدَارِیَّہ، اَلمَعْمَرِیَّہ، اَلشَّحَامِیَّہ، اَلْجَاحِظِیَّہ، اَلْخَابِطِیَّہ، اَلحِمَارِیَّہ، اَلْخَیَاطِیَّہ، اَلشَّخْلَمِیَّہ، اَلصَّالِحِیَّہ، اَلمَرِیْسِیَّہ، اَلْکَعْبِیَّہ، الجَبَائِیَّہ، اَلْبَھْشَمِیَّہ۔

ان میں سے بعض اہم فرقوں کی تفصیل آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہے۔

معتزلہ قدریہ کے ضمنی فرقوں کی تفصیل

۱۔ اَلْوَاصِلِیَّہ اور اُس کے نظریات

یہ فرقہ واصل بن عطاء معتزلی کا پیرو ہے۔ کہا جاتا ہے کہ واصل پہلا شخص ہے جسے معتزلی کہا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ پہلے واصل حضرت حسن بصریؒ کا شاگرد اور ان کے حلقۂ درس کا طالب علم تھا لیکن اس نے بعض ایسے خیالات کا اظہار شروع کر دیا جن سے حضرت حسن بصریؒ متفق نہ تھے۔ آخر اس اختلاف نے شدت اختیار کر لی اور حضرت حسن بصریؒ نے اُسے اپنے حلقۂ درس میں بیٹھنے سے منع کر دیا چنانچہ اُس نے ضد میں آکر اُسی مسجد کے ایک کونہ میں اپنا الگ حلقۂ درس بنا لیا۔ اس پر حسن بصریؒ نے فرمایا اِعْتَزَلَ عَنَّا یعنی اُس نے ہم سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ یہاں سے اس کا نام معتزلی یعنی الگ ہو جانے والا مشہور ہو گیا۔

واصل کو معبد جُھَنِیْ اور غیلان دمشقی کے بعد معتزلہ کا تیسرا بڑا قائد تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے مخصوص نظریات یہ تھے:

1۔ اُمّت اسلامیہ کا جو شخص گناہ اور نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے وہ نہ مومن ہے اور نہ کافر بلکہ وہ فاسق ہے۔ اگر اُس نے مرنے سے پہلے توبہ نہ کرلی تو ہمیشہ دوزخ میں رہے گا جبکہ خوارج میں سے بعض کے نزدیک ایسا شخص مشرک ہے اور بعض اُسے کافر قرار دیتے ہیں اور دائمی جہنمی مانتے ہیں۔ اہل السنّت والجماعت کے نزدیک ایسا شخص مومن اور مسلمان تو ہے لیکن گنہگار اور فاسق ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو اُسے سزا دے اور چاہے تو معاف کردے نیز ایسا شخص اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر دوزخ سے نکل آئے گا اور جنت میں جائے گا۔

واصل کا یہ نظریہ بھی تھا کہ حضرت علیؓ اور ان کے حامی بمقابلہ حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ و حضرت عائشہؓ اور ان کے ساتھی ان دونوں گروہوں میں سے ایک گروہ لَا عَلَی التَّعْیِیْنِ فاسق ہے۔ اَیْ اَحَدُ الْفَرِیْقَیْنِ فَاسِقٌ بِلَا تَعْیِیْنٍ۔ اس لئے اگر دونوں گروہوں میں سے ایک ایک آدمی مل کر کسی واقعہ کے بارہ میں شہادت دیں تو قاضی کو چاہیے کہ وہ ان کی شہادت ردّ کردے کیونکہ ان میں ایک لازماً فاسق ہے اور فاسق کی شہادت قابلِ ردّ ہے اور اگر ایک ہی گروہ کے دو آدمی مل کر گواہی دیں تو ان کی گواہی مقبول ہوگی کیونکہ یہ یقین نہیں کہ یہی لازماً فاسق ہیں۔[1]

۲۔ اَلْھُذَیْلِیَۃُ اور اس کے نظریات

یہ فرقہ ابو الھذیل محمد بن الھذیل کا پیرو تھا۔ ابو الھذیل کا لقب علّاف تھا۔ یہ قبیلہ عبدالقیس کا مولیٰ تھا اور جیسا کہ بتایا جاچکا ہے زیادہ تر موالی یعنی فارسی نومسلموں نے ہی مسلمانوں میں مختلف قسم کی بدعتوں کو رواج دیا ہے فَکَذٰلِکَ اَبُو الْھُذَیْلِ جَرٰی عَلٰی مِنْھَاجِ اَبْنَاءِ السَّبَایَا لِظُھُوْرِ اَکْثَرِ الْبِدَعِ مِنْھُمْ۔[2]

ابو الھذیل معتزلی کے مخصوص نظریات یہ تھے۔

اللہ تعالیٰ کے سارے مقدورات یعنی ساری کائنات بشمول جنت و دوزخ فنا ہو جائیں گے اور

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۸۳ [2] الفرق بین الفرق صفحہ ۸۴

خدا ان کے اعادہ پر قادر نہ ہوگا۔ یہ ایک سکون کا دور ہوگا جس میں سب کچھ حالتِ سکون میں ہوگا۔
فَلا یَقْدِرُ اللّٰہُ فِی تِلْکَ الْحَالِ عَلٰی اِحْیَاءِ مَیِّتٍ وَ لَا اِمَاتَۃِ حَیٍّ وَ لَا عَلٰی تَحْرِیْکِ سَاکِنٍ وَ لَا عَلٰی تَسْکِیْنِ مُتَحَرِّکٍ وَ لَا عَلٰی اِحْدَاثِ شَیْءٍ۔[1]

اگلے جہان میں جنتی اور دوزخی دونوں اپنے اپنے افعال میں مجبور محض ہوں گے یعنی جنتی کھانے پینے اور عیش اُڑانے پر مجبور ہوں گے اور دوزخی چیخنے چلانے اور رو او یلا کرنے پر مجبور ہوں گے۔ وہاں ان کی مرضی نہیں چلے گی بلکہ یہ سب کچھ ان سے اللہ تعالیٰ کرائے گا جبکہ جہمیہ فرقہ اسی دنیا میں اس قسم کے جبر کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک انسان بلکہ ہر چیز مجبور محض اور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں کھلونا ہے۔ اسی نظریہ کی وجہ سے اس فرقہ کو جبریہ بھی کہا جاتا ہے۔ تقرب الٰہی کی نیت نہ بھی ہو تب بھی اچھے کام کرنے والوں کو ثواب ملے گا اور ایسا کرنے والے کو مطیع اور فرمانبردار کہا جا سکتا ہے۔ جبکہ اہل السنّت والجماعت کے نزدیک خدا تعالیٰ کی پہچان اور اس پر ایمان لانے کے سلسلہ میں غور وفکر کرنے کی حد تک تو یہ نظریہ درست ہے۔ اس قسم کے غور وفکر کا انسان کو ثواب ملے گا خواہ اس میں اُس کی نیت تقرب اور عبادت کی نہ ہو لیکن جب یہ معرفت حاصل ہوگئی تو پھر اس کے بعد صرف اُسی کو ثواب ملے گا جس نے کوئی اچھا کام تقرب اور اطاعتِ الٰہی کی نیت وارادہ سے کیا ہو۔[2]

اللہ تعالیٰ کی صفات عینِ ذات ہیں۔ اس کی ذات سے الگ ان کا کوئی وجود اور تصور نہیں۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ اور علم ایک ہی چیز ہے۔ اس نظریہ پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اگر یہ درست ہے تو پھر یہ کہنا بھی درست ہونا چاہیے کہ علم عالم ہے۔ قدرت قادر ہے حالانکہ علم کو عالم کہنا اور قدرت کو قادر کہنا بے معنٰی اور لغو بات ہے۔

یقینی خبر وہ ہے جسے کم از کم بیس آدمی بیان کریں اور ان میں سے کم از کم ایک صادق الایمان اور جنتی ہو۔ اگر سارے کے سارے غیر مومن ہوں خواہ وہ لاکھوں ہوں تو ان کی دی ہوئی خبر یقینی اور واجب القبول نہ ہوگی۔ اسی طرح ابو الہذیل کے نزدیک کسی ''خبرِ احاد'' سے تب کوئی حکم شرعی ثابت ہوگا جبکہ اس کے راوی کم از کم چار ہوں۔

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۸۵ [2] الفرق بین الفرق صفحہ ۸۸

جُزْءٌ لَا یَتَجَزّٰی (مزید تقسیم نہ ہوسکنے والی چیز) کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ نہ اُسے انسان دیکھ سکتا ہے اور نہ خدا کیونکہ دیکھنے کے لئے کسی چیز کا رنگدار ہونا ضروری ہے اور جُزْءٌ لَا یَتَجَزّٰی کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔[1]

۳۔ اَلنِّظَامِیَّۃ اور اُس کے نظریات

یہ فرقہ ابو اسحاق بن سیار النظام معتزلی کا پیرو تھا۔ نظام ابو الھذیل کا بھانجا اور عجمی النسل تھا۔ اس نے بھی کئی نئے نظریات اختراع کئے جن میں سے چند یہ ہیں۔

جو باتیں انسان کی بہبود اور اس کی مصلحت سے تعلق رکھتی ہیں اللہ تعالیٰ ان کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا کیونکہ وہ عادل ہے اور انسانی بہبود کو نظر انداز کردینا عدل کے خلاف ہے۔ پس نظام کے نزدیک نعیم الجنت میں سے ایک ذرّہ بھی کم نہیں ہوسکتا اور جہنمیوں کے عذاب میں ایک ذرّہ کا اضافہ بھی نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی مومن کو دوزخ میں نہیں ڈال سکتا۔ مثلاً ایک بچہ دوزخ کے کنارے کھڑا ہے وہ خود دوزخ میں کود سکتا ہے فرشتے اُسے دوزخ میں دھکا دے سکتے ہیں، لیکن خدا ایسا نہیں کرسکتا کیونکہ یہ اس کی صفتِ عدل کے خلاف ہے اس طرح نہ وہ بینا کو اندھا کرسکتا ہے اور نہ تندرست کو لولا۔ لِاَنَّہٗ لَیْسَ ھُوَ قَادِرٌ عَلَی الظُّلْمِ وَالکِذْبِ۔ اس کے برخلاف بصری معتزلہ کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ فَیَجِبُ اَنْ یَّکُوْنَ قَادِرًا عَلَی الظُّلْمِ وَالْکِذْبِ کَمَا ھُوَ قَادِرٌ عَلَی الْعَدْلِ وَالصِّدْقِ ...... اہلِ سنت والجماعت کے ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ اِنَّہٗ قَادِرٌ عَلَی الظُّلْمِ والْکِذْبِ وَلٰکِنَّہٗ لَا یَفْعَلُ اِیَّاھُمَا لِقُبْحِھِمَا۔[2] مانویّہ کا نظریہ بھی نظام کے نظریے سے ملتا جلتا ہے کیونکہ وہ بھی یہ مانتے ہیں کہ نور خیر کے سوا کچھ نہیں کرسکتا اور ظلمت صرف مصدرِ شر ہے اَیْ اِنَّ النُّوْرَ لَا یَفْعَلُ اِلَّا خَیْرًا وَ لَا یَقْدِرُ عَلَی الشَّرِّ وَ اِنَّ الظُّلْمَۃَ لَا تَسْتَطِیْعُ فِعْلَ الْخَیْرِ لِاَنَّھَا لَا تَقْدِرُ اِلَّا عَلَی الشَّرِّ۔[3]

نظام کا یہ نظریہ بھی تھا کہ ایک جنس بیک وقت دو متضاد کام نہیں کرسکتی مثلاً یہ ممکن نہیں کہ آگ گرم بھی کرے اور ٹھنڈا بھی یا برف ٹھنڈا بھی کرے اور گرم بھی۔ اسی نظریہ کے مطابق نظام کے نزدیک

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۹۲ [2] اسی نظریہ کے تحت برصغیر پاک و ہند کے دیوبندی علماء امکانِ کذب باری کے قائل ہیں یعنی چونکہ خدا قادرِ مطلق ہے اس لئے وہ جھوٹ بولنے پر بھی قادر ہے۔ اسی طرح امکانِ نظیر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسئلہ بھی ان کے ہاں موضوعِ بحث رہتا ہے۔ [3] الفرق بین الفرق صفحہ ۹۵

خدا معاًمصدرِ خیر وشر نہیں ہوسکتا جبکہ اہل السنّت وَالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ کو جزو ایمان مانتے ہیں۔

نظام ”طَفْرَة“ کے نظریہ کا بھی قائل تھا یعنی اُس کے نزدیک ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک جسم آناًفاناً ایک جگہ سے بیسویں جگہ تک درمیانی حصوں کو عبور کئے بغیر پہنچ جائے اور بغیر اس کے کہ وہ پہلے مکان سے مفقود ہو دوسرے مکان میں جا موجود ہو۔ ایسا ہوسکتا ہے۔ اسی طفرہ کے نظریہ کے مطابق بعض صوفیاء یہ جائز سمجھتے ہیں کہ ایک شخص دو مکانوں میں خواہ وہ کتنے ہی فاصلہ پر ہوں بیک وقت موجود نظر آسکتا ہے۔[1]

نظام کا یہ نظریہ بھی تھا کہ ساری کائنات جن وانس، چرند پرند بیک وقت پیدا ہوئے۔ پیدائش کے لحاظ سے ان میں کوئی تقدّم وتأخر نہیں البتہ ظهور فِي الْمَكَان اور شهود فِي الزَّمان کے لحاظ سے ان میں تقدّم و تأخر ہے۔

قَالَ اَهْلُ السُّنَّةِ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى خَلَقَ اللَّوْحَ وَالْقَلَمَ قَبْلَ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِنَّمَا اخْتَلَفَتِ الْمُسْلِمُوْنَ فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَيُّهُمَا خُلِقَتْ اَوَّلًا۔[2]

نظام یہ بھی کہا کرتا تھا کہ کلماتِ قرآن کریم کی ترتیب وتألیف یعنی نظم قرآن میں کوئی اعجاز نہیں اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ کوئی معجزہ ہے اسی طرح نظام دوسرے معجزات کا بھی منکر تھا۔[3]

نظام اس بات کا بھی قائل تھا کہ اجماعِ اُمّت حُجّتِ شَرْعِيَّه نہیں کیونکہ اُس کے نزدیک یہ بالکل ممکن ہے کہ سب کے سب غلطی کھا گئے ہوں۔[4]

نظام کا یہ نظریہ بھی تھا کہ انسان کے ساتھ بچھو، سانپ، مکھیاں، کیڑے مکوڑے غرض ہر قسم کے چرند و پرند جنت میں جائیں گے وہاں ان سب کا درجہ فضل و احترام کے لحاظ سے برابر ہوگا۔[5]

مندرجہ ذیل فقہی مسائل میں بھی نظام کو دوسرے فقہائے اُمّت سے اختلاف تھا۔

سَرِقَـه کا نصاب دوسو درہم ہے جبکہ دوسرے یہ بات نہیں مانتے۔ طلاقِ کنایہ لغو ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کی بھی یہی رائے ہے جبکہ دوسرے ایسی طلاق کو مؤثر مانتے ہیں۔

عمداً نماز چھوڑنے والا اقضاء کی رعایت کا مستحق نہیں۔ اس کا علاج صرف ندامت اور توبہ ہے۔

---

[1] الفرق بين الفرق صفحه ۱۰۱ [2] الفرق بين الفرق صفحه ۱۰۲

[3] الفرق بين الفرق صفحه ۱۰۳، ۱۰۸ [4] الفرق بين الفرق صفحه ۱۰۴

[5] الفرق بين الفرق صفحه ۱۰۵

نظام صحابہؓ کو بُرا بھلا کہنے سے بھی نہ ہچکچاتا تھا۔ مثلاً اُس کا کہنا تھا کہ (والعیاذ باللہ) اِنَّ اَبَا هُرَيْرَةَ كَانَ اَكْذَبَ النَّاسِ وَ اِنَّ عُمَرَ شَكَّ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَّةِ وَ اِنَّهٗ ضَرَبَ فَاطِمَةَ وَ مَنَعَ مِيْرَاثَ الْعِتْرَةِ وَابْتَدَعَ صَلٰوةَ التَّرَاوِيْحِ ۔[1]

اَلْمَعْمَرِيَّه اور اس کے نظریات

یہ فرقہ معمر بن عباد معتزلی کا پیرو تھا۔ اس کے بارہ میں صاحب طبقات المعتزلہ لکھتا ہے۔

كَانَ مَعْمَرٌ عَالِمًا عَدْلًا وَ اَنَّ الرَّشِيْدَ وَجَّهَ بِهٖ اِلٰى مَلِكِ السِّنْدِ لِيُنَاظِرَهٗ ۔[2]

معمر کا نظریہ تھا کہ اَعــراض کو اللہ تعالیٰ نے پیدا نہیں کیا بلکہ ان کا ظہور طبعی ہے یعنی یہ اجسام کی طبیعت کے تقاضے ہیں۔ گویا موت و حیات اور دوسرے اَعــراض جسم کے طبعی تقاضے اور کوائف ہیں اس لئے خدا نہ مُحْیِیْ ہے اور نہ مُمِیْت نیز معمر کے خیال میں اعراض لا متناہی ہیں۔[3]

معمر کے نزدیک انسان صرف رُوح کا نام ہے جسم انسانی رُوح سے زائد چیز ہے۔ جزا سزا بھی رُوح کو ملے گی اَیْ هُوَ فِي الْجَنَّةِ مُنَعَّمٌ وَ فِي النَّارِ مُعَذَّبٌ ۔ اُس کا یہ بھی نظریہ تھا کہ رُوح کے بارہ میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اَنَّهٗ طَوِيْلٌ عَرِيْضٌ عَمِيْقٌ ذُوْ وَزْنٍ سَاكِنٌ مُتَحَرِّكٌ وَ غَيْرُهَا مِنَ الْكَوَائِفِ الْجِسْمِيَّةِ ۔

فلاسفہ خدا کی بھی یہی تعریف کرتے ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى حَيٌّ ، قَادِرٌ ، عَالِمٌ ، حَكِيْمٌ ، مُنَزَّهٌ عَنْ اَنْ يَّكُوْنَ مُتَحَرِّكًا اَوْ سَاكِنًا اَوْ حَارًّا اَوْ بَارِدًا اَوْ رَطْبًا اَوْ يَابِسًا اَوْ ذَا لَوْنٍ اَوْ وَزْنٍ اَوْ طَعْمٍ اَوْ رَائِحَةٍ فَاَيُّ فَرْقٍ بَيْنَ الرُّوْحِ الْاِنْسَانِيِّ وَالْاِلٰهِ ۔[4]

اَلثُّمَامِيَّه اور اُس کے نظریات

یہ فرقہ ثُمَامَةُ بْنُ اَشْرَسَ النُّمَيْرِيُّ کا پیرو تھا۔ ثمامہ بنو نمیر کے موالی میں سے تھا۔ مامون الرشید، معتصم اور واثق کے عہد میں حکومت کا خاص مقرب اور درباری تھا۔ اور معتزلہ کا مانا ہوا بڑا اباا ثر لیڈر تھا۔ اسی نے مامون الرشید کو اکسایا کہ جو لوگ خلقِ قرآن کے عقیدہ کو نہیں مانتے اُن پر سختی کی جائے۔

---

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۰۷
[2] طبقات المعتزلة صفحہ ۵۴
[3] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۱۰
[4] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۳-۷

ثمامہ کے مندرجہ ذیل خصوصی نظریات تھے۔

جو لوگ جاہل دیوانے اور مجذوب ہیں اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کے اہل نہیں وہ دوسرے حیوانات کی طرح غیر مکلّف ہیں۔اس لئے ایسے جہلاء کا دوسرے حیوانوں کی طرح حشر بھی نہیں ہوگا بلکہ وہ فنا ہوکر نابود ہوجائیں گے۔ اَیْ یَصِیْرُوْنَ کُلُّھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ تُرَابًا ۔یہی حال نابالغی کی حالت میں مرنے والے بچوں کا ہوگا کیونکہ آخرت تو عمل کرنے والوں کے لئے جزا سزا کا گھر ہے اور جن کا کوئی عمل نہیں ان کا حشر لغو اور بے معنی ہوگا۔[1]

کہتے ہیں کہ ثمامہ، احمد بن داؤد اور محمد بن عبدالملک الزَّیَّات تینوں عہد عباسی کے سربرآوردہ معتزلہ تھے۔انہوں نے عباسی خلیفہ واثق کو اکسایا کہ وہ احمد بن نصر خزاعی کو قتل کردے کیونکہ وہ خلقِ قرآن کا نظریہ رکھنے والوں کو کافر کہتا ہے اور رویتِ باری کے نظریہ کا بھی قائل ہے۔واثق نے ان کی ترغیب پر احمد کو قتل کروادیا۔بعد میں وہ بہت پچھتایا کہ اس سے یہ کیا ظلم ہوگیا ہے کہ اس نے ایک ایسے بزرگ اور نیک انسان کو بلاوجہ مروادیا ہے اس وجہ سے وہ ان تینوں معتزلہ پر بھی ناراض ہوا لیکن انہوں نے اس کے سامنے قسمیں کھائیں اور اسے یقین دلایا کہ یہ قتل بالکل جائز تھا اور اگر وہ ایسی رائے دینے میں غلط کار ہیں تو انہیں اللہ تعالیٰ فلاں فلاں طریق پر ہلاک کردے۔ہر ایک نے جو طریق اپنی موت کے لئے تجویز کیا وہ اسی طرح پر ہلاک ہوا۔ثمامہ نے دعا کی تھی کہ اگر وہ اس گناہ میں ملوث ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر ایسے لوگوں کو مسلّط کردے جو تلوار سے اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیں۔چنانچہ اس کے بعد وہ ایک بار مکہ گیا وہاں بنوخزاعہ کے لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے ہمارے بزرگ احمد کو قتل کروایا تھا۔انہوں نے ثمامہ کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا اور اس کی نعش حرم سے باہر پھینک دی جہاں کتے اور گدھ اسے کھا گئے۔دوسرے دو کا بھی برا حشر ہوا۔فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِھَا وَکَانَ عَاقِبَۃُ اَمْرِھَا خُسْرًا ۔[2]

اَلْجَاحِظِیَّہ اور اُس کے نظریات

یہ فرقہ عمرو بن بحر اَلجاحظ کا پیرو تھا۔جاحظ بڑا فصیح البیان مقرر، ماہر ادیب اور قابل مصنف مانا جاتا ہے۔یہ عربی النسل اور بنو کنانہ میں سے تھا لیکن علاّمہ بغدادی کو اس سے اتفاق نہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ اگر جاحظ کا یہ دعویٰ صحیح ہے تو پھر اُس نے ایسی کتابیں کیوں لکھیں جن میں بنو قحطان کی تعریف کی گئی ہے

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۲۷ [2] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۲۸

اور بنو کنانہ اور بنو عدنان کی ہجو اور مذمت۔ اسی طرح اس نے ایک ایسی کتاب بھی لکھی جس میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ عجمی عربوں سے افضل ہیں مثلاً اس کی ایک کتاب کا نام ہے مَفَاخِر الْقَحْطَانِیَّة عَلَی الْکِنَانِیَّةِ وَ سَائِرِ الْعَدْنَانِیَّة اور اُس کی دوسری کتاب کا نام ہے فَضْلُ الْمَوَالِیْ عَلَی الْعَرَبْ۔ پس کیا کوئی شخص اپنے آباءواجداد کی مذمت کرسکتا ہے۔

جاحظ کی بعض دوسری کتابیں بھی اسی قسم کی لغویات سے پُر ہیں مثلاً حِیَلُ اللُّصُوْص، حِیَلُ الْمُکدِّیْن، غِشُّ الصَّنَاعَات، اَلْقِحَاب وَ الْکِلَاب وَ غَیْرُها مِنَ الْکُتُبِ۔[1]

جاحظ کا خاص نظریہ یہ تھا کہ انسان کے جملہ افعال اُس کے طبعی تقاضے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اگر یہ بات درست ہے تو پھر انسان کو سزا کیوں کر مل سکتی ہے؟ کیا کسی انسان کو اس بنا پر سزا دی جاسکتی ہے کہ وہ کالا کیوں ہے، وہ لمبا کیوں ہے، وہ موٹا کیوں ہے؟ لِاَنَّ الْاِنْسَانَ لَا یُثَابُ وَ لَا یُعَاقَبُ عَلٰی مَا لَا یَکُوْنُ کَسْبًا لَهٗ۔[2]

اَلْکَعْبِیَّہ اور اُس کے نظریات

یہ فرقہ ابوالقاسم عبداللہ اَلْکَعْبِیْ اَلْبَلْخِیْ کا پیرو تھا۔ کعبی کا یہ نظریہ تھا کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں کام کا ارادہ کیا، تو یہ ایسے ہی ہے جیسا قرآن کریم میں آیا ہے۔ جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ یعنی اس قسم کے استعمالات مجاز اور استعارات ہیں۔ نظام معتزلی کا بھی یہی نظریہ تھا جبکہ باقی سب معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ ایک حقیقت مؤثرہ ہے تاہم وہ حادث ہے۔ اہل السنّت کے نزدیک اِرَادَةُ اللّٰه ایک حقیقت بھی ہے اور ازلی ابدی بھی۔[3]

اَلْجَبَائِیَّہ اور اُس کے نظریات

یہ فرقہ ابوعلی الجبائی کا پیرو تھا۔ ابوعلی کا خاص نظریہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ''مطیع'' بھی ہے یعنی وہ اپنے بندوں کی اطاعت کرتا ہے، اُن کے کام کرتا ہے اور ان کی دُعائیں قبول کرتا ہے اور مطیع کے یہی معنے ہیں کہ مَنْ فَعَلَ مُرَادَ غَیْرِہٖ۔ اسی طرح وہ یہ بھی مانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت مُحْبِل ہے یعنی وہ عورتوں کو حاملہ کرتا ہے۔ علامہ بغدادی اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ تو

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۳۰ [2] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۳۰
[3] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۳۴

عیسائیوں کے عقائد سے بھی بدتر ہے وہ خدا کو مسیح کا باپ تو کہتے ہیں لیکن اسے مُخبِلِ مریم نہیں سمجھتے۔ الغرض جبائی اسماء الٰہی کے توقیفی ہونے کا قائل نہ تھا بلکہ وہ اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے نام گھڑنے اور رکھنے کو جائز سمجھتا تھا۔

اَلْبَهْشَمِیَّه اور اُس کے نظریات

یہ فرقہ ابو ہاشم الجبائی کا پیرو تھا جو ابوعلی الجبائی کا بیٹا تھا۔ علامہ بغدادی لکھتے ہیں کہ ہمارے زمانہ کے اکثر معتزلہ بَهْشَمِیْ ہیں کیونکہ آل بَـویہ کا وزیر ابن العباد اَلْـمُـلَـقَّبْ بِالصَّاحِب ابو ہاشم الجبائی کا عقیدت مند ہے اور بَهْشَــمِیْ عقائد سے دلچسپی رکھتا ہے اس لئے بمطابق اَلـنَّـاسُ عَـلٰـی دِیْـنِ مُلُوْکِهِمْ دوسرے سربرآوردہ لوگ بھی اپنے آپ کو ہشمی کہلانے میں فخر سمجھتے ہیں۔ ابو ہاشم کا عقیدہ تھا کہ جرم کے عملی ارتکاب کے بغیر بھی انسان مستوجب سزا ہوسکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نماز پڑھنے پر قادر تھا سارے وسائل مہیا تھے اور وہ نماز ادا کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اجل نے اُسے آلیا تو یہ شخص ترک نماز کی سزا پائے گا کیونکہ قدرت کے باوجود اس نے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ اَیْ لَمْ یَـفْـعَـلْ مَا اُمِرَبِـهٖ مَعَ قُدْرَتِهٖ عَلَیْهِ ......ابو ہاشم کا ایک نظریہ یہ تھا کہ اسباب وشروط بجائے خود عبادت نہیں مثلاً نماز کے لئے طہارت اور وضو شرط ہے لیکن یہ بجائے خود عبادت نہیں کیونکہ اگر کوئی دوسرا کسی کو نہلا دے یا وضو کرا دے تو طہارت حاصل ہوجائے گی۔ اگر یہ عبادت ہوتی تو پھر ایسا نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ عبادت میں نیابت درست نہیں۔ کام کوئی کرے اور سبکدوش دوسرا ہوجائے، نماز کوئی پڑھے اور ثواب دوسرے کو مل جائے اور اس کا فرض ادا ہوجائے یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟

ابو ہاشم کا یہ نظریہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ ساری کائنات کو بیک وقت اور بتمامه توفنا کرسکتا ہے لیکن جزواً ایسا نہیں کرسکتا مثلاً یہ نہیں ہوسکتا کہ زمین و آسمان تو موجود رہیں لیکن ان میں سے کوئی ذرّہ فنا ہوجائے اَیْ اَنَّـهٗ تَـعَـالٰی لَا یَقْدِرُ عَلٰی اَنْ یُّفْنِیَ مِنَ الْعَالَمِ ذَرَّةً مَعَ بَقَاءِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اَنَّهٗ یَقْدِرُ عَلٰی اِفْنَاءِ الْعَالَمِ جُمْلَةً۔[1]

معتزلہ کے اور بھی کئی ضمنی فرقے ہیں لیکن غیر اہم ہیں کوئی خاص امتیازی خصوصیت نظر نہیں آتی جو قابل بیان ہو۔[2]

[1] الفرق بین الفرق صفحہ ۱۳۸،۱۴۶،۱۴۷ [2] الفرق بین الفرق ۸۷ تا ۱۵۰

اَلْجَبْرِیَّه اور اس کے نظریات

جبریہ بھی اپنے طرز استدلال اور نہجِ فکر کے لحاظ سے معتزلہ میں ہی شمار ہوتے ہیں لیکن معتزلہ کا یہ حصہ قدر کی بجائے جبر کا قائل ہے یعنی اس فرقہ کا نظریہ یہ ہے کہ انسان اپنے اَفعال اور اَعمال میں خود مختار نہیں بلکہ وہ مجبورِ محض ہے ۔خدا جس طرح چاہتا ہے اُس سے کرواتا ہے فَالْاِنْسَانُ عِنْدَهُمْ لَيْسَ بِقَادِرٍ عَلٰى اَفْعَالِهٖ بَلْ فِيْ اِخْتِيَارِ اللّٰهِ يُقَلِّبُهٗ كَيْفَ يَشَآءُ۔

جَبْرِیَّہ کے مندرجہ ذیل ضمنی فرقے ہیں۔

اَلْجَهْمِيَّه، اَلنَّجَّارِيَّه، اَلْبِكْرِيَّه، اَلضَّرَارِيَّه۔

اَلْجَهْمِيَّه اور اُس کے نظریات

یہ فرقہ جَہم بن صفوان کا پیرو تھا۔جہم مشہور آزاد مفکر جعد بن درہم کا شاگرد تھا۔کہا جاتا ہے کہ جہم بڑا فتنہ پرداز، ذہنی انتشار پھیلانے میں ماہر اور رشاطرقسم کا عالم تھا۔یہ پہلا معتزلی ہے جس نے خلقِ قرآن کا عقیدہ ایجاد کیا۔جہم جبر کا بھی قائل تھا یعنی اُس کا یہ نظریہ تھا کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے يُقَلِّبُهٗ كَيْفَ يَشَآءُ۔

جہم کے نزدیک جنت و دوزخ فانی ہیں وہ کہا کرتا تھا اِنَّ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ تَبِيْدَانِ وَ تَفْنِيَانِ ۔وہ یہ بھی کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا علم حادِث ہے اس بارہ میں اس کا یہ نظریہ بھی تھا کہ جس وصف سے دوسرے متصف ہو سکتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا وصف نہیں ہو سکتا۔اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اَللّٰهُ حَيٌّ، عَلِيْمٌ، عَالِمٌ، سَمِيْعٌ، بَصِيْرٌ، مَوْجُوْدٌ، مُرِيْدٌ ۔البتہ یوں کہہ سکتے ہیں اَللّٰهُ قَادِرٌ، مُوْجِدٌ، خَالِقٌ، مُحْيِيْ وَ مُمِيْتٌ کیونکہ یہ اوصاف اللہ کے سوا کسی دوسرے میں نہیں پائے جاتے ۔جہم سیاست میں بھی سرگرم حصہ لیتا رہا۔بنو اُمیہ کے خلاف کئی جنگوں میں شامل ہوا اور آخر انہی جنگوں میں مارا گیا ۔جہم نے صغار تابعین کو دیکھا تھا اس لئے اس کا شمار تبع تابعین میں کیا گیا ہے۔علامہ بغدادی نے لکھا ہے کہ آج کل جہم کے پیرو نہاوند میں پائے جاتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر اسمٰعیل بن ابراہیم الدیلی کی تبلیغ سے اہل السنّت میں شامل ہوگئے ہیں۔[1]

---

[1] الفرق بین الفرق ایڈیشن چہارم ۲۰۰۳ء دار المعرفۃ بیروت صفحہ نمبر ۱۹۴، ۱۹۵

اَلنَّجَّارِیَّہ اور اُس کے نظریات

یہ فرقہ حسین بن محمد النجار کا پیرو تھا۔ نجار بہت بڑا قابل مناظر تھا۔ اُس نے نظام معتزلی کے ساتھ کئی کامیاب مناظرے کئے۔ بعض مسائل میں یہ اہل السنّت کے ساتھ متفق تھا اور بعض میں معتزلہ جبریہ کے ساتھ مثلاً اس کا عقیدہ تھا کہ افعال العباد کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور اکتساب بجائے خود ایک فعل ہے۔ کائنات میں وہی کچھ ہوتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ ارادہ کرے اور جو چاہے۔ وہ یہ بھی مانتا تھا کہ گنہگار کی مغفرت ہوسکتی ہے۔ یہی بات اہل السنّت بھی مانتے ہیں۔ معتزلہ کے نظریات میں سے مندرجہ ذیل نظریات کو نجار درست مانتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کوئی الگ چیز نہیں بلکہ عینِ ذات ہیں۔ ان آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی رُوٴیت ممکن نہیں۔ کلام اللہ ایک حادث وصف ہے۔

مندرجہ ذیل باتوں میں نجار کا الگ خاص مسلک تھا

اَلْاِیْمَانُ یَزِیْدُ وَلٰکِنْ لَا یَنْقُصُ جبکہ محدثین کہتے ہیں اَلْاِیْمَانُ یَزِیْدُ وَ یَنْقُصُ اور امام ابوحنیفہؒ اور آپ کے بعض پیروؤں کا نظریہ یہ ہے کہ اَلْاِیْمَانُ لَا یَزِیْدُ وَ لَا یَنْقُصُ۔ نجار کے نزدیک اَعراض کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو جسم کا حصہ اور اس کی جز ہیں مثلاً رنگ، بو اور مزہ (اَللَّوْن، اَلرَّائِحَة وَالطَّعم) یہ اللہ تعالیٰ کے مقدور نہیں بلکہ طبعی ہیں۔

دوسری قسم کے اَعراض وہ ہیں جو کبھی ہوتے اور کبھی نہیں ہوتے مثلاً علم، جہالت، حرکت، سکون، قیام، قعود۔ اس قسم کے اَعراض جسم کا حصہ اور اس کی جز نہیں اس لئے وہ مقدور ہیں۔ نجاریہ کے کئی ضمنی فرقے تھے مثلاً بَرْغُوْثِیَّہ، زَعْفَرَانِیَّہ وغیرہ۔

اَلْبَرْغُوْثِیَّہ اور اُس کے نظریات

البرغوثیہ کے نزدیک طبعی افعال بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اُس کے اختیار سے ہیں۔ اہلِ سنت کا بھی یہی عقیدہ ہے جبکہ معتزلہ کہتے ہیں کہ طبعی افعال کا تعلق صرف جسم کی طبیعت سے ہے مثلاً اگر کوئی چیز اوپر سے نیچے کی طرف گرتی ہے تو معتزلہ کے نزدیک یہ جسم کا طبعی تقاضا ہے لیکن برغوثیہ اور اہل سنت کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے نیچے کی طرف گرایا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو مارتا ہے

اور اُسے درد ہوتا ہے یا اس کا کوئی عضو کٹ جاتا ہے تو دراصل مار، درد اور کٹنا یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے گویا اللہ تعالیٰ نے اسے مار دیا، درد پیدا کی یا عضو کاٹ دیا۔[1]

اَلْبِکْرِیَّہ اور اُس کے نظریات

یہ فرقہ بکر بن اُخت عبدالواحد بن زیاد کا پیرو تھا۔ بکر کے بارہ میں محدّث ابن حبانؒ کا قول ہے کہ یہ شخص دجّال اور حدیثیں گھڑنے میں ماہر تھا۔ کَانَ دَجَّالًا یَضَعُ الْاَحَادِیْثَ ۔[2]

اس کا نظریہ تھا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنی ایک صورت اختیار کرے گا اور اسی صورت میں وہ بندوں کو نظر آئے گا اور اُن سے ہمکلام ہوگا۔

بکر کے نزدیک گناہ کبیرہ کے مرتکب کو مُسلم، مومن، منافق، مکذّب سب کچھ کہا جاسکتا ہے اور وہ دائمی جہنمی ہے۔ اس کے خیال میں پیاز اور لہسن حرام ہے اور ریپیٹ میں گُوگُو یعنی قَرْقَرَۃُ الْبَطْن سے وضوٹوٹ جاتا ہے۔ اَفْعَالِ مُتَوَلِّدَۃ یعنی طبعی افعال کے بارہ میں یہ اہل سنت سے متفق تھا اور کہا کرتا تھا اَللّٰہُ مُخْتَرِعُ الْاَلَمِ عِنْدَ الضَّرْبِ ۔[3]

اَلضَّرَارِیَّہ اور اُس کے نظریات

یہ فرقہ ضرار بن عمرو کا پیرو تھا۔ ضرار کا نظریہ یہ تھا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایک ''چھٹی حس'' بخشے گا جس کی وجہ سے وہ اُسے دیکھ سکیں گے۔ ضرار ''اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ'' کی روایت کو درست نہیں مانتا تھا اس لئے وہ امامت اور خلافت کے لئے قریش کی تخصیص کا قائل نہیں تھا۔[4]

اَلْمُرْجِئَہ اور اُس کے نظریات

مُرْجِئَہ مسلمانوں کا وہ فرقہ ہے جو اعمال کو جزو ایمان نہیں مانتا بلکہ زائد از ایمان تسلیم کرتا ہے۔ یہ لفظ اِرْجَاءٌ سے مشتق ہے جس کے معنے پیچھے رکھنے اور دوسرا درجہ دینے کے ہیں۔ چونکہ یہ فرقہ اعمال کو ایمان سے پیچھے رکھتا ہے اور ایمان کے مقابلہ میں اسے دوسرا درجہ دیتا ہے یا یہ تسلیم کرتا ہے کہ اعمال

---

[1] الفرق بین الفرق ۱۵٦

[2] میزان الاعتدال صفحہ ۳۴۵ ۔ الفرق بین الفرق صفحہ ۱۵۹

[3] الفرق بین الفرق صفحہ ۱٦۰

[4] خوارج کا نظریہ بھی یہی تھا۔ الفرق بین الفرق صفحہ ۱٦۱، اعتقادات فرق المسلمین و المشرکین صفحہ ٦۹

میں کوتاہی کرنے والے کا معاملہ آخرت میں طے ہوگا یعنی اس کوتاہی کے مرتکب کو اللہ تعالیٰ سزا دیتا ہے یا معاف کرتا ہے اس کا فیصلہ وہاں ہوگا۔

اس قسم کے نظریات کی وجہ سے ایسے لوگوں کو مرجئہ کا نام دیا گیا۔ اَیْ اَنَّھُمْ اَخَّرُوْا الْعَمَلَ عَنِ الْاِیْمَانِ وَالْاِرْجَاءِ بِمَعْنَی التَّاخِیْرِ۔

مرجئہ کی تین قسمیں ہیں

ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ ایمان تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان کا نام ہے۔ رہے اعمال تو ایمان سے ان کا کوئی خاص تعلق نہیں۔ عمل کرے یا نہ کرے ایمان پر اس کا کوئی اثر مرتب نہ ہوگا نیز انسان اعمال میں مختار اور آزاد ہے جیسے معتزلہ قدریہ مانتے ہیں۔

دوسرے گروہ کا نظریہ ایمان کی تعریف کے بارہ میں وہی ہے جو پہلے گروہ کا ہے لیکن وہ اعمال اور افعال میں انسان کو مختار اور آزاد نہیں مانتا بلکہ مجبور سمجھتا ہے جیسا جبریہ کا نظریہ ہے۔

تیسرا گروہ وہ ہے جو قدر اور جبر کا قائل نہیں نہ وہ قدریہ سے متفق ہے اور نہ جبریہ سے تاہم یہ اعمال کی وہ اہمیت تسلیم نہیں کرتا جو ایمان کی ہے۔ ایمان نہ ہو تو نجات ممکن نہیں، لیکن اگر عمل نہ ہو یا عمل میں کوتاہی ہو تو نجات ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو ایسے شخص کو معاف کر دے اور اُسے جنت میں لے جائے نیز اس گروہ کا یہ نظریہ بھی ہے کہ ایمان گھٹتا بڑھتا نہیں اور نہ اس میں فرق مراتب ہے اَیْ اِنَّ الْاِیْمَانَ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ وَلَا یَتَفَاضَلُ النَّاسُ فِیْہِ۔ اسی نظریہ کو اپنانے کی وجہ سے بعض نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کو بھی مرجئہ کہا ہے جبکہ عام محدثین کا نظریہ یہ ہے کہ اعمال ایمان کا حصہ اور جزو ہیں اور اَلْاِیْمَانُ یَزِیْدُ وَیَنْقُصُ وَیَتَفَاضَلُ النَّاسُ فِیْہِ۔[1]

اَلْکَرَامِیَّہ اور اُس کے نظریات

یہ فرقہ ابوعبداللہ محمد بن کرام سجستانی (المتوفی ۲۵۵ھ) کا پیرو تھا۔ اس فرقہ کے کئی ذیلی گروہ ہیں مثلاً حَقَائِقِیَّہ، طَرَائِقِیَّہ، اِسْحَاقِیَّہ۔ یہ سب ضمنی گروہ بعض اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کو

[1] تفصیل کے لئے دیکھیں الفرق بین الفرق صفحہ ۱۵۱ تا ۱۵۵ نیز اعتقادات فرق المسلمین والمشرکین صفحہ ۷۰،۷۱)

کافر نہیں کہتے۔ اس لئے یہ اس لحاظ سے ایک ہی فرقہ کی ذیلی شاخیں ہیں اور ان کا بطور فرقہ الگ الگ ذکر چنداں ضروری نہیں۔

ابن کرام کے بعض نظریات اہل سنت کے نظریات سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ اس وجہ سے اسے سجستان سے نکلنا پڑا اور وہ غرجستان جا کر پناہ گزیں ہو گیا۔ کئی عجمی قائد اور اہل اُفشِیْن، غُور مین اور اَوغاد اس کے معتقد تھے جن کے سہارے یہ اپنے عقائد کے فروغ میں کوشاں رہتا تھا۔ مشہور فاتحِ ہند سلطان محمود غزنوی بھی کرامیہ فرقہ سے عقیدت رکھتا تھا۔[1]

ابن کرام کے مخصوص نظریات مندرجہ ذیل تھے

۱۔ خدا کا جسم ہے۔ لَا کَالْاَجْسَامِ وَ بِلَا کَیْفٍ[2] اس کا جو حصہ عرش سے متصل اور ملاقی اور محدود ہے اَیْ عَرْضُهٗ کَعَرْضِ الْعَرْشِ البتہ باقی اطراف سے خدا لامحدود ہے۔

۲۔ خدا جوہر ہے جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے۔ اہل السنّت خدا کو جوھر سے بالا سمجھتے ہیں۔

۳۔ کرامیہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ خدا محل حوادث ہے یعنی اُس میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ هُوَ الْاٰنَ کَمَا کَانَ ہے بَلْ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَانٍ۔ وہ کہتے ہیں کہ ازل میں خدا حوادث اور تغیرات سے خالی تھا لیکن جب اُس نے تخلیق کا ارادہ کیا تو اُس وقت سے وہ غیر محدود حوادث اور تغیرات کا مورد اور محل بن گیا اور آئندہ وہ کبھی تغیرات، حوادث اور اعراض سے خالی نہیں ہوگا۔ دہریہ اور فلاسفہ کا ہیولی کے بارہ میں بھی یہی نظریہ ہے۔

اَیْ اَنَّهَا کَانَتْ فِی الْاَزَلِ خَالِیَةٌ عَنِ الْاَعْرَاضِ وَالصُّوَرِ ثُمَّ حَدَثَتِ الْاَعْرَاضُ وَالصُّوَرُ فِیْهَا وَهِیَ لَا تَخْلُوْ مِنْهَا اَبَدًا. هُوَ یَتَحَوَّلُ وَیَنْتَقِلُ وَیَنْزِلُ۔

۴۔ ابن کرام کا یہ کہنا بھی تھا کہ ''اعراضِ حادثہ'' کو نہ ہم مخلوق کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے قرآن جو کلام اللہ ہے نہ مخلوق ہے اور نہ محدث۔

---

1. قد اثنی علیه ابن خزیمة وابو سعید عبدالرحمن بن الحسین الحاکم وهما اماما الشافعیة والحنفیة۔ (تاریخ الفرق الاسلامیة صفحه ۲۰۹ بحواله طبقات الشافعیة صفحه ۳۱)

2. له تعالی جسم لا کالاجسام و یَدٌ لا کالایدی و وجه لا کالوجوه (تاریخ الفرق الاسلامیة صفحه ۲۱۱ بحواله الملل والنحل جلد اوّل صفحه ۱۶۲)

۵۔ ابن کرام افلاک اور کواکب کو غیر فانی مانتا تھا اَیْ یَقُوْلُ بِقَوْلِ الْفَلَاسَفِةِ اَنَّ الْاَ فْلَاکَ وَالْکَوَاکِبَ لَهَا طَبِیْعَةٌ خَامِسَةٌ لَا تَقْبَلُ الْفَسَادَ وَ الْفَنَاءَ۔ کرامیہ کا یہ نظریہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے خالق اور رازق ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ پیدا کر سکتا ہے اور رزق دے سکتا ہے۔ اَیْ اَنَّهُ تَعَالٰی لَمْ یَزَلْ خَالِقًا رَازِقًا وَ مَعْنَاهُمَا اَنَّهُ قَادِرٌ عَلَی الْخَلْقِ وَ الرِّزْقِ وَ هٰکَذَا سَائِرُ صِفَاتِهٖ تَعَالٰی قَبْلَ ظُهُوْرِهَا۔

٦۔ ابن کرام کا یہ نظریہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس جسم کو پیدا کیا اُس میں زندگی تھی۔ جمادات کی پیدائش اس کے بعد ہوئی ہے اور یہ اس کی حکمت کا تقاضا تھا۔ اہل السنّت کا نظریہ یہ ہے کہ سب سے پہلے لوح و قلم پیدا ہوئے۔ ابن کرام کا کہنا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایسے بچے کو نابالغی میں نہیں مار سکتا جس کے بارہ میں اُسے علم ہے کہ یہ بڑا ہو کر نیک اور صالح ہو گا کیونکہ ایسے بچے کو مار دینا اس کے حکیم ہونے کی صفت کے خلاف ہے۔

ابن کرام کا یہ نظریہ بھی تھا کہ نبوت اور رسالت دوسرے مَلَکَات کی طرح ایک ملکہ ہے[1] اور جس میں یہ ملکہ ہو اُسے نبی اور رسول بنانا اللہ تعالیٰ پر واجب اور فرض ہے۔ اُس کے نزدیک رسول وہ ہے جس میں یہ ملکہ ہو اور مرسَل وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس ملکہ کی وجہ سے رسول بنا کر بھیجے۔ مُرسَل وفات کے بعد صرف رسول رہ جاتا ہے اور اس کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے اس لئے اُس کی قبر کی زیارت کے لئے جانا اور اسے ثواب سمجھنا بے معنی بات ہے۔

ابن کرام کی رائے تھی کہ نبی اور رسول ایسی غلطیوں سے مُبرّا اور معصوم ہوتے ہیں جن کی سزا ''حد'' ہے یا جس کے ارتکاب سے انسان درجۂ عدالت اور قبول شہادت سے گر جاتا ہے۔ دوسری قسم کی غلطیاں نبی سے سرزد ہو سکتی ہیں۔ اسی قسم کی غلطی (وَالْعِیَاذُ بِاللّٰهِ) آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے اس وقت ہوئی جبکہ آپ سورۃ النجم کی تلاوت کر رہے تھے اور آپ نے وَ مَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی کی تلاوت کی تو معاً بعد ہی آپ تِلْکَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَ اِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰی کے الفاظ بھی کہہ گئے۔ کرامیہ کا یہ نظریہ اہل السنّت کے نظریہ کے خلاف ہے کیونکہ اہل السنّت کے نزدیک انبیاء ہر لحاظ سے معصوم ہوتے ہیں۔

---

[1] اَیْ لَا یَتَعَلَّقُ بِالْکَسْبِ وَ مَا لَا یَکُوْنُ بِکَسْبِهٖ لَا یَکُوْنُ لَهٗ عَلَیْهِ اَجْرٌ (نفس المصدر صفحہ ۲۱۳)

کرامیہ کا یہ نظریہ بھی ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے حکیم ہونے کے خلاف ہے کہ وہ آغاز کائنات اور تخلیق انسان کے بعد ہی نبی بھیج کر اُسے کامل اور مکمل دائمی شریعت دے دیتا جبکہ اہل السنّت کے نزدیک ایسا کرنا جائز اور ممکن تھا۔

ابن کرام کے نزدیک بیک وقت دو خلیفے اور امام ہوسکتے ہیں جواپنے اپنے حلقہ میں واجبُ الاطاعت ہوں جیسے حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ اپنے اپنے حلقہ کے سربراہ تھے اگرچہ علیؓ امام برحق بمطابق سنت تھے اور معاویہؓ مُتَغَلِّب اور غیر عَلَی السُّنَّۃ لیکن اپنے اپنے دائرۂ اقتدار میں دونوں واجب الاطاعت تھے گویا ابن کرام کے نزدیک امام عادل ہو یا باغی اور طاغی اُس کی اطاعت اور اس کے احکام کو تسلیم کرنا امن اور مصلحت عامہ کی بنا پر ضروری ہے۔[1]

کرامیہ کے نزدیک ازلی اقرار جس کی طرف اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی میں اشارہ کیا گیا ہے۔ دُنیا میں اس ازلی اقرار کا کم ازکم ایک بار اعادہ ضروری ہے۔

کرامیہ کے نزدیک تجہیز و تکفین فرض کفایہ ہے جبکہ نماز جنازہ اور غسل سنت کفایہ۔[2]

---

[1] قيل ان السلطان محمود بن سبكتگين اضطهد الاشاعرة و حمل الناس على اعتناق مذهب الكرامية و قرّب علماء هم و انكثل بالاحناف و قد تاثر بمذهب الكرامية من الصوفياء المشهورة الهروى الانصارى و من السلفية اكبر مفكرى الاسلام تقى الدين ابن تيمية ۔(تاريخ الفرق الاسلامية صفحه ۲۱۵ و ۲۱۵)

[2] الفرق بين الفرق صفحه ۱۶۴ تا ۱۶۹ ۔ تاريخ الفرق الاسلامية صفحه ۲۰۸، ۲۱۶

اٹھارھویں صدی عیسوی اوراس کے بعد اصلاح اُمّت کی چند متفرق کوششیں

اٹھارھویں صدی جو مسلمانوں کے دینی زوال، سیاسی، علمی اور اقتصادی تنزّل کی صدی ہے اس میں چند دردمند مصلحین نے اسلامی دنیا کے اس عالمگیر زوال پر بند لگانے کی کوشش کی ان میں سے محمد بن عبدالوہاب نجدی، شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی، سید احمد بریلوی اور مہدی سوڈانی کی تحریکات کے اثرات خاصے وسیع تھے لیکن یہ اثرات کسی عالمگیر حرکی انقلاب کا باعث نہ بن سکے۔

تحریک وَلِیُ اللّٰہِی

اٹھارھویں صدی میں جبکہ مسلم دنیا ایک عالمگیر زوال کی زد میں تھی برصغیر ہندوپاک میں ایک علمی اور اصلاحی تحریک کا آغاز ہوا اس تحریک کے بانی حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی تھے۔ آپ ۱۷۰۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام شاہ عبدالرحیم تھا جو دلی کے ممتاز علماء میں سے تھے اور فقہ کی مشہور کتاب فتاوٰی عالمگیریہ کے مرتبین میں شامل تھے جو نامور مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے تیار ہوئی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد اورنگ زیب کا انتقال ہوگیا اور اس کے بعد عظیم مغل سلطنت میں زوال کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے ابتدائی علوم اپنے والد ماجد اور دہلی کے دوسرے نامور اساتذہ سے پڑھے کچھ عرصہ اپنے والد صاحب کے قائم کردہ مدرسہ رَحِیْمِیَّہ میں درس وتدریس کا فریضہ سرانجام دیا۔ جب آپ کی عمر تیس سال کے قریب ہوئی تو آپ فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے مکہ مکرّمہ تشریف لے گئے وہاں آپ نے حرمین شریفین کے مشہور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور حدیث میں خاص مہارت پیدا کی۔ وہاں کے اساتذہ میں سے آپ سب سے زیادہ شیخ ابو طاہر مدنی سے متأثر ہوئے۔ دو سال کے بعد آپ واپس آئے اور پھر سے مدرسہ رَحِیْمِیَّہ میں پڑھانا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ تالیف وتصنیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ آپ کی مشہور کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ''اَلْفَوْزُالکبیر'' جس میں تفسیر القرآن کے اصول وضوابط پر بحث ہے۔ مصفّٰی اور'' تَنْوِیْرُ الْحَوَالِکْ'' کے نام سے مؤطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ ایک عربی میں اور دوسری فارسی زبان میں۔

"تَفْهِیْمَاتِ اِلٰهِیَه" اس میں تقرب الٰہی اور تصوف کے اسلوب واصول اور منازل سلوک کی وضاحت ہے۔

آپ کی سب سے مشہور اور جامع کتاب "حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه" ہے جس میں مقاصدِ شریعت، فلسفۂ عبادت اور اصولِ دین کی حکیمانہ تشریح وتفصیل ہے۔ یہ بڑے پائے کی علمی کتاب ہے جس سے حضرت شاہ صاحب کے کمال علمی اور فہمِ دین میں مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ آپ نے اپنی اس کتاب میں بیان کردہ دینی حکمتوں کے حوالہ سے اپنی اصلاحی تحریک کی بنیاد رکھی اور مسلم معاشرہ کی دینی اور اخلاقی بیماریوں کے لئے علاج ڈھونڈنے کی کوشش کی اور اس بات پر زور دیا کہ دین کے فروغ کے لئے ایک مثالی معاشرہ کے قیام کی ضرورت ہے۔ آپ نے ان مقاصد کے حصول کے لئے درس وتدریس اور تالیف وتصنیف کے ذرائع کو اختیار کیا۔

آپ کا دوسرا بڑا کارنامہ دوسری زبانوں میں قرآن کریم کے تراجم کا آغاز ہے۔ نامعلوم مُدّت سے مسلم معاشرہ اس بات کا قائل چلا آرہا تھا کہ کسی دوسری زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کرنا جائز نہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام معاشرہ قرآن کریم سے دُور چلا گیا اور قرآنی علوم سے واقفیت صرف گنتی کے چند علماء تک محدود ہو کر رہ گئی اور اس کا تعلق بھی زیادہ تر فقہی مسائل سے تھا۔ قرآن کریم کے باقی معارف سربستہ راز تھے اور عوام صرف تلاوت کی حد تک قرآنی برکات سے واقف تھے۔ جب حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی نے قرآن کریم کے فارسی ترجمہ کا آغاز کیا تو علماء زمانہ کی طرف سے آپ کی سخت مخالفت ہوئی۔ عوام کو اشتعال دلایا گیا اور آپ کے مدرسہ پر پتھراؤ کرایا گیا لیکن جس راہ کو آپ حق سمجھتے تھے اُس پر آپ برابر گامزن رہے اور پھر آہستہ آہستہ علماء اور عوام کی مخالفت کم ہوتی چلی گئی۔ آپ کے لائق بیٹوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے اُردو زبان میں قرآن کریم کے تراجم کئے۔ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کو تو اس زمانہ کے اردو ادب کا ایک شاہکار قرار دیا گیا ہے۔

آپ کا تیسرا بڑا کارنامہ ہندی مسلمانوں کو احادیثِ رسولؐ کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ اس سے پہلے علماء اور عوام زیادہ تر فقہی مسائل میں منہمک رہتے تھے اور اس سے آگے قرآن وحدیث کی طرف ان کی نظر نہ جاتی تھی۔ برصغیر میں علومِ حدیث کے فروغ کا سہرا حضرت شاہ ولی اللہ کے سر بندھتا ہے اور تاریخ کا یہ ایک اہم واقعہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کو اللہ تعالیٰ نے علمی فضیلت کے علاوہ نیک اور قابل اولاد سے بھی نوازا تھا۔ آپ کے بیٹے حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت شاہ عبدالقادر، حضرت شاہ رفیع الدین اپنے زمانہ کے چوٹی کے عالم اور دینی رہنما تھے۔ سارے برصغیر میں ان کی قیادت دینی کو تسلیم کیا گیا۔ خصوصاً حضرت شاہ عبدالعزیز کی علمی خدمات نے بڑا مؤثر کردار ادا کیا اور آپ کی قیادت میں علمِ حدیث کے فروغ نے اِرتقاء کے مراحل طے کئے۔ اس مبارک خاندان کے پروردہ علماء مثلاً حضرت شاہ اسحاق اور مولانا مملوک علی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا محمد قاسم نانوتوی بانیٔ دارالعلوم دیوبند اور انیسویں صدی کے دوسرے بزرگان دین کے ذریعہ ہی علوم دینیہ کو عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ سب خاندان ولی اللٰہی کے فیض یافتہ تھے۔ برصغیر کے قریباً تمام سُنّی مسالک کیا بریلوی اور کیا دیوبندی، کیا سَلَفِی اور کیا وہابی، سب حضرت شاہ ولی اللہ اور آپ کے خانوادہ سے مذہبی اور دینی عقیدت رکھتے ہیں اور اسی چشمۂ علمی کے فیض یافتہ ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کی اصلاحی تحریک کو حضرت شاہ اسماعیل شہید جو حضرت شاہ صاحب کے پوتے تھے اور حضرت سید احمد بریلوی شہید نے ایک نیا رنگ دیا۔ ان دونوں بزرگوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے پنجاب کے مسلمانوں کو سکھوں کے تسلّط سے آزاد کرانے کی تحریک چلائی اور مختلف علاقوں میں اپنے داعی بھیجے۔ رضا کاروں کو جمع کیا۔ مالی امداد کا انتظام کیا اور ایک لمبا فاصلہ طے کر کے سندھ اور افغانستان کے راستے صوبہ سرحد پہنچے اور سکھوں سے جنگ کا آغاز کیا لیکن بوجوہ ناکامی ہوئی اور دونوں بزرگ اور اُن کے بہت سے ساتھی بالاکوٹ ضلع ہزارہ کے مقام پر شہید ہو گئے۔

اس ناکامی کی بڑی وجہ مقامی لوگوں کا عدم تعاون اور سپلائی کے مراکز کی ابتری اور دوری تھی۔ بعض فقہی مسائل کا عملی اختلاف بھی خلفشار کا باعث بنا کیونکہ یہ دونوں بزرگ اور ان کے اکثر ساتھی سلفی یعنی اہل حدیث تھے اور مقامی پبلک حنفی المسلک تھی۔ دوسری وجوہات کے علاوہ اس وجہ سے بھی مجاہدین مقامی لوگوں کا دلی تعاون حاصل نہ کر سکے اور سکھ حکومت کے ایجنٹوں کی سازش کامیاب رہی۔

چونکہ مسلم معاشرہ کا تنزل عالمگیر تھا۔ دوسرے مقامی اصلاحی کوششیں بھی ہمہ پہلو نہ تھیں۔ تیسرے بعد کی قیادت بڑی حد تک صالح سیاست سے بالکل عاری ہو گئی تھی اور صرف تشدّد بلا استعداد و

تیاری کو ذریعہ کامیابی سمجھ لیا گیا تھا۔ ان وجوہات کے باعث یہ اصلاحی تحریک مؤثر نتائج حاصل نہ کر سکی اور بے اثر ہو کر رہ گئی۔

یہ لوگ بڑے مخلص تھے اور جذبۂ ایثار بھی رکھتے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ مسلم معاشرہ کا زوال رُک جائے اور اسلام کو فروغ ملے اور اس کے لئے قربانیاں بھی پیش کی گئیں لیکن کامیابی نہ ہوئی اور نہ ہی مسلم معاشرہ کا زوال رُک سکا۔ یہ صورتِ حال دراصل اس طرف اشارہ تھا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کو روکنے اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے ایک بالکل نئے انداز کی عالمگیر اصلاحی تحریک کا آغاز ہو کیونکہ اتنے نیک اور مخلص عناصر جب جہاد بالسیف کی مساعی میں ناکام رہے تو اس کے صاف معنے یہ تھے کہ دین کے فروغ کے لئے اب یہ ذریعہ نہ اللہ تعالیٰ کو منظور ہے اور نہ اُس کے ہاں مقبول اور نہ اس کے لئے وسائل مسلمانوں کو اُس کے حضور سے مہیا ہوں گے اور اس راہ میں جو بھی کوششیں ہوں گی وہ سب کی سب ناکامی کا منہ دیکھیں گی کیونکہ اب خدا یہ نہیں چاہتا بلکہ اُس کا منشا یہ ہے کہ مسلمانوں کو پھر سے مسلمان بنایا جائے اور اُس دور کا آغاز ہو جو قدیم سے مقدر تھا یعنی

چوں دور خسروی آغاز کردند   مسلماں را مسلماں باز کردند

اُنیسویں صدی میں بہائی تحریک کا آغاز ہوا لیکن اسلام کی کسی خدمت کی بجائے وہ اسلام کے منسوخ ہو جانے کا دعویٰ لے کر اُٹھی اور اپنے مسلک اور نام ہر دو لحاظ سے اسلام اور مسلمانوں سے دور چلی گئی۔

انیسویں صدی میں ہی برصغیر پاک وہند میں آزاد خیالی اور مختلف مذاہب کے درمیان بحث و مباحثہ کے دَور کا آغاز ہوا۔ اس وقت انگریز سارے ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے اور مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت بکلی نکل چکی تھی اور عیسائیت کی تبلیغ کا زور تھا۔ دوسری طرف مغربی فلسفہ دہریت کے فروغ کا باعث بن رہا تھا۔ اس صورت حال سے ہندوؤں نے بھی فائدہ اُٹھایا۔ برہمو سماج اور آریہ سماج کی تحریکات کو فروغ ملا۔ یہ وقت مسلمانوں کے لئے بے حد نازک تھا۔ نئی حکومت مسلمانوں سے بدگمان تھی۔ ہندو بھی پُرانے بدلے چکانے کے لئے پَر تول رہے تھے۔

سر سیّد احمد خاں صاحب کی نیچرل تحریک

مسلم رہنماؤں میں سے سر سیّد احمد خاں (ولادت ۱۸۱۷ء) نے اس نازک دَور میں اپنے دائرۂ کار اور رجحان طبع کے لحاظ سے اصلاحِ احوال کی قابلِ قدر کوشش کی۔ اُن کی اس تحریک کا یہ اثر خاصہ نمایاں رہا کہ اس علاقہ کے مسلمانوں کا ایک مؤثر طبقہ نئے علوم اور مغربی انداز بود و باش، اُصولِ حکمرانی اور نئے سیاسی انداز سے روشناس ہوا۔ تاہم یہ تحریک نہ تو عالمگیر تھی اور نہ ہمہ پہلو۔ اس تحریک کا مذہبی پہلو تو خاصہ کمزور اور مرعوبیت زدہ تھا۔ اس وجہ سے بحیثیت مجموعی اس تحریک سے ملّتِ اسلامیہ کے مصائب میں کوئی خاص کمی نہ آسکی۔ اس سلسلہ میں قدامت پسند علماء کی شدید مزاحمت کا بھی انہیں سامنا کرنا پڑا۔ ان کی مخالفت کا یہ انداز خاصا زور دار تھا کہ سر سیّد احمد خاں دینی علوم کے ماہر نہیں اس لئے جو کچھ دین کے بارہ میں انہوں نے لکھا ہے اس کی عقلی اور نقلی بنیادیں بے حد کمزور ہیں اور اُس سے ذہنی انتشار اور فکری تذبذب کے سوا کوئی اور مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ بہر حال سر سیّد مرحوم نے دینی مسائل کے بارہ میں جو کچھ لکھا اور جسے مولانا حالی نے مرتب کیا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

سر سیّد احمد خاں صاحب کے دینی نظریات

اجماع اور قیاس حجت شرعیہ نہیں ہیں اور نہ یہ تشریع کے مسلّمہ مأخذ ہیں۔ صحاح ستّہ کی احادیث تنقید سے بالا نہیں اور نہ ان سے کسی دینی مسئلہ کا استنباط واجب التسلیم ہے۔ اس طرح اگر کسی حدیث سے اسلام پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے تو اسلام اُس کا جواب دِہ نہیں ہے۔

بائبل میں تحریف لفظی کا دعویٰ درست نہیں۔ ہاں تحریف معنوی ممکن ہے۔ جو مسائل قرآن و سنت میں بالتصریح مذکور نہیں ان میں ہر سمجھدار اجتہاد کر سکتا ہے۔ وضع و لباس میں تشابہ بالغیر قابلِ اعتراض نہیں۔ جبر و قدر اور تقدیر خیر و شر کا عقیدہ جزو ایمان نہیں۔ قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی معجزہ کا ذکر نہیں۔ اسی طرح انبیاء کے جن معجزوں کا ذکر ہے وہ بھی دراصل استعارے ہیں۔ قرآن کریم کا اعجاز معنوی ہے لفظی نہیں۔ کوئی بات خارق عادت یا خلاف فطرت وقوع پذیر نہیں ہو سکتی اس لئے معجزہ کا تصور غلط ہے اور معجزہ کو دلیل نبوت قرار دینا بھی بے اصل ہے۔ ملائکہ مختلف فطرتی قوتوں کے نام ہیں۔ شیطان اور ابلیس سے مراد نفسِ امارہ ہے۔ آدم اور ابلیس کا قصہ تمثیل ہے۔ اس کی کوئی واقعی تاریخی

حیثیت نہیں۔قرآن کریم میں مذکور جنوں سے مراد گرانڈیل پہاڑی وحشی اقوام ہیں۔وحی، نبی کے قلبی واردات کا نام ہے باہر سے کوئی چیز نازل نہیں ہوتی۔

صفاتِ باری، صور کا پھونکا جانا، حشر ونشر، حساب و کتاب، میزان وصراط، جنت و دوزخ سب استعارے اور تمثیل ہیں۔رؤیت باری نہ اس دُنیا میں ممکن ہے اور نہ آخرت میں۔معراج اور شقِ صدر کے واقعات دراصل خواب تھے بیداری کی حالت کا کوئی واقعہ نہ تھا۔مختلف جنگوں میں فرشتوں کے نزول کا جو ذکر قرآن کریم میں ہے یہ دراصل غیر معمولی نُصرتِ الٰہی کے نزول سے استعارہ ہے۔شہداء کی زندگی سے مراد دُنیا میں نیک اور قابل تقلید مثال چھوڑ جانا ہے۔حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے کا عقیدہ درست نہیں۔حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ کی عمر یاس کی حد سے متجاوز نہ تھی۔ اُن کی عمر ایسی ہی تھی جس میں عورتیں بالعموم بچہ جننے کے قابل ہوتی ہیں۔دُعا صرف عبادت ہے۔حصولِ مقاصد کے لئے اس کی تاثیر غیر مسلّم ہے۔اصل چیز صرف صحیح تدبیر ہے۔چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹ دینا ضروری نہیں۔انسان جس کے حق میں چاہے جتنی چاہے وصیّت کرسکتا ہے نہ وارث کے حق میں وصیّت منع ہے اور نہ ساری جائیداد کی منع ہے۔روزہ کی بجائے فدیہ ایک عمومی سہولت ہے۔موجودہ بینکنگ کی طرز پر لین دین رِبا نہیں۔سُود وہی منع ہے جس کا رواج زمانہ جاہلیت میں تھا۔قرآن کریم کا کوئی حکم منسوخ نہیں۔تقلید ذہنی جمود اور عقلی تعطل کا نام ہے اس لئے اسے واجب قرار دینا غلط ہے۔ قرآن کریم کے احکام کی دو قسمیں ہیں۔اصلی احکام اور محافظ احکام۔اصلی احکام ہمیشہ قانونِ فطرت کے مطابق اور غیر متبدل ہوتے ہیں۔محافظ احکام کا قانون فطرت کے مطابق ہونا ضروری نہیں اور نہ ہر حال میں ان کی پابندی لازم ہے مثلاً نماز میں اصل حکم توجہ إلی اللہ ہے۔طہارت، غسل، وضو، توجہ، قبلہ، قیام، رکوع، سجدہ، قعود محافظ احکام ہیں ان کی پابندی ہر حال میں ضروری نہیں۔نصاریٰ کا ذبیحہ حلال ہے۔اسی طرح اگر وہ پرندہ کو گلا گھونٹ کر ماردیں تو اُس کا کھانا بھی جائز ہے جو غیر مسلم مسلمانوں سے زیادتی نہیں کرتے ان کی جان و مال کے دشمن نہیں اور نہ ان کو ان کے وطن سے نکالتے ہیں ان سے موالات اور تعلقات استوار کرنے کی اجازت ہے۔صرف انہی کفار سے تعلقات رکھنے کی ممانعت ہے جو ظلم کی راہ اختیار کرتے ہیں اور مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہیں۔ہر قائم اور قانون کی پابند حکومت کی اطاعت ضروری

ہے۔حضرت عیسیٰؑ صلیب سے زندہ اتار لئے گئے تھے اور وہ طبعی موت مرے، زندہ آسمان پر نہیں گئے اور نہ دوبارہ اس دنیا میں آئیں گے۔مسیح کے نزول کا عقیدہ غلط ہے۔[1]

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ دینی مسائل میں سرسید احمد خاں صاحب کا رجحان اہل السنّت والجماعت کی بجائے معتزلہ کی طرف زیادہ تھا۔

تحریک اتحادِ عالمِ اسلامی

سرسید کی نیچرل یا آزاد خیالی کی تحریک کے ہمعصر ایک اور تحریک کے نشان بھی تاریخ کے صفحات میں ملتے ہیں۔یہ پان اسلام ازم یا اتحادِ عالمِ اسلامی کی تحریک تھی جس کے روح رواں سید جمال الدین افغانی،مصر کے مفتی محمد عبدہٗ اور ترکی کے حلیم پاشا تھے۔اس تحریک کا رخ زیادہ تر منفی سیاست کی طرف تھا اس لیے یہ تحریک استعماری اقوام کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارنے تک محدود رہی اور کوئی قابلِ ذکر تعمیری کارنامہ سرانجام نہ دے سکی اور نہ مسلمانوں کی سیاسی تربیت کا فریضہ نباہ سکی۔

تحریک رابطۂ عالمِ اسلامی

یہ ادارہ دراصل تحریک اتحادِ عالمِ اسلامی کا ایک طرح کا مثنیٰ ہے اس لیے اپنے اصل کی طرح اس کا کام بھی سرتاسر منفی انداز کا ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ اتحادِ عالمِ اسلامی کی مجلس کا کام استعماری طاقتوں کے خلاف نفرت کو فروغ دینا تھا اور رابطہ عالمِ اسلامی کی جمعیت کا کام اپنوں کے خلاف نفرت اُبھارنا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے خدمتِ اسلام سرانجام دینے والے دردمند مخلص اور دیندار مسلمانوں کی راہ میں روڑے اٹکانے کے سوا اس کا کوئی مقصدِ تنظیم ہی نہیں اور نہ اُسے یہ فکر دامن گیر ہے کہ عالمی کمیونزم مغربی استعمار کے غیر اسلامی فلسفے اور اس کی سازشیں،اُس کے مادی علوم،اُس کی محیّر العقول صنعتی کامیابیاں،اُس کی قارون کو مات دینے والی اقتصادی پالیسیاں یہ سب عناصر مل کر عالمِ اسلام کو کس قدر نقصان پہنچا رہے ہیں، کس طرح مسلمانوں کو کھائے جا رہے ہیں،ان کو تقسیم کر کے آپس میں کس طرح لڑا رہے ہیں اور ان کے بے پناہ قدرتی وسائل کو بارود اور آگ بنا کر خود انہی کے ہاتھوں تباہ کروا رہے ہیں لیکن اس حماقت پر ان کو متوجہ کرنے والا کوئی نہیں اور نہ کسی عالمی اثر رکھنے والی ہمہ پہلو آگاہ مؤید من اللہ عقل مند روحانی

---

[1] حیاتِ جاوید صفحہ ۵۲۴ تا ۵۲۶۔مولانا الطاف حسین حالی ناشر نیشنل بک ہاؤس ایبک روڈ لاہور

قیادت کی انہیں تلاش یا تمنا ہے۔پس آپس کی نفرتوں کو فروغ دینا اور خود اپنے ہاتھوں اتحاد اور یگانگت کے تقاضوں کو سبوتاژ کرنا ان کا مقصد تنظیم ہے۔اسی کا نام ہے، برعکس نہند نام زنگی کافور۔

تحریک انکارِ حدیث

مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی، حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری اور غلام احمد صاحب پرویز۔

سرسید احمد خاں صاحب کا بحیثیت ماٰخذِ شریعت حدیث کے بارہ میں جو رویہ تھا اُس سے انکارِ حدیث کے رجحان کو فروغ ملا۔چنانچہ اہلِ قرآن اسی رجحان کی پیداوار ہیں۔اس تحریک کے روحِ رواں مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی جامعہ ملّیہ کے پروفیسر حافظ محمد اسلم جیراج پوری اور رسالہ طلوعِ اسلام کے مدیر غلام احمد صاحب پرویز تھے۔

ان میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز طرزِ عمل مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی کا تھا۔ان کے نزدیک حدیث کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ان کا موقف یہ تھا کہ مسائلِ اسلام کو سمجھنے کے لئے حدیث کی کوئی ضرورت نہیں صرف قرآن کافی ہے لیکن جب وہ اپنے اس دعویٰ کی تفصیلات میں اُلجھے تو انتہائی بودے استدلال اور دور کی کوڑی لانے کی راہ پر چل پڑے۔نمازیں پانچ کی بجائے تین رہ گئیں۔یہی حال روزہ، حج اور دوسرے مسائل کا ہوا۔

جامعہ ملّیہ کے پروفیسر حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری نے مولوی عبداللہ چکڑالوی کے کمزور پہلو کو بھانپتے ہوئے انکارِ حدیث کے نظریہ میں کچھ ترمیم کی اور یہ خیال پیش کیا کہ مسائل عبادات کے تعیّن کے لئے تو قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ''عمل متواتر'' کی پابندی ضروری ہے باقی دینی مسائل کے تعین کے بارہ میں حدیث کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ان مسائل کا فیصلہ ہر زمانہ کا ''مرکزِ ملّت'' کرے گا۔

رسالہ طلوعِ اسلام کے مدیر غلام احمد صاحب پرویز نے اس نظریہ میں مزید ترمیم کی۔ان کی رائے میں دین اور دنیا، عبادات اور معاملات کی تفریق غیر اسلامی اور عجمی سازش ہے اس لئے مسئلہ عبادات سے تعلق رکھتا ہو یا معاملات سے اگر قرآن کریم میں اس کی تصریح نہیں ملتی تو اس کا تعین ہر زمانہ کا ''مرکزِ ملّت'' کرے گا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی روشنی میں جو تفصیلات طے فرمائیں

وہ بحیثیت ''مرکز ملّت'' کے ہی طے فرمائی تھیں۔ یہی مقام خلفاء راشدین کا تھا اور پھر اسی مقام اور اسی اختیار کا حامل ہر زمانہ کا ''مرکز ملّت'' ہے۔ وہ چاہے تو سابقہ سنت و دستور کو قائم رکھے اور چاہے تو زمانہ کے تقاضا کے مطابق اس میں تبدیلی کرے۔ اس لحاظ سے پرویز صاحب کے نزدیک احادیث کی حیثیت تاریخی ہے دینی نہیں کہ طَابَقَ النَّعْلُ بِالنَّعْلِ کے طور پر ان کی اتباع ضروری ہو۔[1]

علامہ سر محمد اقبال صاحب کا موقف

حدیث کی دینی حیثیت کے بارہ میں علامہ سر محمد اقبال کا موقف مولانا عبیداللہ صاحب سندھی اور حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری کے موقف سے ملتا جلتا ہے۔ وہ ''میدانِ اجتہاد'' کی اُس وسعت کے قائل تو نہیں جس کے داعی غلام احمد صاحب پرویز ہیں لیکن اخبار احاد کی شرعی حیثیت ان کے ہاں بھی مشتبہ ہے۔ علامہ مرحوم نے اپنے اس موقف کی وضاحت کے لئے ''ثبات وتغیر'' کی اصطلاح استعمال کی ہے یعنی ایمانیات اور عبادات سے متعلق جو اصول قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بذریعہ سنت متواترہ کھول کر بیان کر دیئے ہیں ان میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش نہیں البتہ دوسرے مسائل میں اجتہاد کا میدان وسیع اور آزاد ہے۔ کوئی حدیث اس وسعت کو محدود نہیں کر سکتی اس لئے ان مسائل میں اجتماعی اجتہاد کے ادارے تبدیلیاں کر سکتے ہیں۔ اس طرح ان کے نزدیک مسائل دینیہ کا ایک حصہ ''ثبات'' کے دائرہ کے اندر ہے اور دوسرا حصہ تغیر و تبدل کی آماجگاہ ہے جسے اصولِ دین کا سا تقدس اور ثبات حاصل نہیں۔[2] جہاں تک تفاصیل کی ترتیب اور عملی اقدامات کا تعلق ہے چند فلسفیانہ تجاویز اور آراء کے سوا علامہ اقبال بھی کوئی تنظیمی یا انقلابی کارنامہ سرانجام نہ دے سکے۔

نوٹ۔ ''تجدید الٰہیات اسلامیہ'' پر علامہ کے اصل لیکچر انگریزی میں تھے جن کا ترجمہ سیّد نذیر نیازی صاحب نے اُردو میں کیا جسے ''تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' کے نام سے بزمِ اقبال لاہور نے شائع کیا۔

سَلفِیؔ اور دیوبندی تحریک

اٹھارھویں صدی میں محمد بن عبدالوہاب نجدی اور شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے ذریعہ تقلید کے

---

[1] قرآنی دستور پاکستان صفحہ ۲۱۱۔ مقام حدیث صفحہ ۶۳

[2] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ صفحہ ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۶۳ تا ۲۶۷۔ ناشر بزم اقبال نرسنگھ گارڈن کلب روڈ لاہور

خلاف اور حجیت حدیث کے حق میں جو تحریک چلی برصغیر میں اس سے متاثر دو اور گروہ سامنے آئے۔ایک گروہ اہلِ حدیث یا وہابی کے نام سے مشہور رہا جو اپنے آپ کو سلفی کہلاتا تھا۔دوسرا گروہ اہل دیوبند کا تھا۔یہ دونوں گروہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو اپنا مقتدا اور پیشوا تسلیم کرتے ہیں تاہم اہل حدیث کا جھکاؤ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی طرف زیادہ ہے اس وجہ سے اس گروہ نے افراط کی راہ اختیار کی اور احادیث کے بارہ میں ان کا رویہ سرتاسر غیر تنقیدی رہا۔چنانچہ وہ احادیث کے غالب حصہ کو ہر قسم کی تنقید سے بالا سمجھتے ہیں۔ان کی رائے میں سابقہ محدثین نے حدیث کے سلسلہ میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا ہے اور اب مسلم علماء کا صرف یہ کام ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرر کئے یا ان کی جو تشریحات کی ہیں وہ انہی کی پیروی کریں کیونکہ یہ احادیث ہر حال میں قابلِ ترجیح ہیں اس لئے اگر ان میں سے کوئی حدیث بظاہر نص قرآن کے خلاف نظر آئے تو حدیث کو ترجیح ہوگی اور نص قرآنی کی اس کے مطابق تاویل کی جائے گی یا اُسے منسوخ قرار دیا جائے گا کیونکہ اس درجہ کی احادیث قرآن پر مقدم ہیں۔اس قسم کی تقشف تشدّد اور نجدی عصبیّت کے غلبہ کی وجہ سے یہ گروہ تنگ نظری میں مقلدین سے بھی بڑھ گیا۔جمود اس کا نصیبہ اور تعصب اس کا وطیرہ نظر آنے لگا جس کی وجہ سے اس کا قدم آگے اُٹھنے کی بجائے بہت پیچھے جا پڑا۔

اہلِ دیوبند

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے متاثر دوسرا گروہ اہل دیوبند کا ہے۔مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (ولادت ۱۸۳۲ء) نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ۱۸۶۶ء میں رکھی۔یہ دارالعلوم برصغیر میں ''قدیم دینی علوم'' کے فروغ کا مرکز ثابت ہوا۔علماء دیوبند نے اس لحاظ سے علم حدیث کی قابل قدر خدمت سرانجام دی کہ ان کی کوششوں سے فقہ حنفی کی تائید کے لئے احادیث کا قابل لحاظ ذخیرہ مرتب ہوا اور انہوں نے اس نقطۂ نظر سے تنقیدِ حدیث کے معیار پر بحثیں کیں۔مختلف احادیث میں تطبیق اور توافق کے اصولوں کی وضاحت کی۔تاہم ان علماء کی کوششیں بھی ایک خاص دائرہ میں محدود رہیں۔وہ فقہ حنفی کی تائید کے دائرہ سے باہر نہ نکل سکے اور اس نقطۂ نظر سے آزادئ اجتہاد اور وسیع نظری کی طرف ان کا رویہ بھی سراسر منفی انداز کا تھا۔بعض کلامی مسائل کے بارہ میں بانیٔ مدرسہ دیوبند مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی علمی

خدمات کا انکار ممکن نہیں۔اس سلسلہ میں ان کی بصیرت قابل قدر اور ان کی نظر بڑی وسیع تھی۔بہر حال دیوبندی گروہ حَنَفِیَت کی تائید کی وجہ سے برصغیر کے عوام کے ساتھ ملا جلا رہا اور اس کی طرف سے اشاعت حدیث کی کوششیں بھی خاصی مقبول رہیں اور مدرسہ دیوبند کی مرکزیت کی وجہ سے اس کے اثر کو ایک حد تک ثبات ملا۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تحریک

علی گڑھ اور دیوبند کی تحریکات سے متاثر ہو کر اسی زمانہ میں ایک اور ادارہ منصۂ شہود پر اُبھرا۔ یہ ادارہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی قیادت میں ندوۃ العلماء لکھنو کے نام سے مشہور رہوا۔اس ادارہ کا دعویٰ تھا کہ اس کے ذریعہ قدیم وجدید عقل ونقل دونوں اہلیتوں کے حامل علماء پیدا کئے جائیں گے تاکہ مغربی تہذیب کے طوفان کا مقابلہ کیا جا سکے لیکن چونکہ خود مولانا شبلی کا زیادہ تر رجحان ادب و تاریخ کی طرف تھا اس لئے یہ ادارہ تاریخ و ادب کی خدمت سے آگے نہ بڑھ سکا اور فکری اور عملی لحاظ سے وہ نتائج مرتب نہ ہو سکے جس کے حصول کا دعویٰ کیا گیا تھا۔

جماعتِ اسلامی

مذکورہ بالا علمی اور فکری تحریکات اور دوسرے فروغ پذیر فلسفہ ہائے زندگی خاص طور پر کمیونزم سے متاثر ہو کر برصغیر میں سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کی جماعت اسلامی اور عرب ممالک خاص طور پر مصر میں الاخوان المسلمون کی تنظیموں نے جنم لیا۔اخوان المسلمین کے قائد دراصل جماعتِ اسلامی سے ہی متاثر تھے۔اس لئے یہ دونوں تنظیمیں اپنے فلسفہ اور طریق کار کے لحاظ سے ایک ہی تحریک کے دو رُخ ہیں۔برصغیر میں جماعت اسلامی کی تنظیم زیادہ تر اہل حدیث اور دیوبندی مکتبۂ فکر کے افراد پر مشتمل ہے اور مذہب و سیاست کے نام پر قائم اس تنظیم کے اصل قائد، بانی اور روح رواں سید ابو الاعلی صاحب مودودی تھے۔مودودی صاحب نے اسلام کے نام پر بعض معاشی، اقتصادی اور سیاسی نظریات کو ایک نئے انداز میں پیش کیا اور اپنے پُر زور مضامین اور ادب کی چاشنی لئے ہوئے مقالات کے ذریعہ مغربی تعلیم یافتہ افراد کے ایک حصّہ کو خاصہ متاثر کیا لیکن مودودی صاحب کے نظریات و خیالات میں اتنا واضح تضاد ہے کہ اس کی کوئی صحیح توجیہ ممکن نہیں۔چنانچہ جب ان کے حسین نظریات نے عملی تشکیل پائی تو

اس کی شکل وصورت اتنی بھیانک اور خوفناک سامنے آئی کہ مذہب کے نام پر خون دین کے نام پر بہتان، سچ کے نام پر کذب وافتراء اور مقصد براری کے لئے ہر جائز وناجائز حربہ تقاضۂ مصلحت بن گیا اور بالکل وہی ہولناک شکل وصورت سامنے آئی جو کارل مارکس کے حسین معاشی نظریات کی عملی تشکیل کے سلسلہ میں لینن اور سٹالن نے دنیا کو دکھائی جس کی دہشت سے سارا عالم کانپ اٹھا۔ مودودی صاحب کے فکر وعمل کے بارہ میں یہ تبصرہ کتنا برمحل اور صحیح ہے کہ

> ''سید مودودی صاحب جب خالص علمی اور فکری نقطۂ نظر سے لکھتے ہیں تو بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے وہ زورِ تحریر میں بڑے بڑے مفکرین کو پیچھے چھوڑ جائیں گے لیکن دوسرے وقت میں وہ اتنی جامد اور اتنی خشک ذہنیت کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں کہ قدامت پسند تنگ نظر ملاؤں کی طرح پستی کی انتہا تک جا پہنچتے ہیں۔ اس تضاد کی وجہ غالباً یہ ہے کہ فکری اور علمی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان میں حرص اور کجی کی راہ کی طرف لے جانے والی تنظیمی صلاحیتیں بھی تھیں۔ اس اجتماع ضدین نے اُن کی شخصیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ حرصِ اقتدار اور سیاسی تنظیم کے تقاضے بعض اوقات اُنہیں جادۂ حق سے بھٹکا دیتے اور وہ ہر اُس ظلم وزیادتی اور بہتان تراشی کے لئے دینی جواز تلاش کر لیتے جن سے ان کے تنظیمی اور سیاسی مقاصد کو تقویت ملتی تھی اور حصولِ مقصد کی خاطر وہ ہر اُس راہ پر چل نکلنے میں کوئی باک یا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے جس کے خلاف وہ خود بڑی شدومد سے لکھ چکے ہوتے تھے۔''

طوالت کے خوف سے مثالیں پیش کرنا مشکل ہے۔ اگر ان کی تحریرات اور ان کے نظریات اور ان کے تنظیمی اقدامات کو یکجائی نظر سے دیکھا جائے تو جگہ جگہ انتشارِ فکر اور تضادِ عمل کے نمونے بکھرے پڑے نظر آئیں گے۔ ۱۹۴۵ء سے پہلے کے ان کے افکار اور پاکستان بننے کے بعد کے ارشادات تضاد بیانی کے نادر نمونے پیش کریں گے۔ اسی طرح بمطابق اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ ...... مودودی صاحب کی تربیت یافتہ جماعتِ اسلامی کی موجودہ سرگرمیوں سے بھی اس قسم کے عملی اور فکری تضادات کے واضح نشان مل سکتے ہیں۔ دیدۂ حق بین کی ضرورت ہے۔

بریلوی مسلک

جہاں تک عوامی توہم پرستی اور اندھی عقیدت کا تعلق ہے یہ مرض بہت پرانا ہے۔ بت پرستی اسی توہم پرستی کی شاخ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی نبی نے خدا کی طرف سے مبعوث ہونے کا دعویٰ کیا عوام کی طرف سے ہمیشہ مخالفت کا یہ انداز سامنے آیا کہ ہماری طرح کے ایک انسان کو یہ مقام کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔ نبی کو تو ایک مافوق البشر آسمانی ہستی ہونا چاہیے جس کی طاقتیں لامحدود ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ اس نبی کی صداقت کھلتی جاتی ہے۔ اُس کے ماننے والوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اُس کا تقدس دلوں میں گھر کرتا چلا جاتا ہے اور پھر ایک زمانہ گزرنے کے بعد اسی نبی کے ماننے والے عوام جسے شروع میں ایک عام انسان سمجھ کر رد کر دیا گیا تھا اُسے مافوق البشر طاقتوں کا مالک سمجھنے لگتے ہیں اور اُن میں وہی جاہلانہ خیالات سرایت کر جاتے ہیں اور وہ اپنے اس نبی کے بارہ میں لاہوتی تصورات کی بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں اور سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کا یہ نبی الٰہی طاقتوں کا مالک ہے۔ وہ خدا سے سب کچھ منوا لینے کا اختیار رکھتا ہے۔ رُوحانی تنزل، تہذیبی گراوٹ اور سیاسی زوال اور عملی تکاسُل کے بعد جبکہ قوائے عملیہ کمزور پڑ جاتے ہیں اور تن آسانی اور تمناؤں کی بیماری قبضہ جما لیتی ہے تو عوام تو عوام علماء کہلانے والے بھی انہی جاہلانہ لاہُوتی تصورات میں کھو جاتے ہیں، چنانچہ بعض مفاد پرست دینی رہنماؤں نے اس صورت حال سے خوب فائدہ اُٹھایا اور مسلم عوام کے لئے ایسے جاہلانہ خیالات کو دین کا حصہ بنا دیا جن کا کتاب وسنت میں نشان تک نہیں ملتا۔ اس طرح توہم پرستی اور اندھی عقیدت نے عالمگیر وبا کی صورت اختیار کر لی اور ہر علاقہ کے مسلم عوام اِلاّ ماشاء اللہ اس وہمی مرض کے شکار ہو گئے۔

برصغیر ہندو پاک میں ان غیر اسلامی جاہلانہ تصوّرات نے بریلی کے ایک بزرگ مولانا سید احمد رضا خاں صاحب (ولادت ۱۸۵۶ء) کے ذریعہ خوب فروغ پایا۔ اسی وجہ سے ان علاقوں میں اس قسم کا مسلک رکھنے والے عوام ''بریلوی'' کے نام سے مشہور ہیں اور برصغیر کے خانقاہی سلسلے بھی زیادہ تر انہی نظریات سے منسلک ہو گئے ہیں اور ''سواد اعظم'' یعنی سنیوں کی غالب اکثریت کی قیادت کے دعوے دار بن کر سامنے آئے ہیں۔ بہرحال بریلوی علماء اور خانقاہی صوفیاء ایک عرصہ سے مندرجہ ذیل عقائد ورسوم کی نشر واشاعت میں سرگرم عمل ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مافوق البشر طاقتوں کے مالک ہیں۔ آپ نور محض ہیں۔ آپ نور سے پیدا ہوئے جبکہ دوسرے لوگ مٹی سے پیدا ہوئے۔ آپ کا سایہ نہیں تھا۔ آپ کے پسینہ میں عطر کی سی خوشبو تھی۔ آپ کی نظیر ممکن نہیں۔ آپ عالم الغیب ہیں۔ خدا تعالیٰ کے علم اور آپ کے علم میں صرف اتنا فرق ہے کہ خدا کا علم ذاتی ہے اور آپ کا علم خدا کا عطا کردہ، ورنہ کمیّت و کیفیّت کے لحاظ سے دونوں کے علم میں کوئی فرق نہیں۔ آپ حاضر و ناظر ہیں۔ سب جگہ موجود اور سب کچھ دیکھ رہے ہیں آپ لوگوں کی پکار کو سنتے ہیں اور اُن کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ میلاد کی مجالس میں جب درود وسلام پڑھا جاتا ہے تو آپ خصوصیت کے ساتھ اس مجلس میں رونق افروز ہونے کے لئے تشریف لے آتے ہیں اس لئے آپ کی پیشوائی اور احترام کے لئے سب حاضرین مجلس کو کھڑے ہو جانا چاہیے۔ آپ فوت نہیں ہوئے۔ آپ کے فوت ہو جانے کے صرف اسی قدر معنے ہیں کہ آپ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں ورنہ حیاتِ جسمانی کے لحاظ سے آپ پہلے کی طرح زندہ ہیں۔

بارہ ربیع الاوّل کو عید میلاد اور ستائیس رَجَبُ الْمُرَجَّب کو معراج شریف کی تقریبات بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی ہیں۔ اسی طرح دوسرے مشہور اولیاء اللہ کے عُرس بھی بڑے زور وشور سے منائے جاتے ہیں۔ اولیاء کی کرامات بے حد وحساب ہیں۔ غوثِ اعظم حضرت سید عبد القادر جیلانیؒ بڑی پہنچ والے بزرگ ہیں۔ وہ خدا سے سب کچھ منوا سکتے ہیں۔ یَا شَیْخ عَبْدَ الْقَادِرْ جِیْلَانِیْ شَیْئًا لِلّٰهِ کے ورد سے سب حاجتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ آپ کی گیارھویں دینے میں بڑی برکات مضمر ہیں۔

دوسرے بزرگ بھی بڑی طاقتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ بے اولادوں کو اولاد عطا کرتے ہیں۔ بے وسیلوں کا وسیلہ ہیں۔ بے روزگاروں کے کارساز اور ان کے حاجت روا ہیں۔ اس لئے ان کی چوکھٹ پر حاضری دینا، ان کے مزارات پر سلام کے لئے جانا، ان کو پکارنا، ان کے وسیلہ سے دُعائیں کرنا، اُن کے مزارات پر چلّہ کشی کرنا یہ سب کام وصالِ الٰہی کا ذریعہ اور نجاتِ ابدی کی کلید ہیں۔ اسی طرح نماز میں تصوّرِ شیخ، رُوحانی ترقی اور قبولیت عبادت کا باعث ہے۔[1] قبر پر سجدۂ تعظیمی میں کوئی حرج نہیں اور نہ یہ شرک ہے۔

---

[1] اسی عقیدہ کے ردّ عمل کے طور پر بعض دیوبندی علماء یہاں تک کہہ گئے کہ نماز میں گدھے کا تصور مفسد نماز نہیں لیکن کسی پیر یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تصور سے نماز فاسد ہو جائے گی کیونکہ نماز میں تعظیم غیر مفسدِ صلوٰۃ ہے۔

بریلوی حضرات، فاتحہ خوانی، قُل، چہلم، ختم قرآن مجید، نذر و نیاز اور مزارات پر طرح طرح کے چڑھاوے چڑھانے پر بھی بہت زور دیتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جب نام مبارک لیا جائے تو دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگانے کو ادب و ثواب سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اذان و نماز کے بعد ذکر جہری اور آج کل اس کے لئے لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے کے دلدادہ اور اسے اپنا دینی حق سمجھتے ہیں۔

غرض بُت پرست قومیں جو کچھ اپنے بتوں کے اَستھانوں پر کرتی ہیں وہی کچھ یہ لوگ اپنے بزرگوں کی مزارات پر کرتے ہیں۔ روح ایک ہے، صرف نام اور انداز میں فرق ہے یعنی بزرگوں کے بتوں، مجسموں اور ان کی یادگاروں کے سامنے اگر یہ کام کئے جائیں تو یہ شرک ہے لیکن اگر یہی کام مزارات اور خانقاہوں میں سرانجام دیئے جائیں تو عین اسلام ہے۔

مسلمانوں کی سیاسی بحالی سے متعلق تحریکات

جن استعماری طاقتوں کے ہاتھوں عالمگیر مسلم اقتدار کا خاتمہ ہوا ان کی دو قسمیں ہیں۔

تغلب اور آمریت پسند طبیعت رکھنے والی استعماری طاقتیں جیسے روسی طاقت یا بعض اور آمریت پسند حکومتیں، قانون پسند طبیعت رکھنے والی استعماری طاقتیں جیسے برطانیہ، فرانس اور امریکہ وغیرہ۔ پہلی قسم کی طاقت نے جن اسلامی حصوں پر تسلّط جمایا۔ جیسے روسی تُرکستان، منگولیا اور چین کے بعض مسلم علاقے، وہاں مذہبی آزادی کی کوئی تحریک آج تک پنپ نہیں سکی اس لئے ان علاقوں میں کسی مسلم قیادت کے اُبھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی اصلاحِ اُمّت کی کسی تحریک کا وہاں نام ونشان ملتا ہے۔

دوسری قسم کی استعماری طاقتوں کے تسلّط میں رہنے والے مسلمانوں میں سیاسی تحریکات اٹھیں اور آہستہ آہستہ انہوں نے فروغ حاصل کیا لیکن ان تحریکات کا رجحان چونکہ سرتاسر منفی انداز کا تھا۔ سارا زور استعماری طاقت کے خلاف نفرت پیدا کرنے پر صرف کیا گیا یہاں تک کہ جوشِ مخالفت میں قومی، علمی اداروں کو نقصان تک پہنچایا گیا۔ لوگوں سے سول ملازمتیں چھڑوائی گئیں گویا ان کے مالی وسائل کو تباہ کیا گیا۔ تحریک سول نافرمانی اور تحریک ہجرت میں مسلم عوام سے یہی کچھ کروایا گیا جبکہ ہندو برادرانِ وطن کا ہر قدم قوم کے وسائلِ بہبود کی طرف اٹھتا تھا۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اُن قومی نقائص اور عیوب کے دور کرنے کے سلسلہ میں کوئی تعمیری کارنامہ سرانجام نہ دیا جاسکا جو مسلم زوال کا اصل باعث تھے۔ نہ قومی اخلاق کی تعمیر کے طاقتور ادارے قائم ہوئے، نہ نئے علوم کے فروغ کے بصیرت افروز مرکز اُبھرے، نہ اقتصادی حالات درست کرنے کی طرف کوئی مضبوط قدم اُٹھا، نہ قومی نظم ونسق اور اجتماعی تنظیم وتربیت کی جاندار کوششیں ہوسکیں اور نہ ایثار وقربانی کے تسلسل اور بے غرضی اور بے نفسی کے تعہد کے لئے قوم کو کوئی سبق ملا۔ اس صورت حال کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ جاندار سیاسی تحریکات کے نتیجہ میں آزادی تو بے شک مل گئی، غیر ملکی استعمار کا خاتمہ تو ہوا لیکن تشکیلِ حکومت کے اصولوں اور ووٹ کے استعمال کرنے کی قدر وقیمت سے عوام چونکہ ناواقف تھے اس لئے جمہوری ذرائع کے طفیل آزادی حاصل کرنے کے باوجود جمہوریت کی افادیت کو بھلا دیا گیا اور مسلم معاشرہ بدیسی حکومت کے تسلّط سے نکل کر دیسی مفاد پرستوں اور انارکی کے دلدادہ خودغرضوں کے چنگل میں پھنس کر رہ گیا۔ جنہیں نہ حکومت کے اصولوں

سے کچھ واسطہ ہے اور نہ عدل عمرانی اور جمہوری اقدار سے کوئی تعلق۔وہ اپنے مفاد اور اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے ہر ظلم روا رکھتے ہیں اور اپنے اقتدار کو استحکام اور دوام بخشنے کے لئے کسی حربہ کو کام میں لانے سے نہیں چوکتے۔نام جمہوریت کا لیتے ہیں اور رویہ پرلے درجہ کی ظالمانہ آمریت کا اپناتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک عام آدمی پہلے سے بھی زیادہ دُکھی ہے اور بے رحم آمریت کے چنگل میں پھنس کر رہ گیا ہے۔فروغ علم وفن، ترقی صنعت وحرفت، اقتصادی بحالی اور قومی اتحاد کا جذبہ تو دور کی بات ہے عام پبلک تو اپنے بنیادی حقوق تک سے محروم ہے اور ہر قسم کے استحصال کا شکار بنی ہوئی ہے۔موازنہ کر کے دیکھئے جاپان جنگ میں ہار گیا مغربی جرمنی تباہ ہوا لیکن چند سالوں میں ہی اقتصادی اور صنعتی ترقی کے لحاظ سے دونوں ملک فاتح اقوام کو بھی مات دینے لگے۔اس کے بالمقابل افغانستان شروع سے آزاد رہا۔سعودی عرب کسی بدیسی حکومت کے زیر فرمان نہیں رہا۔ترکی اور ایران بھی بڑی حد تک خود مختار رہے لیکن کسی ملک نے نہ علم وفن میں کوئی مقام پیدا کیا اور نہ صنعت وحرفت میں کوئی نام حاصل کر سکا۔یہی حال دوسرے آزاد ہونے والے مسلم ممالک کا ہے غور فرمایئے کیا بلحاظ علم وفن، کیا بلحاظ صنعت و حرفت اور کیا بلحاظ اقتصاد و معاش اقوام عالم میں کسی مسلم ملک کا کوئی مقام ہے؟ حالانکہ جہاں تک مالی وسائل کا تعلق ہے کئی مسلم ممالک اس دولت سے مالا مال ہیں لیکن اپنی بے تدبیریوں اور عیش پرستیوں کے ہاتھوں خود اپنے وسائل سے محروم ہیں اور دوسرے ان کے وسائل سے ترقیات حاصل کر رہے ہیں اور خود مسلم ممالک یا تو اپنی دولت عیش پرستیوں میں تباہ کر رہے ہیں یا پھر آپس کی دشمنیوں اور جنگوں میں غارت کر رہے ہیں اور آزاد ہونے کے باوجود نہ انہیں عالِم اسلام کے زوال کی فکر ہے اور نہ دین کے مصائب کی۔

کب پیٹ کے دھندوں سے مُسلم کو بھلا فرصت   ہے دین کی کیا حالت یہ اُس کی بلا جانے
جو جاننے کی باتیں تھیں ان کو بھلایا ہے   جب پوچھیں سبب کیا ہے کہتے ہیں خدا جانے
(کلام محمود)

اور ان کا حال ایک مدت سے غالب کے اس شعر کے مطابق ہے

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رو کے ساتھ   پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو مَیں

تین عظیم الشان موعود

''ایک گھر کا مالک تھا جس نے انگورستان لگایا اور اُس کی چاروں طرف روندھا اور اس کے بیچ میں حوض کھود کے کولھو گاڑا اور برج بنایا اور باغبانوں کو سونپ کے آپ پردیس گیا اور جب میوہ کا موسم قریب آیا تو اُس نے اپنے نوکروں کو باغبانوں پاس بھیجا کہ اس کا پھل لاویں پر باغبانوں نے اُس کے نوکروں کو پکڑ کے ایک کو پیٹا اور ایک کو مار ڈالا اور ایک کو پتھراؤ کیا۔ پھر اُس نے اور نوکروں کو جو پہلوں سے بڑھ کر تھے بھیجا۔ انہوں نے ان کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا۔ آخر اُس نے اپنے بیٹے کو اُن پاس یہ کہہ کر بھیجا کہ وے میرے بیٹے سے دبیں گے لیکن جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا، آپس میں کہنے لگے وارث یہی ہے آؤ اِسے مار ڈالیں کہ اس کی میراث ہماری ہوجائے اور اُسے پکڑ کے اور انگورستان سے باہر لے جا کر قتل کیا۔ جب انگورستان کا مالک آوے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا کرے گا؟ وے اسے بولے ان بدوں کو بُری طرح مار ڈالے گا اور انگورستان کو اور باغبانوں کو سونپے گا جو اسے موسم پر میوہ پہنچاویں''[1]۔

جب سے دنیا میں تمدن اور مل جل کر رہنے کا آغاز ہوا ہے اُس وقت سے اللہ تعالیٰ کی یہ سنت چلی آرہی ہے کہ زمین میں جب ظلم وجور کا دور دورہ ہوتا ہے اور فساد غالب آجاتا ہے، توازنِ زندگی بگڑ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ انسانیت کو بچانے اور عدل وانصاف قائم کرنے کے لئے اپنی طرف سے ہادی اور مرسل بھیجتا ہے حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم تک ارسال رسل کے اس سلسلہ کو دنیا کا اکثر حصہ تسلیم کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس گناہ اور فساد کی روک تھام کے لئے یہ سلسلہ جاری ہوا کیا وہ گناہ اور فساد اب ختم ہوگئے ہیں؟ قریباً تمام آسمانی کتب اس قسم کے گناہوں کی تفاصیل سے بھری پڑی ہیں جن کی وجہ سے بعثت انبیاء و مصلحین ہوئی اور اب بھی گناہوں اور فسادوں کے ایسے دور آتے رہتے ہیں اور سینکڑوں ایسی انسانیت سوز خرابیاں

---

[1] متی باب ۲۱ آیت ۳۳ تا ۴۱

گھراؤ کئے ہوئے ہیں جن سے معاشرہ کا امن وامان تباہ ہو جاتا ہے اور دنیا الامان الحفیظ پکار اٹھتی ہے یہی حالات ہوتے ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ماموراور مرسل آتے ہیں جو تزکیہءنفس اور کتاب وحکمت کے ذریعہ بھٹکی ہوئی روحوں کو سیدھی اور کامیاب زندگی کی راہ دکھانے کا عملی فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

ان مرسلین اور مصلحین میں سے بعض ''خاص اور معیّن وجودوں'' کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے سے خوشخبری دینے کی سنت الٰہی بھی تمام آسمانی مذاہب میں مسلّم چلی آتی ہے یعنی آسمان سے یہ خبر دی جاتی ہے کہ فلاں وقت اور ان علامتوں کے ساتھ ایک عظیم مصلح آئے گا جو دنیا کی ہدایت کا فریضہ سرانجام دے گا۔ اس الٰہی سنت کے بالمقابل گمراہ اور مریض دنیا کا طرزِ عمل ہمیشہ یہ رہا کہ جب بھی کوئی ایسا عظیم موعود ہادی اپنے صدق کی علامات کے ساتھ آیا دنیا کے ایسے عناصر نے اُس کا انکار کیا اور اپنے شدید ردّ عمل کا اظہار کیا اور اُس کے ساتھ تکبر اور استہزاء، استعلاء اور افتراء کا معاملہ کیا۔

ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ کسی پیشگوئی میں تمثیل اور استعارہ غیب اور خفا کی جو آمیزش ہوتی ہے اُسے یہ لوگ سمجھ نہیں سکتے اور اُس پیشگوئی کو ظاہر پر محمول کرتے ہیں اور اُس کے غلط معنے سمجھتے ہیں اور پھر اس غلط روش پر اصرار کی وجہ سے قبول حق سے محروم ہو جاتے ہیں۔

دنیا کا قدیم ترین مذہب ہندومت ہے۔ اس مذہب کے ہادی حضرت کرشن مہاراج [1] کی طرف سے یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ...... جب جب کل جگ کا دور ہوگا اور دنیا میں انتہائی پستی اور گراوٹ پیدا ہوگی تب تب وہ اس پاپ کو دور کرنے کے لئے پھر سے جنم لیں گے اور اس دنیا میں واپس آئیں گے [2]۔

لیکن باوجود اس واضح پیشگوئی کے ہندو آج تک کسی عظیم ہادی کو کرشن کا اوتار نہ مان سکے کیونکہ ''اوتار'' کا جو تصور ہندوؤں نے اپنے ہاں اپنایا اُن کے اس تصور کے مطابق کوئی ظہور کرشن

---

[1] كَانَ فِي الْهِنْدِ نَبِيٌّ اَسْوَدَ اللَّوْنِ اِسْمُهٗ كَاهِنٌ. ملفوظات جلد ۱۰ صفحہ ۴۳ مطبوعہ الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ۔ تاریخ ہمدان دیلمی، باب الکاف (نوٹ) اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ حیدرآباد دکن کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

[2] گیتا ادھیائے نمبر ۴ شلوک نمبر ۷، ۸

کے معیار کا انہیں نظر نہ آیا اور اسی وجہ سے وہ کرشن مہاراج کے بعد ہر آنے والے عظیم مصلح کو ماننے کی سعادت سے محروم ہو گئے۔ یہی حال دنیا کے دوسرے قدیم مذاہب مثلاً مجوسیت اور بدھ مت وغیرہ کے ماننے والوں کا ہے۔اُن کے ہاں بھی مصلحین کے آنے کی پیشگوئیاں ہیں لیکن ان پیشگوئیوں کے بارہ میں جو تصوران کا قائم ہوا اُس کے عین مطابق وہ کسی عظیم ہادی کو نہ پا کر اُس کے صدق کے منکر ہو گئے۔

یہودیت، عیسائیت اور اسلام تاریخی اور روایتی لحاظ سے زیادہ محفوظ مذاہب ہیں اور ان میں اس قسم کی پیشگوئیاں بکثرت ہیں جن میں کسی عظیم موعود اور مصلح کے آنے کی خبر دی گئی ہے اور ان کی تفصیلات کا معلوم کرنا نسبتاً زیادہ آسان بھی ہے اس لئے ان پیشگوئیوں کی حقیقت جاننے کے لئے کوئی مشکل پیش نہیں آنی چاہئے لیکن ضد اور ہٹ دھرمی اب بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ بائبل میں یہ پیشگوئی موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا۔

> "میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کناروں کی ریت کی مانند کر دوں گا اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہو گی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی"۔[1]

اس پیشگوئی کی تفصیل کے دو حصے ہیں۔ایک حصہ کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کے چھوٹے بیٹے حضرت اسحٰقؑ کے ساتھ ہے جس کے صدق، جس کی عظمت اور برکت کے یہودی اور عیسائی اب بھی قائل ہیں اور اس کے ساتھ بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔

اس پیشگوئی کے دوسرے حصہ کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیل کے ساتھ ہے جس کی وضاحت بائبل نے اس طرح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

> "اسماعیل کے حق میں بھی مَیں نے تیری سنی۔دیکھ میں اُسے برکت دوں گا اور اُسے برومند کروں گا اور اُسے بہت بڑھاؤں گا......اور میں اُسے ایک بڑی قوم بناؤں گا"۔[2]

تاہم یہودی اور عیسائی پیشگوئی کے اس حصہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور باوجود اس کے واضح

---

[1] پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۷، ۱۸ [2] پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۰

ہونے کے محض تعصب اور ضد، سوتیلا پن اور کینہ پروری کی وجہ سے نہ وہ حضرت اسماعیلؑ کی عظمت کے قائل ہیں اور نہ ان کی نسل کی کوئی قدر کرتے ہیں بلکہ طرح طرح کی تاویلیں کر کے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی اولاد کو بنظر حقارت دیکھتے ہیں۔

یہ تو تکبر استعلا اور انکار کی ایک مثال ہے ورنہ تفصیل میں جائیں تو سینکڑوں ایسی مثالیں مل جائیں گی جن میں حق کے طالبوں کے لئے بڑی عبرت کے سامان ہیں تاہم...... اس وقت تین **''خاص عظیم مصلحین اور ہادیوں''** کا کسی قدر تفصیلی ذکر ہمارے مدنظر ہے۔

ان میں سے **پہلے عظیم موعود ''حضرت عیسیٰ بن مریم''** ہیں جن کی آمد کے بارہ میں بائبل کی واضح پیشگوئیاں موجود ہیں مثلاً لکھا ہے۔

> ''اے بنت صیُّون تو نہایت شادمان ہو، اے دختر یروشلیم خوب للکار کیونکہ دیکھ تیرا بادشاہ تیرے پاس آتا ہے۔ وہ صادق ہے اور نجات اُس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ حلیم ہے وہ گدھے پر بلکہ جوان گدھے پر سوار ہے۔ وہ قوموں کو صلح کا مژدہ دے گا اور اُس کی سلطنت سمندر سے سمندر تک اور دریائے فرات سے انتہائے زمین تک ہوگی''[1]۔

پھر لکھا ہے۔

> ''اُس روز گناہ اور ناپاکی دھونے کو داؤد کے گھرانے اور یروشلیم کے باشندوں کے لئے ایک سوتا پھوٹ نکلے گا''[2]۔

ایک اور جگہ لکھا ہے

> ''اُس کی قبر شریروں کے درمیان ٹھرائی گئی اور وہ اپنی موت میں دولت مندوں کے ساتھ ہوا''[3]

علاوہ ازیں بائبل کے بیان کے مطابق اس عظیم وجود کے لئے ایک اور بڑا نشان مقرر ہوا اور وہ یہ کہ اُس موعود کے آنے سے پیشتر ایلیا نبی نازل ہوگا جو رتھ سمیت آسمان پر چلا گیا تھا[4]

---

[1] زکریاہ باب ۹ آیت ۹، ۱۰۔ متی باب ۲۱ آیت ۵ [2] زکریاہ باب ۱۳ آیت ۱
[3] یسعیاہ باب ۵۳ آیت ۹ [4] ۲۔ سلاطین باب ۲ آیت ۱۱ ''ایلیاہ بگولے میں ہو کر آسمان پر جاتا رہا''

وہ آکر اس موعود کے لئے راہ ہموار کرے گا چنانچہ لکھا ہے۔

''دیکھو خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے کے پیشتر میں ایلیا (الیاس) نبی کو تمہارے پاس بھیجوں گا اور وہ باپ کا دل بیٹے کی طرف اور بیٹے کا باپ کی طرف مائل کرے گا مبادا میں آؤں اور زمین کو ملعون کروں''[1]

ان واضح پیشگوئیوں کے ہوتے ہوئے بھی جب وہ موعود آیا اکثر یہودیوں نے اُسے پہچاننے سے انکار کر دیا کیونکہ انسانی طبیعت ہمیشہ عجوبہ پسند رہی ہے۔ سادہ سی بات کو بھی افسانہ کا رنگ دے دیا جاتا ہے۔

سو اسی کے مطابق آنے والے مسیح کے بارہ میں بھی یہودیوں نے عجیب وغریب تصورات اپنا رکھے تھے مثلاً وہ سمجھنے لگے تھے کہ مسیح کے آنے سے پہلے ایلیا نبی خود آسمان سے نازل ہوگا اور مسیح کی تصدیق کرے گا۔ اسی طرح مسیح کی زبردست روحانی قوت کے مقابلہ میں دشمن آناً فاناً تباہ اور برباد ہو جائے گا اور یہودیوں کو بیٹھے بٹھائے بادشاہی مل جائے گی اور مسیح ان کا بادشاہ بن کر ساری دنیا پر حکومت کرے گا اور آن کی آن میں اُن کی بگڑی بنا دے گا۔ خود یہودیوں کو نہ کوئی قربانی دینی پڑے گی اور نہ کسی قسم کی جدوجہد کی ان کو ضرورت ہوگی اور بلا کسی محنت کے دنیا بھر کی نعمتیں ان کی جھولی میں آگریں گی لیکن جب مسیح ان کے ان غلط تصورات کے برعکس آیا اور اُس نے اپنے آپ کو اسرائیل کے لئے بطور نجات دہندہ پیش کیا تو یہودی مسیح کے اس دعویٰ کو سن کر سخت متعجب ہوئے اور پھر کر شدید مخالفت پر اُتر آئے اور مسیح کو استہزاء کا نشانہ بنایا۔ کانٹوں کا تاج بنا کر ان کو پہنایا۔ ٹھٹھا کیا اور مخول کے رنگ میں ان کے پیچھے پیچھے جا کر نعرے لگانے لگے کہ لوگو! دیکھو یہ ہمارا بادشاہ آیا ہے۔ خود بیکس اور لاچار لیکن دعویٰ یہ کہ وہ ہمارے لئے طاقت کا سرچشمہ ہے۔ پاس نہ طاقت ہے اور نہ دولت اور آیا ہمیں حکومت دلانے اور دولتمند بنانے ہے اور نجات کا مژدہ سنا رہا ہے۔ یہودیوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ اُس عظیم موعود سے پہلے ایلیا نبی نے آنا تھا وہ کہاں ہے؟

حضرت مسیح نے یہودیوں کے اِن اعتراضات کے جواب میں فرمایا۔ اے ناسمجھو! اگر تم

[1] ملاکی باب ۴ آیت ۵

میری مانو اور اطاعت کرو اور جو کچھ میں کہتا ہوں اُسے سنو تو اللہ تعالیٰ وہ تمہیں وہ ساری برکتیں دے گا جن کی تم آنے والے مسیح سے توقع رکھتے ہو اور جو قربانیاں ضروری ہیں انہیں میرے کہنے کے مطابق پیش کرو تو غیر معمولی حالات میں تمہیں دشمن پر وہ غلبہ بھی حاصل ہوگا جس کی مثال تم نے گزشتہ قوموں میں نہیں دیکھی ہوگی۔

رہا ایلیا نبی کا پہلے آنا اور آسمان سے نازل ہونا تو وہ ایک تمثیل ہے کیونکہ خود ایلیا نبی نے اپنے سابقہ وجود کے ساتھ آسمان سے نہیں اترنا وہ تو فوت ہو چکا ہے اس لئے اس کا آسمان سے نازل ہونا بطور تمثیل کے ہے جو یحیٰی بپتسمہ دینے والے کے روپ میں آگیا ہے۔ چنانچہ مسیحؑ نے یہودیوں سے کہا۔

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں اُن میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ..... چاہو تو مانو، ایلیاہ جو آنے والا تھا وہ یہی ہے۔ جس کے سننے کے کان ہوں وہ سن لے''[1]

پھر لکھا ہے

''میں تم سے کہتا ہوں کہ ایلیاہ تو آ چکا اور انہوں نے اس کو نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اُس کے ساتھ کیا''[2]

مقام غور ہے کہ آخر صحیح اور سچ کیا نکلا وہ جو یہودی کہتے تھے یا وہ جو مسیحؑ نے کہا کیونکہ جو آنے والا تھا وہ تو عین وقت پر آیا۔ نشانوں کے ساتھ آیا لیکن یہودیوں نے اپنی نفسانی خواہشات اور ذاتی خود ساختہ تصورات کے مطابق نہ پا کر اُسے رد کر دیا اور اُس کو نیست و نابود کرنے کے درپے ہو گئے۔ آنے والا آ گیا اور سعادتمندوں اور سمجھداروں نے اُسے قبول بھی کر لیا اور برکتوں پر برکتیں پائیں[3] لیکن یہودیوں کے ایک حصہ نے نہ مانا اور اپنے مزعومہ موعود کا انتظار کرتے رہے اور اب تک انتظار کر رہے ہیں اور بِحَبْلٍ مِّنَ النَّاس کے سہارے زندہ ہیں۔

---

[1] متی باب ۱۱ آیت ۱۱ تا ۱۵ [2] متی باب ۱۷ آیت ۱۲

[3] ان برکتوں اور ناشکری کی صورت میں اس پر سزا کا ذکر قرآن کریم کی سورۃ المائدۃ کی آیت نمبر ۱۱۲ تا نمبر ۱۱۶ میں ہے۔

دوسرے عظیم الشان موعود بلکہ موعود اقوام عالم سید ولد آدم حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کے آنے کی پیشگوئی دنیا کے تمام آسمانی مذاہب میں موجود ہے۔ تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں صرف بائبل کی بعض پیشگوئیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کے شارع نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''میں اُن کے لئے اُن کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا وہ سب اُن سے کہے گا تم اس کی سننا...... جو کوئی میری اُن باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اُن کا حساب اُس سے لوں گا''۔[1]

پھر لکھا ہے مرد خدا موسیٰ نے جو دعائے خیر اپنی وفات کے وقت سے پہلے بنی اسرائیل کو بطور برکت دی وہ یہ ہے۔

''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لئے تھی''۔[2]

حضرت سلیمان ''اس محبوب عالمؐ'' کی یوں خبر دیتے ہیں

''میرا محبوب سرخ وسفید ہے۔ دس ہزار آدمیوں کے درمیان جھنڈے کی مانند کھڑا ہوتا ہے۔...... ہاں وہ محمدیم ہے[3]۔ اے یروشلم کی بیٹیو! یہ میرا پیارا ہے۔ یہ میرا جانی ہے''۔[4]

حضرت داؤدؑ آپ کے حق میں اس طرح پیشگوئی بیان کرتے ہیں۔

''وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا کونے کا سرا ہوگیا۔ یہ خداوند سے ہوا جو ہماری

---

[1] استثنا باب ۱۸ آیت ۱۸، ۱۹ [2] استثنا باب ۳۳ آیت ۲

[3] حضرت سلیمان نے اس پیشگوئی میں ''محمدیم'' کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اردو مترجمین نے اس کا ترجمہ ''عشق انگیز'' کیا ہے حالانکہ یہ نام ہے اور نام کا ترجمہ کرنا غلط ہے۔

[4] غزل الغزلات باب ۵ آیت ۱۰ تا ۱۶

نظروں میں عجیب ہے''[1]

سلسلہ موسویہ کے آخری نبی اور عظیم موعود **حضرت مسیح علیہ السلام** آپؐ کی آمد کی یوں خبر دیتے ہیں۔

''یشوع نے انہیں کہا، کیا تم نے نوشتوں میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو راج گیروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہوا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہے اور ہماری نظروں میں عجیب۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور ایک اور قوم کو جو اُس کے میوے لاوے دی جائے گی''[2]

پھر ایک موقع پر مسیحؑ نے کہا۔

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ ''مددگار'' (تسلی دینے والا) تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن میں جاؤں گا تو اُسے تمہارے پاس بھیج دوں گا وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارہ میں قصوروار ٹھہرائے گا''

اسی تسلسل میں آپ مزید فرماتے ہیں۔

''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ ''روحِ حق'' آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا''[3]

---

[1] زبور ۱۱۸ آیت ۲۲:۲۳

[2] متی باب ۲۱ آیت ۴۲:۴۳۔ اس پیشگوئی کا شروع کا حصہ آغاز مضمون دیکھیں۔

[3] یوحنا باب ۱۶ آیت ۷ تا ۱۴۔ یوحنا کی اس پیشگوئی کے ترجمہ میں لفظ ''مددگار'' ''روح حق'' قابل غور ہیں۔ سوال یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اصل لفظ کیا بولا تھا جس کا ترجمہ ''مددگار'' یا ''روح حق'' وغیرہ کیا گیا ہے۔ اگر صحیح اور اصل لفظ کا پتہ لگ سکے تو حقیقت کھل کر سامنے آسکتی ہے۔ یونانی انجیل یوحنا میں یہ لفظ پاراکلیو س'' (PARACLETUS یا PARAKLETOS) ہے جو انگریزی میں ''پاراکلیٹ'' (PARACLETE) بن گیا جس کا عربی تلفظ ''فارقلیط'' مروج ہوا لیکن یہ یونانی لفظ ''PERICLYTOS'' ہے (پیریقلیطس یا پرکلیطس) بھی ہوسکتا ہے جس کے معنے ''تعریف کیا گیا'' کے ہیں۔ اس طرح یہ گویا لفظ ''محمد'' کے ہم معنے ہے۔ بہرحال مسیح کا اصل لفظ سریانی زبان میں کیا تھا یہ سوال ابھی تشنۂ جواب۔ سیرۃ ابن ھشام میں سریانی لفظ ''مُنْحَمَنَّا'' کوٹ کیا گیا ہے جو محمد کے ہم معنے ہے۔ (سیرۃ ابن ھشام صفۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

حضرت مسیح علیہ السلام کی اس پیشگوئی کا ذکر قرآن کریم کی سورۃ الصف میں اس طرح ہے۔

وَ اِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ [1]

اور یاد کرو جب عیسیٰ بن مریم نے اپنی قوم سے کہا اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔ تورات میں جو باتیں میرے آنے سے پہلے بیان ہو چکی ہیں ان کو میں پورا کرنے والا ہوں اور ایک ایسے رسول کی بھی خبر دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا جس کا نام ''احمد''[2] ہوگا۔ پھر جب وہ رسول دلائل لے کر آ گیا تو وہ (بنی اسرائیل) کہنے لگے۔ یہ تو کھلا کھلا جادو اور فریب ہے۔

بائبل کی یہ پیشگوئیاں کس قدر واضح ہیں لیکن ہوا وہی جو ہمیشہ ہوتا چلا آیا ہے کیونکہ جب وہ موعود اقوام عالم آیا اور ساری علامات کے ساتھ آیا تو دنیا کے بڑے حصہ بالخصوص اہل کتاب نے اُس کا صاف انکار کر دیا حالانکہ اُن کی اپنی کتابیں اس آنے والے کی علامات سے بھری پڑی تھیں اور وہ اس کی آمد کے منتظر بھی تھے مگر اپنی غلط سوچ کی وجہ سے وہ اس کو نہ پہچان سکے اور ماننے کے لئے تیار نہ ہوئے تاہم جس نے آنا تھا وہ تو آ گیا اور بڑی شان سے آیا اور منکر آج تک اُس کا انتظار کر رہے ہیں بلکہ اب تو انتظار کرتے کرتے بڑی حد تک مایوس ہو چکے ہیں اور طرح طرح کی تاویلات اور تحریفات کے سہارے گریز کی راہیں تلاش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

سیدنا حضرت **خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ** نے اپنے خطبہ فرمودہ ۱۲/اگست ۱۹۸۸ء میں

بقیہ حاشیہ۔ (۲) بائبل کی ان پیشگوئیوں کی تشریح اور مزید پیشگوئیوں کی تفصیل کے لئے دیکھیں تفسیر کبیر جلد ا صفحہ ۳۷۰ زیر آیت مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ[1]۔ (البقرۃ:۴۲)

[1] الصف:۷

[2] آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دو نام ہیں ایک ''محمد'' اور دوسرا ''احمد'' اگرچہ آپ کا نام ''محمد'' زیادہ مشہور ہے اور کلمہ میں بھی یہی نام استعمال ہوا ہے لیکن بمطابق قرآن کریم حضرت مسیح علیہ السلام نے آپ کا دوسرا نام ''احمد'' لیا ہے جس میں اہل فکر و دانش کے لئے کئی حکمتیں پوشیدہ ہیں فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ؟

سورۃ الحجر کی آیات ۱۲ تا ۱۶ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:۔

سورۃ الحجر سے یہ چند آیات جو میں نے آج کے جمعہ کے لیے منتخب کی ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے کہ کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ اُن کے پاس کوئی رسول آئے اور وہ اُس سے استہزاء کا سلوک نہ کریں یا جب کبھی بھی اُن کے پاس کوئی رسول آتا ہے۔ وہ اس کے سوا کچھ نہیں کرتے کہ اُس سے تمسخر کرتے ہیں اور استہزاء کا سلوک کرتے ہیں۔ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ اسی طرح ہم مجرموں کے دل میں یہ عادت داخل کر دیتے ہیں یعنی اُن کے مزاج میں، اُن کی عادات میں فطرت ثانیہ کی طرح یہ کجی داخل ہو جاتی ہے کہ جب بھی خدا کی طرف سے کوئی آئے اُس کے ساتھ استہزاء کا سلوک کرنا ہے لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ وہ ایمان نہیں لاتے۔ بھیجے ہوئے پر ایمان نہیں لاتے اور اُن کے لیے اور اس سے پہلے لوگوں کی سنت اور اُن کی تاریخ ایک نمونہ بن جاتی ہے یعنی اُس نمونے کے پیچھے چلنے والے ہیں۔ گویا وہی لوگ ہیں جو گزشتہ زمانوں میں اسی قسم کی حرکتیں کر چکے ہیں اور اب دوبارہ ظاہر ہوئے ہیں۔ تو اپنے سے پہلوں کی سنت پر عمل کرنے والے یہ لوگ ہیں اور اُس کے مقابل پر خدا کی بھی ایک سنّت ہے۔ اُس کا بھی یہیں ذکر ہے فرمایا قَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ حالانکہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس سے پہلے اسی قسم کے لوگوں کے ساتھ خدا کی کیا سنّت جاری ہوئی تھی اور ان دونوں سنتوں میں آپ کوئی تبدیلی نہیں دیکھیں گے۔ نہ ان بدکردار لوگوں کی سنّت میں تبدیلی دیکھیں گے جن کو خدا تعالیٰ نے اُن کے جرموں کی وجہ سے ایک غلط طرز عمل اختیار کرنے پر پابند فرما دیا ہے۔ اُن کے دلوں میں جاگزین کر دی ہے یہ بات کہ تم اس لائق نہیں ہو کہ سچوں کو قبول کرو اس لیے تم جس حد تک تم سے ممکن ہے کج روی اختیار کرو۔ دوسری طرف سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ سے مراد وہ سنّت ہے جو اوّلین کے بارے میں خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی رہی ہے۔ جو اُن کے ساتھ خدا کا سلوک ہوتا رہا ہے۔ وہ اُن کی سنّت بن گیا یعنی پہلے انکار کی سنّت اور پھر ہلاکت اور

تباہی کی سنّت وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جن کے اوپر اگر ہم آسمان سے دروازے بھی کھول لیں۔ ایسے دروازے جن پر یہ چڑھ سکیں اور خود آسمان کی بلندیوں پر جا کر سچائی کا مشاہدہ کریں اور نشانات کو دیکھ لیں لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا وہ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد یہ کہیں گے کہ ہماری آنکھیں مدہوش ہو گئی ہیں، ہماری آنکھوں کو نشہ چڑھ گیا ہے بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ہم تو ایسی قوم ہیں جس پر جادو کر دیا گیا ہے۔ ان آیات میں دو مضامین بیان ہوئے ہیں۔ اگر چہ تسلسل ہے مضمون کا، لیکن اس مضمون کو دو حصوں میں بیان فرمایا گیا ہے۔ پہلا یہ کہ خدا تعالیٰ کی یہ سنّت ہے، خدا تعالیٰ کی یہ تقدیر ہے کہ بعض لوگ لازماً اس کے بندوں سے اُس کے بھیجے ہوؤں سے استہزاء کا سلوک کرتے ہیں اور اُن کا یہ رویہ اُن کا مقدر بنا دیا جاتا ہے۔ ان کے دلوں میں یہ بات داخل کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُس سے ٹل نہیں سکتے، اُن کے مقدر میں یہ بات لکھی جاتی ہے۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ خود انبیاء کے منکرین کو استہزاء کا طریق سکھاتا ہے اور اُن کے دلوں میں یہ بات جما دیتا ہے، نقش کر دیتا ہے کہ تمہیں بہر حال میرے بھیجے ہوؤں سے مذاق کرنا ہے اور استہزاء اور تمسخر کا سلوک کرنا ہے تو اُن کا پھر کیا قصور۔ لیکن اس سوال کا جواب اسی آیت میں اس کے آخری حصے میں بیان فرما دیا گیا فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ہم یہ نصیبہ مجرموں کا بناتے ہیں۔ اس سے ایک بات خوب کھل گئی کہ جب خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو بھیجا کرتا ہے بنی نوع انسان کی اصلاح کے لیے تو دراصل وہ قوم مجموعی طور پر بحیثیت قوم مجرم ہو چکی ہوتی ہے۔ اُس میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں، استثناء بھی موجود ہوتے ہیں لیکن ایک بھاری تعداد اُس قوم میں جرم کرنے والوں کی ہوتی ہے۔

پس دراصل جرم کی سزا میں صداقت سے محرومی بھی شامل ہے۔ پس خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہوتا کہ ان لوگوں کو صداقت پہچاننے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ فرمایا وہ مجرم ہیں اور اس قسم کے مجرم ہیں کہ اُس جرم سے باز آنے والے نہیں۔

ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ وہ صداقت سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ پس اسی وجہ سے وہ صداقت سے محروم نہیں ہوتے کہ خدا تعالیٰ نے ان کے دل پر نقش کر دیا ہے کہ تم لازماً صداقت کا انکار کرو گے بلکہ جرم کے نتیجے میں یہ اُن کو سزا ملتی ہے۔ چنانچہ اس مضمون کو خوب کھول دیا لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وہ کبھی بھی اُس خدا کے بھیجے ہوئے پر ایمان نہیں لائیں گے وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اور ان سے پہلے ایسے لوگوں کی سنت گزر چکی ہے۔ جو کسی صورت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مرسلین اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان نہیں لائے اور اسی حالت میں وہ ہلاک ہو گئے۔ دوسرا پہلو وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ میں یہ مضمون بیان فرمایا گیا ہے کہ ان کا انکار اس وجہ سے نہیں کہ ان کو کوئی نشان نہیں دکھایا جاتا لیکن اس مضمون کے اس حصے کو میں بعد میں بیان کروں گا۔ پہلے اس پہلے حصے سے متعلق کچھ مزید باتیں میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں جیسا کہ میں نے بیان کیا تھا سنت میں دو پہلو ہیں۔ پہلوں کی سنت کیا ہے۔ وہ جو خود کرتے رہے تحقیر اور استہزاء اور تمسخر۔ یہ ایک ان کی سنت ہے اور ایک سنت وہ ہے جو خدا نے اُن پر جاری فرمائی اور وہ اُن کا بد انجام ہے۔

اس سے متعلق قرآن کریم میں متعدد آیات ہیں جو اس مضمون کو مختلف رنگ میں کھول کھول کر بیان فرما رہی ہیں جیسا کہ فرمایا قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ وہی لفظ سنت ہے جس کی جمع استعمال فرمائی گئی یہاں۔ فرمایا قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ[1] اس سے پہلے تم سے پہلے لوگوں کی سنّت تمہارے سامنے گزر چکی ہے اور اس سنّت کا ایک حصہ یعنی اُن کی کج روی، اُن کی بغاوت، اُن کا طغٰی یہ سب چیزیں تم پر روشن ہیں لیکن تم زمین پر پھر کے خوب سیر کر کے دیکھو تو سہی کہ اُن کی عاقبت کیسے ہوئی تھی۔ ان جھٹلانے والوں کا انجام کیا تھا۔ پس سنّت میں یہ دونوں باتیں داخل ہیں اُن کی بد اعمالی، اُن کا انکار اور پھر اُن کا انجام۔ چنانچہ سنن کے تابع ان

[1] آل عمران:۱۳۸

دونوں مضامین کو قرآنِ کریم میں یہاں اکٹھا بیان فرما دیا ہے پھر فرمایا قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ [1]۔

اے محمد ﷺ مخاطب حضور اکرمؐ ہیں۔ محمد کا نام تو ظاہر نہیں فرمایا گیا لیکن مراد یہی ہے کہ اے میرے رسول تو اُن سے کہہ دے، ان کو پیغام پہنچا دے سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ وہ خوب زمین میں سیر کریں اور پھر کر سیاحت کر کے پرانی قوموں کے انجام کا مشاہدہ کریں ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ پھر یہ دیکھیں سمجھیں کہ اس سے پہلے تکذیب کرنے والے جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا تھا پھر فرمایا۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ [2]

کہ ہم نے ہر امت میں رسول مبعوث فرمائے تھے اور ان کو یہ پیغام دیا تھا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو یعنی شیطانی طاقتوں سے الگ رہو فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ اُن میں سے بعض وہ تھے جن کو خدا نے ہدایت عطا فرمائی وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ایسے بھی تھے اُن میں جن پر گمراہی مقدر کر دی گئی جن کا مقدر ہو گئی گمراہی۔ حَقَّتْ کا مطلب ہے لازم ہو گئی۔ ایسی تقدیر بن گئی جسے ٹالا نہیں جا سکتا۔ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ

پس خوب زمین میں پھر کے سیاحت کر کے دیکھو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہے یا کیا انجام تھا۔ پھر بیان فرمایا فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ پس آج کے دن ہلاکت ہے سب جھٹلانے والوں کے لیے اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ [3] وہ جو اپنی سرکشی اور گمراہی میں بھٹک رہے ہیں۔

اس مضمون کو بیان کرنے کے لیے آج میری توجہ ایک رؤیا کے ذریعہ مبذول

---

[1] الانعام: ۱۲ [2] النحل: ۳۷ [3] الطور: ۱۳

کراوئی گئی ہے۔رات میں نے رؤیا میں دیکھا کہ کچھ انگریز احمدی بیٹھے ہوئے ہیں اور ان میں سے ایک مجھ سے سوال کرتا ہے کہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کسی تحریر کا جو آپ نے ترجمہ کیا ہے وہ مجھے درست معلوم نہیں ہوتا اور وہ ترجمہ یہ بیان کرتا ہے۔انگریزی کا ایک محاورہ ہے history repeats itself کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔اُس ترجمے میں اس محاورے کا پہلا حصہ استعمال کر کے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دوسرا نتیجہ نکالا ہوا ہے۔اردو میں بھی یہی ہے اور ترجمہ میں بھی یہی ہے کہ (اُن کے الفاظ اس قسم کے ہیں) تاریخ اپنے آپ کو ضرور دہراتی ہے اور خدا تعالیٰ مجرموں کو ضرور سزا دیتا ہے۔چنانچہ اس کا خواب میں مجھ پر یہ اثر ہے کہ میں نے ترجمہ کیا ہے کہ History repeats itself اور آگے مجھے یاد نہیں کہ الفاظ کیا تھے لیکن Punishment کے لفظ تھے یا کوئی اور لفظ تھے لیکن مضمون یہی تھا۔اس لیے چونکہ خواب کے انگریزی الفاظ یاد نہیں میں اس کو چھوڑتا ہوں لیکن بعینہٖ اس مضمون کو میں نے انگریزی میں بیان کیا یعنی اُس کے نزدیک میری تحریر میں یہ بات تھی۔وہ کہتا تھا History repeats کا یہ مطلب تو نہیں ہے۔یعنی اعتراض یہ تھا کہ تم نے History repeats کا دوسرا معنی کر دیا ہے حالانکہ اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے۔کچھ دوسرے انگریز احمدی ہیں وہ میری تائید میں بولتے ہیں۔وہ کہتے ہیں نہیں بالکل صحیح ہے، اس موقع پر یہی محاورہ استعمال ہونا چاہئے تھا۔پھر میں اُس کو سمجھاتا ہوں اور میں اُسے کہتا ہوں دیکھو تم لوگوں کا جو دنیاوی محاورہ ہے وہ درحقیقت ایک سطحی بات تھی۔اُس میں فی الحقیقت کوئی بھی ٹھوس مضمون بیان نہیں ہوا بلکہ اس کے نتیجے میں ابہام پیدا کر دیا گیا ہے۔

بہت سے لوگ اس محاورہ کو سنتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ گویا تاریخ بعینہٖ دوبارہ اپنے آپ کو دہراتی چلی جاتی ہے کوئی نئے نقوش دنیا میں ظاہر ہی نہیں ہوتے۔ہمیشہ وہی چکر ہے جو اپنے آپ کو دوبارہ ظاہر کرتا چلا جاتا ہے۔

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس محاورے میں جان ڈال دی ہے یہ متوجہ فرما کر کہ تاریخ اس طرح دہرایا کرتی ہے کہ خدا کی کچھ سنتیں ہیں جن میں تم کوئی تبدیلی نہیں دیکھو گے اور بدکرداروں اور مجرموں کے حق میں وہ سنتیں اس طرح ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ اس لیے اس story کو تم کبھی بھی تبدیل نہیں کر سکتے یہ بہر حال اپنے آپ کو دہرائے گی۔ تو میں دیکھتا ہوں وہ جو تائید میں بولنے والے تھے ان کے چہرے بشاشت میں کھلکھلا اٹھتے ہیں کہ ہاں اب سمجھ آئی کہ یہ مضمون کیا ہے اور جن کی طرف جو ایک صاحب اعتراض کر رہے تھے ان کے اندر بھی اعتراض میں گستاخی نہیں تھی بلکہ ایک پوچھنے کا رنگ تھا۔ اُن کے چہرے پر اُس طرح بشاشت تو نہیں آئی لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بات سمجھ گئے ہیں۔

اس رؤیا سے مجھے خیال آیا کہ اس مضمون کے متعلق میں آج آپ کے سامنے کچھ بیان کروں اور آپ کو دعا کی طرف متوجہ کروں کیونکہ یہ بہت انذاری رؤیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قوم کو آج ہم مخاطب کر رہے ہیں، جس کو ہم نے مباہلے کی دعوت دی ہے بدقسمتی سے اُن کے مقدر میں خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا دن دیکھنا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ اس طرح میرے ذریعے پیغام نہ دیتا History repeats itself اس میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھو گے، مجرموں کو خدا ضرور سزا دے گا۔ اس لیے وہ آیات جو میں نے آپ کے سامنے پڑھ کر سنائی ہیں یہ وہی تاریخ ہے جو دہرائی جا رہی ہے جس کا ذکر خدا تعالیٰ قرآن کریم میں بار بار ذکر فرماتا ہے قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ اور تم خوب دنیا میں سیاحت کرو اور گھوم پھر کے دیکھو۔ تم دیکھو گے کہ مکذبین کی عاقبت اُن کا انجام بہت برا ہے۔ كَيْفَ میں یہ نہیں فرمایا کہ برا ہے مگر جب ایک چیز بہت ہی زیادہ درجے تک پہنچ جائے تو وہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑا کرتی کے برا ہے یا اچھا ہے لفظ كَيْفَ ہی بتا دیتا ہے کہ دیکھو دیکھو کیسا اُن کا انجام ہے۔ پس جب بدی حد کو پہنچ جائے تو اس

کے لیے لفظ کَیۡفَ ہی استعمال ہوگا اور جب کوئی خوبی حد کو پہنچ جائے تو اُس کے لیے بھی لفظ کَیۡفَ ہی استعمال ہوگا لیکن دوسری آیت جو الطّور کی ہے اُس نے اس مضمون کو اور بھی کھول دیا۔ بیان فرمایا۔ فَوَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ہلاکت ہے اس دن اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے تکذیب کی راہ اختیار کی ہے۔

ان آیات پر غور کرتے ہوئے انسان کا ذہن اس طرف بھی منتقل ہوتا ہے کہ سارے قرآن میں کہیں مومنین کے لیے ہلاکت کا ذکر نہیں آیا خواہ وہ غلط ہی ایمان لانے والے ہوں۔ ڈرایا گیا ہے مکذّبین کو اُن کی تکذیب سے اور کہیں یہ نہیں فرمایا گیا کہ دیکھو غلطی سے فلاں لوگ ایمان لے آئے تھے ہم نے اُن کو ہلاک کر دیا ہے۔ غلطی سے وہ لوگ ایک جھوٹے کو سچا سمجھ بیٹھے تھے ہم نے اُن کو تباہ کر دیا ہے۔ سارے قرآن میں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ جس میں خدا تعالیٰ نے اس صورت حال سے متنبہ فرمایا ہو کہ دیکھو فلاں قوم نے غلطی سے ایک ایسے شخص کو قبول کر لیا تھا جس کو میں نے نہیں بھیجا تھا اور دیکھو وہ کس طرح ہلاک کئے گئے اور کس طرح تباہ کئے گئے۔ یہ خدا تعالیٰ کی رحمت اور اس کی شان ہے ایمان لانے والا اگر سچے دل سے ایمان لاتا ہے تو اس کے لیے کوئی خوف نہیں اور کوئی ہلاکت نہیں لیکن تکذیب کرنے والے کے لیے ہلاکتیں ہیں اور متعدد بار ان ہلاکتوں کا قرآنِ کریم میں اس طرح کھول کھول کر ذکر فرمایا گیا ہے کہ کسی پر یہ مضمون مشتبہ نہیں رہنا چاہئے[1]۔

---

[1] خطبات طاہر جلد ۷ صفحہ ۵۴۷ تا ۵۵۳ خطبہ بیان فرمودہ مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۸۸ء

تیسرا عظیم الشان موعود جس کے ظہور کی پیشگوئیاں کتب سابقہ اور اسلام کے دینی ادب میں بکثرت موجود ہیں وہ ''مسیح موعود'' ہے لیکن قبل اس کے کہ ان پیشگوئیوں اور دلائل کو زیر بحث لایا جائے جن کا تعلق ''مسیح موعود'' کی صداقت سے ہے ایک ''بنیادی اُصول'' کو بیان کرنا ضروری ہے جس میں یہ وضاحت ہے کہ ماموریت کے دعویداران کو اگر لوگ سچا نہیں سمجھتے تو وہ ان کے ساتھ کیا رویہ اور سلوک اختیار کریں۔ قرآن کریم نے اس ''الٰہی اُصول'' کو ایک واقعہ کی شکل میں بیان کیا ہے جس کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو آپ کی سخت مخالفت شروع ہوگئی اس پر قوم کے ایک سمجھ دار فرد نے نصیحت کے رنگ میں مخالفین سے کہا کہ موسیٰ نے ایک دعویٰ کیا ہے وہ اس دعویٰ کو لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے اس سلسلہ میں نہ وہ تشدد سے کام لیتا ہے اور نہ ہی بغاوت اور فساد پر اُکساتا ہے صرف وعظ و تلقین کی راہ اختیار کئے ہوئے ہے اس دعویٰ میں اگر وہ جھوٹا ہے تو اس جھوٹ کی سزا اُسے خدا دے گا وہ خود پکڑا جائے گا اور خدا تم سے یہ نہیں پوچھے گا کہ تم نے اس جھوٹے کی مخالفت کیوں نہیں کی تھی لیکن اگر وہ سچا ہے تو پھر مخالفت کر کے تم مارے جاؤ گے خدا کی گرفت سے تم بچ نہیں سکو گے۔ پس اگر وہ سچا ہے تو وہ ضرور کامیاب ہوگا اور تم ناکام رہو گے[1]۔

یہ قرآنی اُصول ہر اُس مدعیِ نبوت اور ماموریت سے متعلق دائمی ہے جس نے اپنے مشن کی بنیاد حکمت و موعظت پر رکھی ہو۔

اس اصولی وضاحت کے بعد سب سے پہلے ہم انجیل کی بعض پیشگوئیوں کو پیش کرتے ہیں جن کا تعلق مسیح موعود کی بعثت سے ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام اپنی دوبارہ آمد کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

''میں تمہیں یتیم نہ چھوڑوں گا۔ میں تمہارے پاس آؤں گا.......تم سن چکے ہو کہ میں نے تم سے کہا کہ جاتا ہوں اور تمہارے پاس پھر آتا ہوں''[2]۔

پھر انجیل متی کے مطابق مسیحؑ نے فرمایا۔

---

[1] اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ۔ (المؤمن:۲۹)

[2] یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۸ تا ۲۸

''جیسا کہ نوح کے دنوں میں ہوا ویسا ہی ابن آدم کے آنے کے وقت ہوگا کیونکہ جس طرح طوفان سے پہلے کے دنوں میں لوگ کھاتے پیتے اور بیاہ شادی کرتے تھے اُس دن تک کہ نوح کشتی میں داخل ہوا اور جب تک طوفان آ کر اُن سب کو بہا نہ لے گیا ان کو خبر نہ ہوئی اسی طرح ابن آدم کا آنا ہوگا..... پس جاگتے رہو کیونکہ تم نہیں جانتے تمہارا خداوند کس دن آئے گا....... جس گھڑی تم کو گمان بھی نہ ہوگا ابن آدم آجائے گا''[1]۔

کتاب اعمال میں مسیح کے دوبارہ آنے کی یہ پیشگوئی اس طرح ہے

''توبہ کرو اور رجوع لاؤ کہ تمہارے گناہ مٹائے جائیں اور اس طرح خداوند کے حضور سے تازگی بخش ایام آئیں اور وہ یسوع مسیح کو پھر بھیجے جس کی منادی تم لوگوں کے درمیان آگے سے ہوئی۔ ضرور ہے کہ وہ آسمان میں اس وقت تک رہے جب تک کہ وہ سب چیزیں بحال نہ کی جائیں جن کا ذکر خدا نے اپنے پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا ہے اپنی حالت پر آویں کیونکہ موسیٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے ایک نبی میری مانند اٹھاوے گا جو کچھ وہ تمہیں کہے اُس کی سب سنو۔ اور ایسا ہوگا کہ ہر نفس جو اُس نبی کی نہ سنے وہ قوم میں سے نیست کیا جائے گا بلکہ سب نبیوں نے سموئل سے لے کر پچھلوں تک جتنوں نے کلام کیا اِن دنوں کی خبر دی ہے۔ تم نبیوں کی اولاد اور اُس عہد کے ہو، جو خدا نے باپ دادوں سے باندھا ہے جب ابراہام سے کہا کہ تیری اولاد سے دنیا کے سارے گھرانے برکت پاویں گے۔ تمہارے پاس خدا نے اپنے بیٹے یسوع کو اٹھا کے پہلے بھیجا کہ تم میں سے ہر ایک کو اُس کی بدیوں سے پھیر کے برکت دے''[2]۔

بائبل کی یہ پیشگوئیاں اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل واضح ہیں لیکن اس کے باوجود مسیح کے ماننے والوں کا طرزِ عمل وہی ہے جو مسیح کے وقت کے لوگوں کا تھا کیونکہ یہ لوگ بھی مسیح کے دوبارہ

---

[1] متی باب ۲۴ آیت ۳۷ تا ۴۴ [2] اعمال باب ۳ آیت ۱۹ تا ۲۶۔ اس پیشگوئی میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت اولیٰ اور بعثت ثانیہ دونوں کا ذکر ہے جیسا کہ قرآن کریم کی سورۃ الجمعہ آیت نمبر ۴ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔

آنے کے مفہوم اور اُس کے تمثیل ہونے کے معنے کو نہ سمجھ سکے اور یہ عقیدہ بنالیا کہ ان پیشگوئیوں کے مطابق مسیح نے خود دوبارہ آنا ہے حالانکہ جب سے دنیا آباد ہوئی ہے اُسی وقت سے الٰہی سنت یہی رہی ہے کہ جو گیا وہ واپس نہیں آیا اور کسی نے کسی کو وفات کے بعد دوبارہ آسمان سے اترتے نہیں دیکھا۔حضرت ایلیا کے آسمان سے اترنے کی پیشگوئی بائبل میں موجود ہے لیکن خود مسیح نے اس کی یہ تشریح فرمائی کہ خود ایلیا دوبارہ نہیں آئے گا بلکہ اُس کے آنے سے مراد اُس کے مثیل یحییٰ کا آنا ہے جو ایلیا کی خُوبُو لے کر آیا ہے۔ایسا ہی مسیح کے ماننے والوں نے ''محمد یم۔ مُنْحَمَنَّا اور روح حق کو نہ پہچانا اور نہ اُن کے بھائیوں میں سے'' کے مفہوم کو سمجھے اور نہ دس ہزار قدوسیوں کے معنوں پر غور کیا اور کہا تو یہی کہا کہ ''وہ نبی'' ابھی تک نہیں آیا۔اب یہی غلطی اُن سے اِس زمانہ میں بھی ہوئی اور مسیح کے دوبارہ آنے کے مفہوم کو غلط سمجھا ....جس نے آنا تھا وہ تو وقت پر ضرورت کے عین مطابق آ گیا اور اب تا قیامت وہ کسی کو آسمان سے اترتے نہیں دیکھیں گے......
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا [1]۔

اب ہم اس سوال کو لیتے ہیں کہ مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کسی عظیم مصلح اور مسیح کے آنے کے بارہ میں اسلام کیا کہتا ہے اور اس زمانہ کے لوگوں کو کس حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے ۔اس تعلق میں جو اصول وہدایات اور جو پیشگوئیاں اور روایات اسلام کی چودہ سو سالہ دینی کتب میں تواتر کی حد تک موجود ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

اسلام بھی یہی کہتا ہے اور دنیا کے تمام سنجیدہ اور دیندار لوگ بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ جب بھی دنیا میں فساد بڑھا،انسانی اقدار کو خطرہ لاحق ہوا مذہبی انارکی کا غلبہ ہوا۔اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اُس کے تدارک کے سامان کئے،اپنے مامور بھیجے اور اُن کے ذریعہ پھر سے اصلاح کی ایک نئی زمین اور ہدایت کا ایک نیا آسمان معرض ظہور میں آیا [2]۔

خداوند تعالیٰ کے یہ مرسل اور مامور دو قسم کے ہوئے ہیں ایک وہ جو آسمان سے ایک نیا قانون اور ایک نئی شریعت لائے،ایک نئے تمدن اور ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی اور ایک نئی اُمت اور ایک نئی قوم بنائی ۔اس قسم کے مامورین اور مرسلین کا سلسلہ حضرت آدم یا حضرت نوح علیہما السلام سے

---

[1] الاحزاب:۶۳ [2] البقرۃ:۳۹ و ال عمران :۸۲

شروع ہوا اور سردار دو عالم حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفی صلے اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ آپ کی شریعت آخری شریعت ہے، آپ کی اُمّت آخری اُمّت ہے، آپ کا کلمہ آخری کلمہ ہے، آپ پر نازل شدہ قرآن کریم خداوند تعالیٰ کا آخری شرعی کلام ہے اس کے بعد آسمان سے کوئی اور کتاب احکام نازل نہ ہو گی[۱]۔

دوسری قسم میں وہ مرسلین اور مامورین شامل ہیں جو شارع نبی کے تابع ہو کر آتے ہیں۔ اُس کی شریعت کی پیروی کرتے ہیں اور اُس کی امت میں جو خرابیاں امتداد زمانہ کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں ان کی اصلاح کرتے ہیں۔ افراد امت کے ایمانوں کو تازہ کرتے ہیں۔ اپنے ذاتی نمونہ اور نشانات اور مبشرات کے ذریعہ لوگوں کی عملی حالت کو درست کرتے ہیں شریعت کے صحیح منشاء کی وضاحت کرتے ہیں اور دین کی خاطر قربانیاں پیش کرنے کے صحیح رُخ کی تعیین کرتے ہیں اور امت کے منتشر لوگوں کو ایک نقطہ پر جمع کر کے ان کی امامت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں اور لفظی اور زبانی مسلمانوں کو حقیقی مسلمان بناتے ہیں[۲]۔

غرض ان کی کوششیں شریعت کے اندر اُس کے قیام اور اُس کی برکات کی توسیع اور اتحاد اُمت کے عظیم مظاہر پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ایسے مأمورین اور مرسلین کی پیروی میں برکات ہیں۔ خدا کی رضا ہے۔ شریعت کی عملی تفسیر کا اتباع ہے نیز ان کو ماننے والے اخلاص کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں لیکن امت کے جو لوگ ایسے مأمورین کو نہیں مانتے اور ان کا انکار کرتے ہیں۔ وہ اگرچہ دائرہ امت سے خارج نہیں ہوتے لیکن جماعت کے لئے ان کا وجود غیر اہم ہو جاتا ہے۔

وہ اتحاد عملی اور نفاذ شریعت کی متحدہ کوششوں کی برکات سے محروم رہتے ہیں اور اُن کی ساری سرگرمیاں اخلاص کی دولت اور رضائے الٰہی کی نعمت سے خالی ہوتی ہیں اور دنیا طلبی ان کا نشان بن جاتی ہے[۳]۔

سابقہ امتوں میں ایسے مأمورین کی مثال کے لئے حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت

---

۱ المائدۃ:۴، البقرۃ:۸۸، الانعام:۸۵تا۹۱

۲ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں ''ہم کسی کلمہ گو کو اسلام سے خارج نہیں کہتے''۔ (ملفوظات جلد ۱۰ صفحہ ۳۷۶۔ مطبوعہ الشرکۃ الاسلامیۃ)

۳ البقرۃ:۱۰۳و۲۰۱۔ ال عمران:۷۸۔ البقرۃ:۲۸۶ نفس مضمون

ہارونؑ ،حضرت سلیمانؑ اور حضرات دانیالؑ وغیرہ کا نام پیش کیا جا سکتا ہے ۔امت محمدیہ میں ایسے ہادیوں کو قرآن کریم نے بالعموم خلفاء اور اولیاء کا نام دیا ہے اور ان کے اور نام بھی گنوائے ہیں لیکن جہاں تک اُن کے مقام اور کام کا تعلق ہے جس طرح ان کے ہادیٔ اعظم ؐسرور دو عالم اور خاتم الانبیاء اور قرب الٰہی کے بلند تر مقام پر فائز ہیں اسی طرح آپ کی امت **خیر الامم** اور اُس کے امام **خیر الائمہ** اور **رئیس الخلفاء** ہیں کیونکہ جہاں تک عہدنامہ قدیم اور عہدنامہ جدید یعنی بائبل اور یہود ونصاریٰ کی دینی تاریخ کا تعلق ہے وہ کارنامے جو انبیائے بنی اسرائیل سے ظاہر ہوئے اُن سے بڑھ کر حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت نے سرانجام دیئے انہی رفعتوں اور سربلندیوں کی وجہ سے آپ **خیر الرسل** اور آپ کی امت **خیر الامم** کہلائی ۔امام الزمان حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ۔

ہم ہوئے خیرِ اُمم تجھ سے ہی اے خیرِ رسل　　　تیرے بڑھنے سے قدم آگے بڑھایا ہم نے

آپ علیہ السلام فرماتے ہیں ۔

> اس امت میں آج تک ہزارہا اولیاء اللہ صاحب کمال گزرے ہیں جن کی خوارق اور کرامات بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ثابت اور متحقق ہو چکی ہیں اور جو شخص تفتیش کرے اس کو معلوم ہوگا کہ حضرت احدیت نے جیسا کہ اس امت کا خیر الامم نام رکھا ہے ایسا ہی اس امت کے اکابر کو سب سے زیادہ کمالات بخشے ہیں جو کسی طرح چھپ نہیں سکتے [۱]۔

اسی حقیقت کی طرف رہنمائی حضرت محمد باقرؒ کی اس تفسیر سے ملتی ہے جو آپ نے آیہ کریمہ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا [۲] کے سلسلہ میں بیان فرمائی آپ فرماتے ہیں:۔

> جَعَلَ (اللّٰهُ) مِنْهُمُ الرُّسُلَ وَ الْاَنْبِيَاءَ وَ الْاَئِمَّةَ فَكَيْفَ يُقِرُّوْنَ فِيْ آلِ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ يُنْكِرُوْنَ فِيْ آلِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ [۳]۔

---

۱ براہین احمدیہ ہر چہار حصص ۔روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۵۳ حاشیہ نمبر ۴　　۲ النسآء:۵۵

۳ الصافی شرح اصول الکافی جلد ۳ صفحہ ۱۱۹

یعنی اللہ تعالیٰ نے آل ابراہیمؑ میں سے رسول، نبی اور امام بنائے لیکن عجیب بات ہے کہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی برکات اور ایسے درجات کے موجود ہونے کا لوگ انکار کرتے ہیں۔

حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

أُوْتِيَ الْاَنْبِيَاءُ اِسْمَ النُّبُوَّةِ وَ أُوْتِيْنَا اللَّقْبَ أَيْ حُجِرَ عَلَيْنَا اِسْمُ النُّبُوَّةِ مَعَ اَنَّ الْحَقَّ تَعَالٰى يُخْبِرُنَا فِيْ سَرَائِرِنَا بِمَعَانِيْ كَلَامِهٖ وَ كَلَامِ رَسُوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيُعْتَبَرُ صَاحِبُ هٰذَا الْمَقَامِ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ الْاَوْلِيَاءِ[1]۔

یعنی سابقہ امتوں کے بزرگ ''نبی'' کے نام سے پکارے جاتے تھے اور ہمیں یہی لقب اور مقام تو حاصل ہے لیکن (بعض حکمتوں کے تحت) یہ نام ہمارے لئے استعمال نہیں ہوا باوجود اس کے کہ قرآن کریم کے معانی حق تعالیٰ کے حضور سے ہمیں القاء ہوتے ہیں اور اُس کے رسولؐ کے کلام کو سمجھنے کے لئے ہمیں آسمان سے رہنمائی ملتی ہے اور اسی وجہ سے امت محمدیہ میں اس مقام کے حاملین اَلْاَنْبِيَاءُ الْاَوْلِيَاء کہلاتے ہیں[2]۔

حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ امت محمدیہ کے متعدد افراد کو ''نبوّتِ مبشّرات'' کا مقام حاصل ہے[3]۔ جیسا کہ ایک حدیث بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ یعنی نبوت تشریعات تو ختم ہوگئی ہے لیکن نبوت مبشرات جاری وساری ہے۔

یہ نظریہ قرآن کریم کی متعدد آیات اور مستند احادیث پر مبنی ہے جن میں سے چند یہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَ

---

[1] اليواقيت و الجواهر للشعراني جلد۲ صفحه ۲۵ المطبعة الازهرية المصرية ۱۳۰۶ھ طبع دوم. الانسان الكامل في معرفة الاواخر والاوائل للسيد عبد الكريم الجيلي. البحث الخامس والثلاثون في محمد صلى الله عليه وسلم خاتم النبيين كما صرح به القرآن. جلد ۲ صفحه ۱۰۹ ۔مطبوعہ ۱۳۰۰ھ۔

[2] اسی مقام کا دوسرا نام ''امتی نبی'' بھی ہے۔

[3] حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام سے ایک مرتبہ سوال کیا گیا کہ کیا ایک ہی وقت میں کئی نبی ہو سکتے ہیں؟ فرمایا۔ ہاں۔ خواہ ایک ہی وقت میں ہزار بھی ہو سکتے ہیں مگر چاہئے ثبوت اور نشان صداقت۔ (ملفوظات جلد ۱۰ صفحہ ۲۸۱ مطبوعہ الشرکۃ الاسلامیہ)

حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا[1]۔

یعنی جولوگ اللہ اوراس رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان انعام پانے والے لوگوں میں شامل ہوں گے جو (علیٰ حسب المراتب) نبی، صدیق، شہید اور صالح ہیں اور یہ کتنی عمدہ رفاقت اور گروپنگ ہے[2]۔سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل پر مبنی ہے اور صورت واقعی کے لئے اللہ کی یہ (فعلی) شہادت کافی (وزنی اور بڑی کامل) ہے۔

قرآن کریم کی یہ آیات دراصل اُس سوال کا جواب ہیں جو سورۂ فاتحہ میں سکھائی گئی دعا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ[3] کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ **منعم علیھم** کون ہیں جن کے راستہ پر چلنے کے لئے یہ دعا سکھائی جارہی ہے۔سو ان آیات میں اس سوال کا جواب دیا گیا کہ وہ **منعم علیھم** نبی، صدیق، شہید اور صالح ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس رسول کی سچی پیروی کرنے والے امت محمدیہ کے افراد یہی انعام پائیں گے اور یہی درجات حاصل کریں گے۔

سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ[4]۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے اور (ایمان کے تقاضا کے مطابق) مناسبِ حال عمل کئے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اُن سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا اور جو دین اُس نے اُن کے لئے پسند کیا ہے اُسے ان کے لئے مضبوط اور مستحکم کردے

---

[1] النساء: ۷۰،۷۱

[2] اس وضاحت سے ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کا یہ اعتراض درست نہیں کہ احمدیوں کے نزدیک محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی روحانیت ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔(حرف اقبال صفحہ ۱۵۰،۱۵۱)

[3] الفاتحۃ: ۶،۷ [4] النور: ۵۶

گا اور اُن کے خوف کو امن کے حالات میں تبدیل کر دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں بنائیں گے اور جو لوگ اس (نشان کو دیکھنے) کے بعد بھی (ان خلفاء کا) انکار کریں گے وہ فاسق اور نافرمان شمار کئے جائیں گے[1]۔

اس آیت کریمہ میں یہ وضاحت موجود ہے کہ جو جو روحانی اور دُنیوی نعمتیں اور درجات پہلے لوگوں کو ملے وہی نعمتیں اور وہی درجات امت محمدیہ کے پاک اور صالح لوگوں کو ملیں گے۔ ایک ذرہ بھی کمیت میں فرق نہیں ہوگا اور کیفیت میں تو وہ اُن سے کہیں بڑھ کر ہوں گے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ امت محمدیہ نے اگرچہ پہلوں کے مقابلہ میں نسبتاً قربانیاں پیش کرنے میں کم وقت لیا ہے لیکن پھل بہت جلد پایا ہے اور بہت زیادہ پایا ہے اور جب پہلی قوموں نے خدا کے حضور اس کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا تمہارے کام کا جو معاوضہ مقرر ہوا تھا اس میں تو کوئی کمی نہیں ہوئی۔ رہا امت محمدیہ کا انعام تو ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا یہ میرا فضل ہے جسے چاہوں دوں[2]۔

آیت خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ سے بھی انہی معنوں کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ یہاں خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ سے مراد ایسے وجود کا ظہور ہے جس کا فیضان سب پر حاوی ہے پہلوں نے بھی اُسی کے طفیل فیض پایا اور پچھلے بھی اُسی کے ذریعہ فیضان کے سب درجات حاصل کریں گے۔

امام الزمان حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔

''وہ خاتم الانبیاء بنے مگر ان معنوں میں نہیں کہ آئندہ کوئی روحانی فیض نہیں ملے گا بلکہ ان معنوں سے کہ وہ صاحب خاتم ہے بجز اُس کی مہر کے کوئی فیض کسی کو نہیں پہنچ سکتا اور اُس کی امت کے لئے قیامت تک مکالمہ اور مخاطبہ الٰہیہ کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوگا اور بجز اُس کے کوئی نبی صاحب خاتم نہیں ایک وہی ہے جس کی مہر سے ایسی نبوت

---

[1] اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو کلمہ گو امت محمدیہ کے خلفاء کا انکار کرتا ہے اس کا یہ کفر مُکَفِّر دُوْنَ مُکَفِّر کے درجہ میں ہے اور وہ امت کے دائرہ سے خارج نہیں ہوتا اگرچہ وہ فاسقوں، قانون شکن اور نافرمانوں کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

[2] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب من ادرک رکعۃً من صلوٰۃ العصر قبل الغروب

بھی مل سکتی ہے جس کے لئے اُمتی ہونا لازمی ہے"۔[1]

ایک دوسرے موقع پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے لفظ "نبی" کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

"نبی کا لفظ نَبَأٌ سے نکلا ہے اور نَبَأٌ کہتے ہیں خبر دینے کو اور نبی کہتے ہیں خبر دینے والے کو یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک کلام پا کر جو غیب پر مشتمل زبردست پیشگوئیاں ہوں۔ مخلوق کو پہنچانے والا اسلامی اصطلاح کی رو سے نبی کہلاتا ہے۔......
یاد رکھو کہ سلسلہ مکالمہ مخاطبہ اسلام کی روح ہے ورنہ اگر اسلام کو یہ شرف حاصل نہ ہوتا تو یقیناً اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح ایک مردہ مذہب ہوتا"۔[2]

آپ ایک اور موقع پر فرماتے ہیں۔

"ہم اس بات کے قائل ہیں کہ خدا تعالیٰ کے مکالمات ومخاطبات اس امت کے لوگوں سے قیامت تک جاری ہیں۔ اور یہ بالکل سچ ہے کیونکہ یہی تمام اولیاء اُمت کا مذہب رہا ہے"۔[3]

عرفان کی وادیوں کے شناسا سابقہ بزرگ بھی اسی نظریہ کی تصدیق کرتے ہیں چنانچہ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں

"مَعْنٰی قَوْلِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ الرِّسَالَۃِ وَ النُّبُوَّۃَ قَدِ انْقَطَعَتْ فَلَا رَسُوْلَ بَعْدِیْ وَلَا نَبِیَّ اَیْ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ یَکُوْنُ عَلٰی شَرْعٍ یُخَالِفُ شَرْعِیْ بَلْ اِذَا کَانَ یَکُوْنُ تَحْتَ حُکْمِ شَرِیْعَتِیْ ...... فَھٰذَا ھُوَ الَّذِیْ اِنْقَطَعَ وَ سُدَّ بَابُہٗ لَا مَقَامَ النُّبُوَّۃِ"۔[4]

یعنی وہ نبوت جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگئی ہے وہ تشریعی نبوت ہے اس لئے آپ کے بعد جو نبی ہوگا وہ آپ کی شریعت کے تابع ہوگا پس نبوت تشریعی منقطع ہوئی ہے مقام نبوت ختم نہیں ہوا کیونکہ نبوت کی یہ قسم امت میں جاری اور ساری ہے۔

اسی طرح امام عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں۔

"اِعْلَمْ اَنَّ النُّبُوَّۃَ لَمْ تَرْتَفِعْ مُطْلَقًا بَعْدَ مُحَمَّدٍ ﷺ وَ اِنَّمَا اِرْتَفَعَ نُبُوَّۃُ التَّشْرِیْعِ فَقَطْ"۔[5]

---

1. حقیقۃ الوحی روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۲۹، ۳۰ 2. ملفوظات جلد ۱۰ صفحہ ۲۶۷ تا ۲۶۹ مطبوعہ الشرکۃ الاسلامیہ ربوہ
3. ملفوظات جلد ۱۰ صفحہ ۳۷۳ مطبوعہ الشرکۃ الاسلامیہ ربوہ 4. فتوحات مکیہ جلد ۲ صفحہ ۳ مطبوعہ دار صادر بیروت
5. الیواقیت و الجواھر جلد ۲ صفحہ ۲۴ مطبع منشی نولکشور آگرہ

یعنی مطلق نبوت (جو کثرت مکالمہ ومخاطبہ کا نام ہے) مرتفع نہیں ہوئی ۔ جو نبوت ختم اور منقطع ہوئی ہے وہ تشریعی نبوت ہے۔

امام ربّانی حضرت مجدد الف ثانیؒ اور امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کا نظریہ بھی یہی ہے[1]۔

مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحی فرنگی محلّی لکھتے ہیں۔

''بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے یا زمانے میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مجرد کسی نبی کا ہونا محال نہیں بلکہ صاحب شرع جدید ہونا البتہ ممتنع ہے''[2]۔

مراتب قرب الٰہی کی اس بحث کے بعد اب طبعًا یہ مرحلہ سامنے آتا ہے کہ اسلام میں ایک عظیم الشان ظہور یعنی مسیح اور مہدی کی آمد کا جو عقیدہ اور نظریہ مشہور ہے وہ اپنے اندر کیا صداقت رکھتا ہے اور اُس کی ماہیت اور حقیقت کیا ہے اور اس بارہ میں جو روایات ہیں ان کا معیار صداقت کس حد تک ثقہ مستند اور وزنی ہے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ متعدد مسائل اپنے اصل کے لحاظ سے بڑے سادہ اور واضح المفہوم ہوتے ہیں لیکن بعد میں ان کے بارہ میں جو فلسفیانہ حاشیہ آرائی ہوتی ہے وہ انہیں مشکل اور گنجلک بنا دیتی ہے مثلاً ہستی باری تعالیٰ، اس کی توحید اور اس کی صفات کا عقیدہ کتنا سادہ اور عام الفہم ہے۔ اسے ہر فرد بشر جان سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے کہ اس کائنات کو پیدا کرنے والی ایک ہستی ہے۔ وہ بڑی طاقتور ہے، وہ ایک ہے اور تمام اعلیٰ صفات سے متصف ہے لیکن جب اس عقیدہ میں فلسفیانہ بحثیں شامل ہوئیں تو یہ مسئلہ اتنا الجھا کہ چیستان بن کر رہ گیا۔ کسی نے کہا وہ ایک بھی ہے اور اسی وقت وہ تین بھی ہے۔ کوئی کہنے لگا وہ اور کائنات ایک ہی وجود کے مختلف مظہر ہیں۔ کوئی کہنے لگا وہ اگر بولتا ہے تو اُس کا منہ بھی ہوگا۔ اُس کی شکل بھی ہوگی، اُس کا چہرہ ہے، آنکھیں ہیں، کان ہیں، ہاتھ ہیں، وہ آسمان پر ہے یا کائنات میں سمایا ہوا ہے۔ غرض سینکڑوں نظریات نے اس مسئلہ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ یہی حال مافوق الطبعیات سے تعلق رکھنے والے ہر سوال کا ہے اور مسیح اور مہدی کے آنے کا عقیدہ بھی اس دائرہ سے باہر نہیں۔

---

[1] مکتوبات امام ربانی مکتوب نمبر ۳۰۱ جلد ۱ صفحہ ۴۳۲۔ تفہیمات الٰہیہ صفحہ ۵۳۔ تحذیر النّاس صفحہ ۳

[2] دافع الوسواس فِیْ آثَرِ ابنِ عبّاس صفحہ ۱۶ مطبوعہ مطبع یوسفی فرنگی محل لکھنؤ۔ طبع دوم

یہ حقیقت تو تسلیم کی جانی چاہئے کہ اسلام کے آغاز سے لے کر اب تک تمام مستند اسلامی لٹریچر خواہ قرآن کریم ہو یا سنت و حدیث تاریخ ہو یا علم العقائد کا کوئی مجموعہ یہ سب اس نظریہ کے ذکر سے خالی نہیں کہ آئندہ زمانہ میں ایک عظیم الشان ظہور اور ایک روحانی قیادت دنیا میں ابھرے گی جو مسلمانوں کے تنزل کا مداوا کرے گی اور اسلام کی ترقی اور اس کا دوبارہ عروج اُس کے پروگرام اور اس کی پیروی سے وابستہ ہوگا۔ امت مسلمہ کے تمام مفسرین، تمام محدثین، تمام متکلمین کا اس پر اتفاق ہے۔ اسی طرح تمام فقہاء اور صوفیاء بھی اس بارہ میں متفق ہیں۔ اصل عقیدہ میں کوئی اختلاف نہیں، اختلاف اگر ہے تو فروعات میں ہے، تفاصیل میں ہے۔ مثلاً یہ کہ یہ ظہور اور یہ قیادت ایک شخصیت کی صورت میں ہوگی یا اس کے لئے دو الگ الگ وجود ہوں گے۔ وہ کسی خاص خاندان سے ہوگا یا امت مسلمہ کے اندر کسی بھی قوم سے وہ ہوسکتا ہے۔ وہ آسمان سے نازل ہوگا یا زمین پر کسی مسلمان کے گھر پیدا ہوگا۔ اس کا اور اس کے باپ کا نام کیا ہوگا، وہ کہاں اور کس شہر میں ظاہر ہوگا۔ وہ کافروں اور منکروں کو زبردستی مسلمان بنائے گا یا وہ آسمانی حربوں سے کام لے گا اور حکمت و موعظہ کی راہ اختیار کرے گا۔

غرض سینکڑوں اختلاف ہیں اور ہوسکتے ہیں لیکن ایک حقیقت پر سب کا اتفاق ہے کہ ایسا ظہور اٹل اور مقدر رہے، آسمان و زمین ٹل سکتے ہیں لیکن یہ عظیم ظہور نہ رک سکتا ہے اور نہ ٹل سکتا ہے [1]۔

اب ہم اس اہم نظریہ کے اس پہلو پر بحث کرتے ہیں کہ یہ عظیم الشان قیادت ایک شخصیت کی صورت میں دنیا کے سامنے آئے گی یا دو وجودوں نے ظاہر ہونا ہے یا اس کے مظہر متعدد وجود ہوں گے۔

مہدی کا عام مفہوم یہ ہے کہ ایسے ہدایت یافتہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کی خاص نظر ہو اور وہ آسمانی ہدایت سے فیضیاب ہوں اور اللہ تعالیٰ ان سے اصلاح خلق کا کوئی غیر معمولی کام لے گویا وہ آسمان سے ہدایت پاتے ہیں اور اس کے اشارہ کے مطابق زمین کے لوگوں کے لئے ہادی اور نمونہ بنتے ہیں۔ مہدویت کے اس عام مفہوم اور اس نظریہ کی وسعت کے لحاظ سے کئی عظیم بزرگ اس لقب کے مستحق گزرے ہیں..... ان معنوں کی رو سے تمام انبیاء مہدی ہیں [2] بلکہ مہدی اعظم

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب المہدی۔ مسند احمد جلد ۱ صفحہ ۹۹۔ شرح ترمذی لابن العربی جلد ۹ صفحہ ۷۴

[2] الانعام: ۱۹

سرورِ دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ تمام گزشتہ مہدی بھی آپ کے طفیل مہدی بنے اور آئندہ آنے والے بھی آپ سے فیض پا کر مقام مہدویّت پر فائز ہوں گے۔ انہی معنوں میں حضرت حسان بن ثابتؓ نے آپ کو مہدی کہا ہے۔ ان کا شعر ہے

مَا بَالُ عَيْنِكَ لَا تَنَامُ كَأَنَّمَا كُحِلَتْ مَآقِيهَا بِكُحْلِ الْأَرْمَدِ

جَزَعًا عَلَى الْمَهْدِيِّ أَصْبَحَ ثَاوِيًا يَا خَيْرَ مَنْ وَطِأَ الْحَصٰى لَا تَبْعُدِ [1]

یعنی تیری آنکھ کو کیا ہو گیا ہے کہ اُس کے آنسو تھمتے نہیں نیند اُڑ گئی ہے یوں لگتا ہے جیسے اُس میں شب بیداری کا سرمہ لگایا گیا ہو، یہ شدید گھبراہٹ اُس "عظیم مہدی" کی وفات کے صدمہ کی وجہ سے ہے جسے ابھی دفن کیا گیا ہے۔ اے خیر الناس اور افضل الرسل آپ ہمیشہ اللہ کی رحمتوں کے مورد رہیں یہ کبھی آپ سے دور نہ ہوں۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جریر بن عبد اللہ البجلیؓ کے حق میں دعا کی اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْهُ وَاجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا [2]۔

انہی معنوں میں خلفاء راشدین کو بھی مہدی کہا گیا ہے جیسے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ [3]۔

کہ میری اور میرے خلفاء کی سنت کی پیروی کرنا جو راشد اور مہدی ہیں حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کو بھی مہدی کہا گیا ہے۔ اس کے بعد مہدی کا ایک خاص مفہوم امّت میں متعارف ہوا اس کی تقریب یہ ہوئی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے تیسرے فرزند حضرت محمد بن حنفیہ جو بڑے فاضل اور بے بدل عالم تھے اُن کے عقیدت مندوں اور پیروؤں نے جن کا قائد مختار ثقفی تھا یہ تہیہ کیا کہ امام حسینؓ کے قتل کا بدلہ لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے چُن چُن کر اُن لوگوں کو قتل کیا جنہوں نے حضرت امام حسینؓ کو شہید کرنے میں حصہ لیا تھا۔ یہ لوگ محمد ابن حنفیہ کو مہدی مانتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ محمد ابن حنفیہ کے ذریعہ بنو امیہ کے ظلم وستم سے مسلمانوں کو نجات ملے

---

[1] سيرة ابن هشام شعر حسان بن ثابت في رثاء رسول الله صلى الله عليه وسلم

[2] ترمذی كتاب العلم باب ما جاء في الأخذ بالسّنة

[3] بخاری كتاب الجهاد باب مَنْ لَا يَثْبُتُ عَلَى الْخَيْلِ . سیرت ابن هشام جلد ١ صفحه ٨٠ حاشيه

گی لیکن وہ کوئی متوقع انقلاب بپا کئے بغیر فوت ہو گئے۔اس پر ان کے عقیدتمندوں کو مایوسی سے بچانے کے لئے اس نظریہ کو شہرت ملی کہ محمد بن حنیفہ دراصل فوت نہیں ہوئے بلکہ رضوی نامی پہاڑوں میں چھپ گئے ہیں۔جنگل کے شیر ان کی حفاظت پر مامور ہیں اور وہاں شہد اور پانی کے چشمے ان کی خوراک کے لئے موجود ہیں۔یہی وہ وقت ہے جبکہ ''مہدی منتظر'' کے نظریہ نے فروغ پایا جس کے ایک معنے یہ متعین ہوئے کہ فلاں بزرگ مہدی ہیں وہ اس وقت تو غائب ہو گئے ہیں لیکن بعد میں کسی مناسب موقع پر ظاہر ہوں گے، دشمن کو قتل کریں گے اور اپنے متبعین کو بامِ عروج تک پہنچائیں گے۔دوسرا مفہوم یہ مشہور ہوا کہ اگرچہ وہ اس وقت فوت ہو گئے ہیں یا دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے ہیں لیکن بعد میں جب اللہ تعالیٰ چاہے گا انہیں زندہ کر کے دوبارہ دنیا میں بھیجے گا تا کہ وہ عدل وانصاف کے لئے ایک عظیم انقلاب بپا کریں۔بہرحال ''مہدی'' کے اس متعارف مفہوم کے علی الرغم ایسی روایات بھی موجود ہیں جو عمومی مفہوم کے لحاظ سے متعدد مہدیوں کے آنے کے امکان کو ثابت کرتی ہیں۔مثلاً ایک روایت یہ ہے کہ

لَا یَذْھَبُ الدَّھْرُ حَتّٰی یَمْلِکَ الْعَرَبَ رَجُلٌ مِنْ اَھْلِ بَیْتِیْ یُوَاطِئُ اِسْمُہٗ اِسْمِیْ [1]

اس مفہوم کی متعدد روایات ہیں گو یہ سنداً بخاری اور مسلم کی پایہ کی نہیں لیکن ان کا کثرت طرق سے آنا ان کی صحت کے پہلو کو واضح کرتا ہے [2]۔

جس کے معنے یہ ہو سکتے ہیں کہ امت کے اندر مختلف زمانوں میں جو بگاڑ اور فساد پیدا ہو گا اس کو دور کرنے اور امت مسلمہ کی اصلاح کا کام بعض ایسے لوگوں کے سپرد ہو گا جو میرے ہمنام ہوں گے۔ آپ کے دو نام زیادہ مشہور ہیں۔ محمد اور احمد چنانچہ بمطابق روایت بالا محمد نام کے متعدد مہدی اور مصلح گزرے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں ہدایت وارشاد کا خاص فریضہ سرانجام دیا اور اپنے منصب کے لحاظ سے انہوں نے ''مہدی'' ہونے کا دعویٰ کیا یا ان کے کام کے لحاظ سے ان کے مریدوں نے انہیں مہدی قرار دیا اس سلسلہ میں امام محمد بن حنفیہؒ اور امام محمد باقرؒ کا نام پہلے گزر چکا ہے۔شیعہ اثنا عشریہ امام محمد بن الحسن العسکری کو ''مہدی منتظر''

---

1. مسند احمد بن حنبل جلد ا صفحہ ۳۷۶، ۳۷۷ مطبوعہ بیروت
2. صاحب کتاب البیان نے اکتیس سے زائد طرق گنوائے ہیں۔(البیان فی اخبار صاحب الزمان صفحہ ۹۴ تا ۹۷)

مانتے ہیں جو شیعہ عقائد کے مطابق اپنی عمر کے کسی حصہ میں غائب ہو گئے تھے اور وقت مقرر پر ظاہر ہوں گے اور عظیم دینی انقلاب کی قیادت کا فریضہ سرانجام دیں گے[1]۔

حضرت امام شافعیؒ کا نام بھی محمد بن ادریس تھا جنہوں نے تفقّہ فی الحدیث کے لئے خاص کام کیا۔ اسی طرح صحیح بخاری کے مرتب کا نام محمد بن اسماعیل بخاری تھا جنہوں نے صحتِ احادیث کے اصول مرتب کرنے کے لحاظ سے اُمّت میں ایک خاص مقام حاصل کیا ہے۔

ایک اور حدیث ہے۔ **لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یَمْلِکَ رَجُلٌ مِّنْ اَھْلِ بَیْتِیْ**[2]۔ **یَفْتَحُ الْقُسْطُنْطُنِیَّہ وَ جَبَلَ دَیْلَمْ**[3]۔

یعنی اُس وقت تک وہ موعود گھڑی[4] نہیں آئے گی جب تک کہ قسطنطنیہ اور دَیْلَمْ کے پہاڑی علاقوں کو میرے گھرانے کا ایک رجل شجاع فتح نہیں کر لے گا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لئے متعدد مہمیں بھجوائی گئیں۔ ایسی پہلی کوشش حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ میں ہوئی جس میں کئی صحابہؓ بھی شامل تھے۔ اس لشکر نے قسطنطنیہ کا محاصرہ بھی کیا لیکن کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ آخر یہ عظیم فتح ۱۴۵۳ء میں ایک عثمانی ترک سلطان کے ذریعہ نصیب ہوئی جس کا نام "محمد" تھا چنانچہ تاریخ میں وہ "**سلطان محمد الفاتح**" کے نام سے مشہور ہے۔

ایک یورپی مؤرخ نے لکھا ہے کہ جب اس نیک دل بہادر بادشاہ نے قسطنطنیہ فتح کیا اور شہر کے بڑے بڑے پادری، شہر اور وہاں کے مرکزی گرجا کی چابیاں بادشاہ کے حضور پیش کرنے کے لئے صف بستہ کھڑے ہوئے تو بادشاہ اپنے گھوڑے سے اترا اور سجدہ میں گر گیا۔ اُس نے جب سجدہ سے سر اٹھایا تو زمین سے مٹی لے کر اپنے تاج سر پر ڈالی اور کہا نہ تکبر ہے اور نہ استعلا[5]۔ میں تو اپنے رسولؐ کی ایک پیشگوئی پورا کرنے آیا ہوں جو قسطنطنیہ کی فتح کے متعلق تھی۔ پھر سلطان نے چابیاں

---

[1] البیان فی اخبار صاحب الزمان صفحہ ۱۴۱

[2] آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اہل فارس کو بھی اپنے خاندان میں شامل کیا ہے اور حضورؐ کے زمانہ میں روسی ترکستان کے علاقے بھی فارس کا حصہ تھے۔

[3] البیان فی اخبار صاحب الزمان صفحہ ۱۴۱۔ کنزل العمال جلد ۷ صفحہ ۱۸۷ الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ۔

[4] غالبًا یورپ اور مغربی اقوام کے دوسرے غلبہ کے آغاز کی طرف اشارہ ہے جس سے تیسری دنیا متاثر ہوئی

[5] یہ ایک آیہ کریمہ کی عملی تفسیر ہے جو یہ ہے۔ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔ (القصص : ۸۴)

لے کر شہر کے پادریوں کو واپس کر دیں اور کہا امن و امان سے رہو اور مخلصانہ اطاعت کو اپنا شعار بناؤ، آپ کے سارے حقوق باقاعدہ ادا ہوتے رہیں گے۔ سلطان محمد الفاتح کا قسطنطنیہ پر یہ حملہ کسی ظلم یا جارحیت کی بنا پر نہ تھا بلکہ اس وجہ سے یہ فتح ضروری تھی کہ آغاز اسلام سے ہی قسطنطنیہ کی یہ بازنطینی حکومت مملکتِ اسلامیہ کے لئے خطرہ بنی رہی جنگ موتہ اور غزوۂ تبوک سے اس خطرہ کا آغاز ہوا اور فتح قسطنطنیہ تک مسلمان حکومتوں کے سر پر منڈلاتا رہا قرون وسطیٰ کی صلیبی جنگوں کا مرکز بھی قسطنطنیہ تھا۔

ایک اور روایت ہے کہ مہدی کا نام میرے نام کے مطابق اور مہدی کے باپ کا نام میرے باپ کے نام کے مطابق ہوگا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

لَوْ لَمْ یَبْقَ مِنَ الدُّنْیَا اِلَّا یَوْمٌ لَطَوَّلَ اللّٰهُ ذَالِکَ الْیَوْمَ حَتّٰی یَبْعَثَ رَجُلًا مِنِّیْ اَوْ مِنْ اَهْلِ بَیْتِیْ یُوَاطِئُ اسْمُهٗ اِسْمِیْ وَ اسْمُ اَبِیْهِ اسْمَ اَبِیْ [1]۔

یہ روایت بھی اگر چہ قوی السند نہیں لیکن اپنی قدیم شہرت کے لحاظ سے مقبولیت کا درجہ پا گئی ہے۔ چنانچہ کئی بزرگوں نے اس روایت کے مطابق مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اصلاح امت کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔

ان میں سے ایک حضرت امام محمد بن عبداللہ بن الحسن المثنّٰی بن الحسن بن علی بن ابی طالبؓ ہیں۔ گویا یہ حضرت علی کَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ کے پڑپوتے کے بیٹے اور فاطمی النسل ہیں اور اپنی پاک طینت کی وجہ سے ''اَلنَّفْسُ الزَّکِیَّه'' کے لقب سے مشہور ہیں۔

حضرت محمد بن الحنفیہ کے بیٹے ابوالہاشم نے بنو امیہ کے ظلم و جور کے خلاف جو ایک خفیہ تنظیم قائم کی تھی جسے بعد میں بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ آگے چل کر اس تنظیم کے قائدین نے جن میں علوی اور عباسی دونوں خاندانوں کے بزرگ شامل تھے حضرت امام محمد بن عبداللہ کے ہاتھ پر انہیں ''مہدی'' تسلیم کر کے بیعت کی۔ حضرت امام محمد بن عبداللہ اَلنَّفْسُ الزَّکِیَّه اپنے وقت کے صاحب کمال بزرگ تھے حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ وغیرہ اُس وقت کے مسلمہ مجتہد اور

---

[1] شرح الترمذی لابن العربی جلد۹ صفحہ ۷۴۔ مشکوۃ المصابیح للخطیب التبریزی باب اشراط الساعۃ ۔ ابو داؤد کتاب المھدی ۔ مستدرک حاکم مع التلخیص جلد۴ صفحہ ۴۶۴

فقہاء بھی ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور انہیں ان کی قیادت سے ہمدردی تھی۔

چونکہ اس تحریک میں بنو عباس پیش پیش تھے اس لئے جب ابو مسلم خراسانی کی افواج کی مدد سے یہ تحریک کامیاب ہوئی اور بنو اُمیّہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو بنو عباس نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے ابو مسلم کو اپنی حمایت پر آمادہ کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا اور خلافت عباسیہ کی بنیاد رکھی۔ علویوں نے اس تغلّب کی مخالفت کی اور کہا کہ امام محمد بن عبداللہ کے ہاتھ پر بطور "مہدی" سب نے بیعت کی ہے اس لئے وہ خلافت کے زیادہ مستحق ہیں۔ چنانچہ دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور سے اس سوال پر امام محمد بن عبداللہ کی جنگ بھی ہوئی جس کے دوران امام محمد شہید ہو گئے۔

بنو اُمیّہ کے خلاف اس تحریک کے دوران "مہدی کی فوری آمد" کے نظریہ کو بہت شہرت ملی یہاں تک کہ اُس زمانہ کے مسلم عوام کا یہ مسلّمہ عقیدہ بن گیا کہ مہدی کا نام محمد بن عبداللہ ہو گا۔ اتفاق سے دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے اپنے اس بیٹے کو "المہدی" کا لقب دے کر اپنا ولی عہد مقرر کیا جو منصور کی وفات کے بعد تختِ خلافت پر بیٹھا اور اس مشہور روایت کی وجہ سے وہ عوام کی عقیدت کا مرکز بن گیا۔ اُس نے اپنے عہدِ خلافت میں زنادقہ کے لادینی فتنہ کا استیصال کیا جس نے اُس زمانہ میں بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی اور عوام اس فساد سے بڑے تنگ آئے ہوئے تھے۔

مہدویت کی اس علوی اور عباسی تحریک کے دوران دو اور روایتوں نے بھی بڑی شہرت پائی۔ ان میں سے ایک روایت یہ ہے کہ مہدی کی مدد کے لئے مشرق سے افواج آئیں گی جن کے پاس سیاہ جھنڈے ہوں گے اس روایت کے متعلقہ الفاظ یہ ہیں۔ **حَتّٰی یَأْتِیَ قَوْمٌ مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ وَ مَعَهُمْ رَایَاتٌ سُوْدٌ**[1] ...... **فَیَسْأَلُوْنَ الْخَیْرَ** ...... **فَیُقَاتِلُوْنَ فَیُنْصَرُوْنَ** ...... **حَتّٰی یَدْفَعُوْهَا اِلٰی رَجُلٍ مِنْ اَهْلِ بَیْتِیْ۔ الحدیث**[2]

دوسری روایت جسے اُس وقت خاص مقبولیت نصیب ہوئی یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا عباسؓ کے لئے دعا کرتے ہوئے فرمایا "**اَللّٰهُمَّ انْصُرِ الْعَبَّاسَ وَ وُلْدِ الْعَبَّاسَ قَالَهَا**

---

[1] ابو مسلم خراسانی کی افواج کے جھنڈوں کا رنگ سیاہ تھا اور بعد میں بنو عباس نے بھی اسی رنگ کو اپنایا۔

[2] ابن ماجہ کتاب الفتن باب خروج المهدی جلد ۲ صفحہ ۲۷۰۔ مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۲۷۷ مطبوعہ بیروت ۔ مستدرک حاکم مع التلخیص جلد ۴ صفحہ ۴۶۴

ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ یَا عَمِّ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ الْمَھْدِیَّ مِنْ وُلْدِکَ مُوَفَّقًا رَاضِیًا مَرْضِیًّا"[1] یعنی اے میرے اللہ عباس اور اس کی اولاد کی خاص مدد فرما آپ نے تین بار یہ دعا کی اور پھر عباسؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: اے میرے چچا کیا آپ کے لئے یہ بات خوش آئند نہیں کہ آپ کی اولاد سے بھی مہدی ہوگا جو توفیق یافتہ اپنے نصیبہ پر خوش اور پسندیدہ خصال ہوگا؟

آنحضرت کے دوسرے نام "احمد" سے متعلق بھی روایات ہیں کہ مہدی کا نام احمد ہوگا۔ ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ، سَمِعْتُ خَلِیْلِیْ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ یَقُوْلُ لَا یَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یَبْعَثَ اللّٰهُ عِصَابَتَانِ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمَا النَّارَ، عِصَابَةٌ تَغْزُو الْهِنْدَ وَ هِیَ تَکُوْنُ مَعَ الْمَهْدِیْ اِسْمُهٗ اَحْمَدَ ....[2]۔

یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ایک جماعت" ہندوستان میں مصروف جہاد ہوگی جس کی قیادت وہ امام مہدی فرمائیں گے جن کا نام احمد ہوگا۔ اس حدیث کی سند کو ضعیف[3] ہے لیکن واقعاتی لحاظ سے اس کی صحت مرجح ہے۔ ایک تو یہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اُس ارشاد کے مطابق ہے جس میں یہ صراحت ہے کہ مہدی کا نام میرے نام کے مطابق ہوگا۔ دوسرے اس کا بنیادی تعلق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ثانیہ سے ہے جس کی مکمل بحث آئندہ صفحات میں پیش کی جارہی ہے تاہم درمیانی عرصہ میں بھی کئی بزرگ اس مفہوم کے مصداق بنے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں دینی اصلاح کے سلسلہ میں خاص خدمات سرانجام دیں اور یہ اُصول مسلّمہ ہے کہ کلام رسولؐ جوامع الکلم کی صفت اپنے اندر رکھتا ہے اور اس میں کئی معانی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ بہرحال ان بزرگوں میں سے جن کا نام احمد تھا اور خاص کارہائے نمایاں انہوں نے سرانجام دیئے ایک امام احمد بن حنبلؒ

---

1 کنزل العمال جلد ۷ صفحہ ۲۶۰ و تاریخ دمشق الکبیر لابن عساکر جلد ۷ صفحہ ۲۳۶ مطبوعہ دارالمسیرہ بیروت ۱۳۹۹ھ 2 رواہ البخاری فی تاریخہ بحوالہ النّجم الثّاقب حصّہ دوم صفحہ ۱۳۴ مطبوعہ مطبع احمدی پٹنہ ۱۳۱۰ھ 3 صاحب نجم الثاقب نے اس روایت کے بارہ میں تحریر کیا ہے کہ "روایت کیا ہے اس کو امام بخاری نے کتاب التاریخ میں اپنی اور کہا اسناد میں اس کے مضائقہ نہیں اور ایسے ہی امام رافعی کی کتاب المہدی میں اور کہا ہے اَسْنَادُہٗ لَا بَأْسَ بِہٖ اور ابن مردویہ و ابن شاہین و ابن ابی الدنیا نے بھی اس کو اخراج کیا ہے اور اتفاق کیا ہے انہوں نے اس کے حسن ہونے پر اور سیوطی نے بھی حسن کہا ہے۔ کذا فی اوراق الخوارزمی ۱۲۔ (ناشر)

ہیں جنہوں نے فتنہ خلق قرآن کا بڑی جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا اور مسند کے نام سے احادیث کا انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا اور ان کو ان کارناموں کی وجہ سے اُن کے پیروؤں نے مہدی کہا ہے[1]۔

دوسرے ہندوستان کے مشہور بزرگ حضرت امام ربّانی مجدد الف ثانی شیخ ''احمد'' سرہندی ہیں جنہوں نے اکبر بادشاہ کے لادینی فتنہ کے استیصال کے لئے خاص کوششیں کیں اور سلسلہ نقشبندیہ کو اسلامی ممالک میں مستحکم کیا۔

تیسرے بزرگ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں آپ کا نام بھی ''احمد'' تھا۔ ہندوستان میں فروغ حدیث رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے آپ کی مساعی ناقابل فراموش ہے۔

بہرحال سطور بالا میں بعض روایات مہدی سے متعلق ایک تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ان روایات کی صحت کے پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ نظریہ کہ درمیانی دور میں کئی ''مہدیوں'' کے آنے کی روایات ملتی ہیں اس کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

''لَنْ تَهْلِكَ اُمَّةٌ اَنَا فِيْ اَوَّلِهَا وَ عِيْسٰى فِيْ آخِرِهَا وَالْمَهْدِيُّ فِيْ وَسَطِهَا''[2]

یعنی وہ اُمت ہرگز ہلاک اور برباد نہیں ہو سکتی جس کے آغاز میں میں ہوں اور جس کے آخر میں عیسیٰ ہوں گے اور جس کے وسط میں مہدی آئیں گے۔

شارحین حدیث حیران ہوتے ہیں کہ عام خیال کے مطابق مسیح اور مہدی نے اکٹھے اور ایک زمانہ میں آنا ہے۔ مہدی کے درمیانی زمانے میں آنے کے کیا معنے؟ حالانکہ اگر 'المہدی' کے لفظ پر غور کیا جائے تو حدیث کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے کیونکہ ''المہدی'' کا الف لام یہاں عموم[3] کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ درمیانی عرصہ میں کئی ایسے مصلح آئیں گے جو مہدی کے مقام پر فائز ہوں گے۔ انہی کو دوسری احادیث میں مجدّد کہا گیا ہے[4]۔

گویا درمیانی عرصہ میں جب اُمت مختلف قسم کے بحرانوں سے دوچار ہو گی تو عام مہدی اور مجدد آ کر ان کو دور کریں گے[5] اور جب آخری زمانہ میں تنزّل کی انتہا ہو گی، مصائب کی آندھیاں

۱؎ الشفا بتعریف حقوق المصطفٰی لقاضی عیاض جلد ۲ صفحہ ۱۳ مطبوعہ مصر ۲؎ کنز العمال جلد ۷ صفحہ ۱۸۷ ۔ جامع الصغیر للسّیوطی جلد ۲ صفحہ ۱۰۲ (الفاظ کے فرق کے ساتھ) ۳؎ اصول فقہ کا یہ ایک مسلّمہ قاعدہ ہے کہ نکرہ مُعَرَّف بِاللّام عموم کا فائدہ دیتا ہے اور اس کے معنے ''کئی'' اور ''متعدد'' کے ہوتے ہیں۔
۴؎ ابو داؤد کتاب الفتن ۵؎ حجج الکرامہ صفحہ ۳۴۹ ۔ اکمال الدین صفحہ ۱۵۷

چلیں گی اور اُمت کا شیرازہ بکھرنے لگے گا تو وہ موعود عظیم مہدی آئے گا جو تَشَابُه فِي الْاَخْلَاق کی وجہ سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا بروز کامل اور کسر صلیب کے مقاصد کے لحاظ سے مثیل مسیح کہلائے گا اور اس کا آنا نزول[1] عیسیٰ بن مریم کے مترادف ہوگا کیونکہ نصاریٰ کے غلبہ کے استیصال کے لئے وہ ایک الٰہی نظام قائم کرے گا۔ اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس عظیم موعود کی بعثت کے وقت سے متعلق روایتوں میں کیا لکھا ہے اور بزرگان امت نے اس بارہ میں کیا اندازہ پیش کیا ہے۔ سو بعض روایات کے الفاظ یہ ہیں۔

"عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْاٰیَاتُ بَعْدَ الْمِأَتَیْنِ "[2]

یعنی ابوقتادہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خاص علامات دوسو سال کے بعد ظاہر ہوں گی۔ علماء نے تصریح کی ہے کہ دوسو سال سے مراد وہ دوسو سال ہیں جو ایک ہزار سال کے بعد گزریں گے۔ اس کے یہ معنے ہوئے کہ ایک ہزار دوسو سال کے بعد "ظہور مہدی" کے آثار نظر آنے لگیں گے۔ چنانچہ علامہ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی السندی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "اَلْمُرَادُ بِالْمِأَتَیْنِ الْمِاتَانِ بَعْدَ الْاَلْفِ "[3]

مشکوٰۃ المصابیح کے شارح حضرت مُلّا علی قاری اس حدیث کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

" وَیَحْتَمِلُ اَنْ یَّکُوْنَ اللَّامُ لِلْعَهْدِ اَیْ بَعْدَ الْمِأَتَیْنِ بَعْدَ الْاَلْفِ وَ هُوَ وَقْتُ ظُهُوْرِ الْمَهْدِیِّ "[4]

ان معنوں کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حذیفہ بن یمانؓ سے مروی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اِذَا مَضَتْ اَلْفٌ وَّمِاتَانِ وَاَرْبَعُوْنَ سَنَةً یَبْعَثُ اللّٰهُ الْمَهْدِیَّ"[5]

یعنی جب ایک ہزار دوسو چالیس سال (۱۲۴۰) گزریں گے تو اللہ تعالیٰ امام مہدی مبعوث کرے گا۔

یہ روایت اگرچہ قوی السند نہیں لیکن جہاں تک دوسو سال کی اس تشریح کا تعلق ہے متعدد

---

[1] نزول کے معنے خاص برکات کی حامل ہستی کا آنا یا کسی کثیر المنافع مفید عام چیز کا خاص خدا کے فضل کے تحت ملنا۔ دیکھیں الحدید:۲۶، الزمر:۷، الاعراف:۲۷، النحل:۱۱، الطلاق:۱۱، البقرة :۵۹، المائدة: ۱۱۵۔

[2] سنن ابن ماجه جلد۲ صفحه ۲۶۰ مطبع علمیّه مصر ۱۳۱۳ھ طبع اوّل۔

[3] حاشیہ بر ابن ماجه جلد۲ صفحہ ۲۶۰ مطبع علمیه مصر ۱۳۱۳ھ ایڈیشن اوّل۔

[4] مرقاة بر حاشیه مشکوة صفحه ۴۷۱ مطبوعه اَصَحُّ المَطَابِع دهلی۔

[5] اخرجه مصنّف ابن ابی شیبه حوالہ کے لئے دیکھیں النّجم الثاقب جلد۲ صفحه ۲۰۹ مطبوعہ پٹنہ ۱۳۱۰ھ

علماء[1] نے اسے صحیح تسلیم کیا ہے۔

حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ فرماتے ہیں۔

یاد ہے وہ دن جبکہ کہتے تھے یہ سب ارکانِ دین ۔۔۔ مہدیٔ موعودِ حق اب جلد ہوگا آشکار

پھر وہ دن جب آگئے اور چودھویں آئی صدی ۔۔۔ سب سے اوّل ہوگئے منکر یہی دیں کے منار

اب آئندہ صفحات میں اُس عظیم مہدی کے ظہور کا ذکر آرہا ہے جس کے متعلق احادیث ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا ہیں۔ سنداً بھی وہ ہر لحاظ سے صحیح ہیں اور بزرگان دین کے اتفاق کے لحاظ سے بھی وہ قوی ہیں۔ یہ وہ عظیم مہدی ہے جس کا ایک کام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ثانیہ کے مقصد کی تکمیل ہے اور اس کا دوسرا کام عیسیٰ بن مریم اور مسیح کے نزول کی پیشگوئی کے معانی کو کھولنا ہے۔ **سب سے پہلے ہم اُن احادیث کو پیش کرتے ہیں جن کی صحت پر تمام علماء حدیث کا اتفاق ہے۔**

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ پیشگوئیاں بالعموم تعبیر طلب ہوتی ہیں اور ان کی زبان تمثیلی ہوتی ہے خصوصاً کسی سابقہ نبی کی دوبارہ آمد کا مطلب سنتِ الٰہی میں یہ ہوا کرتا ہے کہ اُس نبی کی برکات، اُس کے اُسوۂ حسنہ کا احیاء اور اُس کے کسی ایسے بروز[2] اور مثیل اور متبع کامل کا ظہور رہے

---

[1] حجج الکرامہ نواب صدیق حسن خان صاحب صفحہ ۳۹۳۔ اربعین فی احوال المهدیین شاہ اسماعیل شہید. الیواقیت والجواهر جلد ۲ صفحہ ۱۴۷ مطبوعہ مصر ۱۳۱۷ھ وفیہ وَاَوَّلُ الالف محسُوبٌ من وفاةِ علی بن ابی طالب رضی اللّٰہ تعالی عنه آخر الخلفاء الخ ۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی۔ حوالہ حجج الکرامہ صفحہ ۳۹۴ مطبوعہ ۱۲۹۱ھ وغیرہ۔

[2] بُرُوز کا لفظ بَرَزَ سے نکلا ہے جس کا مفہوم ظہور اور کھل کر سامنے آنا ہے۔ کسی مذہب یا کسی فرقہ کے صوفیاء بروز کی اصطلاح کو کن معنوں میں استعمال کرتے اس سے ہمیں غرض نہیں یہاں بروز کی اصطلاح جن معنوں میں استعمال ہوئی ہے اس کی وضاحت خود حضرت بانیء سلسلہ نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔

"جیسا تشابہ فی الصور ہوتا ہے ایسا ہی تشابہ فی الاخلاق بھی ہوا کرتا ہے☆"۔

"کامل متبع ہوتا ہی نہیں جب تک بروزی رنگ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کمالات کو اپنے اندر نہ رکھتا ہو...... جب ایک شخص کامل اطاعت کرتا ہے اور گویا اطاعتِ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم میں محو اور فنا ہو کر گم ہو جاتا ہے اُس وقت اس کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے ایک شیشہ سامنے رکھا ہوا ہو اور تمام و کمال عکس اس میں پڑے ۞"۔

☆ ملفوظات جلد ۸ صفحہ ۲۰۷ مطبوعہ الشرکۃ الاسلامیہ ۞ ملفوظات جلد ۸ صفحہ ۲۴۶ مطبوعہ الشرکۃ الاسلامیہ

جوفنا فی الرسول کے مقام پر فائز ہو اور متبوع کے مقاصد کی تکمیل کرنے والا ہو۔ایک دوسری جگہ بانی سلسلہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام اس کی وضاحت یوں فرماتے ہیں۔

''سو جیسا کہ وہ نبی شہزادہ دنیا میں غربت اور مسکینی سے آیا اور غربت اور مسکینی اور حلم کا دنیا کو نمونہ دکھلایا۔اس زمانے میں خدا نے چاہا کہ اس کے نمونہ پر مجھے بھی جو امیری اور حکومت کے خاندان سے ہوں اور ظاہری طور پر بھی اس شہزادہ نبی اللہ کے حالات سے مشابہت رکھتا ہوں۔ان لوگوں میں کھڑا کرے جو ملکوتی اخلاق سے بہت دور جا پڑے ہیں۔سو اس نمونہ پر میرے لئے خدا نے یہی چاہا ہے کہ میں غربت اور مسکینی سے دنیا میں رہوں۔خدا کے کلام میں قدیم سے وعدہ تھا کہ ایسا انسان دنیا میں پیدا ہو۔اسی لحاظ سے خدا نے میرا نام مسیح موعود رکھا......اس کے معنی اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں کہ مجھے تمام اخلاقی حالتوں میں خدائے قیوم نے حضرت مسیح علیہ السلام کا نمونہ ٹھہرایا ہے تا امن اور نرمی کے ساتھ لوگوں کو روحانی زندگی بخشوں [1]۔''

اس اصول کی وضاحت کے بعد اب ہم وہ احادیث لکھتے ہیں جو مستند اور صحیح ہیں ان کی صحت میں کسی محدث اور فقیہ نے شک کا اظہار نہیں کیا اور اُس میں ''ظہور عظیم'' کی پیشگوئی ہے۔

۱۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ [2]۔

یعنی وہی خدا ہے جس نے اُمیوں میں (جو کسی مدرسہ کے پڑھے ہوئے نہیں) انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن کو خدا کے احکام سناتا ہے اور ان کا تزکیہ اور ان کی تربیت کرتا ہے اور ان کو علم وحکمت سکھاتا ہے جبکہ وہ اس سے پہلے بڑی بھول اور جہالت میں پڑے ہوئے تھے اور وہ خدا ان کے سوا ایسے دوسرے لوگوں میں بھی اُسے بھیجے گا جو ابھی تک ان میں شامل نہیں ہوئے اور وہ ایسا کرنے پر غالب اور قادر ہے اور بڑی حکمت والا ہے۔

۱؎ کشف الغطاء۔ روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۱۹۲، ۱۹۳ ۲؎ الجمعۃ : ۳،۴

جب یہ آیات نازل ہوئیں تو موجود صحابہؓ نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ "آخرین" سے کون لوگ مراد ہیں جن میں آپ مبعوث ہوں گے تو آپ نے پاس بیٹھے ہوئے اپنے صحابی سلمان فارسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔

"لَوْ كَانَ الْإِيْمَانُ مُعَلَّقًا بِالثُّرَيَّا لَنَا لَهُ رَجُلٌ مِّنْ هٰؤُلَآءِ" [1]

صحیح بخاری کی اس روایت سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں پر ایک ایسا دور آئے گا کہ حقیقی ایمان اُٹھ جائے گا اور ان کی دوبارہ ترقی آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ثانیہ کی مرہون منت ہوگی جو آپ کے ایک فارسی النسل غلام کے ذریعہ ہوگی اور اُس کے حواری بھی انہی علاقوں سے تعلق رکھتے ہوں گے [2]۔

بخاری کی اس روایت سے اُن روایات کی بھی تائید ہوتی ہے جن میں آیا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے سلمان فارسی کے بارہ میں فرمایا۔ سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَيْتِ نیز یمن کے والی باذان اور اُس کے فارسی النسل حامیوں کے مسلمان ہونے پر آپ نے انہیں بھی فرمایا کہ وہ میرے اہل بیت اور میرے خاندان کا حصہ ہیں۔ یہ اسی لئے ہے کہ اسلام کی نشاءۃ ثانیہ اسی نسل کے لوگوں سے وابستہ تھی [3]۔

صحیح بخاری کی دوسری حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"كَيْفَ اَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ فِيْكُمْ وَ اِمَامُكُمْ مِنْكُمْ" [4]

یعنی تم کیسے نازک حالات سے گزر رہے ہو گے جب تم میں ابن مریم نازل ہوں گے جو تمہارے امام تمہیں میں سے ہوں گے۔ صحیح مسلم کی ایک روایت سے بخاری کی اس حدیث کی مزید وضاحت ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

---

[1] بخاری کتاب التفسیر سورۃ الجمعۃ زیر آیت ۴

[2] قَالَ الزُّهْرِیْ (فی تشریح مجیئ وفد باذان الفارسی صاحب الیمن) فلمَّا بَلَغَ ذَالِکَ (ای خبر قتل کسریٰ پرویز) باذانَ بَعَثَ باسلامه و اسلام مَنْ مَّعَهُ مِنَ الفرسِ الی رسولِ اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم فقالت الرسل من الفرس لِرسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم الی من نحنُ یَا رسول اللّٰه؟ قَالَ اَنْتم مِنَّا وَ اِلَيْنَا اَهْلَ البيت (السیرۃ النبویۃ لابن هشام ذکر ما انتهی الیه امر الفرس بالیمن. اسلام باذان)

[3] رواہُ البخاری فی تاریخه

[4] بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسٰی ابن مریم.

"کَیْفَ اَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْیَمَ فِیْکُمْ فَاَمَّکُمْ مِنْکُمْ"[۱]

یعنی تمہاری کتنی نازک حالت ہوگی جب تم میں ابن مریم آئیں گے جو تمہاری امامت اور قیادت کا فریضہ سرانجام دیں گے اور تم میں شامل ہوں گے۔

مسند احمد کی حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

"یُوْشِکُ مَنْ عَاشَ مِنْکُمْ اَنْ یَّلْقٰی عِیْسٰی بْنَ مَرْیَمَ اِمَامًا مَهْدِیًّا وَ حَکَمًا عَدْلًا فَیَکْسِرُ الصَّلِیْبَ وَ یَقْتُلُ الْخِنْزِیْرَ"[۲]۔

یعنی تم میں سے جو زندہ رہے گا وہ عیسٰی بن مریم سے ضرور ملے گا وہی امام مہدی ہے حکم عدل ہے صلیب کو (بدلائل) توڑے گا اور خنزیروں کو قتل کرے گا۔

کنز العمال کی روایت بھی اس حدیث کی تصدیق کرتی ہے جو یہ ہے

"لَا یَزْدَادُ الْاَمْرُ اِلَّا شِدَّةً وَ لَا الدُّنْیَا اِلَّا اِدْبَارًا وَ لَا النَّاسُ اِلَّا شُحًّا وَلَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلٰی شِرَارِ النَّاسِ وَ لَا مَهْدِیَّ اِلَّا عِیْسٰی ابْنُ مَرْیَمَ"[۳]

یعنی ایک وقت آتا ہے کہ حالات زیادہ بگڑ جائیں گے۔ دنیا میں (مسلمانوں کے) ادبار کا دور دورہ ہوگا لوگ بخل اور خودغرضی سے بھر جائیں گے اور وہ شرارتوں میں اس قدر بڑھ جائیں گے کہ گویا قیامت ہی آگئی ہے (سب کی زبان پر یہ ہوگا کہ کوئی مصلح کوئی منجی لیکن) اُس وقت عیسٰی بن مریم کے سوا کوئی مہدی اور نجات دہندہ نہیں ہوگا انہی کے ذریعہ حالات سُدھریں گے۔

حضرت حسن بصریؒ جو صاحب عرفان محدث تھے وہ فرماتے ہیں۔

"اِنْ کَانَ الْمَهْدِیُّ فَعُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِیْزِ وَ اِلَّا فَلَا مَهْدِیَّ اِلَّا عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ"[۴]

یعنی اگر کوئی مہدی ہے تو عمر بن عبدالعزیز ہیں ورنہ پھر عیسٰی کے سوا کوئی اور مہدی نہ ہوگا۔

ان روایات سے ایک اور ایک دو کی طرح یہ بات ثابت ہے اور جو شخص اسلام کی حقانیت پر

۱۔ مسلم کتاب الایمان باب نزول عیسیٰ ابن مریم

۲۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۴۱۱

۳۔ کنزل العمال جلد ۷ صفحہ ۱۸۶ مطبوعہ مطبع النظامیہ حیدرآباد دکن ۱۳۱۴ھ

۴۔ تاریخ الخلفاء للسیوطی صفحہ ۱۵۸ (عہد بنوامیہ)

ایمان رکھتا ہے وہ یہ بات ماننے پر مجبور ہے کہ مسلمانوں کے انتہائی تنزل اور نہایت نازک زمانہ میں ایک خاص شان کے موعود نے آنا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مادی ہتھیاروں سے لیس ہوگا، یا آسمانی اور روحانی حربوں سے کام لے گا، اس کی ایک نظر کفر کی طاقتوں کو تباہ کر دے گی یا سنت انبیاء اور بالخصوص اپنے سردار اور اپنے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرح محنت اور مشقت، سعی پیہم اور جُہدِ اَتم کے دریا میں سے ہو کر اور طرح طرح کی قربانیاں پیش کر کے کامیابی کی راہیں ہموار کرے گا۔

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے آقاؐ کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

''ہمارے رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون ہوگا۔ وہ افضل البشر، افضل الرسل والانبیاء تھے جب انہوں نے ہی پھونک سے وہ کام نہیں کئے تو اور کون ہے جو ایسا کر سکے؟ دیکھو آپ نے غار حرا میں کیسے کیسے ریاضات کئے۔ خدا جانے کتنی مدت تک تضرعات اور گریہ وزاری کیا کئے۔ تزکیہ کے لئے کیسی کیسی جانفشانیاں اور سخت سے سخت محنتیں کیا کئے۔ جب جا کر کہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیضان نازل ہوا''[1]۔

اس سے پہلے آپؑ صحابہؓ کی جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل ہمارے واسطے ایک اسوۂ حسنہ اور عمدہ نمونہ ہے ..... انہوں نے تو خدا تعالیٰ کی رضا کے حصول کے واسطے اپنی جانوں تک کی پروا نہ کی اور بھیڑ بکریوں کی طرح خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان ہو گئے''[2]۔

بہر حال جو صاحبِ فہم حضرات پیشگوئی کی تعبیری زبان کو سمجھتے ہیں اور اُن میں جو تمثیل اور استعارے ہوتے ہیں ان کی حقیقت سے واقف ہیں اور پیشگوئیوں کے بارہ میں ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ ان پر یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ مذکورہ بالا روایات میں جو زبان استعمال ہوئی ہے وہ اپنے ظاہری معنوں اور سطحی مطالب پر مشتمل نہیں بلکہ اُس کے اندر عرفان کے دریا موجزن ہیں اور عبرت کے سامان پوشیدہ ہیں۔

پس ان پیشگوئیوں میں جس عظیم موعود کے آنے کا ذکر ہے اُسے ہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم

[1،2] ملفوظات جلد ۱۰ صفحہ ۲۰۵ مطبوعہ الشرکۃ الاسلامیہ ربوہ

کے مظہر ہونے کی وجہ سے ''المھدی'' کا نام دیا گیا ہے اور اس وجہ سے کہ اُس کے ذریعہ صلیب کے غلبہ کا استیصال ہوگا۔ اُسے مثیل مسیح اور مظہر عیسیٰ بن مریم کا لقب دیا گیا ہے کیونکہ وہ عیسیٰ بن مریم جو آج سے دو ہزار سال پہلے گزر چکے ہیں اور اُسی طرح آسمان پر جا چکے ہیں جس طرح دوسرے انبیاء آسمان پر گئے اور جنہیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے معراج کے موقع پر مختلف آسمانوں کا مکین دیکھا وہ دوبارہ آسمان سے نازل نہیں ہوں گے کیونکہ یہ سنت الٰہی کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ جو طبعی عمر پا کر فوت ہوا وہ واپس اس دنیا میں نہ آیا اور حسب آیات قرآن کریم عیسیٰ بن مریم وفات پا چکے ہیں[1]۔ اس لئے وہ واپس اس دنیا میں نہیں آسکتے اور جیسا کہ سطور بالا میں اس حقیقت کو کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ کسی فوت شدہ بزرگ یا نبی کی دوبارہ آنے کے معنے یہ ہوا کرتے ہیں کہ اس کا مثیل آئے گا جو اُس نبی کی برکات کا حامل ہوگا اس کی سنت کا احیاء کرے گا۔ اخلاق میں اُس کے مشابہ ہوگا اور اُن مقاصد کو پورا کرے گا جو اس کی بعثت کا باعث تھے۔

اسی موعود ماَمور کو صحیح مسلم کے حدیث میں چار بار نبی اللہ کہا گیا ہے۔ یہ ایک لمبی حدیث ہے جس کے متعلقہ الفاظ یہ ہیں۔

" یُحْصَرُ نَبِیُّ اللّٰہِ عِیْسٰی وَ اَصْحَابُہٗ ...... فَیَرْغَبُ نَبِیُّ اللّٰہِ عِیْسٰی وَاَصْحَابُہٗ ثُمَّ یَھْبِطُ نَبِیُّ اللّٰہِ عِیْسٰی وَ اَصْحَابُہٗ ...... فَیَرْغَبُ نَبِیُّ اللّٰہِ عِیْسٰی وَ اَصْحَابُہٗ ''[2]۔

جیسا کہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ مرتبہ اور کردار کے لحاظ سے امت محمدیہ کے بزرگ افراد کو اسی طرح مقام نبوت حاصل ہے جیسا کہ سابقہ انبیاء کو حاصل تھا ایک ذرہ بھی فرق نہیں بلکہ خیر الرسلؐ کی امت ہونے کی وجہ سے بعض افراد امت کا درجہ ان سابقہ انبیاء سے کہیں بڑھ جاتا ہے تاہم امت کے ان افراد کو ''نبی'' کے نام کی بجائے دوسرے روحانی نام ملے ہیں۔ جیسے خلفاء، اولیاء، مجددین اور مہدیّین لیکن ایک عظیم فرد امت کو حسب حدیث مسلم نبی کے نام سے بھی پکارا گیا ہے تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ امت اس مقام بلند سے محروم نہیں لیکن خاتم النّبیین کے مقام کی عظمت شان

---

[1] سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۵۶ میں یہ تصریح ہے کہ عیسیٰ بن مریم کی وفات پہلے ہوگی اور پھر حسب آیت النساء ۱۵۹ اُن کا رفع ہوگا اور سورۃ المائدہ ۱۱۷ میں یہ وضاحت ہے کہ عیسیٰ بن مریم وفات پا چکے ہیں۔ اُن کے علاوہ بھی متعدد آیات اور احادیث ہیں جو عیسیٰ بن مریم کی وفات کو ثابت کرتی ہیں۔

[2] مسلم کتاب الفتن باب ذکر الدجال۔ ریاض الصالحین للنووی شارح صحیح مسلم کتاب المنثورات والملح

اور حکمت کا تقاضہ تھا کہ اب نبی کے نام کا استعمال عام نہ ہو گا[1]۔

بہر حال مذکورہ بالا عظیم پیشگوئیوں کے مطابق عین وقت پر یہ **مسیح آخر الزمان اور مہدیٔ دوراں آ گیا** جس نے اپنی بعثت کی ایک غرض یہ بتائی کہ لفظی اور زبانی مسلمانوں کو حقیقی مسلمان بنایا جائے اور انہیں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے رنگ میں رنگیں کیا جائے۔

آپ کا نام نامی اور اسم گرامی **"مرزا غلام احمد"** ہے اور آپ کے والد ماجد کا نام مرزا غلام مرتضیٰ ہے۔ آپ مغل برلاس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے بزرگ سمرقند کے علاقہ سے آئے تھے اور اُس جگہ آ کر آباد ہوئے جس کا نام اب "قادیان" ہے جو ضلع گورداسپور صوبہ مشرقی پنجاب ملک بھارت کا ایک قصبہ ہے۔ آپ ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ جب آپ کی عمر چونتیس یا پینتیس سال کے قریب تھی تو آپ کو اپنے والد ماجد کی وفات کے قریب ہونے کی بذریعہ الہام اطلاع ملی۔ الہام کے عربی الفاظ یہ تھے۔

"وَ السَّمَآءِ وَالطَّارِقِ"

آپ نے اس الہام کا جو مفہوم سمجھا اُسے آپ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

"قسم ہے آسمان کی جو قضاء و قدر کا مبدء ہے اور قسم ہے اُس حادثہ کی جو آج آفتاب کے غروب کے بعد نازل ہو جائے گا[2]۔"

اس الہام سے آپ یہ سمجھے کہ آپ کے والد ماجد کا آج رات انتقال ہو جائے گا اور یہ الہام اس صدمہ کے موقع پر بطور تسلی ہے۔ آپ کو اس موقع پر دوسرا الہام یہ ہوا کہ

"اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ"

آپ اس دوسرے الہام کے سلسلہ میں آپ لکھتے ہیں۔

"مجھے اُس خدائے عزّ و جلّ کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اُس نے اپنے اس مبشرانہ الہام کو ایسے طور سے مجھے سچا کر کے دکھلایا کہ میرے خیال اور گمان

---

[1] حضرت بانی سلسلہ احمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔ "جبکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء تھے ...... اس لئے اگر تمام خلفاء کو نبی کے نام سے پکارا جاتا تو امر ختم نبوت مشتبہ ہو جاتا اور اگر کسی فرد کو بھی نبی کے نام سے نہ پکارا جاتا تو عدم مشابہت کا اعتراض باقی رہ جاتا کیونکہ موسیٰ کے خلفاء نبی ہیں"۔ (تذکرۃ الشہادتین روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۴۵)

[2] کتاب البریہ۔ روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۱۹۳

میں بھی نہ تھا۔میرا وہ ایسا متکفل ہوا کہ کبھی کسی کا باپ ہرگز ایسا متکفل نہیں ہوگا۔میرے پراُس کے وہ متواتر احسان ہوئے کہ بالکل محال ہے کہ میں ان کا شمار کرسکوں''۔[1]

آپ نے ۱۸۸۰ء کے قریب اپنی مشہور زمانہ کتاب ''**براہین احمدیہ**'' کی طباعت کا سلسلہ شروع کیا۔یہ وہ زمانہ تھا جب کہ انگریزی حکومت کا غلبہ پورے عروج پر تھا اور پوری قوت کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ ہورہی تھی اور بانیٔ اسلامؐ کے خلاف صدہا کتابیں شائع ہورہی تھیں۔اسی زمانہ میں آریہ سماج اور برہم سماج کی تحریکیں بھی اپنے شباب پر تھیں اور اسلام پر اعتراضات کی بوچھاڑ کررہی تھیں۔مسلمانوں کی حالت اپنی جگہ ایسی ناگفتہ بہ اور قابل تشویش تھی کہ مولانا حالی نے ۱۸۷۹ء میں اس بےبسی اور بیکسی کا نقشہ یوں کھینچا۔

رہا دین باقی نہ اسلام باقی — اک اسلام کا رہ گیا نام باقی

ایسے نازک حالات میں حضرت **مرزا غلام احمد** صاحب نے اپنی یہ کتاب تصنیف کی جس میں کلام الٰہی قرآن مجید کی حقانیت اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے زبردست دلائل بیان کئے اس کتاب کی مقبولیت اور اس کی شاندار تاثیرات کا اندازہ اس تبصرہ سے لگایا جاسکتا ہے جو اُس زمانہ کے مشہور اہل حدیث عالم مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے اپنے رسالہ **اشاعۃ السنہ** میں اس کتاب کے بارہ میں شائع کیا۔مولوی صاحب لکھتے ہیں۔

''ہماری رائے میں یہ کتاب اس زمانہ میں اور موجودہ حالت کی نظر سے ایسی کتاب ہے جس کی نظیر آج تک اسلام میں تألیف نہیں ہوئی ...... اور اس کا مؤلف بھی اسلام کی مالی و جانی وقلمی ولسانی وحالی وقالی نصرت میں ایسا ثابت قدم نکلا ہے جس کی نظیر پہلے مسلمانوں میں بہت ہی کم پائی گئی ہے۔ہمارے ان الفاظ کو کوئی ایشیائی مبالغہ سمجھے تو ہم کو کم سے کم ایک ایسی کتاب بتاوے جس میں جملہ فرقہ ہائے مخالفین اسلام خصوصاً فرقہ آریہ و برہم سماج سے اس زور سے مقابلہ پایا جاتا ہو اور دو چار ایسے اشخاص انصار اسلام کی نشان دہی کرے جنہوں نے اسلام کی نصرت مالی و جانی وقلمی ولسانی کے علاوہ حالی نصرت کا بیڑا بھی اٹھالیا ہو اور مخالفین اسلام و

[1] کتاب البریہ۔روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۱۹۵ حاشیہ

منکرین الہام کے مقابلہ میں مردانہ تحدّی کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہو کہ جس کو وجود الہام میں شک ہو وہ ہمارے پاس آکر اس کا تجربہ اور مشاہدہ کرے اور اس تجربہ اور مشاہدہ کا اقوام غیر کو مزہ بھی چکھا دیا ہو‘‘۔[۱]

یہ آثار اور نشانات اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ وہ **’’رجل موعود‘‘** جس کی آمد کا انتظار مدت سے کیا جا رہا تھا۔ وہ آپ کی ذات میں ہویدا ہونے والا ہے ضرورت زمانہ اور مسلمانوں کی حالت بھی اس کی متقاضی تھی اور ایسا ہی ہوا بھی۔ چنانچہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب اپنی ماموریت کے بارہ میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

’’اس صدی کے سر پر جو خدا کی طرف سے تجدید دین کے لئے آنے والا تھا وہ میں ہی ہوں تا وہ ایمان جو زمین پر سے اٹھ گیا ہے اس کو دوبارہ قائم کروں اور خدا سے قوت پا کر اُسی کے ہاتھ کی کشش سے دنیا کو صلاح اور تقویٰ اور راستبازی کی طرف کھینچوں ...... وہ مسیح جو امت کے لئے ابتدا سے موعود تھا اور وہ آخری مہدی جو تنزل اسلام کے وقت اور گمراہی کے پھیلنے کے زمانہ میں براہ راست خدا سے ہدایت پانے والا اور اس آسمانی مائدہ کو نئے سرے سے انسانوں کے آگے پیش کرنے والا تقدیر الٰہی میں مقرر کیا گیا تھا جس کی بشارت آج سے تیرہ سو برس پہلے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دی تھی وہ میں ہی ہوں‘‘۔[۲]

آپ مزید فرماتے ہیں۔

’’تمام اکابر اس بات کو مانتے چلے آئے ہیں کہ اس امت مرحومہ کے درمیان سلسلہ مکالمات الٰہیہ کا ہمیشہ سے جاری ہے اس معنے سے ہم ’’نبی‘‘ ہیں ورنہ ہم اپنے آپ کو امتی کیوں کہتے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ جو فیضان کسی کو پہنچ سکتا ہے وہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے پہنچ سکتا ہے اُس کے سوائے اور کوئی ذریعہ نہیں ...... حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ آنے والا مسیح نبی بھی ہوگا اور امتی بھی ہوگا اور امتی تو وہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے فیض حاصل کر کے تمام کمالات حاصل کرے‘‘۔[۳]

۱۔ اشاعۃ السنہ نمبر ۶ جلد ۷ صفحہ ۱۶۹، ۱۷۰ ۲۔ تذکرۃ الشہادتین۔ روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳، ۴

۳۔ ملفوظات جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۸ مطبوعہ الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ

آپ نے ایک دفعہ فرمایا۔

''باقی رہی یہ بات کہ ہم نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ نزاع لفظی ہے۔ مکالمہ مخاطبہ کے تو یہ لوگ خود بھی قائل ہیں۔ اسی مکالمہ مخاطبہ کا نام اللہ تعالیٰ نے دوسرے الفاظ میں نبوت رکھا ہے ورنہ اس تشریعی نبوت کا تو ہم نے بارہا بیان کیا ہے کہ ہم نے ہرگز ہرگز دعویٰ نہیں کیا۔...... اس طرح کی نبوت کا کہ گویا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو منسوخ کردے دعویٰ کرنے والے کو ہم ملعون اور واجب القتل جانتے ہیں۔ ہم پر جو اللہ تعالیٰ کے فضل ہیں یہ سب رسول اکرم کے فیض سے ہی ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے الگ ہو کر ہم سچ کہتے ہیں کہ کچھ بھی نہیں اور خاک بھی نہیں۔...... کوئی ہزار تپسیا کرے، جپ کرے، ریاضتِ شاقہ اور محنتوں سے مشت اِستخواں ہی کیوں نہ رہ جاوے مگر ہرگز کوئی سچا روحانی فیض بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور اتباع کے کبھی میسر آ سکتا ہی نہیں اور ممکن ہی نہیں''[۱]۔

''یہ سب عطیات اور عنایات اور یہ سب تفضلات اور احسانات اور یہ سب تلطفات اور توجہات اور یہ انعامات اور تائیدات اور یہ سب مکالمات اور مخاطبات بیمن متابعت و محبت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں''[۲]۔

جمال ہم نشین در من اثر کرد   وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اب ہم اس مدعیٔ مہدویّت اور مسیحیّت کی صداقت کے دلائل اور اس کی بعثت کی علامات کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

۱۔ مسیح موعود کی بعثت کے وقت کی ایک علامت یہ ہے کہ...... مسلمانوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ وہ اپنی سابقہ عظمت اور شان و شوکت سے محروم ہو جائیں گے۔ اُن میں نہ اتفاق باقی رہے گا اور نہ اتحاد۔ بہتر فرقوں میں وہ بٹ جائیں گے۔ ہر فرقہ صرف اپنے آپ کو ناجی قرار دے گا۔ روحانی، تمدنی اور سیاسی ہر لحاظ سے ان کی ساکھ ختم ہو جائے گی۔ وہ تمام بدیاں جو کبھی

---

۱ ملفوظات جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۲ مطبوعہ الشرکۃ الاسلامیہ۔ ربوہ

۲ براہین احمدیہ ہر چہار حصص۔ روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۴۶

یہود میں پائی جاتی تھیں وہ سب مسلمانوں میں راہ پا جائیں گی۔قرآن کریم کی سمجھ اور اُس کے احکام پر عمل کا فقدان ہوگا۔ اُس کے صرف الفاظ باقی رہ جائیں گے اور اسلام کا صرف نام رہ جائے گا۔ان کی مسجدیں بظاہر آباد اور بھری نظر آئیں گی لیکن ہدایت اور نجات کے لحاظ سے ویران دکھائی دیں گی۔اُن کے علماء آسمان کے نیچے بدترین مخلوق ہوں گے۔وہ خود فتنے اُٹھائیں گے اور پھر خود ہی ان فتنوں کی آگ میں جل بھن مریں گے''۔

ان سب حالات کا ذکر قرآن کریم میں اجمالاً اور کتب حدیث میں تفصیلاً موجود ہے۔

قرآن کریم مسلمانوں کی بگڑی حالت کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے

قَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا [1]

یعنی رسولؐ (عالم روحانی میں مسلمانوں کی حالت دیکھ کر) کہیں گے،اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو (بیکار سمجھ کر) چھوڑ دیا ہے اور دوسرے فلسفوں اور برباد کن نظریوں اور ہلاکت خیز راہوں کو اختیار کرلیا ہے۔

حدیث رسولؐ ہے کہ آپ نے فرمایا۔

یَأْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُہٗ، وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرآنِ اِلَّا رَسْمُہٗ [2]۔

یعنی لوگوں پر ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ اسلام کا فقط نام باقی رہ جائے گا اور قرآن کی صرف تحریر اور حروف کی شکل رہ جائے گی اس پر عمل کوئی نہیں کرے گا۔

مسلمانوں کے مسلّمہ لیڈر اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ حالات مسلمانوں پر گزر رہے ہیں۔چنانچہ مولانا حالی نے مسلمانوں کی اس دردناک حالت کا مرثیہ پڑھا اور علامہ اقبال نے اس حالت کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود   یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود

غرض وہ تمام بدیاں اور کمزوریاں اقتصادی نکبتیں اور بدحالیاں جوگزشتہ زمانہ میں بعثتِ انبیاء کی متقاضی ہوئیں وہ تمام اپنی ساری شناعتوں کے ساتھ موجودہ مسلمانوں میں موجود ہیں۔

وقت تھا وقت مسیحا نہ کسی اور کا وقت   میں نہ آتا تو کوئی اور ہی آیا ہوتا

---

[1] الفرقان : ۳۱   [2] مشکوۃ المصابیح کتاب العلم، الفصل الثالث

۲۔ اس عظیم ''مہدیٔ دوراں'' کی صداقت کی ایک علامت یہ ہے کہ اس کی صداقت کی گواہی آسمان دے گا اور وہ اس طرح کہ اُس کے دعویٰ کے بعد رمضان کے مہینہ کی تیرہ تاریخ میں چاند گرہن ہوگا اور اسی مہینہ کی اٹھائیس تاریخ میں سورج کو گرہن لگے گا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

" اِنَّ لِمَهْدِيِّنَا آيَتَيْنِ لَمْ تَكُوْنَا مُنْذُ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَنْكَسِفُ الْقَمَرُ لِاَوَّلِ لَيْلَةٍ مِّنْ رَمَضَانَ وَتَنْكَسِفُ الشَّمْسُ فِي النِّصْفِ مِنْهُ "[1]۔

یعنی ہمارے اس مہدی کی صداقت کی دو نشانیاں ایسی ہیں کہ آسمان وزمین کی پیدائش کے آغاز سے بطور نشان کبھی ظاہر نہیں ہوئیں۔

اوّل یہ کہ رمضان کے مہینہ میں چاند گرہن (کی تاریخوں ۱۳۔۱۴۔۱۵ میں سے) پہلی تاریخ (یعنی ۱۳) کو گرہن ہوگا اور اسی مہینہ میں (سورج گرہن کی تاریخوں ۲۷۔۲۸۔۲۹ میں سے) درمیانی (یعنی ۲۸) تاریخ کو سورج گرہن ہوگا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت مرزا غلام احمد صاحبؑ کے دعویٰ مہدویّت کے بعد ۱۳۱۱ھ کے رمضان کی ۱۳ تاریخ کو چاند گرہن ہوا اور اسی مہینہ کی اٹھائیس تاریخ میں سورج گرہن ہوا۔ عیسوی لحاظ سے یہ ۱۸۹۴ء تھا[2]۔

دراصل یہ حدیث قرآن کریم کی آیات **فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ**[3] کی تفسیر ہے اور اس کی تائید انجیل اور دوسرے بزرگوں کی تشریحات سے بھی ہوتی ہے[4]۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس نشان کے ظہور کے سلسلہ میں فرماتے ہیں

''جب سے نسلِ انسانی دنیا میں آئی ''نشان'' کے طور پر یہ خسوف وکسوف صرف

---

[1] سنن الدار قطنی، کتاب العیدین باب صفة صلاة الخسوف۔ بحار الانوار جلد ۵۲ صفحہ ۲۱۳، ۲۱۴ مطبع داراحیاء التراث العربی بیروت لبنان طبع ثالث ۱۹۸۳ء

[2] دراصل یہ نشان دو دفعہ ظاہر ہوا پہلے سال یعنی ۱۸۹۴ء میں مشرقی مما لک میں یہ ظاہر ہوا اور اگلے سال یعنی ۱۸۹۵ء میں مغربی مما لک امریکہ وغیرہ میں اس کا ظہور ہوا جبکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ۱۸۸۹ء کو مہدویت کا دعویٰ کیا اور اس کے دو سال بعد ۱۸۹۱ء میں آپ نے کھلے طور پر مسیحیت کا دعویٰ کیا۔ اسی سال آپ نے جماعت احمدیہ کی بنیاد رکھی۔

[3] القیامة : ۸ تا ۱۱

[4] متی باب ۲۴ آیت ۳۰۔ حجج الکرامہ صفحہ ۳۴۴

میرے زمانہ میں میرے لئے واقع ہوا ہے اور مجھ سے پہلے کسی کو یہ اتفاق نصیب نہیں ہوا کہ ایک طرف تو اُس نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا ہو اور دوسری طرف اُس کے دعویٰ کے بعد رمضان کے مہینہ میں مقرر کردہ تاریخوں میں خسوف کسوف بھی واقع ہو گیا ہو اور اُس نے اس خسوف وکسوف کو اپنے لئے نشان ٹھہرایا ہو۔...... کسوف خسوف خواہ ہزاروں مرتبہ ہوا ہو اس سے بحث نہیں۔نشان کے طور پر ایک مدعی کے وقت (خاص معین تاریخوں میں) صرف ایک دفعہ ہوا ہے[1]۔

محترم پروفیسر حافظ ڈاکٹر صالح محمد الہ دین صاحب سابق صدر شعبہ فلکیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد[2] نے مہدی دوران کی صداقت کی دو علامات یعنی کسوف وخسوف جن کا قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مذکورہ بالا میں ذکر ہے، کے موضوع پر اپنے ایک تحقیقی مقالہ میں اس کی تصریح کی ہے۔آپ لکھتے ہیں۔

مذہب اسلام میں مصلح آخرالزمان کے وقت میں سورج، چاند گرہن کے نشان کا ذکر بہت نمایاں

---

[1] چشمہ معرفت روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۲۹، ۳۳۰ حاشیہ

[2] آپ حافظِ قرآن تھے۔آپ کو قرآن کریم سے خاص تعلق تھا۔دنیاوی تعلیم بھی پی ایچ ڈی تھی اور اسٹرانومی میں انہوں نے بڑا نام پیدا کیا ہے لیکن سائنس کو ہمیشہ قرآن کے تابع رکھا ہے۔عثمانیہ یونیورسٹی سے انہوں نے فزکس میں ایم ایس سی کی پھر بعد میں انہوں نے امریکہ سے اسٹرانومی، ایسٹرفزکس میں پی ایچ ڈی کی۔1963ء میں Observatory University of Chicago USA سے انہوں نے پی ایچ ڈی کی۔آپ بڑی خصوصیات کے حامل تھے، علمی لحاظ سے ان کے قریباً پچاس مضامین اور ریسرچ پیپر بین الاقوامی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں اور جن پر کئی ایوارڈز بھی ان کو ملے ہیں۔چنانچہ ہندوستان کا مشہور ایوارڈ مگناد سہا (Megnanad Saha) ایوارڈ فار تھیوریٹیکل سائنس 1981ء میں آپ کو دیا گیا ہے۔اس کے علاوہ بے تحاشا ایوارڈ ان کو ملے ہیں۔Lunar and Solar Eclipses اور Dynamic of galaxies آپ کے پسندیدہ مضمون تھے جن میں قرآن اور احادیث میں سورج چاند گرہن بطور صداقت حضرت مسیح موعود و امام مہدی بیان ہوا ہے۔۹۵۔۱۹۹۴ء میں اس نشان پر صد سالہ پروگرام کے تحت کئی جماعتی رسائل میں آپ کے مضامین بھی شائع ہوئے۔مختلف یونیورسٹیز کے ریسرچ سکالر اور ریسرچ فیلو بھی تھے۔یہ لمبی ایک فہرست ہے۔پھر Great minds of the 21st century, American biographical institute Raleigh U.S.A 2003 نے ان کو 2003ء میں ایوارڈ بھی دیا۔

طور پر پایا جاتا ہے۔قرآن مجید میں سورۃ القیامۃ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ يَقُولُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ [1] یعنی "پس جس وقت آنکھیں پتھرا جائیں گی اور چاند گرہن ہوگا اور سوج اور چاند اکٹھے کئے جائیں گے یعنی سورج کو بھی گرہن لگے گا تب اس روز انسان کہے گا کہ بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟

اس آخری زمانہ میں ہونے والے گرہنوں کی تفصیل ہمیں ایک مشہور حدیث سے ملتی ہے۔چوتھی صدی ہجری میں حضرت علی بن عمر البغدادی الدار قطنی (۳۰۶ھ/۹۱۸ء تا ۳۸۵ھ/۹۹۵ء) بلند پایہ محدث گزرے ہیں۔وہ اپنی سنن دار قطنی میں حضرت امام باقر محمد بن علی رضی اللہ عنہ (جو حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے تھے) کی روایت سے یہ حدیث درج فرماتے ہیں۔

اِنَّ لِمَهْدِيِّنَا آيَتَيْنِ لَمْ تَكُوْنَا مُنْذُ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ يَنْكَسِفُ الْقَمَرُ لِاَوَّلِ لَيْلَةٍ مِّنْ رَمَضَانَ وَ تَنْكَسِفُ الشَّمْسُ فِي النِّصْفِ مِنْهُ [2]۔

یعنی ہمارے مہدی کے لئے دو نشان ہیں وہ کبھی نہیں ہوئے (یعنی کبھی کسی دوسرے کے لئے نہیں ہوئے) جب سے کہ آسمان اور زمین پیدا ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں کہ رمضان کے مہینہ میں اوّل رات کو گرہن لگے گا (یعنی گرہن کی راتوں میں سے اوّل رات کو) اور سورج کو درمیان میں گرہن لگے گا (یعنی گرہن کے دنوں میں سے درمیانے دن کو) اور یہ ایسے نشان ہیں کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین پیدا کیا کبھی (کسی دوسرے مامور و مدعی کے لئے) نہیں ہوئے۔

گرہن کی تاریخوں کا ذکر نواب صدیق حسن خان صاحب اپنی کتاب حجج الکرامہ میں لکھتے ہیں۔

"گویم خسوف قمر نزد اہل نجوم متقابل شمس بر ہیئت مخصوص میشود در غیر تاریخ سیزدہم و چہاردہم و پانزدہم اتفاق می افتد و ہمچنیں کسوفِ شمس بر ہیئت بر شکل خاص در غیر تاریخ

[1] القیامۃ : ۸تا۱۱

[2] سنن دار قطنی کتاب العیدین باب صفۃ صلوۃ الخسوف جلد اوّل صفحہ ۱۸۸ مطبع انصاری دہلوی

[3] حجج الکرامہ صفحہ ۳۴۴۔مطبوعہ مطبع شاہجہانی بھوپال

بست وہفت وبست وہشت وبست ونہم میشود'' [۲]

یعنی مَیں کہتا ہوں کہ اہل نجوم کے نزدیک چاند گرہن سورج کے مقابل آنے سے ایک خاص حالت میں سوائے تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں اور اسی طرح سورج گرہن بھی خاص شکل میں سوائے ستائیسویں، اٹھائیسویں اور انتیسویں تاریخوں کے کبھی نہیں لگتا۔

پیشگوئی میں یہ بتایا گیا ہے کہ رمضان کے مہینہ میں چاند گرہن اوّل رات میں ہوگا اور سورج گرہن درمیان میں۔ لہٰذا چاند گرہن کے لئے تیرھویں رمضان اور سورج گرہن کے لئے اٹھائیسویں رمضان مقرر ہوئے۔

اس پیشگوئی کے سلسلہ میں متعدد اعتراضات کئے گئے

جو اعتراضات آپ (حضرت مسیح موعود علیہ السلام) پر کئے گئے ان میں یہ اعتراض بھی تھا کہ سورج گرہن چاند گرہن کے بارے میں جو پیشگوئی ہے وہ پوری نہیں ہوئی؟ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ نشان آسمانی دکھایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے مطابق ۱۳۱۱ھ بمطابق ۱۸۹۴ء میں رمضان المبارک کی مقرر کردہ تاریخوں میں چاند اور سورج کو گرہن لگے۔ چاند گرہن رمضان المبارک کی ابتدائی تیرھویں رات ۲۱/مارچ کو ہوا اور سورج گرہن ۲۸ رمضان المبارک بروز جمعہ ۶/اپریل کو۔ ۱۸۹۴ء کی جنتری کے علاوہ گرہن کا ذکر اخبار آزاد اور سیول اینڈ ملٹری گزٹ میں بھی ہوا۔ پروفیسر T.R Von Oppolzir کی کتاب Canon of Eclipses میں B.C ۱۲۰۸ سے لے کر A.C ۱۲۶۱ کے گرہنوں کی انگریزی تاریخیں دی گئی ہیں۔ اس کتاب سے بھی مذکورہ بالا تاریخوں کی تصدیق ملتی ہے۔ یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے شعبہ ہیئت کی لائبریری میں موجود ہے۔ ۱۸۹۴ء کے Nautical Almanal London سے بھی تصدیق حاصل کی جاسکتی ہے۔

۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء کے رمضان کے گرہنوں کی خصوصیات

اس نشان کے ظاہر ہونے کے بعد حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ نے اپنی کتاب نور الحق حصہ دوم تحریر فرمائی جس میں آپ نے تحریر فرمایا کہ ''اس نشان سے ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عظیم الشان پیشگوئی پوری ہوئی''۔ آپ نے اپنے الہام کی روشنی میں یہ بھی وضاحت فرمائی کہ حدیث شریف میں اَوَّلَ لَیۡلَۃ کے جو الفاظ آئے ہیں اس سے مراد چاند گرہن کی پہلی رات یعنی ۱۳/ رمضان کی رات ہے اور فِی النِّصۡف کے جو الفاظ آئے ہیں اس سے مراد سورج گرہن کا درمیانی دن یعنی ۲۸/ رمضان ہے۔ چنانچہ گرہن انہیں تاریخوں میں ہوئے نیز آپ نے اپنی کتاب میں یہ ایمان افروز بات بھی بتائی کہ پیشگوئی کے اوّل اور نصف کے الفاظ دو طرح سے پورے ہوئے۔ ایک تاریخوں کے لحاظ سے۔ دوسرے وقت کے لحاظ سے۔ وقت کے لحاظ سے اس طرح پورے ہوئے کہ چاند گرہن قادیان میں اوّل رات یعنی رات کے شروع ہوتے ہی ہو گیا اور سورج گرہن قادیان میں دوپہر سے پہلے ہوا۔

Calcutta standard time کے مطابق ہندوستان میں چاند گرہن شام کو سات بجے اور ساڑھے نو بجے کے درمیان ہوا اور سورج گرہن دن کو ۹ بجے اور ۱۱ بجے کے درمیان[1]۔

سورج گرہن کے نصف ہونے کے بارے میں آپ فرماتے ہیں۔

''یہ قول کہ سورج گرہن اس کے نصف میں ہوگا اس سے یہ مراد ہے کہ سورج گرہن ایسے طور سے ظاہر ہوگا کہ ایام کسوف کو نصفا نصف کر دے گا اور کسوف کے دنوں میں سے دوسرے دن کے نصف سے تجاوز نہیں کرے گا کیونکہ وہی نصف کی حد ہے۔ پس جیسا کہ خدا تعالیٰ نے یہ مقدر کیا کہ گرہن کی راتوں میں سے پہلی رات کو چاند گرہن ہوا ایسا ہی یہ بھی مقدر کیا کہ سورج گرہن کے دنوں میں سے جو وقت نصف میں واقع ہے اُس میں گرہن ہو۔ سو مطابق خبر واقع ہوا اور خدا تعالیٰ بجز ایسے پسندیدہ لوگوں کے جن کو وہ اصلاح خلق کے لئے بھیجتا ہے کسی کو اپنے غیب پر اطلاع نہیں دیتا۔ پس شک نہیں کہ یہ حدیث پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جو خیر المرسلین ہے[2]۔''

---

[1] الفضل ۱۷/ اگست ۱۹۷۳ء [2] نور الحق حصہ دوم ۔ روحانی خزائن جلد ۸ صفحہ ۲۰۴، ۲۰۵ اردو ترجمہ

ایک اور لطیف بات جس کا ذکر حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ نے اپنی کتاب نورالحق حصہ دوم میں فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے چاند گرہن کے لئے تو **خسف** کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو عام طور پر چاند گرہن کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن سورج گرہن کے لئے **کسف** کا لفظ استعمال نہیں فرمایا جو عام طور پر سورج گرہن کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ سورج گرہن کے لئے **جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ** کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ فرماتے ہیں:

> ''قرآن نے کسوف کو کسوف کے لفظ سے بیان نہیں کیا تا ایک امر زائد کی طرف اشارہ کرے کیونکہ سورج گرہن جو بعد چاند گرہن کے ہوا یہ ایک غیر معمولی اور نادرۃ الصور تھا اور اگر تو اس پر کوئی گواہی طلب کرتا ہے یا مشاہدہ کرنے والوں کو چاہتا ہے۔ پس اس سورج گرہن کی صور غیبیہ اور اشکال عجیبیہ مشاہدہ کر چکا ہے پھر تجھے اس بارے میں وہ خبر کفایت کرتی ہے جو دو مشہور اور مقبول اخبار یعنی پائنیر (Poiner) اور سیول ملٹری گزٹ میں لکھی گئی ہے اور وہ دونوں پرچے مارچ ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئے ہیں[۱]۔''

گرہنوں کے اقسام ہوتے ہیں۔ بعض گرہن خفیف ہوتے ہیں اور بعض نمایاں ہوتے ہیں۔ پروفیسر J.A. Mitchell نے اپنی کتاب Eclipses of The Sun Columbia university press, New York 5th edition 1951 Pages 53 میں سورج گرہن کے چار اقسام کا ذکر کیا ہے اور یہ چار اقسام یہ ہیں۔

1- Partial 2- Annular 3- Annular Total 4- Total

Partial گرہن میں سورج کا کچھ حصہ تاریک ہوتا ہے۔

Annular گرہن میں سورج کا درمیانی حصہ تاریک ہوتا ہے لیکن اطراف کا حصہ تاریک نہیں ہوتا۔

Total گرہن میں سورج تمام کا تمام تاریک ہو جاتا ہے۔

Annular Total جیسا کہ نام سے ظاہر ہے Annular اور Total کے

---

۱ نورالحق حصہ دوم۔ جلد ۸ صفحہ ۲۱۴ اردو ترجمہ

درمیان کی قسم ہے۔یہ تیسری قسم کا گرہن سب سے زیادہ نایاب ہے۔

پروفیسر Mitchell نے ماضی کے گرہنوں کا جائزہ لینے سے یہ استنباط کیا ہے کہ اوسطاً صدی میں ۲۳۷ سورج گرہن ہوئے جن میں سے صرف دس اس قسم کے تھے۔ ۲۸ر رمضان المبارک ۱۳۱۱ھ میں گرہن اس تیسری قسم کا تھا اس لئے وہ عام سورج گرہن سے مختلف تھا۔جیسا کہ حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ نے ذکر فرمایا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ چاند کو جب گرہن لگتا ہے تو زمین کے نصف کرے سے زیادہ حصہ سے دیکھا جا سکتا ہے لیکن سورج گرہن کم علاقہ سے دیکھا جاتا ہے۔کئی دفعہ ایسے مقامات پر سورج گرہن ہوتا ہے جہاں سمندر ہوتا ہے یا آبادی کم ہوتی ہے۔۱۸۹۴ء کا سورج گرہن ایشیا کے کئی مقامات سے دیکھا جا سکتا تھا جس میں ہندوستان بھی شامل ہے۔ جہاں پیشگوئی کے مقصود سیدنا حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ اور آپ کے رفقاء نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا۔حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس میں بھی حق کے طالبوں کے لئے نشان ہے کہ گرہن ہندوستان سے دیکھا جا سکتا تھا۔چنانچہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ تحریر فرماتے ہیں۔

"اے بندگان خدا! فکر کرو اور سوچو کہ کیا تمہارے نزدیک جائز ہے کہ مہدی تو بلاد عرب اور شام میں پیدا ہو اور اس کا نشان ہمارے ملک میں ظاہر ہو اور تم جانتے ہو کہ حکمت الٰہیہ نشان کو اس کے اہل سے جدا نہیں کرتی۔پس کیونکر ممکن ہے کہ مہدی تو مغرب میں ہو اور اس کا نشان مشرق میں ظاہر ہو اور تمہارے لئے اس قدر کافی ہے اگر تم طالب حق ہو[1]۔"

پروفیسر Oppolzer کی کتاب Canon Eclipses میں صرف نمایاں سورج گرہنوں کے مقامات کو نقشہ کے ذریعہ دکھایا گیا ہے۔۱۸۹۴ء کے رمضان کا سورج گرہن چونکہ نمایاں قسم کا تھا اس لئے اس کے Track کو پروفیسر Oppolzer نے map سے بتایا ہے۔ اس کتاب کے Chart 148 میں اس سورج گرہن کے راستہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔۱۸۹۴ء Nautical Almanal میں بھی اس سورج گرہن کے راستہ کو map سے بتایا گیا ہے۔ دونوں کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے کہ سورج گرہن کا راستہ ہندوستان میں سے گزرتا ہے۔

---

[1] نور الحق حصہ دوم۔ روحانی خزائن جلد ۸ صفحہ ۲۱۵،۲۱۶ اردو ترجمہ

۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء میں دوسری دفعہ رمضان میں گرہن

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ دو دفعہ رمضان میں گرہن ہوگا۔

"اِنَّ الشَّمْسَ تَنْكَسِفُ مَرَّتَيْنِ فِيْ رَمَضَانَ "[1]

چنانچہ اگلے سال ۱۸۹۵ء میں رمضان کے مہینہ میں گرہن ہوئے۔ یہ گرہن قادیان سے نظر نہیں آئے۔ انگلستان اور امریکہ کے بعض علاقوں سے نظر آسکتے تھے۔ چاند گرہن ۱۱/ مارچ ۱۸۹۵ء میں ہوا اور سورج گرہن ۲۶/مارچ ۱۸۹۵ء کو ہوا۔ ان گرہنوں کے وقت بھی قادیان میں رمضان کی تاریخیں ۱۳ اور ۲۸ تھیں۔ مقام کے بدلنے سے تاریخیں بدل سکتی ہیں۔ اس دفعہ کا سورج گرہن نمایاں قسم کا نہیں تھا۔ لہٰذا پروفیسر Van Oppolzer نے اپنی کتاب میں اس کے لئے map نہیں دیا ہے۔

حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ نے اپنی کتاب حقیقۃ الوحی میں جو ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی ان گرہنوں کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

> "جیسا کہ ایک اور حدیث میں بیان کیا گیا ہے یہ گرہن دو مرتبہ رمضان میں واقع ہو چکا ہے۔ اوّل اِس ملک میں دوسرے امریکہ میں اور دونوں مرتبہ انہیں تاریخوں میں ہوا ہے جن کی طرف حدیث اشارہ کرتی ہے اور چونکہ اس گرہن کے وقت مہدی معہود ہونے کا مدعی کوئی زمین پر بجز میرے نہیں تھا اور نہ کسی نے میری طرح اس گرہن کو اپنی مہدویّت کا نشان قرار دے کر صدہا اشتہار اور رسالے اردو اور فارسی اور عربی میں دنیا میں شائع کئے۔ اس لئے یہ نشانِ آسمانی میرے لئے متعیّن ہوا۔ دوسری اس پر دلیل یہ ہے کہ بارہ برس پہلے اس نشان کے ظہور سے خدا تعالیٰ نے اِس نشان کے بارہ میں خبر دی تھی کہ ایسا نشان ظہور میں آئے گا اور وہ خبر براہین احمدیہ میں درج ہو کر قبل اس کے کہ جو یہ نشان ظاہر ہو لاکھوں آدمیوں میں مشہور ہو چکی تھی [2]۔"

---

[1] مختصر تذکرہ قرطبی صفحہ ۱۴۸

[2] حقیقۃ الوحی۔ روحانی جلد ۲۲ صفحہ ۲۰۲

مُنْذُ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ کی تشریح

حدیث شریف میں مُنْذُ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَ الْاَرْضِ کے جوالفاظ آتے ہیں اس کی تشریح مناسب معلوم ہوتی ہے۔ بعض لوگ غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ۱۸۹۴ء سے پہلے رمضان کے مہینے میں ۱۳اور ۲۸ تاریخوں میں گرہن کبھی نہیں ہوئے تھے۔ یہ تصور واقعات کے خلاف ہے۔ خاکسار نے جو تحقیق اپنے دوست Dr.Goswemi Mohar Ballebl کے ساتھ کی ہے اس سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ کم وبیش ہر ۲۲ سال میں ایک سال یا مسلسل دوسال ایسے آتے ہیں جبکہ چاند اور سورج دونوں کو رمضان کے مہینے میں گرہن لگتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ایک ہی مقام سے دونوں گرہن نظر آئیں۔ تفصیل کے لئے دیکھیں ریویو آف ریلیجنز جون ۱۹۹۲ء۔ کسی معین جگہ سے معین تاریخوں میں دونوں گرہنوں کا نظر آنا اس واقعہ کو کافی نایاب بنا دیتا ہے۔ ایسا صدیوں میں ایک دفعہ ہوتا ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے لے کر اب تک ۱۰۹ دفعہ سورج گرہن اور چاند گرہن دونوں رمضان کے مہینہ میں ہوئے ہیں لیکن ان میں سے صرف ۲ یا ۳ دفعہ ہی ایسا ہوا کہ ۱۳ر رمضان اور ۲۸ ر رمضان کو یہ گرہن قادیان سے نظر آسکتے تھے۔ مزید ایمان افروز بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے لے کر اب تک صرف ۱۸۹۴ء (۱۳۱۱ھ) ہی ایک ایسا سال تھا جب کہ نہ صرف ۱۳ر اور ۲۸ر رمضان کو قادیان پر گرہن ہوئے بلکہ اَوَّلَ لَیْلَۃٍ کی پیشگوئی کے الفاظ اس طرح بھی پورے ہوئے کہ چاند گرہن قادیان میں رات کے شروع ہوتے ہی ہوگیا۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ. اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ۔

مُنْذُ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَ الْاَرْضِ کے الفاظ سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان تاریخوں میں گرہن پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ مراد ہے کہ ایسے نشان کبھی کسی مدعی کے لئے ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ لہٰذا مدعی کا موجود ہونا ضروری ہے۔ دارقطنی کے الفاظ اِنَّ لِمَھْدِیِّنَا اٰیَتَیْنِ میں لام افادیت کا ہے جس سے ظاہر ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام ان دونوں نشانوں سے فائدہ اٹھائیں گے۔ چنانچہ حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ فرماتے ہیں۔

''ہمیں اس بات سے بحث نہیں کہ ان تاریخوں میں کسوف خسوف رمضان کے مہینہ میں ابتدائے دنیا سے آج تک کتنی مرتبہ واقع ہوا ہے؟ ہمارا مدعا صرف اس قدر ہے کہ جب سے نسل انسان دنیا میں آئی ہے نشان کے طور پر یہ خسوف وکسوف صرف میرے زمانہ میں میرے لئے واقع ہوا ہے اور مجھ سے پہلے کسی کو یہ اتفاق نصیب نہیں ہوا کہ ایک طرف تو اس نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا ہو اور دوسری طرف اس کے دعویٰ کے بعد رمضان کے مہینہ میں مقرر کردہ تاریخوں میں خسوف کسوف بھی واقع ہو گیا ہو اور اس نے اس کسوف خسوف کو اپنے لئے ایک نشان ٹھہرایا ہو اور دار قطنی کی حدیث میں یہ تو کہیں نہیں ہے کہ پہلے کبھی کسوف خسوف نہیں ہوا۔ ہاں یہ تصریح سے الفاظ موجود ہیں کہ نشان کے طور پر یہ پہلے کسوف وخسوف نہیں ہوا کیونکہ لَمْ تَكُوْنَا کا لفظ مؤنث کے صیغہ کے ساتھ دار قطنی میں ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ ایسا نشان کبھی ظہور میں نہیں آیا اور اگر یہ مطلب ہوا کہ کسوف خسوف پہلے کبھی ظہور میں نہیں آیا تو لَمْ يَكُوْنَا مذکر کے صیغہ سے چاہیے تھا نہ کہ لَمْ تَكُوْنَا کہ جو مؤنث کا صیغہ ہے جس سے صریح معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ایتین ہے یعنی دو نشان کیونکہ یہ مؤنث کا صیغہ ہے۔ پس جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ پہلے بھی کئی دفعہ خسوف کسوف ہو چکا ہے اُس کے ذمہ یہ بارِ ثبوت ہے کہ وہ ایسے مدعی مہدویت کا پتہ دے جس نے اس کسوف خسوف کو اپنے لئے نشان ٹھہرایا ہو اور یہ ثبوت یقینی اور قطعی چاہیے اور یہ صرف اسی صورت میں ہوگا کہ ایسے مدعی کی کوئی کتاب پیش کی جائے جس نے مہدی معہود ہونے کا دعویٰ کیا ہو اور نیز یہ لکھا ہو کہ خسوف کسوف جو رمضان میں دار قطنی کی مقرر کردہ تاریخوں کے موافق ہوا ہے وہ میری سچائی کا نشان ہے۔

غرض صرف خسوف کسوف خواہ ہزاروں مرتبہ ہوا ہو اس سے بحث نہیں۔ نشان کے طور پر ایک مدعی کے وقت صرف ایک دفعہ ہوا ہے اور حدیث نے ایک مدعی مہدویت کے وقت میں اپنے مضمون کا وقوع ظاہر کر کے اپنی صحت اور سچائی کو ثابت کر دیا[1]۔''

---

[1] چشمۂ معرفت۔ روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۳۳۰،۳۲۹ حاشیہ

نیز حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ فرماتے ہیں:

''درحقیقت آدم سے لے کر اس وقت تک کبھی اس قسم کی پیشگوئی کسی نے نہیں کی اور یہ پیشگوئی چار پہلو رکھتی ہے۔

۱۔ یعنی چاند کا گرہن اس کی متعلقہ راتوں میں سے پہلی رات میں ہونا۔

۲۔ سورج کا گرہن اس کے مقررہ دنوں میں سے بیچ کے دن میں ہونا۔

۳۔ تیسرے یہ کہ رمضان کا مہینہ ہونا۔

۴۔ چوتھے مدعی کا موجود ہونا جس کی تکذیب کی گئی ہو۔

پس اگر اس پیشگوئی کی عظمت کا انکار ہے تو دنیا کی تاریخ میں سے اس کی نظیر پیش کرو اور جب تک نظیر نہ مل سکے تب تک یہ پیشگوئی ان تمام پیشگوئیوں سے اوّل درجہ پر ہے جن کی نسبت آیت فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖ اَحَدًا کا مضمون صادق آسکتا ہے کیونکہ اِس میں بیان کیا گیا ہے کہ آدم سے آخیر تک اس کی نظیر نہیں''[1]۔

چاند گرہن، سورج گرہن کے نشان ایسے نشان ہیں جو کسی انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جس نے سورج اور چاند اور زمین کو پیدا کیا ہے بکلّی اس کے اختیار میں ہے جیسا کہ حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کو الہام ہوئے کہ قُلْ عِنْدِیْ شَهَادَةٌ مِّنَ اللّٰهِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّؤْمِنُوْنَ. قُلْ عِنْدِیْ شَهَادَةٌ مِّنَ اللّٰهِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔یعنی ان کو کہہ دے کہ میرے پاس خدا کی ایک گواہی ہے کیا تم اُس کو مانو گے یا نہیں؟ پھر ان کو کہہ دے کہ میرے پاس خدا کی ایک گواہی ہے کیا تم اس کو قبول کرو گے یا نہیں؟

اس نشان کے کئی ایمان افروز پہلو ہیں۔مختلف مذاہب کی کتابوں میں ان نشانوں کا ذکر پایا جانا، قرآن مجید میں ان کا نمایاں طور پر ذکر ہونا۔حدیث شریف میں پیشگوئی کی تفصیل پائی جانا اور یہ بتایا جانا کہ ایسا نشان کسی اور مامور کے لئے کبھی ظاہر نہیں ہوا۔

حضرت محمد بن علی امام باقر جو آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کا حدیث کے راوی ہونا۔

---

[1] تحفہ گولڑویہ۔روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۱۳۶

بزرگانِ دین کا ان نشانوں کا ذکر کرنا۔شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کی کتابوں میں اس پیشگوئی کا پایا جانا۔ ان گرہنوں کا ٹھیک دعویٰ مہدویت کے بعد انتہائی مخالفت کے وقت میں وقوع ہونا۔ان گرہنوں کا بڑی باریکیوں کے ساتھ پیشگوئی کے شرائط کو حرف بحرف پورا کرنا۔حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کا بڑی تحدی کے ساتھ ان گرہنوں کا اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کرنا۔آپ کا یہ فرمانا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بتایا ہے کہ یہ نشانات میرے لئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر یہ اعلان کرنا کہ یہ نشانات میری تصدیق کے لئے ہیں۔یہ ایسے امور ہیں جو ہر متلاشی حق کو سچائی کو قبول کرنے کی پرزور دعوت دیتے ہیں۔

حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ اپنے منظوم کلام میں فرماتے ہیں۔

اِسْمَعُوْا صَوْتَ السَّمَاءِ جَآءَ الْمَسِيْحِ جَآءَ الْمَسِيْحِ   نیز بشنو از زمیں آمد امام کامگار

یعنی سنو! آسمان سے آواز آرہی ہے کہ مسیح آگیا مسیح آگیا

نیز فرماتے ہیں۔

آسمان بارد نشان الوقت میگوید زمیں   ایں دو شاہد از پئے تصدیق من استادہ اند

نیز فرماتے ہیں۔

آسماں میرے لئے تو نے بنایا اک گواہ   چاند اور سورج ہوئے میرے لئے تاریک و تار

نیز فرماتے ہیں۔

یارو جو مرد آنے کو تھا وہ تو آچکا   یہ راز تم کو شمس و قمر بھی بتا چکا [۱]

۳۔ اس مسیح موعودؑ کی صداقت کی ایک دلیل یہ ہے کہ اُس کے زمانہ میں دجال اور یاجوج ماجوج کا ظہور اور غلبہ ہوگا

بعض مسلمان جس طرح مہدی اور مسیح کے بارہ میں بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔اسی طرح دجال اور یاجوج ماجوج کی حقیقت کو سمجھنے میں بھی غلطی خوردہ ہیں اور یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ اس سے

---

[۱] ڈاکٹر صالح محمد الٰہ دین صاحب کے مضمون سے اقتباسات۔مصباح مئی ۱۹۹۴ء صفحہ ۳۲ تا ۵۲ سے دیئے گئے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کا اس عنوان پر مضمون خالد اگست ۱۹۹۴ء اور ریویو آف ریلیجنز انگلش ستمبر ۱۹۹۴ء میں بھی شائع ہوا تھا۔(ناشر)

متعلقہ پیشگوئیوں کو حقیقت پر محمول کرتے ہیں اور پیشگوئیوں کے اس اصول کو بھول جاتے ہیں کہ تعبیر اور تمثیل، استعارہ اور مجاز پیشگوئیوں کا خاصہ ہے اور اس زبان کے اختیار کرنے کی ایک حکمت یہ ہوتی ہے کہ جس زمانہ میں پیشگوئی کی جاتی ہے اُس زمانہ کے لوگ پیشگوئی میں مضمر اصل حقیقت کو سمجھ نہیں سکتے نیز ان پیشگوئیوں کا تعلق غیب سے ہوتا ہے اور اصل ثواب ایمان بالغیب میں ہے اور جب وہ ظاہر ہوتی ہیں اور ان کی اصلیت سامنے آتی ہے تو صادق الایمان فوراً کہہ اُٹھتے ہیں هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا [1]

بہر حال عام مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ دجال کوئی مافوق الفطرت عجیب وغریب انسانی وجود ہے جو بڑی تباہ کن، خفیہ، باطنی طاقتوں کا حامل ہوگا اور وہ ایک ایسے گدھے پر سوار ہوگا جس کی طاقتیں بھی اُسی کی طرح غیر معمولی ہوں گی یہی حال یاجوج ماجوج نامی طاقتوں کا ہوگا یہ سب طاقتیں مسلمانوں کو تباہ کرنے پر تل جائیں گی اس وقت اللہ تعالیٰ امام مہدی اور مسیح کو بھیجے گا جو پھونکوں سے ان طاقتوں کو تباہ کر دیں گے۔ مسیح مزید یہ کام کریں گے کہ وہ صلیبوں کو توڑنے کے لئے شہر شہر قریہ قریہ پھریں گے اور خنزیروں کو قتل کرنے کے لئے جنگلوں میں نکل جائیں گے اور یہ دونوں بزرگ وجود بیٹھے بٹھائے مسلمانوں کو دنیا بھر کی حکومتوں اور دولتوں کا مالک بنا دیں گے۔

یہ تصور رجو بہ پسندی اور اَمانی سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اصل حقیقت کیا ہے اس کے لئے بڑے وسیع غور وفکر اور مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اِس مضمون میں چند حقائق ہی پیش کئے جاسکتے ہیں۔ لغت کی قریباً تمام کتب میں دجال کے یہ معنے بیان کئے گئے ہیں

"اَلدَّجَّالُ طَائِفَةٌ عَظِيْمَةٌ تَحْمِلُ الْمَتَاعَ لِلتِّجَارَةِ" [2]

یعنی دجال ایسے بڑے تاجروں کے گروہوں (تجارتی کمپنیوں) کا نام ہے جو مال تجارت کو اِدھر اُدھر لے جانے کے لئے نقل وحمل کے عظیم وسائل رکھتے ہیں۔ عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں دجال کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے اس بات کو بھی نمایاں طور پر واضح کیا گیا ہے کہ مکروفریب جھوٹ اور کھوٹ ان تجارتی طاقتوں کی سرشت میں داخل ہوگا [3]۔

---

[1] الاحزاب: ۲۳ [2] تاج العروس زیر لفظ "دَجَل"

[3] عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری جلد ۱ صفحہ ۴۸۶ مطبوعہ دار الطباعۃ العامرہ مصر

اس لغوی تحقیق کے بعد اب اُن روایات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے جو دجال کے خروج اور اُس کے ہولناک فتنہ کے بارہ میں کتب حدیث میں بیان ہوئی ہیں۔

قریباً تمام قابل ذکر مستند مجموعہ ہائے احادیث اور دوسری کتب دینیہ میں دجال کے آنے کا ذکر موجود ہے۔ان میں سے ایک صحیح بخاری ہے جس میں یہ حدیث روایت کی گئی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ہر زمانہ کے نبی نے اپنی امت کو دجال کے فتنہ سے ڈرایا ہے اور آپ اپنے صحابہؓ کو اس فتنہ سے بچنے کے لئے یہ دعا یاد کرنے اور باقاعدگی کے ساتھ پڑھتے رہنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الْمَسِیْحِ[1] الدَّجَّالِ"

کہ اے اللہ میں "اَلْمَسِیْحُ الدَّجَّال" کے فتنہ سے بچنے کے لئے تیری پناہ چاہتا ہوں[2]۔

دجّال کی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے صحیح مسلم کی ایک طویل حدیث بڑی معنی خیز ہے۔ اس روایت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے۔

ایک مشہور صحابی تمیم الداریؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنا ایک واقعہ[3] سنایا جس کی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے (باعلام الٰہی) تصدیق فرمائی اور دوسرے صحابہ کے سامنے بھی اسے بیان کیا۔اس واقعہ میں حضرت تمیم الداریؓ بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ مغربی سمندر کے سفر پر گئے۔سمندر کی موجیں ان کی کشتی کو ایک جزیرہ کے قریب لے گئیں۔ وہ چھوٹی کشتی میں بیٹھ کر جزیرہ میں جا اترے۔اس جزیرہ میں انہوں نے ایک عجیب و غریب خوفناک شکل والی عورت کو دیکھا بالوں کی وجہ سے جس کے نہ منہ کا پتہ چلتا تھا نہ پیٹھ کا، اُس عورت نے اپنا نام جسّاسہ[4] بتایا۔اس عورت سے تمیم داری اور ان کے ساتھیوں کی بعض باتیں ہوئیں۔

---

[1] مسیح کے ایک معنے ملک ملک بہت گھومنے پھرنے اور اپنا اثر و رسوخ بڑھانے والے کے ہیں اسی بناء پر عیسٰی اور دجال دونوں کو "اَلْمَسِیْح" کہا گیا ہے گویا عیسٰی نیکی پھیلانے اور ہدایت کی شمع روشن کرنے کے لئے سفر میں رہے گا اور اس کے بالمقابل دجال فحاشی اور بے دینی پھیلانے اور استحصالی اغراض پوری کرنے کے لئے گھومے گا۔پس عیسٰی مَسِیْحُ الْخَیْر ہے اور دجّال مَسِیْحُ الشَّر۔

[2] بخاری کتاب الفتن باب ذکر الدّجال

[3] غالبًا یہ واقعہ ایک خواب یا کشف کی صورت میں تھا۔ واللہ اعلم بالصواب

[4] صحیح مسلم کتاب الفتن باب ذکر الجسّاسہ

آخر اُس عورت نے مزید کچھ بتانے سے معذوری کا اظہار کیا اور کہا کہ جزیرہ کے درمیان میں ایک گرجا ہے وہاں جاؤ وہاں تمہیں ایک آدمی ملے گا جو مزید باتیں تمہیں بتائے گا۔ چنانچہ وہ لوگ گرجا میں گئے جہاں انہوں نے ایک اور خوفناک شخصیت کو دیکھا جو زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اُس عجیب وغریب شخصیت نے انہیں جو باتیں بتائیں اُن میں یہ بات بھی تھی کہ وہ ''دجال'' ہے اور اُسے عنقریب اس جزیرہ سے نکلنے کی اجازت ملنے والی ہے اور وہ یہاں سے نکلنے کے بعد ''مکہ اور مدینہ'' کے سوا باقی ساری دنیا پر مسلط ہو جائے گا[1]۔ صحیح مسلم کی اس روایت سے ظاہر ہے کہ دجال کا تعلق بعض مغربی سمندری جزائر کے گرجوں سے ہے جہاں وہ قید ہے[2] اور ایک وقت میں آ کر اُسے اس قید سے نکلنے کا موقع ملے گا۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ دجالی فتنہ کا آغاز یورپ کے بعض جزائر سے ہوگا جو عیسائیت کا گڑھ ہوں گے کیونکہ اب جبکہ طبقات الارض کے ماہرین نے بحر و بر کا چپہ چپہ چھان مارا ہے اور سمندر کے سب جزائر کا علم دنیا کو ہو چکا ہے تو آخر وہ جزیرہ کون سا اور کہاں واقعہ ہے جس کے گرجا میں حضرت تمیم داریؓ نے دجال کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھا اور بعض مسلمانوں کے خیال کے مطابق وہاں وہ ہیبت ناک انسان اب بھی پابند سلاسل ہے۔

مذکورہ بالا وضاحت کے درست ہونے کی ایک اور دلیل وہ حدیث ہے جس میں آتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص دجال کے فتنہ سے بچنا چاہتا ہے وہ سورۂ کہف کے ابتدائی اور آخری رکوع کی بکثرت تلاوت کیا کرے[3]۔

اب جب ہم ان دونوں رکوعوں کے مضمون پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عیسائیوں کے عقائد، اُن کے نظریات اور ان کی مادی ترقی پر بحث کی گئی ہے اور ایسے مضامین کو نمایاں کیا گیا ہے جن کا یورپین طاقتوں کے کردار سے گہرا تعلق ہے۔

پھر ایسی متعدد روایات بھی موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آخری زمانہ میں جبکہ مسیح موعودؑ ظاہر ہوں گے ''روم'' یعنی عیسائی طاقتوں کا غلبہ ہوگا اسی وجہ سے مسیح موعودؑ کا ایک کام یہ بیان کیا گیا ہے

---

[1] غالباً یہ مغربی طاقتوں کے زبردست نظام جاسوسی کی طرف اشارہ ہے جس میں عورتوں کو خاص طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔
[2] غالباً یہ قسطنطنیہ کی اسلامی حکومت کی طرف اشارہ ہے جس نے ایک مدت تک عیسائی طاقتوں کے پھیلاؤ کو روکے رکھا۔
[3] مسلم کتاب الفتن باب ذکر الدَّجّال ۔ بذل المجهود فی حلّ ابیؒ داؤد باب خروج الدَّجّال ۔

کہ کسرِ صلیب کا فریضہ سرانجام دے گا یعنی عیسائیت کی تردید میں ناقابل تردید دلائل پیش کرے گا۔

اب ہم دجال کے گدھے کی حقیقت کے بارہ میں کچھ کہنا چاہتے ہیں جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ عام مسلمانوں کا خیال ہے کہ دجال کا گدھا بھی حیوانی جامہ میں مافوق الفطرت خوفناک طاقتوں کا حامل ہوگا حالانکہ اس ''گدھے'' کی جو علامات اور صفات بیان کی گئی ہیں وہ اس خیال کی تردید کرتی ہیں اور نہ وہ کسی حیوان میں پائی جاسکتی ہیں۔ ان صفات اور علامات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایسے تیز رفتار ذرائع سفر اور مواصلاتی وسائل کی ایجاد کی طرف اشارہ ہے جن کی مثال زمانہ ماضی میں نہیں مل سکتی [1]۔

چنانچہ ریل گاڑیاں، کاریں، بسیں، بحری جہاز، ہوائی جہاز، مختلف قسم کے راکٹ، مصنوعی سیارے، فضائی شٹل اس زمانہ کی مُحَیِّرُ الْعُقُوْل ایجادات ہیں جن سے انسان حیرت زدہ ہے اور بے اختیار پکار اٹھا ہے۔ ع

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

رہا یہ سوال کی ان ایجادات کو ''گدھے'' سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ گزشتہ سامی ادیان میں گدھے کو ''اقتصادی سمبل'' کے طور پر پیش کیا گیا ہے جیسے بعض آرائی دینوں میں بیل اور گائے کو اقتصادی خوشحالی کا نشان سمجھا جاتا ہے [2]۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ایک تمثیل ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ سواریاں گدھے کی مانند عقل وفہم سے عاری ہوں گی [3] اور اپنے چلانے والوں کے حکم اور ارادہ کے تابع چلیں گی اور بعض کی آواز بھی گدھے کی آواز کے مانند ہوگی۔

اب ہم اُن صفات کی کچھ مزید وضاحت پیش کرتے ہیں جو ''دجال کے گدھے'' کی مختلف روایات میں بیان کی گئی ہیں جن سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ یہ کوئی مافوق الفطرت حیوانی گدھا نہیں بلکہ مشینی اور صنعتی دور کے آغاز کی ایک تعبیر ہے۔ مثلاً

---

[1] ان ایجادات کو گدھے سے تعبیر کرنے کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ایجادات حیرت انگیز کارنامے تو سرانجام دیں گی لیکن عقل وخرد سے عاری ہوں گی ۔ کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا

[2] زکریا باب ۹ آیت ۹ [3] کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا

۱۔ اس گدھے کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کی خوراک آگ اور پانی پر مشتمل ہوگی اور وہ بھاپ کی طاقت سے چلے گا[۱]۔

۲۔ اس گدھے کی دوسری علامت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ دھوئیں کے بادل چھوڑے گا[۲]۔

۳۔ اس گدھے کی تیسری علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ اُس کے ایک قدم اور دوسرے قدم کے درمیان کا فاصلہ بھی ایک دن رات کبھی تین دن رات کا ہوگا بلکہ بعض اوقات وہ اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے سورج کو بھی پیچھے چھوڑ جائے گا[۳]۔

۴۔ اس دجّالی گدھے کی چوتھی علامت یہ ہے کہ اُس میں کھڑکیاں اور دروازے ہوں گے اور اُس کے اندر روشن دیئے جل رہے ہوں گے[۴]۔

۵۔ اس گدھے کی پانچویں علامت یہ ہے کہ اُس کے دونوں کانوں کے درمیان ستر گز کا فاصلہ ہوگا[۵]۔ (یہ غالباً اُس سمعی رابطہ کی طرف اشارہ ہے جو ڈرائیور اور کنٹرولر کے درمیاں قائم ہوتا ہے)

۶۔ اس دجالی گدھے کی چھٹی علامت یہ ہے کہ وہ خشکی اور تری دونوں پر بڑی تیز رفتاری سے چلے گا[۶]۔ (یہ زمینی اور بحری دونوں ذرائع مواصلات کی طرف اشارہ ہے)

۷۔ اس گدھے کی ساتویں علامت یہ ہے کہ وہ چیخ مار کر لوگوں کو اپنی طرف بلائے گا[۷]۔ (یہ روانگی کے ہارن یا سائرن کی طرف اشارہ ہے)

۸۔ اس عجیب وغریب گدھے کی آٹھویں علامت یہ ہے کہ اُس کے درمیان سواریاں بیٹھیں گی[۸]

۱؎ مرقاۃ شرح مشکوۃ کتاب الفتن جلد ۲ صفحہ ۲۲۱ ۲؎ کنز العمال جلد ۷ صفحہ ۲٦٦

۳؎ کنز العمال جلد ۷ صفحہ ۲۰۰، ۲۰۱ حدیث نمبر ۲۱۱۰۔ کنز العمال جلد ۷ صفحہ ۲٦٦، ۲٦۷۔ بحار الانوار باب علامات ظهوره عليه السلام جلد ۵۲ صفحہ ۱۹۴ دار احیاء التراث العربی بیروت لبنان طبع ثالث ۱۹۸۳ء

۴؎ بحار الانوار جلد ۵۲ صفحہ ۱۹۳

۵؎ مشکوۃ کتاب الفتن باب العلامات بین یدی الساعۃ الفصل الثالث صفحہ ۴۷۷۔ کنز العمال جلد ۷ صفحہ ۲۰۱

٦؎ تنویر القلوب صفحہ ٦۸ مؤلفہ الشیخ محمد امین الکردی طبع سادس مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۴۸ھ۔ نزھۃ المجالس جلد ۱ صفحہ ۱۰۹ مطبوعہ مطبع میمنیہ مصر ۱۳۰٦ھ

۷؎ بحار الانوار باب علامات ظهوره عليه السلام جلد ۵۲ صفحہ ۱۹۴ نیز کنز العمال جلد ۷ صفحہ ۲٦۷

۸؎ کتابُ تنویرُ القلوب صفحہ ٦۸ مؤلفہ محمد امین الکردی الطبعۃ السادسہ مطبوعہ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۴۸ھ۔ سورۃ العادیات میں بھی ایسی سواریوں کی طرف اشارہ ہے۔ واللّٰہ اعلم بالصّواب

گدھے کی ان صفات پر جو مختصراً بیان کی گئی ہیں غور کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہاں کسی حیوانی گدھے کا ذکر نہیں ہو رہا بلکہ تمثیل کے رنگ میں اُس دجالی دور کی ایجادات اور طرح طرح کی نئی مشینی سواریوں کو بیان کیا جا رہا ہے ۔ کوئی سمجھدار اور عقلمند انسان یہ خیال بھی نہیں کرسکتا کہ یہ کسی حیوانی گدھے کی صفات اور خصوصیات ہوسکتی ہیں ۔ یہ اعتراض کہ اس زمانہ کی مختلف ایجادات اور خاص طور پر سواریوں کو اگر دجال کی صنعت گری اور اس کا گدھا سمجھا جائے تو پھر مسلمان اور دوسری دنیا والے ان سے فائدہ کیوں اُٹھاتے ہیں ۔ کیا دجال کے گدھے پر سوار ہونا کوئی اچھی بات ہے اور کیا دنیا کی بھلائی ان سے وابستہ ہوسکتی ہے انہیں تو دین و دنیا کی تباہی قرار دیا جانا چاہئے؟ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں خیر و شر کے دونوں پہلو ہوتے ہیں کوئی چیز بھی اپنی ذات میں بری نہیں ہوتی بلکہ مقصد اور استعمال کے لحاظ سے اُس میں بھلائی یا برائی کا وصف پیدا ہوتا ہے ۔ کسی چیز کو اچھے کام کے لئے استعمال کریں تو وہ چیز اچھی شمار ہوگی اور اگر بُرے کام کے لئے استعمال کریں تو ساری دنیا اُسے بُرا کہے گی ۔

پس چونکہ دجالی قوتوں نے اپنی ان صنعتوں اور ایجادوں کو استحصال اور تسلُّط اور تغلُّب اور فحاشی اور بے دینی پھیلانے کے لئے استعمال کرنا تھا اس لئے الہامی کتب میں ان کا ذکر شناعت اور برائی کے رنگ میں ہوا ہے ۔ ورنہ اپنی ذات میں یہ صنعتی اور علمی ترقی انسانیت کے فائدہ اور اس کی بہبود کے لئے بھی استعمال ہوسکتی ہے یاجوج ماجوج کے معنی بھی ایسی طاقتوں کے ہیں جو آگ سے کام لینے میں ماہر ہوں خاص طور پر ان کا فلسفہ تشدّد اور تخریب پسندی کے نظریات پر مبنی ہو ۔ پس یہ نام ان قوموں کو دیا گیا ہے جو اپنے نظریات کے فروغ کے لئے تشدّد کے فلسفہ پر یقین رکھتی ہیں جیسا کہ اشتراکی طاقتوں کا اندازِ فکر ہے ۔

بعض روایات اور سابقہ الہامی صحیفوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دجال کا خروج دو دفعہ ہوگا پہلی دفعہ مختصر عرصہ کے لئے اور دوسری دفعہ بڑے لمبا عرصہ کے لئے چنانچہ ایسا ہی وقوع میں آیا ہے ۔ حسب پیشگوئی[1] ۴۸۰ھ بمطابق ۱۰۹۷ء میں پہلی دفعہ دجال کا ظہور صلیبی جنگوں کی شکل میں ہوا جن میں مغربی عیسائی حکومتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ یہ جنگیں قریباً دو سو سال تک کسی نہ کسی

---

[1] مکاشفہ یوحنا باب ۲۰ آیت ۱ تا ۱۳ ۔ اعلام النبوة صفحہ ۳۵ مصنفہ علی بن محمد الماوردی مطبوعہ مصر ۔

صورت میں مسلمانوں کے لئے مصیبت بنی رہیں[1] اور آخر سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور میں بڑی حد تک ان جنگوں کا خاتمہ ہوا لیکن عیسائیت کی اس یلغار کی پسپائی کے بعد مغرب کی مسیحی اقوام نے مشرقِ وسطی اور دوسری مسلم دنیا پر تسلط حاصل کرنے کے لئے اپنی پالیسیاں بدل دیں اور مسلمانوں سے براہ راست تصادم کی پالیسی ترک کر کے دوسرے اقتصادی صنعتی اور علمی حربے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔

چنانچہ حسب پیشگوئی ۱۴۸۶ء کے قریب ان اقوام کی طرف سے بحری مہموں کا آغاز ہوا جن کی وجہ سے مغربی استعماری طاقتیں آہستہ آہستہ افریقہ اور ہندوستان کے بحری راستے معلوم کر کے آگے بڑھنے لگیں اور پھر وہ تجارت کے بہانے اکثر افریقہ، قریباً سارے ایشیا اور سارے امریکہ میں پھیل گئیں۔ اسی تسلسل میں ۱۸۵۷ء کے بعد برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریزوں نے سارے مسلم ہند پر تسلط حاصل کر لیا۔

بہر حال بائبل اور قرآن کریم کے مطالعہ اور دوسرے تاریخی خزائن کی جانچ پڑتال سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دجال سے مراد مغربی استعماری طاقتیں ہیں جن کا ایک الگ دینیاتی نظام ہے وہ صنعت و حرفت میں بھی سب سے آگے ہیں اور یاجوج ماجوج سے مراد اشتراکی نظام کی حامل حکومتیں ہیں کیونکہ یہ تشدد پسندانہ انقلابی تحریکات کی حامی بلکہ روحِ رواں ہیں دوسرے اس انقلابی نظام نے جن اقوام میں فروغ پایا ہے قدیم نوشتوں میں انہیں یاجوج ماجوج کا نام دیا گیا ہے[2]۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جہاں دجّال اور یاجوج ماجوج کے ظہور کی یہ پیشگوئی کی وہاں مسلمانوں کو یہ خوشخبری بھی دی کہ ان نازک اور تباہ کن حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک منجی کو بھیجا جائے گا جس کا ایک لقب مہدی ہوگا اور دوسرا مسیح جس کی رہنمائی اور روحانی جذب کی برکت سے مسلمان بالخصوص اور ساری دنیا بالعموم اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرے گی اور دنیوی برکات کی نعمتوں سے بھی وہ مالا مال ہو جائے گی۔ پس جبکہ اُس کے نزول کی ساری علامات

---

[1] قریباً قریباً اسی زمانہ میں مشرق کی طرف تاتاری فتنہ کا آغاز ہوا جو بالآخر بغداد کی تباہی اور عباسی خلافت کے خاتمہ پر منتج ہوا تاہم ان علاقوں میں اسلام کی روحانی تلوار کے سامنے تاتاری مغلوب ہو گئے اور بعد میں ان علاقوں کے ترکوں کو اسلام کی تاریخ ساز خدمت کی توفیق ملی۔

[2] حزقی ایل باب ۳۸ آیت ۲

پوری ہوچکی ہیں اور اس کی بعثت کا وقت آچکا ہے تو وہ جو اس مقام بعثت کا مدعی ہے اس کی سچائی کے دلائل پر کیوں غور نہ کیا جائے؟

یہ حالات ایسے تھے کہ ساری مذہبی دنیا ایک ہادی اور مرسل کے انتظار میں تھی اور مسلمان بھی اس انتظار میں شامل تھے اور مسلمانوں کے مذہبی رہنما انیسویں صدی کے آخر میں پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ مہدی اور مسیح کے آنے کا یہی زمانہ ہے لیکن آنے والا جب وقت پر آیا تو اکثر علماء منکر ہوگئے اور اُس عظیم موعود کو تسلیم کرنے میں پس و پیش سے کام لیا اور قرآنی وعید یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ [1] کے مورد بن گئے۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ان ساری علامات کے وقوع کے وقت مہدی اور مسیح ہونے کا دعویٰ سوائے حضرت مرزا غلام احمد صاحبؑ کے کسی اور نے نہیں کیا۔ اگر اس دعویٰ میں آپ سچے نہیں تو پھر اور کون ہے جس نے تقاضۂ وقت کے عین مطابق اور ساری علامات کے پورا ہونے کے بعد اس منصب کا دعویٰ کیا ہو کیونکہ مہدی اور مسیح کے آنے کا وقت تو ہے کسی کو تو آنا چاہئے جو اسلام کی خدمت کے لئے کمر بستہ ہو۔

۴۔ ''**مسیح موعود**'' کی صداقت کی چوتھی دلیل یہ ہے کہ آپ نے دعویٰ کے بعد دنیا کو یہ چیلنج دیا کہ دعویٰ سے پہلے کی میری زندگی پر غور کیا جائے اگر اُس میں کوئی عیب نہیں کوئی قابل اعتراض بات نہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ میں یکلخت بیٹھے بٹھائے ایک ایسے جھوٹ کا مرتکب بن جاؤں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں موجب غضب وقہر ہے۔

صداقت کا یہ وہ معیار ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کے سامنے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت پرکھنے کے لئے پیش فرمایا[2]۔

پس آپؑ کے غلام نے بھی آپؐ کی پیروی میں دنیا کے سامنے یہی دلیل پیش کی کہ کون ہے جو میری پہلی زندگی میں کوئی عیب یا کھوٹ ثابت کر سکے۔ آپ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

''تم کوئی عیب، افترا یا جھوٹ یا دغا کا میری زندگی پر نہیں لگا سکتے تا تم یہ خیال کرو کہ جو شخص پہلے سے جھوٹ اور افترا کا عادی ہے یہ بھی اُس نے جھوٹ بولا ہوگا۔

---

[1] یٰسٓ:۳۱ [2] یونس:۱۷۔ اس آیت کا ایک حصہ یہ ہے۔ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔

کون تم میں سے ہے جو میرے سوانح زندگی پر کوئی نکتہ چینی کر سکتا ہے[1]۔

آپ کے اس چیلنج کا کوئی مخالف سامنا نہ کر سکا اور کئی ایک نے اعتراف کیا کہ آپ واقعی پرہیز گار اور متقی انسان ہیں۔ بطور مثال آپ کے ہم وطن مشہور اہلحدیث عالم مولوی محمد حسین بٹالوی نے آپ کے بارہ میں شہادت دی کہ

"مؤلف براہین احمدیہ کے حالات وخیالات سے جس قدر ہم واقف ہیں ہمارے معاصرین سے ایسے واقف کم نکلیں گے، مؤلف صاحب جو ہمارے ہم وطن ہیں بلکہ اوائل عمر کے (جب ہم قطبی وشرح ملاّ پڑھتے تھے) ہمارے ہم مکتب۔...... مؤلف براہین احمدیہ مخالف اور موافق کے تجربہ کی رو سے (وَ اللّٰهُ حَسِیْبُهٗ) شریعت محمدیہ پر قائم پرہیز گار صداقت شعار ہیں"[2]۔

اسی طرح اخبار زمیندار کے مدیر مولانا ظفر علی خان صاحب کے والد ماجد مولوی سراج الدین نے اپنے اخبار زمیندار میں لکھا۔

مرزا غلام احمد صاحب ۱۸۶۰ء یا ۱۸۶۱ء کے قریب ضلع سیالکوٹ میں محرر تھے اُس وقت آپ کی عمر ۲۲ یا ۲۴ سال ہوگی اور ہم چشم دید شہادت سے کہہ سکتے ہیں کہ جوانی میں بھی نہایت صالح اور متقی بزرگ تھے۔ کاروبار ملازمت کے بعد اُن کا تمام وقت مطالعہ دینیات میں صرف ہوتا تھا۔ عوام سے کم ملتے تھے۔ ۱۸۷۷ء میں ہمیں ایک شب قادیان میں آپ کے یہاں مہمانی کی عزت حاصل ہوئی ان دنوں بھی آپ عبادت اور وظائف میں اس قدر محو اور مستغرق تھے کہ مہمانوں سے بھی بہت کم گفتگو کرتے تھے"[3]

۵۔ آپؑ کے سچا ہونے کی **پانچویں دلیل** یہ ہے کہ آپ نے دعویٰ کے بعد ہزارہا مخالفتوں کے باوجود ۲۳ سال سے زیادہ عرصہ بڑی کامیاب اور بامراد زندگی بسر کی۔ آپ کی یہ شاندار کامیابی آپ کی صداقت کی بڑی زبردست دلیل ہے کیونکہ یہ معیار صداقت بھی وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے لئے بیان فرمایا ہے اور کہا ہے۔

---

[1] تذکرۃ الشہادتین، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۶۴ [2] اشاعة السنہ جلد ۷ صفحہ ۶ تا ۹

[3] اخبار زمیندار جون ۱۹۰۸ء ۔ بدر ۲۵/جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۳

''اگر یہ مدعی (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے دعویٰ میں سچا نہ ہوتا اور مجھ پر افترا کرتے ہوئے میری طرف وہ باتیں منسوب کرتا جو میں نے نہیں کہی ہیں تو میں اس کی رگِ جان کاٹ دیتا''۔[1]

پس یہ دلیل صداقت آپ کے غلام نے بھی اپنی سچائی کے لئے پیش کی یعنی جس طرح آنخضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ ماموریت کے بعد ۲۳ سال تک کامیاب وکامران زندگی بسر کی۔شاندار فتوحات حاصل کیں۔دشمنوں کو زیر کیا اور کوئی مخالف آپ کا بال بیکا نہ کرسکا اسی طرح آپ کے غلام مسیح موعود علیہ السلام نے بھی دعویٰ کے بعد تیس سال سے زیادہ عرصہ تک عظیم کارناموں کی توفیق پائی اور اپنا کام مکمل کرکے ۱۹۰۸ء میں کامیاب وکامران اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

۶۔ آپ کے اپنے دعویٰ میں سچا ہونے کی **چھٹی دلیل** یہ ہے کہ یہ مسلّمہ اصول ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور اس کی افادیت اُس کے شیریں ثمرات کے لحاظ سے مانی جاتی ہے سو اسی اصول کے مطابق جب ہم آپ کے کام کے نتائج کو دیکھتے ہیں اور آپ کے کارناموں کو پرکھتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے دینی اور تنظیمی دائرہ میں ایسے **عظیم النتائج** شاندار کام کئے جن کی افادیت اور عظمت کو دوست و دشمن نے تسلیم کیا۔مثلاً

الف۔ آپ کے بڑے کارناموں میں سے ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے دنیا کو قرآنی معارف وحقائق کی طرف متوجہ کیا اور تفسیر قرآن کا ایسا بلند معیار پیش فرمایا کہ جس کی مثال سابقہ تفاسیر میں نہیں ملتی۔آپ کی کتب براہین احمدیہ، اسلامی اصول کی فلاسفی اور آئینہ کمالات اسلام وغیرہ کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کردے گا۔

آپ نے یہ بھی ثابت کیا کہ قرآن کریم کی کوئی آیت بھی منسوخ نہیں ہوئی اس سلسلہ میں آپ نے وہ اصول بھی واضح فرمائے جن کی بنا پر یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ ساری قرآنی آیات اپنے موقع ومحل کے مطابق ہیں اور کسی آیت کے منسوخ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔

---

[1] الحاقۃ: ۴۵ تا ۴۸۔ان آیات کا ایک حصہ یہ ہے وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ۔

تفسیر قرآن کے اصول بیان کرنے کے علاوہ آپ نے مخالفین اسلام کے سامنے دینِ اسلام کی صداقت کے لئے ایسے زبردست دلائل اور براہین پر مشتمل علم کلام پیش کیا کہ مخالف اُن دلائل کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ گئے نیز آپ نے اپنے منصب کے عین مطابق زبردست براہین کے ساتھ عیسائی عقائد کا بُطلان ثابت کیا اور ایک نئے انداز میں کسرِ صلیب کا فریضہ سرانجام دیا۔ مثلاً

عیسائیوں کا ایک بنیادی عقیدہ ''کفارہ'' ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نسلِ آدم نے ورثہ میں گناہ پایا اور چونکہ وہ اس موروثی گناہ سے نجات نہیں پا سکتی اس لئے خدا نے ''محبتِ انسانیت'' کے ناطے اپنے اکلوتے بیٹے کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ صلیب پر اپنی جان دے کر اور لعنتی موت قبول کر کے دنیا والوں کے گناہ اپنے ذمہ لے لے۔

آپ نے بائبل، قرآن کریم، احادیث اور دوسرے تاریخی ذخائر سے اس بات کو ثابت کیا کہ قطع نظر اس کے کہ نسلِ آدم نے گناہ ورثہ میں پایا یا نہیں پایا۔ مسیح خدا کا اکلوتا بیٹا ہے یا نہیں وہ درحقیقت صلیب پر فوت ہی نہیں ہوا کہ اُس کے لعنتی موت مرنے یا نسل آدم کے گناہوں کو اپنے ذمہ لینے کا سوال پیدا ہو۔ اس لئے عیسائیوں کے عقیدہ کفارہ کی بنیاد ہی غلط ہے۔

اسی طرح آپ نے تثلیث اور ابنیت کے عقیدہ کا بطلان بھی ثابت کیا۔ آپ کے پیش کردہ یہ دلائل اس قدر زبردست تھے کہ عیسائی علماء اور پادری ان دلائل کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نا پا سکے اور گھبرا کر انہوں نے بطور پالیسی یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ اس بارہ میں احمدیوں سے کوئی بات ہی نہ کی جائے سچ ہے۔ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۔

غرض اسلام کی صداقت ثابت کرنے اور مخالف اسلام طاقتوں کو پسپا کرنے کے لئے آپ نے جو زبردست علمی اور روحانی دلائل پیش فرمائے۔ موافق اور مخالف سب نے اُن کا اعتراف کیا چنانچہ اخبار وکیل نے آپ کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا۔

> ''وہ شخص بہت بڑا شخص جس کا قلم سحر تھا اور زبان جادو۔ وہ شخص جو دماغی عجائبات کا مجسمہ تھا۔ جس کی نظر فتنہ اور جس کی آواز حشر تھی جس کی انگلیوں سے انقلاب کے تار اُلجھے ہوئے تھے جس کی دو مٹھیاں بجلی کی دو بیٹریاں تھیں۔ وہ شخص جو مذہبی دنیا کے لئے تیس برس تک زلزلہ اور طوفان رہا۔ جو شورِ قیامت ہو کے خفتگانِ خواب ہستی کو

بیدار کرتا رہا خالی ہاتھ دنیا سے اُٹھ گیا ...... مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی رحلت اس قابل نہیں کہ اُس سے سبق حاصل نہ کیا جاوے اور مٹانے کے لئے اُسے امتدادِ زمانہ کے حوالہ کر کے صبر کر لیا جائے ۔ ایسے لوگ جن سے مذہبی یا عقلی دنیا میں انقلاب پیدا ہو ہمیشہ دنیا میں نہیں آتے ۔ یہ نازشِ فرزندانِ تاریخ بہت کم منظر عالم پر آتے ہیں اور جب آتے ہیں دنیا کے کسی حصہ میں انقلاب پیدا کر کے دکھا جاتے ہیں ۔ ....

ان کی (میرزا صاحب کی) یہ خصوصیت کہ وہ اسلام کے مخالفین کے برخلاف ایک فتح نصیب جرنیل کا فرض پورا کرتے رہے ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اس احساس کا کھلم کھلا اعتراف کیا جائے تا کہ وہ مہتم بالشان تحریک جس نے ہمارے دشمنوں کو عرصہ تک پست اور پامال بنائے رکھا آئندہ بھی جاری رہے ۔ ...... مرزا صاحب کا لٹریچر جو مسیحیوں اور آریوں کے مقابلہ پر اُن سے ظہور میں آیا قبول عام کی سند حاصل کر چکا ہے اور اس خصوصیت میں وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔ اس لٹریچر کی قدر و عظمت آج جبکہ وہ اپنا کام پورا کر چکا ہے ہمیں دل سے تسلیم کرنی پڑتی ہے ۔ ....

غرض مرزا صاحب کی یہ خدمت آنے والی نسلوں کو گراں بارِ احسان رکھے گی کہ انہوں نے قلمی جہاد کرنے والوں کی پہلی صف میں شامل ہو کر اسلام کی طرف سے فرض مدافعت ادا کیا اور ایسا لٹریچر یادگار چھوڑا جو اُس وقت تک کہ مسلمانوں کی رگوں میں زندہ خون رہے اور حمایتِ اسلام کا جذبہ اُن کے شعارِ قومی کا عنوان نظر آئے قائم رہے گا[1]۔

ب ۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کارناموں میں سے دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے نظم و ضبط ۔ اتحاد و اتفاق اور اس کی برکات کے شعور کو عملی شکل دی اور نیک مقاصد اور دنیا کی دینی بہبود کے لئے ایک عظیم الشان منظم جماعت کی بنیاد رکھی[2] جس کا نصب العین یہ ہے کہ اس جماعت کے افراد پہلے اپنے نفس کی اصلاح کریں پھر ساری دنیا کے لئے دعوت الی الخیر کا فریضہ سرانجام دیں ۔ چنانچہ یہ عظیم الشان تنظیم جو جماعت احمدیہ کے نام سے مشہور ہے روزِ قیام

[1] اخبار بدر مورخہ ۱۸؍جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۲، ۳ ۔ [2] یوم تاسیس جماعت ۲۳؍مارچ ۱۸۸۹ء

سے ہی اپنے امامِ وقت کی رہنمائی میں مسلسل اس نصب العین کی طرف رواں دواں ہے
اس جماعت کی عظمتِ کردار کا یہ ثبوت کافی ہے کہ علامہ اقبال نے بھی اس جماعت کو اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ قرار دیا اور مشہور احراری لیڈر چوہدری افضل حق صاحب نے لکھا۔

''آریہ سماج کے معرضِ وجود میں آنے سے پیشتر اسلام جسدِ بے جان تھا جس میں تبلیغی حس مفقود ہوچکی تھی۔ مسلمانوں کے دیگر فرقوں میں تو کوئی جماعت تبلیغی اغراض کے لئے پیدا نہ ہوسکی ہاں ایک دل مسلمانوں کی غفلت سے مضطرب ہوکر اُٹھا۔ ایک مختصر سی جماعت اپنے گرد جمع کر کے اسلام کی نشر و اشاعت کے لئے بڑھا...... اور اپنی جماعت میں وہ اشاعتی تڑپ پیدا کر گیا جو نہ صرف مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے لئے بلکہ دنیا کی تمام اشاعتی جماعتوں کے لئے نمونہ ہے'' [۱]۔

مشہور ہندو اخبار تیج دہلی نے جماعت احمدیہ کے اثر و رسوخ کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا۔

''تمام دنیا کے مسلمانوں میں سے سب سے زیادہ ٹھوس اور مؤثر اور مسلسل تبلیغی کام کرنے والی طاقت جماعت احمدیہ ہے...... بلا مبالغہ احمدیہ تحریک ایک خوفناک آتش فشاں پہاڑ ہے جو بظاہر اتنا خوفناک معلوم نہیں ہوتا لیکن اس کے اندر ایک تباہ کن اور سیال آگ کھول رہی ہے جس سے بچنے کی کوشش نہ کی گئی تو کسی وقت موقع پا کر ہمیں جھلس دے گی'' [۲]۔

مشہور پادری ڈاکٹر زویمر نے ایک مضمون لکھا جو چرچ مشنری ریویو آف لندن میں شائع ہوا اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب جماعت احمدیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہ ایک اسلحہ خانہ ہے جو ناممکن کو ممکن بنانے کے لئے تیار کیا گیا ہے اور ایک زبردست عقیدہ ہے جو پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا دیتا ہے۔''

ج۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کارناموں میں سے تیسرا بڑا کارنامہ ''**خلافت علیٰ منہاج النبوۃ**'' کا قیام ہے۔ اس خلافت کے بارہ میں اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں

---

[۱] فتنۂ ارتداد اور پولیٹیکل قلابازیاں طبع دوم صفحہ ۴۲

[۲] ''اخبار تیج'' ۲۵ر جولائی ۱۹۲۷ء

فرماتا ہے اگر تم سچا ایمان پیدا کرو گے اور نیک اعمال بجالاؤ گے تو تمہیں خلافت کی نعمت عطا کی جائے گی [۱]۔ چنانچہ خلافت کی اسی اہمیت کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے معاً بعد آپؐ کے صحابہؓ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ نظام خلافت قائم کر کے اُس کے لئے خلیفہ راشد منتخب کیا۔اس انتخاب میں حسب وعدہ الٰہی بذریعہ وحی خفی تصرف اور روحانی رہنمائی کا دخل تھا۔

خلیفہ راشد کا اصل دین کی تبلیغ اور اس کا استحکام اور مسلمانوں کی روحانی، اخلاقی اور تمدنی رہنمائی ہے ۔حکومت اور سیاست تو ضمنی چیز ہے ۔یہ میسر آئے یا نہ آئے اس سے خلافت کے اصل فرائض پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قرآن کریم نے وعدۂ خلافت کے ضمن میں جو یہ فرمایا ہے کہ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ سابقہ دینی جماعتوں میں جو تنظیمی صلاحتیں ہیں ان کے انداز پر بھی غور کرو۔مثلاً پاپائیت ۔جو ایک رنگ میں مسیحی دین کی خلافت ہے باوجود سینکڑوں خرابیوں کے اپنے اندر ایسی کوئی خوبی ضرور رکھتی ہے جس کی وجہ سے یہ دو ہزار سال سے قائم ودائم ہے اس میں کیا راز ہے۔

حضرت خلیفة المسیح الثانی رضی اللّٰہ تعالی عنہ نے تفسیر کبیر میں نظامِ خلافت پر بحث کرتے ہوئے اس راز کی اس طرح نشان دہی کی ہے۔

> ''پہلی قوموں میں یہودیوں کے علاوہ عیسائی قوم بھی ہے جس میں خلافت بادشاہت کے ذریعہ نہیں آئی بلکہ اُن کے اندر خالص ''دینی خلافت'' تھی۔پس كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ میں پہلوں کے طریق انتخاب کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ایک الہام بھی اس کی تصدیق کرتا ہے آپ کا الہام ہے ''کلیسیا کی طاقت کا نسخہ'' [۲] یعنی کلیسا کی طاقت کی ایک خاص وجہ ہے کہ اس کو یاد رکھو۔گویا قرآن کریم نے كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ کے الفاظ میں جس نسخہ کا ذکر کیا ہے الہام میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ جس طرح وہ لوگ اپنا خلیفہ منتخب کرتے ہیں اُسی طرح یا اُس کے قریب قریب تم

[۱] النور: ۵۶
[۲] تذکرہ صفحہ ۵۲۷ مطبوعہ ۲۰۰۴ء

بھی اپنے لئے خلافت کے انتخاب کا طریقہ ایجاد کرو" [1]۔

د۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے کارناموں میں سے چوتھا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے "عملی جہاد" کا حقیقی معنوں میں احیاء کیا۔ عام مسلمان صرف لفظاً جہاد کے قائل تھے نہ کوئی عمل تھا اور نہ اس کے لئے کوئی تیاری بلکہ وہ تو دین کے لئے قربانی پیش کرنے اور جہاد کے لئے تیاری کرنے کی بجائے اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ جب مسیح اور مہدی آئیں گے تو وہ خود مسلمانوں کے مصائب کا مداوا اس رنگ میں کریں گے کہ محض روحانی طاقت اور منہ کی پھونکوں سے ان کے دشمنوں کو نیست و نابود کر دیں گے۔ سب ملتوں کو مٹا دیں گے۔ وہ غیر مسلموں کے مذہبی نشان مثلاً عیسائیوں کی صلیب کو توڑ پھوڑ دیں گے اور پھر ساری دنیا کی دولتیں نام کے مسلمانوں کے قدموں میں لا ڈالیں گے اور اس طرح مسلمان دنیا بھر کی حکومتوں کے مالک بن جائیں گے۔ یہ تھی مسلمانوں کی خیالی دنیا اور آمــانـی سے بھری سوچ جس کے غلط ہونے کی طرف حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے توجہ دلائی اور بتایا کہ آنے والے مسیح اور مہدی میں خواہ کتنی ہی روحانی طاقتیں ہوں۔ وہ بہر حال اپنے آقا سردار دو جہاں حضرت محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر نہیں۔ پس جبکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو کامیابی اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے جاں گسل محنت اور جد و جہد کرنی پڑی بے مثل جانی اور مالی قربانیاں پیش کرنی پڑیں اور آپ کے صحابہؓ نے اس راہ میں جس طرح سرفروشی کے کارنامے دکھائے تاریخ عالم میں ان کی مثال نہیں ملتی کیونکر وہ محنت کے پسینہ میں نہا کر اور خون کے دریا میں سے گزر کر اپنے اعلیٰ مقاصد تک پہنچے اور اصلاح خلق کا فریضہ بجا لائے تو پھر اور کون ہے جو صرف روحانی پھونکوں اور منہ کی باتوں سے دینی انقلاب لے آئے اور ہولناک طاقتوں کو ہاتھ کے اشارہ سے نیست و نابود کر دے۔

غرض آپ نے دنیا خاص طور پر مسلمانوں کو اصل حقیقت کی طرف توجہ دلائی اور "عملی جہاد" پر یقین رکھنے والی ایک ایسی جماعت کی بنیاد رکھی جو صحابہؓ کی مانند اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربانیاں پیش کرتی چلی جا رہی ہے آپ نے اس جماعت کے اندر اپنی روحانی قوۃ اور خداداد جذب کے ذریعہ یہ یقین اور جذبہ پیدا کیا کہ محنت اور قربانی۔ اتحاد اور اتفاق۔ وسائل کے اندر رہتے ہوئے عقلمندی

[1] تفسیر کبیر "تفسیر سورۃ النور" آیت ۵٦

اور صبر و استقلال کے ساتھ آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کئے بغیر اللہ تعالیٰ کے ''خاص فضل'' حاصل نہیں کئے جاسکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ اٹل قانون ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی [1]۔ آپ نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ دنیا میں سربرآوردہ ہونے کے لئے جن اخلاق اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے انہیں اختیار کیا جائے بات کرنے کا سلیقہ اور دوسرے کی بات سننے کا حوصلہ ہونا چاہئے دین کی اشاعت اور پاک تربیت کے لئے صلاحتیں صرف کرنے کے لئے جس توازن کی ضرورت ہے اُسے اپنا کر ہی یہ مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

کامیاب تربیت کے لئے یہ امتیاز ضروری ہے کہ کونسے مرحلہ میں طاقت کا استعمال ہونا چاہئے اور کونسے مسائل کی ترویج کے لئے وعظ و نصیحت اور حکمت و موعظت سے کام لینا چاہئے اور کونسے کام کا کونسا وقت ہے یہ ساری خوبیاں ایک ترقی پذیر روحانی جماعت کے اندر دینی معاشرہ پیدا کرنے کے لئے ضروری ہیں [2]۔

پس اگر دنیائے اسلام جہاد کی عملی اہمیت کو سمجھ لے اتحاد اور اتفاق کی نعمت کو پالے صبر اور جذبات کی قربانی پیش کرنے کا ملکہ اپنے اندر پیدا کرلیا اور قوت ایجاد کے فقدان کا تدارک کرسکے اور پھر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پیش کردہ دلائل حقہ سے لیس ہوکر بحیثیت اجتماعی فریضہ تبلیغ کی طرف متوجہ ہوتو لادینی طاقتیں اس کے سامنے بالکل ہیچ ہوجائیں اور وہ اپنی علمی کمزوری اور روحانی درماندگی کو پہچان کر بڑی تیزی کے ساتھ گروہ درگروہ ''حق'' کی طرف دوڑنا شروع کردیں۔ اس وقت علمی تبلیغ کے زیادہ مؤثر نہ ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ دنیائے اسلام خود اُن خوبیوں سے عاری ہے جن کی طرف اسلام بلاتا ہے۔ اس وقت نمونے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ امن وسلامتی کا نمونہ۔ اخلاقی برتری کا نمونہ۔ صبر و رضا کا نمونہ۔ قناعت و کفایت کا نمونہ۔ دیانت و امانت کا نمونہ۔ محنت وسعی کا نمونہ۔ حوصلہ اور استقلال کا نمونہ۔ مصائب میں بھی دوسروں کے کام آنے کا نمونہ۔ یہ نمونے بڑی زبردست طاقت ہیں اور یہ طاقت حاصل کرنے کے لئے جماعت احمدیہ اپنے خلیفہ راشد کی قیادت میں آہستہ آہستہ آگے بھی بڑھ رہی ہے اور اپنے مولا

---

[1] النجم: ۴۰

[2] اس روحانی و دینی اور تربیتی پروگرام کی تفصیل جاننے کے لئے ملفوظات حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا مطالعہ ضروری ہے

کریم کے حضور دست بدعا بھی ہے[1]۔

حضرت مسیح آخرالزمان ومہدیٔ دوران علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔

''اے تمام لوگو سن رکھو کہ یہ اس کی پیش گوئی ہے جس نے زمین و آسمان بنایا وہ اپنی اس جماعت کو تمام ملکوں میں پھیلا دے گا اور حجت اور برہان کے رو سے سب پر ان کو غلبہ بخشے گا۔ وہ دن آتے ہیں بلکہ قریب ہیں کہ دنیا میں صرف یہی ایک مذہب ہوگا جو عزت کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ خدا اس مذہب اور اس سلسلہ میں نہایت درجہ اور فوق العادت برکت ڈالے گا اور ہر ایک کو جو اس کے معدوم کرنے کی فکر رکھتا ہے نامراد رکھے گا۔...... اگر اب وہ مجھ سے ٹھٹھا کرتے ہیں تو اس ٹھٹھے سے کیا نقصان؟ کیونکہ کوئی نبی نہیں جس سے ٹھٹھا نہیں کیا گیا۔ پس ضرور تھا کہ ''مسیح موعود'' سے بھی ٹھٹھا کیا جاتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰحَسْرَۃً عَلَی الْعِبَادِ مَا یَاْتِیْھِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ[2]۔ پس خدا کی طرف سے یہ نشانی ہے کہ ہر ایک نبی سے ٹھٹھا کیا جاتا ہے مگر ایسا آدمی جو تمام لوگوں کے روبرو آسمان سے اُترے اور فرشتے بھی اُس کے ساتھ ہوں اُس سے کون ٹھٹھا کرے گا۔ پس اس دلیل سے بھی عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ ''مسیح موعود'' کا آسمان سے اترنا محض جھوٹا خیال ہے

یاد رکھو کہ کوئی آسمان سے نہیں اُترے گا۔ ہمارے سب مخالف جو اب زندہ موجود ہیں وہ تمام مریں گے اور کوئی اُن میں سے عیسٰی بن مریم کو آسمان سے اترتے نہیں دیکھے گا اور پھر ان کی اولاد جو باقی رہے گی وہ بھی مرے گی اور اُن میں سے بھی کوئی آدمی عیسٰی بن مریم کو آسمان سے اترتے نہیں دیکھے گا اور پھر اولاد کی اولاد مرے گی اور وہ بھی مریم کے بیٹے کو آسمان سے اترتے نہیں دیکھے گی۔ تب خدا اُن کے دلوں میں گھبراہٹ ڈالے گا کہ زمانہ صلیب کے غلبہ کا بھی گزر گیا اور دنیا دوسرے رنگ میں آ گئی مگر مریم کا بیٹا عیسٰی اب تک آسمان سے نہ اُترا۔ تب دانشمند یک دفعہ اس عقیدہ

---

[1] قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُھَا مِنْ اَطْرَافِھَا وَاللّٰہُ یَحْکُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُکْمِہٖ وَھُوَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (الرعد: ۴۲)

[2] یٰسٓ: ۳۱

سے بیزار ہو جائیں گے اور ابھی تیسری صدی آج کے دن سے پوری نہیں ہوگی کہ عیسیٰ کے انتظار کرنے والے کیا مسلمان اور کیا عیسائی سخت نومید اور بدظن ہو کر اس جھوٹے عقیدہ کو چھوڑیں گے اور دنیا میں ایک ہی مذہب ہوگا اور ایک ہی پیشوا۔ میں تو ایک تخم ریزی کرنے آیا ہوں سو میرے ہاتھ سے وہ تخم بویا گیا اور اب وہ بڑھے گا اور پھولے گا اور کوئی نہیں جو اُس کو روک سکے''۔[1]

[1] تذکرۃ الشہادتین روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ٦٦، ٦٧

المراجع و المصادر

۱	ابن القیم. الجوزیه ڈاکٹر طاهر سلیمان حموده کلیة الآداب جامعة الاسکندریه مطبوعه دار الجامعات المصریة اسکندریه ۱۹٦۷ء
۲	ابو حنیفه. عبدالحلیم الجندی مطبوعه دار المعارف القاهره ۱۹۸۳ء
۳	اثبات الوصیّة. للامام علی بن ابی طالب علیه السلام ابوالحسن علی بن الحسین بن علی المسعودی (م۳۴٦ھ) منشورات مکتبه بصیرتی قُم ایران
۴	الاسلام و الحضارة العربیّة۔(دو جلد) محمد کرد علی۔ مطبوعه لجنة التألیف والترجمة والنشر القاهره. طبع ثالث ۱۹٦۸ء
۵	اصل الشیعة و اصولها. محمد الحسین آل کاشف الغطاء . مطبوعه منشورات الأعلمي بیروت لبنان
٦	الاصول الکافی. ثقة الاسلام ابوجعفر محمد بن یعقوب الکلینی الرازی (م۳۲۹ھ) دار الکتب الاسلامیة تهران طبع ثالث ۱۳۸۸ھ
۷	اعتقادات فرق المسلمین والمشرکین. الامام فخر الدین الرازی . مطبوعه دار الکتب العلمیة بیروت لبنان ۱۹۸۲ء
۸	اعتقادات الشیخ الصدوق ۔تعلیمی پریس لاہور۔طبع ثانی ۱۹٦۴ء۔اس کا ایک نام اعتقادیة الشیخ الصدوق بھی ہے۔
۹	اعیان الشیعة. السید محسن الامین الحسینی العاملی مطبوعه مطبعة الا تقان دمشق شام طبع ثانی ۱۹۴۷ء۔طبع خامس ۱۹۸۳ء
۱۰	الامام احمد بن حنبل . ڈاکٹر مصطفٰی الشکعه. مطبوعه مطبع النهضة مصر. دار الکتب المصریة طبع اوّل ۱۹۸۴ء

۱۱	ازالہ اوہام۔ روحانی خزائن جلد ۳ از حضرت مسیح موعود علیہ السلام
۱۲	الاسلام و الدولة العربية
۱۳	الامام الشافعي۔ عبدالحليم الجندی مطبوعه دار المعارف القاهره طبع ثالث ۱۹۸۶ء
۱۴	الامام علي۔ بن ابي طالب عبدالفتاح عبدالمقصود۔ مكتبه مصر القاهره۔ طبع خامس
۱۵	الامامة و السّياسة۔ الامام ابو محمد بن عبدالله بن مسلم بن قتيبه الدينوری (م۲۷۶ھ) مطبع مصطفٰى البابي الحلبي مصر ۔ و دارالمعرفة ۔ بيروت لبنان
۱۶	البيان في اخبار صاحب الزمان۔ ابو عبدالله محمد القرشي الكنجي الشافعي المتوفّٰى ۶۵۸ھ قم ايران طبع ۱۹۷۹ء
۱۷	اعلام النبوة مصنفه علي محمد الماوردی مطبوعه مصر
۱۸	الانسان الكامل في معرفة الآواخر و الاوائل سيد عبدالكريم الجيلي مطبوعه ۱۳۰۰ھ
۱۹	اِكمالُ المَين
۲۰	اخبار زمیندار۔ لاہور
۲۱	اخبار وکیل۔ امرتسر
۲۲	اخبار الفضل۔ قادیان
۲۳	اخبار تیج۔ دہلی
۲۴	امام مہدی کا ظہور مصنفہ قریشی محمد اسد اللہ کاشمیری نظارت اشاعت صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ مطبع ضیاء الاسلام پریس ربوہ ایڈیشن دوم
۲۵	بحار الانوار۔ علامه محمد باقر المجلسی (م۱۱۱۱ھ) جلد ۵۲ مطبوعه مطبع احياء التراث العربي بيروت لبنان طبع ثالث ۱۹۸۳ء
۲۶	بذل المجهود في حلّ أبي داؤد
۲۷	بدر۔ قادیان

۲۸	بائبل۔ کتاب مقدس (عہدنامہ قدیم وجدید)
۲۹	براہین احمدیہ ہر چہار حصص روحانی خزائن جلد ۱ حضرت مسیح موعود علیہ السلام
۳۰	تذکرۃ الشہادتین۔ روحانی خزائن جلد ۲۰ از حضرت مسیح موعود علیہ السلام
۳۱	تحفہ گولڑویہ۔روحانی خزائن جلد ۱۷ از حضرت مسیح موعود علیہ السلام
۳۲	تاریخ الامم والملوک ابو جعفر محمد بن جریر الطبری مطبعۃ الحسینیہ المصریہ طبع اوّل۔ (المعروف تاریخ الطبری)
۳۳	تاریخ بغداد۔ حافظ ابوبکر احمد بن علی الخطیب البغدادی (م۴۶۳ھ) ناشر مکتبۃ الخانجی القاھرہ مصر ۔۱۹۳۱ء
۳۴	تاریخ التشریع الاسلامی۔ الشیخ محمد الخضری بک الاستاذ التاریخ الاسلامی بالجامعۃ المصریہ مطبعۃ الاستقامۃ طبع رابع ۱۹۳۴ء
۳۵	تاریخ الجمیعات السریۃ والھدامۃ۔ محمد عبداللہ عنان المحامی۔ ادارۃ الھلال القاھرہ مصر ۔۱۹۲۶ء
۳۶	تاریخ الدولۃ الفاطمیۃ۔ ڈاکٹر ابراھیم حسن۔ استاذ التاریخ الاسلامی بجامعۃ القاھرہ۔ مطبوعہ مطبعۃ النھضۃ قاھرہ مصر ۔ طبع رابع ۱۹۸۱ء۔
۳۷	تاریخ الشیعۃ۔ الشیخ محمد حسین المظفر۔ دارالزھراء بیروت لبنان ۱۹۸۵ء
۳۸	تاریخ العرب (مطول) ڈاکٹر فیلیب حیتی ناشر دارالکشّاف بیروت لبنان طبع ۱۹۵۸ء ۱۳۷۸ھ تعریب ڈاکٹر ایدورد جرجی۔ ڈاکٹر جبرائیل جبور
۳۹	تصحیح الاعتقاد بصواب الانتقاد۔ ھبۃ الدین محمد شھرستانی
۴۰	تاریخ الدولۃ العباسیۃ۔ اخبار الراضی باللہ والمتقی للہ۔ ابوبکر محمد بن یحیٰ بن عبداللہ الصولی (م۳۳۵ھ)
۴۱	تاریخ الفرق الاسلامیۃ۔ الشیخ محمد حسین الزین۔ مطبوعہ منشورات مؤسّسۃ الأعلمی بیروت لبنان طبع ثانی ۱۹۸۵ء

۴۲	تاریخ المذاھب الاسلامیة۔ محمد ابو زُھرہ استاذ جامعة القاھرہ۔ مطبعة النموذجیہ القاھرہ۔ مصر
۴۳	تاریخ یعقوبی لاحمد بن یعقوب مطبوعہ دار صادر بیروت ۱۹۶۰ء
۴۴	تاریخ الکبیر للبخاری
۴۵	History of Syria by Philip K,Hitty second edition London 1957ء تاریخ شام۔تعریب ڈاکٹر کمال الیازجی۔ دار الثقافة۔ بیروت لبنان۔طبع ثانی ۱۹۷۲ء (اردو ترجمہ) ازمولانا غلام رسول مہر ناشر غلام علی اینڈ سنز لاہور طبع اوّل ۱۹۶۲ء
۴۶	تذکرة الحفّاظ۔ الامام ابو عبداللّٰہ شمس الدین محمد بن احمد الذہبی (م ۷۴۸ھ) ناشر دار الفکر العربی۔
۴۷	تشکیل جدید الٰہیات اسلامیة۔ علّامہ اقبال۔ترجمہ نذیر نیازی۔ناشر بزم اقبال نرسنگھ داس گارڈن۔کلب روڈ لاہور۔
۴۸	تفسیر الدر المنثور فی تفسیر المأثور۔ امام عبدالرحمٰن بن الکمال جلال الدین السیوطی (م۹۱۱ھ) دار الفکر بیروت لبنان۔ طبع اوّل ۱۹۸۳ء
۴۹	تفسیر القرآن العظیم۔ امام عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن کثیر (م۷۷۴ھ) دار الفکر۔ بیروت لبنان۔
۵۰	تھذیب التھذیب۔ ابو الفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانی (م۸۵۲ھ) مطبع مجلس دائرة المعارف النظامیہ حیدرآباد دکن۔طبع اوّل ۱۳۲۷ھ
۵۱	تفسیر کبیر۔ سیدنا حضرت خلیفة المسیح الثانی امام جماعت احمدیہؓ
۵۲	تحذیر الناس۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانئ دار العلوم دیوبند۔
۵۳	تفہیمات الٰہیہ۔ حضرت شاہ ولی اللّٰہ محدّث دھلویؒ
۵۴	تاریخ دمشق الکبیر۔ ابن عساکر مطبع دار المسیرة بیروت ۱۳۹۹ھ

۵۵	تاريخ الخلفاء۔ علامه جلال الدين سيوطي
۵۶	تاج العروس
۵۷	تنوير القلوب۔ الشيخ محمد امين الكردي۔ مطبع السعاده مصر طبع سادس ۱۳۴۸ھ
۵۸	تاريخ همدان ديلمي۔ (حیدرآباددکن کی لائبریری میں اس کا قلمی نسخہ تھا)
۵۹	تذكره۔ مجموعہ الہامات وکشوف ورؤیا حضرت مسیح موعود علیہ السلام
۶۰	جامع البيان في تفسير القرآن (المعروف تفسير طبری)۔ الامام ابوجعفر محمد بن جرير الطبری (م۳۱۰ھ)مطبعة الكبرىٰ الاميريه بولاق ۔مصر
۶۱	اَلجامعُ الصّحيحُ سننُ التّرمذی۔ لأبی عيسٰی محمد بن عيسٰی بن سورة بن موسٰی الترمذی
۶۲	الجامع الصغير للسيوطی
۶۳	چشمۂ معرفت ۔روحانی خزائن جلد ۲۳ از حضرت مسیح موعود علیہ السلام
۶۴	حديث رسول كا تشريعي مقام۔ غلام احمد حريری۔ ناشر ملک برادرز کارخانہ بازار فیصل آباد پاکستان ۔ یہ کتاب دراصل ترجمہ ہے ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی صدر شعبہ فقہ اسلامی جامعہ دمشق کی کتاب اَلسُّنَّةُ وَ مكانتها فی التشريع الاسلامی کا۔
۶۵	حلية الاولياء لأبی نعيم الاصفهانی
۶۶	حجج الكرامه ۔نواب صدیق حسن خان بھوپالوی مطبوعہ مطبع شاہجہانی بھوپال
۶۷	حاشيه بر ابن ماجه مطبوعه مطبع علميه مصر ۱۳۱۳ھ ایڈیشن اوّل
۶۸	حقيقة الوحی ۔روحانی خزائن جلد ۲۲ از حضرت مسیح موعود علیہ السلام
۶۹	حیات جاوید ۔مولانا الطاف حسین حالی ۔مطبع نیشنل بک ہاؤس لاہور ۔طبع ۱۹۸۶ء
۷۰	حیات قمر الانبیاء ۔شیخ محمد اسماعیل پانی پتی
۷۱	حرف اقبال ۔علامہ اقبال کے مضامین کا مجموعہ

۷۲	الخطط المقریزیہ۔ امام تقی الدین احمد بن علی المعروف بالمقریزی طبع بولاق ۱۲۷۰ھ
۷۳	خصائص امیر المؤمنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجھہ۔ الامام ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائی (م۳۰۳ھ) المطبع الخیریہ طبع ۱۳۰۸ھ
۷۴	خطبات طاہر جلد ۷ شائع کردہ طاہر فاؤنڈیشن ربوہ
۷۵	دیوان الامام الشافعیؒ۔ مطبوعہ مؤسسة الأعلمی للمطبوعات بیروت لبنان طبع اولیٰ ۲۰۰۰ء
۷۶	الدولة الفاطمیة۔ حسن ابراھیم حسن استاذ التاریخ الاسلامی جامعہ قاھرہ مکتبة النھضة المصریة القاھرہ طبع رابع ۱۹۸۱ء
۷۷	دافع الوسواس فی أثر ابن عباس۔ مولانا محمد عبدالحی لکھنوی فرنگی محلّی مطبوعہ مطبع یوسفی فرنگی محل لکھنؤ طبع دوم
۷۸	دعائم الاسلام۔ ابوحنیفہ النعمان بن محمد المغربی الشیعی الاسماعیلی مطبوعہ دارالمعارف مصر ۱۹۵۱ء
۷۹	ریاض الصالحین۔ الامام ابی زکریا یحیٰ بن شرف النووی الدمشقی
۸۰	ریویو بر مباحثہ بٹالوی و چکڑالوی۔ روحانی خزائن جلد ۱۹ از حضرت مسیح موعود علیہ السلام
۸۱	رسالہ اشاعة السنہ زیر ادارت مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی
۸۲	سنن الدار قطنی لامام الحافظ علی بن عمر الدارقطنی مطبوعہ دارالمحاسن القاھرہ مصر ۱۹۶۶ء
۸۳	سنن ابی داؤد للامام أبی داؤد سلیمان بن الاشعث الأدیؒ السجستانی
۸۴	سنن ابن ماجہ۔ الحافظ أبی عبداللہ محمد بن یزید قزوینی
۸۵	سنن النسائی۔ للحافظ جلال الدین السیوطی
۸۶	سیرة ابن ھشام۔ ابو محمد عبدالملک بن ھشام المعافری المتوفّٰی ۲۱۳ھ۔ مطبوعہ دارالجلیل۔ بیروت ۱۹۷۵ء

۸۷	سیر اعلام النبلاء۔ شمس الدین الذہبی
۸۸	الشّیعۃ فی التاریخ۔ محمد حسین الزین العاملی مطبوعہ مطبع العرفان صیداء طبع ۱۹۳۸ء
۸۹	شذرات الذہب۔ عبدالحی بن احمد بن محمد ابن العماد العکری الحنبلی ابوالفلاح (م۱۰۸۹ھ)
۹۰	شرح الترمذی۔ لابن العربی جلد۹
۹۱	(الف) الشّفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ لقاضی عیاض مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی ۱۳۶۹ھ (ب) شرح الشفاء لمُلّا علی القاری المطبع العامرہ مصر ۱۲۸۵ھ
۹۲	اَلصّلۃ بین التصوف والتّشیُّع ۔ ڈاکٹر مصطفیٰ الشیبی استاذ الفلسفۃ الاسلامیۃ فی کلیۃ الاداب بجامعۃ بغداد طبع دارالمعارف القاہرہ مصر ۔ طبع ثانی ۱۹۶۹ء
۹۳	الصّواعق المحرقۃ فی الرّدّ علی اہل البدع والزندقہ۔ محدّث احمد بن حجر الَہَیثمی (م۹۹۹ھ) مکتبہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان شہر۔ طبع اوّل ۱۹۷۶ء
۹۴	صحیح بخاری۔ للامام أبی عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری
۹۵	صحیح مسلم۔ للامام أبی الحسین مسلم بن الحجّاج بن مسلم
۹۶	الصّافی شرح اصول الکافی
۹۷	الطبقات الکبریٰ ۔ ابن سعد۔ بیروت طبع ۱۹۵۸ء
۹۸	طبقات المعتزلۃ۔ احمد یحیٰ المرتضیٰ ۔ المطبعۃ الکاثولیکیہ۔بیروت لبنان ۱۹۶۱ء
۹۹	طرائق الحقائق ۔ محمد معصوم شیرازی۔ناشر کتب خانہ نارانی تہران ایران
۱۰۰	العِبَر و دیوان المبتدء والخبر (تاریخ ابن خلدون) علامہ عبدالرحمن بن خلدون المغربی۔ ناشر دارالکتب اللبنانی بیروت لبنان۔ طبع ۱۹۸۱ء

۱۰۱	عمدة القاری شرح صحیح بخاری جلد ۱ مطبوعه دار الطباعة العامره ۔مصر
۱۰۲	اَلْعِقْدُ الْفَرِيْد۔ ابو عمر احمد بن محمد بن عبد ربّہٖ الاندلسی۔ مطبع لجنة التألیف والرجم والنشر القاهره مصر۔ طبع ثالث ۱۹۶۵ء
۱۰۳	العقود الدّریه من مناقب شیخ الاسلام احمد بن تیمیّه۔ ابو عبداللّٰہ محمد بن احمد بن عبدالهادی (م۷۴۴ھ) مطبوعه دار الکتب العلمیة۔ بیروت لبنان
۱۰۴	عقیدة الشیعة۔ ڈاکٹر دویت رونلد سن۔ تعریب۔ ع.م۔ ناشر مکتبه الخانجی مطبع السعادة بجوار محافظة مصر۔
۱۰۵	العقیدة والشریعة فی الاسلام۔ جوله تسهر المستشرق۔ تعریب محمد یوسف موسٰی۔ عبدالعزیز عبدالحق۔ علی حسن عبدالقادر مطبوعه دار الکتاب المصری ۱۹۷۶ء
۱۰۶	علل الحدیث و معرفة الرجال۔ الحافظ المحدّث علی بن عبداللّٰہ المدینی (شیخ البخاری م ۲۳۴ھ) ناشر دار الوعیٰ۔ حلب۔ سوریه
۱۰۷	علوم الحدیث ومصطلحهٗ۔ صبحی الصالح۔ دار العلم للملائیین۔ بیروت لبنان
۱۰۸	علیٌّ وَ بَنُوْهُ (الفتنة الکبریٰ جلد دوم) طٰهٰ حسین دار المعارف القاهره مصر طبع ۱۹۸۲ء
۱۰۹	اَلْفَرْقُ بَيْنَ الْفِرَق۔ علّامه عبدالقاهر البغدادی (م۴۲۹ھ) دار الکتب العلمیة۔ بیروت لبنان ۱۹۸۵ء۔ ایضًا دار المعرفة بیروت اڈیشن چہارم مطبوعہ ۲۰۰۳ء
۱۱۰	فِرَقُ الشِّيْعَةِ۔ الشیخ الحسن بن موسٰی النوبختی مطبع دار الاضواء۔ بیروت لبنان۔ طبع ثانی ۱۹۸۴ء
۱۱۱	الفصل فی الملل والاهواء والنحل۔ امام ابو محمد علی بن احمد بن ابن حزم الظاهری الاندلسی (م ۴۵۶ھ) مطبع الادبیة مصر۔ طبع ۱۳۱۷ھ
۱۱۲	فتوحات مکیه۔ امام محي الدین ابن عربیؒ مطبوعه دار صادر بیروت

۱۱۳	فتنۂ ارتداد اور پولیٹیکل قلابازیاں۔چوہدری افضل حق طبع دوم
۱۱۴	قرآن کریم
۱۱۵	کتاب البریہ۔روحانی خزائن جلد۱۳ از حضرت مسیح موعود علیہ السلام
۱۱۶	کشف الغطاء ۔ روحانی خزائن جلد ۱۴ ۔ از حضرت مسیح موعود علیہ السلام
۱۱۷	الکامل فی التاریخ. علّامہ عزّ الدین علی بن ابی الکرم المعروف بابن اثیر. مطبع الطباعۃ المنبریۃ مصر ۔ ۱۳۴۹ھ
۱۱۸	کتاب الفھرست ۔ ابو الفرج محمد بن اسحاق الندیم (م ۴۷۷ھ) المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ. مصر
۱۱۹	کتاب المجروحین من المحدّثین و الضعفاء و المتروکین. الامام محمد بن حبّان التّیمی (م ۳۵۴ھ) ناشر دار الوعی حلب سوریہ. طبع ۱۹۷۵ء
۱۲۰	کنز العمال ۔ مطبوعہ مطبعۃ النظامیۃ حیدرآباد دکن سن اشاعت ۱۳۱۴ھ
۱۲۱	الکشف الحثیث عَمَّنْ رَوٰی بِوَضْعِ الْحَدِیْث. برھان الدین الحلبی المتوفّٰی ۱۸۴۱ء ناشر احیاء التراث الاسلامی. مطبعۃ العانی ۔ بغداد عراق.
۱۲۲	گیتا ادھیائے سری کرشن
۱۲۳	لمحات النظر للکوثری. مطبوعہ قاھرہ ۔ ۱۳۶۸ھ
۱۲۴	اللیث بن سعد امام مصر ۔ ڈاکٹر السید احمد خلیلالاستاذ المساعد. بجامعۃ الاسکندریہ. مطبوعہ دار المعارف القاھرہ مصر ۔ ۱۹۶۹ء
۱۲۵	مالک بن انس ۔ عبدالحلیم الجندی. مطبوعہ دار المعارف القاھرہ مصر ۔ ۱۹۸۳ء
۱۲۶	مکتوبات امام ربّانی حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرھندیؒ
۱۲۷	محاضرات فی تاریخ المذاھب الفقھیۃ. الاستاذ محمد ابو زُھرہ. مطبوعہ مطبع المدنی ۔ ناشر جمیعۃ الدراسات الاسلامیۃ

۱۲۸	مختصر تذکرہ قرطبی لعبدالوهاب شعرانی
۱۲۹	مروج الذهب و معادن الذهب۔ علامه ابو الحسن علی بن الحسین المسعودی۔ مطبع الازهریه المصریه۔ طبع ۱۳۰۳ھ
۱۳۰	مستدرک للحاکم مع التلخیص مطبع النصر الحدیث الریاض
۱۳۱	مشکٰوۃ المصابیح للخطیب التبریزی۔
۱۳۲	مرقاۃ المصابیح شرح مشکٰوۃ المصابیح مطبوعه اصحُّ المطابع دہلی
۱۳۳	مسند احمد حنبلؒ۔ طبع القاهرہ و البیروت لبنان
۱۳۴	مؤطا امام مالک۔ امام دار الهجرۃ مالک بن انسؓ
۱۳۵	معرفۃ علوم الحدیث۔ الامام الحاکم ابوعبدالله محمد بن عبدالله النیسابوری۔ مطبع دارالکتب المصریه القاهرہ مصر و ناشر ادارۃ جمیعۃ دائرۃ المعارف العثمانیۃ حیدر آباد دکن
۱۳۶	مقالات الاسلامِیّین۔ ابوالحسن علی بن اسماعیل الاشعری (م۳۲۵ھ)۔ مکتبۃ النهضۃ المصریۃ القاهرہ مصر۔ طبع اوّل ۱۹۵۰ء
۱۳۷	مقاتل الطالبین۔ ابوالفرج علی بن الحسین بن محمد الاصفهانی (م۳۵۶ھ) مطبوعه دارالمعرفۃ بیروت لبنان
۱۳۸	مقدمه ابن الصلاح۔ الامام ابو عمرو عثمان بن عبدالرحمٰن المعروف بابن الصلاح (م ۶۴۲ھ) ناشر فاروقی کتب خانه بیرون بوہڑ گیٹ ملتان شہر پاکستان
۱۳۹	الملل والنحل۔ ابوالفتح محمد بن عبدالکریم الشهرستانی (م ۵۴۸ھ) مطبع المصطفٰی البابی۔ طبع ۱۹۶۱ء
۱۴۰	مهزلۃ العقل البشری۔ ڈاکٹر علی الوردی مطبعۃ الرابطه بغداد عراق۔ طبع اوّل ۱۹۵۵ء
۱۴۱	معرفۃ اخبار الرجال۔ ابوعمر محمد بن عمر بن عبدالعزیز

۱۴۲	المهدية في الاسلام. سعد محمد حسن من علماء الازهر مطبع دار الكتب العربي. مصر. طبع ۱۹۵۳ء
۱۴۳	ميزان الاعتدال في نقد الرجال. ابو عبدالله محمد بن احمد الذهبي (م ۷۴۸ھ) مطبع عيسىٰ البابي الحلبي
۱۴۴	ملفوظات سیدنا حضرت مسیح موعودؑ جلد ۱۰،۸ شائع کردہ الشرکۃ الاسلامیہ ربوہ
۱۴۵	نور الحق حصہ دوم. روحانی خزائن جلد ۸ از حضرت مسیح موعود علیہ السلام
۱۴۶	النزاع والتخاصم بين بني أُميّة و بني هاشم. الحافظ بن علي المقريزي (م ۸۴۵ھ) مطبوعة المكتبة السلاميه بيروت لبنان ۱۹۸۱ء
۱۴۷	نيل الاوطار. الشيخ الامام المجتهد محمد بن علي بن محمد الشوكاني
۱۴۸	نهج البلاغه. الشريف ابو الحسن محمد الرضٰى مع شرح الاستاذ محمد عبدهٗ مفتي الدّيار المصرية. مطبعة الاستقامة. ناشر دار البلاغة بيروت لبنان طبع ۱۹۸۵ء
۱۴۹	النّجم الثاقب مطبوعہ مطبع احمدی پٹنہ ۱۳۱۰ھ
۱۵۰	نزهة المجالس. مطبوعه مطبع ميمنيه مصر ۱۳۰۶ھ
۱۵۱	اليواقيت و الجواهر. عبدالوهاب الشعرانيؒ مطبوعه ۱۳۰۶ھ۔المطبعة الازهريه المصريه طبع ثالث ۱۳۲۱ھ و مطبوعہ مطبع منشی نولکشور آگرہ